PDFBOOKSFREE.PK

سسپنس ڈائجسٹ

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

اِنشائیہ — 11
جون ایلیا
تشبیہات سے تمن شعر میں شعر و شاعری کی گفتگو اتحاد و اتفاق کا درس ایک یادگار تحریر

آپ کے خط — 12
مدیرِ اعلیٰ
سسپنس کی مجلسِ مشاورت قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور خلوص مشورے

جہد حاصل — 20
ڈاکٹر ساجد امجد
ماضی کا آئینہ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

کالے راستے — 53
ایم اے راحت
دلفریب موسم کی سحر انگیزی اور... نفس کی شر انگیزیوں کا احوال

کشکول — 76
انوار صدیقی
اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

کند ہم جنس — 109
منظر امام
"جس ... کی شرم ... " ... ایک ... کا ...

تلاش — 113
کاشف زبیر
ساحل پر ... چند پیاسوں کے ماروں کا قصۂ الم

نرم چارا — 126
مرزا امجد بیگ
حتی الامکان سچ کا ساتھ دینے والے مرزا امجد بیگ کا ایک اور کارنامہ

عینی شاہد — 155
نظارت نصر
ایک قاتل کی کہانی...... ایک بے زبان کی زبانی

محفلِ شعر و سخن — 162
قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

محبت زیردست — 165
مریم کے خان
"ایک انار...... دو نہیں سو بیمار" ایک اناڑی عاشق کی روداد

اناڑی — 180
حالات کی سنگینی اور دریاؤں کی روانی ... بھائی ایک اناڑی کی کتھا

سوئے دار — 213
ثمر عباس
ٹھکرائے ہوئے لوگوں کی قدر دانی کا ایک دلچسپ انداز

حضرت حزقیل علیہ السلام — 219
رضوانہ ساجد
حضرت یرمیاہ علیہ السلام کے پیروکار ایک اور نبی کا احوال

آوارہ گرد — 2[illegible]
تنویر ریاض
... کو چلانے والے ... آوارگی کا احوال

جنت — 238
ناصر ملک
دنیا سے بیزار اور کچھ الگ سا کرنے کی دھن میں مگن عجیب انسانوں کی عجیب داستان

CPNE

MEMBER APNS

جلد40 • شمارہ 11 • نومبر 2011 • زرسالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
... مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
... مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انشائیہ

نشیان کے تین شعر

جون ایلیا

ایک نوجوان ہے نشیان۔ اسے آپ میں سے ہزاروں لوگ جانتے ہوں گے۔ وہ میرا ہمزاد ہے۔ نشیان لفظ اور معنی میں جیتا ہے اور لفظ اور معنی میں مرتا ہے۔ میں نے یونانی خدوخال اور الجھے ہوئے بڑے بڑے بالوں والے اس نوجوان کو کبھی خوش نہیں دیکھا۔

''خوش نہیں دیکھا؟ جون ایلیا! یہ تم نے کیا کہا؟ یہ کہو کہ میں نے اسے ہمیشہ طیش کی یا عذاب زندگی کی حالت میں دیکھا۔''

''ہاں، مجھے یہی کہنا چاہیے تھا، مجھ سے غلطی ہوئی خیر۔ آج کل موصوف میرے پاس آئے ہوئے ہیں۔ جب وہ آتے ہیں تو مجھے ایسا ہوتا ہے جیسے میں اپنے آپ میں آ گیا ہوں۔ جناب نشیان ایک خداداد گھر میں رہتے ہیں جو امارو بستی [illegible] شمال مغرب میں واقع ہے۔ یہاں گھر کے لفظ کی تشریح نامناسب نہ ہوگی۔ اپنے گردوپیش میں کسی قدر گھر جیسا یہ ایک ہی ''واقعہ'' ہے جو مستطیل [illegible] ہے۔ اس کے چاروں طرف کھنڈر ہیں۔ جناب نشیان کو اپنے اس ''صحرائی محل'' کا گردوپیش بہت پسند ہے۔ آں جناب روزانہ صبح و شام اس گردوپیش میں گھومتے ہیں اور جھومتے ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یہ کھنڈر یونانیوں کے زمانے کی یادگار ہیں۔ میرے اور نشیان کے [illegible] ابو ورلیش اور دانش مند بزرگ چچا دیمترا طیس نے حافظے میں محفوظ رکھنے کے لیے اکثر فرمایا ہے ''فرزندو! سنو کہ امارو بستی کے مغرب میں [illegible] کے پیڑوں کے خاتمے پر پتھروں کا ساتھ ہاتھ کا شکستہ اور کم نمود سا جو ابھار ہے وہ سیلوکس یونانی کی قبر ہے۔''

چچا دیمترا طیس نے ہمیں اور بھی بہت سی باتیں بتائی ہیں جو ہم نے لکھ لی ہیں۔ گویا معلومات اور نکات کا ایک بیش بہا خزینہ ہے جو ہم دونوں کو عطا فرمایا گیا ہے تاکہ ہم ان جواہر پاروں کو رولیں اور تولیں۔ امارو بستی کے [illegible] کا بیان ہے کہ چچا گزشتہ طوفان کے زمانے میں اکانوے برس کے ہو چکے تھے۔ خدا چچا کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم اور ان کی ملاطفت اور شفقت دائم رکھے۔

''تذکرہ ہو رہا تھا نشیان کا اس کے بیچ یہ دم چھلا کہاں سے آ گیا؟'' میں اپنے آپ سے بولتا ہوں۔

''دم چھلا، یعنی چچا دیمترا طیس کا تذکرہ! جون ایلیا یہ کیا بے ہودگی ہے۔ چچا دیمترا طیس کا تذکرہ نشیان کے تذکرے کا دم چھلا ہے! شرم نہیں آئی تمہیں یہ کہتے ہوئے؟ بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا یونانی خدوخال اور الجھے ہوئے بالوں والا نشیان۔''

''چلو چھوڑو معاف کر دو۔ تمہیں کڑاڑوں سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں۔ سچ مچ میں بہت شرمندہ ہوں۔ چچا کی کیا بات ہے۔ وہ تو سراپا دانش ہیں۔ تو اب نشیان کا ذکر شروع کرتے ہیں۔ جب وہ میرے پاس آ کر ٹھہرتا ہے تو ہم دونوں ایک ہی بستر پر سوتے ہیں، ایک ہی رکابی میں کھاتے ہیں اور ایک ہی کٹورے میں پیتے ہیں۔ ہم دونوں صبح کو ایک ہی ساتھ گھر سے نکلتے ہیں۔ دن بھر ایک ہی ساتھ رہتے ہیں۔ معاملوں اور مسئلوں سے ایک ہی ساتھ الجھتے ہیں، ایک ہی ساتھ جھلاتے ہیں اور پھر شہر اور شہریوں سے تھک کر ایک ہی ساتھ گھر پلٹتے ہیں۔

اس وقت میں اور نشیان ایک بیزار شام بھگت رہے ہیں۔ نشیان نے آج کچھ شعر کہے ہیں جن میں سے تین کا مفہوم یہ ہے۔

''میرے دل میں شام کا آزار آ ٹھہرا ہے۔ پر نجانے دنیا میں آج کیا ٹھہری؟''

''رات ہم آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے۔ وہ صرف عرض سخن ہی کی مجلس تھی۔ آخر میں یہ بات ٹھہری کہ جو کچھ کہا گیا وہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے۔''

''سب کے راستے جدا جدا تھے۔ آخر سب کا ایک ہی راستہ ٹھہرا۔''

میرے ہمزاد نشیان نے تین باتیں کہی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ شام کی اذیت میں مبتلا ہے پر نہیں جانتا کہ دوسرے بھی اس کی اس اذیت میں اس کے ساتھ ہیں یا نہیں۔ دوسری بات یہ کہی ہے کہ جو بات بھی کہی جا رہی ہے وہ پہلے ہی کہی جا چکی ہے (اور ایسا ہے بھی) تیسری بات جو اس نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ ہم زندگی بھر اپنے اپنے راستے پر چلتے رہتے ہیں پر ہمیں زندگی کے آخری لمحے میں اس سچائی کا تجربہ ہوتا ہے کہ ہم سب جو الگ الگ سمتوں میں چلتے جا رہے تھے، آخر کار ہمیں ایک ہی سمت کا رخ کرنا تھا۔

میں یہ کہتا ہوں کہ آخر میں سمجھ میں آنے والی یہ بات اگر شروع ہی میں جان لی جائے تو پھر مجھ میں اور اس شخص میں جو میری ہر بات کو غلط جانتا ہے، بھلا کیا جھگڑا باقی رہے گا۔ ہم کس بات کے حق میں دلیل دیں گے اور کس بات کے خلاف دلیل سنیں گے اور ہاں، اگر ہم سوچنے کی طرح سوچیں تو ہمارے حریف کی دلیل کسی طرح بھی ہماری دلیل سے کم مضبوط نہیں ہے اور ہماری دلیل بھی کسی طرح ہمارے حریف کی دلیل سے کم مضبوط نہیں۔ وہ بھی اس منطق کا ماہر ہے [illegible] ہم بھی اس منطق کے ماہر ہیں جس کا وہ۔ اے عزیز، بات یہ ہے کہ سارے جھگڑے عقیدوں، مسلکوں اور مشربوں کے سارے جھگڑے دو [illegible] زید اور بکر پیش کرتے ہیں۔ زید بکر کے یقین کو غلط گردانتا ہے اور بکر زید کے یقین کو۔ نتیجہ کیا نکلا؟ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں کا یقین [illegible] یقین بھی درست ہے اور بکر کا بھی۔ میرے دوستو! تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ آخر میں میری یہ بات ضرور [illegible] ایک فضول اور نکول گردانتا ہوں۔ زید ہو یا بکر، ان میں سے کوئی بھی عقل و ہوش کی حالت میں [illegible] تم دونوں ایسی کوئی بات کہتے ہو تو میں تمہیں ''تلقین'' کی عبارت یاد دلاؤں گا [illegible]

''[illegible]''

اب میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تمہیں تمہارے خدا، تمہارے رسول، تمہارے مسیح، تمہارے بھگوان اور تمہارے اوتاروں کی قسم! بتاؤ کہ کیا تم زندگی [illegible] کی طرح سنتے اور سمجھنے کی طرح سمجھتے ہو؟ کیا تم میں سے کوئی ایسا شخص ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ میں نے زندگی بھر سننے کی طرح سنا اور سمجھنے کی طرح سمجھا [illegible]

اے دوستو! آج مجھے تم سے یہی کہنا تھا اور اپنے ہمزاد نشیان کی یاد دلانی تھی۔ یہ امر بے مصلحت نہیں ہے اور پھر یہ خود نشیان مصلحتوں کی ایک مصلحت [illegible] آئندہ مقام بیان و بلاغ میں قیام کرے گا اور سننے والوں کے کشکول دانش سے بھرے گا۔

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عزیز قارئین!

تسلیمات

نومبر 2011ء کا سسپنس اپنے منفرد انداز میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ جس قوم کے رہنما محض ''راہ...... نما'' یعنی ''رستہ جیسے'' بن کر رہ جائیں قوم کی حالت میں سدھار نہیں آسکتا...... کیونکہ رستے پر تو لوگ آتے جاتے ہی رہتے ہیں...... بہرحال پچھلے دنوں سفارتی سطح پر کچھ تشویشناک معاملات پیش آئے اور امریکا کی جانب سے الزامات اور دھمکیوں کا سلسلہ جاری رہا جس کے پیش نظر حکومت نے (A.P.C) آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد کیا، ایک قرارداد پر متفق ہو گئے مگر مثل مشہور ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ امریکا کی ساری دنیا ہم نوا ہے، ایک ہم ہیں کہ بھینس کے آگے بین بجا رہے ہیں۔ گویا ''اندھے کے آگے روئے...... اپنے بھی نین کھوئے'' جو موجودہ حالات کا سبب بنے اسی سے بہتری کی امید عبث نہیں تو کیا ہے؟ جب قائدین میسر آنے والی لاٹھیوں کو بے ساکھی کے طور پر استعمال کرنے لگیں تو چالوں میں لڑکھڑاہٹ آہی جاتی ہے۔ جیسا کہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی۔ اس ماہ حکیم الامت کا یوم پیدائش بھی منایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے بزرگوں اور رہنماؤں کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں۔ اور چلتے ہیں اپنی ''اے پی سی'' کی جانب...

✠ **قاضی محمد قیصر شہزاد**، داجل تحصیل جام ضلع راجن پور سے تبصرہ کرتے ہیں ''طویل عرصے کے بعد ایک بار پھر آپ کے در دولت پر حاضر ہونے کی جسارت کر رہے ہیں۔ امید واثق ہے خوش دلی سے سواگت کریں گے (خوش آمدید) اس بار میگزین بہت لیٹ ملا...... یقیناً سیلاب جو انسانی جانوں کے لیے زیاں و مہلک بیماریوں کا بھی موجب بنا۔ یہ ہمارے اعمال کی سزا ہے کہ ہم ناگہانی آفتوں میں گرفتار ہیں۔ سرورق دیکھ کر اداسی کی لہر پورے جسم میں دوڑ گئی کیونکہ ''موصوفہ'' رنگین کپڑوں میں ملبوس تھی مگر چہرے پر اداسی کے تاثرات نمایاں تھے باقی ذاکر انکل سے پوچھنا پڑے گا کہ بےچاری کا شوہر نامدار بیرون ملک روزی روٹی کمانے تو نہیں گیا۔ (آپ کو کیسے پتا چلا۔ اداسی سے انتظار کا) انشائیہ میں جون ایلیا جی نے پھر ایک اہم حقیقت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ہمارے ملک میں آئے روز حوا کی بیٹی ان حالات سے دوچار ہے۔ آج محفل یاراں اپنے عروج پر پہنچی ہوئی ہے۔ صدارت کی کرسی پر ''ادریس احمد خان'' براجمان ہیں۔ ان کے لیے مبارک باد۔ پورے خطوط میں ہر قاری کی نظر ماہا جی اور طاہرہ یاسمین صاحبہ پر ہوتی ہے اور ہر کوئی اس کار خیر میں حسب توفیق ثواب کما رہا ہے باقی سب کی نوک جھونک اچھی جا رہی ہے بہرحال ان تبصرہ نگاروں میں صوبیدار (ر) عبدالحکیم صاحب جو کہ ہمارے پرانے لکھاریوں میں شمار ہوتے ہیں اچھے تبصرہ نگار ہیں۔ تفسیر عباس صاحب جو پاکستان کے ہر میگزین میں پائے جاتے ہیں اور خاص طور پر جاسوسی اور سرگزشت ڈائجسٹ میں۔ ہمایوں سعید راج، محمد جاوید بلوچ اور طاہرہ یاسمین صاحبہ کے اچھے تبصرے تھے اور ماہا ایمان صاحبہ بھی اچھی تبصرہ نگار ہیں مگر بلیک لسٹ میں تھیں اور ہم ایک اچھے تبصرے سے محروم رہ گئے۔ تاریخ کے جھروکوں سے لی گئی، ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی صحرا بہ صحرا، مغل اور افغانوں کے گزرے ہوئے تازہ بہ تازہ حالات سے روشناس ہوئے...... اپنوں کی غداری ہی کے مرہون منت کئی حکمران تخت سے تختے پر آ کر گرے۔ کاشف زبیر صاحب نے اپنے قلم کے زور پر کہانی میں چاشنی پیدا کر دی اور سسپنس کے پہلو کو آخر تک اجاگر رکھا اور ایلی کو ایرک کی صورت میں نیا مددگار ملا۔ اسرار و تحیر خوف اور تجسس میں اپنی مثال آپ انور صدیقی صاحب کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ مددگار، واقعات کے ساتھ پوری طرح عہدہ برآ ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سراج صاحب میڈم روبی کو افضل خان کی ہوس سے بچا سکتے ہیں یا نہیں۔ کردار، پلاٹ اور حالات کردار حقیقی معنوں میں پر تجسس ہے پتا نہیں مصنف کب ان کے راز سے پردہ اٹھائیں گے۔ زادِ راہ حقیقی معنوں میں دل کے تاروں کو چھیڑنے والی کہانی تھی۔ ایک عجیب و غریب کردار ہمارے سامنے تھا کیونکہ اکثر لوگ ماضی کی تلخ یادوں میں تباہ و برباد ہو جاتے ہیں مگر یہاں شہاب ماضی کے حسین لمحوں کو مقید کر کے اس کے سہارے جی رہا تھا۔ پرایا مال واقعی پرایا ثابت ہوا۔ معاشرے میں پھیلے ہوئے ناسوروں میں سے ایک ناسور کا احوال جس نے پیسا کمانے کے لیے بیٹے کو داؤ پر لگا دیا۔ ملک صفدر حیات صاحب اس بار واقعی زبردست کہانی لے کر آئے۔ سسپنس کو آخر تک ملحوظِ خاطر رکھا۔ اس عجیب و غریب معما قتل پر ہم بھی چکرا کر رہ گئے۔ ہر سیر کو سوا سیر کے مصداق جونی کیمپ کو بھی سوا سیر مل گیا، دوسروں کو چکر دینے والا خود چکرا کر رہ گیا۔ ویل ڈن مریم کے خان جی بہت اچھی اسٹوری تھی۔ اناڑی بہت اچھی جا رہی ہے۔ اگلی قسط میں دیکھتے ہیں نور صاحبہ باز یاب ہوتی ہیں یا نہیں۔ زبیر سلیمانی صاحب ایک پر فکر اور احساس طلب اسٹوری لے کر آئے معاشرے میں ظالم کس طرح غریب کو کھا جاتا ہے اس کی عمدہ مثال پیش کی۔ محبت میں آ کر سب کچھ لٹا دینے میں مائیکل جوزف آگے آگے ٹھہرے، مغرب میں مشرقی محبت دیکھ کر چنداں حیران نہیں ہوئے کیونکہ محبت پہ کسی کا زور نہیں کیونکہ یہ لگائے نہ لگے بجھائے نہ بنے۔ ویل ڈن ثمر عباس جی۔ رضوانہ صاحبہ اس بار حضرت حزقیل علیہ السلام لے کر آئیں۔ ہر بار مخلوق کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو مبعوث فرمایا۔ نواب انکل اس بار ہر بار کی طرح خوبصورت تحریر لائے۔ شیطان انسان کو بھٹکانے کی بہت سعی کرتا ہے مگر اللہ پاک اپنے خاص بندوں پر نظر کرم فرماتا ہے، بہت پیاری تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن میں محمد امجد ریاض، رانا مختار احمد، نوشین ناز، ارسلا فضل، ماہا ایمان، افشاں اور عاصم اقبال کے اشعار دلفریب تھے۔''

✠ **ماہا ایمان**، پنجاب سے چلی آ رہی ہیں ''اکتوبر 2011ء کا پیارا سسپنس تمام تر لوازمات سے آراستہ و پیراستہ ہمارے روبرو ہے۔ جو

ہمارے لیے تو اچھا خاصا دھماکا خیز ثابت ہوا ہے۔ سرورق بہت ہی عام سا تھا جو سسپنس کے شایانِ شان ہرگز نہیں تھا۔ ٹائٹل حسینہ ہمیں کچھ بھائی نہیں۔ ہاں جون ایلیا کا انشائیہ ہمیشہ کی طرح بہت خاص تھا۔ بچے واقعی پھول ہوتے ہیں۔ وہ شاہو یا کراچی کا معید جس کا مقدر ابد تک خاک اوڑھ کے سونا نکلا، کیا مقدر ہے ہمارا۔ کسی دھماکے میں جو لوگ مرتے ہیں ان میں اور ان لوگوں میں کیا فرق ہے جو سیلاب اور بارشوں سے مر جاتے ہیں۔ اگر سیلاب اور بارشوں سے بچ جائیں تو خوراک، دودھ اور پانی نہ ملنے سے مر جاتے ہیں۔ ایک فرق تو یہ ہے کہ دھماکے میں مرنے والوں کی گنتی ہوتی ہے لیکن جو لوگ کھلے آسمان تلے مر جاتے ہیں ان کی گنتی نہیں پنجاب میں ڈینگی بھی گاڑ چکا ہے۔ ہر لمحہ دعاؤں کے بعد خوف و ہراس میں گزر رہا ہے۔ دل بہت اداس تھا جب سسپنس سے ملاقات ہوئی اور یہ اداسی اسی وقت غم میں ڈھل گئی جب بلیک لسٹ میں جگمگاتا اپنا نام پڑھنے کو ملا۔ جاتے جاتے یہ مزہ بھی چکھا دیا ہمیں آپ نے کیونکہ چھ سالوں میں ریکارڈ تھا کہ کبھی میرا تبصرہ بلیک لسٹ نہیں ہوا تھا۔ (کبھی مجبوراً ایسا بھی کرنا پڑتا ہے) اگر وقت پر مل جاتا تو ضرور محفل کی زینت بنتا) یہاں میں کوئی شکوہ نہیں کروں گی صرف احتجاج کروں گی کہ محفل سے صنف نازک کو کمین میں سے بال کی طرح نکالا جا رہا ہے۔ میرے ساتھ چونکہ فرسٹ ٹائم یہ حادثہ ہوا ہے تو دوسروں کی تکلیف کا احساس زیادہ ہوا۔ ثمر عباس کی باوزن تحریر باوزن سے آغاز کیا۔ مائیکل کی محبت اور لیزا کا آخری فیصلہ پسند آیا۔ تقدیر اور تدبیر کے مختلف زاویوں پر روشنی ڈالتی خزاں سے پہلے نازک احساسات کی ترجمان تحریر تھی۔ کاشف زبیر ہمیشہ کی طرح خاصے کی چیز لائے۔ مددگار میں ایرک ویمپائر کا آٹھواں بوائے فرینڈ خوشی خوشی بن گیا اور یہ فیصلہ ہمیں تو بالکل پسند نہیں آیا۔ خیر محبت یا تو ہوتی ہے یا نہیں ہوتی اور معاشرے کے مروجہ کسی قانون کو نہیں مانتی سو آگے بڑھتے ہیں اناڑی کی طرف ماہ نور صاحبہ کا ابھی پتا نہیں چلا مسٹر اناڑی ابھی ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ کیا فائدہ ہوا آفتاب خان کو اغوا کرنے کا؟ کشکول زبردست طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے لیکن کہانی کی بنیاد قدرے کمزور ہے۔ ابھی تک واضح نہیں ہوا ہیرو کون ہے لیاقت یا سراج؟ شبنم کی اسٹوری عمدہ تھی۔ میڈم کو یقیناً افضل سے سراج بچا لے گا۔ ملک صاحب کی اقبالِ جرم روایتی پولیس اور جرم کی کہانی تھی۔ طاہر جندرا کے ایسے انجام سے دکھ ہوا۔ بہت ہی بےعقل مجرم تھا۔ حضرت حزقیل علیہ السلام کے دور کے واقعات پڑھتے ہوئے خود کو اسی دور میں محسوس کیا۔ صحرا بہ صحرا اور نواب صاحب کی تحریر پارسائی معروفیات کی وجہ سے ابھی نظروں سے نہیں گزریں۔ محفل شعر و سخن میں اس دفعہ زیادہ معیاری اشعار پڑھنے کو ملے، ملک آصف نواز کا شعر عمدہ تھا۔ محفل میں ہماری غیر موجودگی کی وجہ سے پھیکا پن غالب تھا۔ آہ سیدہ نسرین آمل کے کریں آہ و زاریاں، شاید مدیر اعلیٰ کے دل پر ہماری آہ و فغاں و نالہ و فریاد اثر کر جائے۔ (زبردست) ہمایوں سعید بھی راج بھی رومیو، نیک پروین ڈھونڈتے ہوئے سوچ لینا کہ تم کوئی حاجن ڈیزرو بھی کرتے ہو یا نہیں۔ ذیشان افتخار آپ کی بےبسی قابل غور ہے۔ طاہرہ یاسمین میرے خط کو کھلنے کا اذن ہی نہ ملا ورنہ تفسیر صاحب بھی آج اپنی چونچ سہلا رہے ہوتے۔ محسن علی موم صنف نازک کو جوتیاں اٹھانے کے علاوہ لگانی بھی آتی ہیں۔ ہوشیار رہنا۔ ایم ڈبل اے اللہ آپ کو ایسے طنز سے بچائے۔ محمد جاوید بلوچ کیوں ہمایوں سعید کو الٹے سیدھے خواب دکھلا رہے ہو؟ جوابی وار کے طور پر آپ بھی سینکائی کروانے کے لیے تیار رہنا۔ تفسیر عباس، بیٹا مبارک ہو۔ اب آپ ہیٹ ٹرک کرنے کے قابل ہو گئے۔ رائے قیصر عباس کھرل آپ تو ہمارے گرائیں نکلے۔ عمران حیدر بلوچ آپ کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ بہاولپور میں کیا خاص ہے یہ تو کوئی ہم سے پوچھے۔ ادریس احمد خان کا تبصرہ اچھا لگا۔ مدنی صاحب بہت مزہ آیا لیکن ان کی کمی تھی اور وہ کمی اب پوری ہونے جا رہی ہے اور ہمارے مسٹر رائٹ نے وارننگ بھی دے دی ہے کہ وہ ہماری بھرپور توجہ چاہتے ہیں۔''

✠ **اشتیاق احمد**، پنجاب سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ''سسپنس کی محفل میں دوسری بار شرکت کر رہا ہوں۔ پہلا خط مارچ 2010ء میں شائع ہوا تھا جب دیوتا جیسا عظیم الشان سلسلہ اختتام پذیر ہوا تھا۔ اب کشکول پڑھ کر دوبارہ قلم اٹھایا ہے کیونکہ اس تحریر میں بھی دیوتا کی طرح پراسراریت دکھائی دے رہی ہے۔ ایسی کہانیوں کا تو میں ویسے ہی بہت دلدادہ ہوں اور جب محی الدین نواب اور انور صدیقی جیسے بلند پائے کے ادیب ایسی تحریریں تخلیق کر رہے ہوں تو اس کا مزہ ہی الگ ہوگا ہے۔ اکتوبر کا شمارہ 19 ستمبر کو موصول ہوا۔ حسینۂ سرورق مشرقی حسن کا بہترین نمونہ اور ذاکر انکل کی خوبصورت سوچ اور عمدہ تخیل کا شاہکار لگی۔ تبصرہ بہت پسند آیا۔ ان کے علاوہ حیدر خان، عمران حیدر، تفسیر عباس بابر، محمد جاوید بلوچ، ریاض بٹ اور طاہرہ یاسمین کے خیالات قابل تحسین تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے کشکول کا مطالعہ کیا۔ لیاقت حسین کی غیبی صلاحیت ابھی واضح نہ ہو سکی۔ سراج کا کردار بےحد پسند آیا۔ باقی قسط میں ہنگامہ خیزی، اغوا وغیرہ نے خوبصورتی بڑھا دی۔ اس کے بعد اناڑی کا مطالعہ کیا۔ یہ تحریر ربڑ کی طرح کھنچتی ہی جا رہی ہے۔ پھیکے پتر اور راجا کی نوک جھونک نے لطف دیا۔ نورتا حال لاپتا تھی۔ آخری صفحات پر محی الدین نواب صاحب براجمان تھے۔ پارسائی میں نماز کا درس، دوسروں پر تہمت نہ لگانے کا درس اور یہ سبق ملا کہ کبھی کبھی سچائی بھی دھوکا دے جاتی ہے۔ محفل شعر و سخن میں جنید احمد کا شعر قابل داد تھا۔ منظر امام کی تحریر نے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ باقی شمارہ بے مثال تھا۔''

✠ **سید شکیل حسین کاظمی**، اسلام آباد سے لکھتے ہیں ''سلام مسنون! اس دفعہ سسپنس قدرے تاخیر سے مارکیٹ کی زینت بنا۔ اس کی وجہ شاید حالیہ بارشوں کا سلسلہ ہوگا۔ پھر بھی ہم نے 20 تاریخ کو سسپنس تک رسائی حاصل کر ہی لی۔ سرورق میں مشرقی حسن غالب نظر آیا اور دوشیزۂ سرورق کے لباس اور ساڑی میں رنگوں کا امتزاج بہت دلکش منظر پیش کر رہا تھا۔ کیئر کریم، میڈی کیم ٹوتھ پیسٹ سمیت اشتہارات میں موجود تمام خواتین [illegible] ہوئے۔ یہ ایک ایسے پھول کی داستان تھی جو بہار میں ہی مرجھا ہو گیا۔ بہت جگر سوز تحریر تھی اپنی محفل میں پہنچے تو مدیر اعلیٰ ملکی حالات پر فکر انگیز گفتگو کرتی نظر آئیں۔ مگر ارباب اختیار ہنوز محوِ آرام ہیں اور اب تو پچھلے ایک لمحے سے لوڈشیڈنگ کی یہ صورت حال ہے کہ اللہ کی پناہ۔ ایک اسی کا عذاب دوسرا بجلی، پانی غائب۔ انہیں کب یہ سلسلہ رکے گا اور رکے گا بھی یا نہیں؟ طفل تسلیاں تو بہت دے چکے ہیں ابھی تک عوام کو۔ محفل کی ابتدا ادریس احمد کے خط سے ہوئی۔ تبصرہ بہت جامع و مکمل تھا۔ سو بہت پسند آیا۔ تہ دل سے مبارک باد وصول کریں۔ حکیم سید محمد رضا صاحب آپ کا خط آخر شائع ہو ہی گیا۔ میری یہ تیسری کوشش ہے۔ دیکھتے ہیں کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ خواجہ مدنی صاحب آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ حیدر عباس کا خوشبو میں معطر تبصرہ اچھا لگا۔ قیصر عباس صاحب آپ کو بھی دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہتے ہیں کیونکہ ہماری محبوبہ مشترکہ (سسپنس) ہے، یہ وضاحت لازم تھی۔ صوبیدار (ر) حاجی عبدالحکیم صاحب آپ کی آنکھوں میں آنسو تبصرہ دیکھ کر آ گئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یا یہ دیکھ کر کہ وہ صفحہ نمبر 17 پر ہے؟ تفسیر بابر عباس، جناب آپ کا تبصرہ ہمیشہ ہی جامع اور بھرپور ہوتا ہے آپ کو دوسرے شہزادے کی ولادت مبارک ہو، آپ کے بیٹوں کے نام مجھے بہت پسند آئے ہیں۔ خدا ان کو لمبی عمر، صحت اور تندرستی عطا فرمائے۔ آمین! ہمایوں سعید راج کا شریر تبصرہ پڑھ کے بہت مزہ آیا۔ اس کے علاوہ ایم ڈبل اے، محمد جاوید بلوچ، ذیشان افتخار ڈھلوں اور محفل میں موجود واحد خاتون طاہرہ یاسمین کے تبصرے اچھے لگے۔ سیدہ نسرین کو بلیک لسٹ دیکھ کر دکھ ہوا کہ پورے ضلع نارووال کی واحد تبصرہ نگار ہیں۔ میں بھی نارووال کے ایک گاؤں سے ہوں مگر اسلام آباد میں بسلسلۂ روزگار گزشتہ پانچ سال سے مقیم ہوں۔ کہانیوں کی طرف آئے تو سب سے پہلے کشکول کا مطالعہ کیا۔ لیاقت کسی روحانی قوت کے زیرِ اثر نظر آ رہا ہے۔ سراج اور میڈم روبی کے کردار بہت ہی زبردست اور باہمت ہیں۔ امید ہے سراج میڈم کو بچالے گا۔ یہ ایک بہترین سلسلہ ہے اس دفعہ اناڑی کی یہ قسط بہت شاندار رہی۔ اس میں رفیق اپنے دوست راجا سمیت ایکشن میں نظر آیا۔ اب بس نور کی بازیابی کا انتظار ہے۔ کاشف زبیر کی مددگار کسی فلمی اسٹوری جیسی تھی۔ مگر پھر بھی دلچسپ تھی۔ آجکل واقعی احتیاط کی ضرورت ہے کیا پتا کون سی لڑکی آدم خود نکل آئے۔ زادِ راہ بہت ہی حساس تحریر تھی اور اس پر ایسی منظر کشی، لگ رہا تھا جیسے سلطانہ شہاب سے نہیں مجھ سے رخصت ہو رہی ہے۔ آخر میں شہاب کا فیصلہ بہت اچھا لگا۔ اقبالِ جرم ملک صاحب کی بہترین کاوش ثابت ہوئی۔ شروع میں خودکشی کا فلسفہ بیان کر کے زیادہ تجسس پیدا کر دیا کہ شاید خودکشی ہی ہو۔ پرایا مال ایک شگفتہ تحریر تھی۔ انتساب تنویر ریاض کی ایک منفرد کہانی تھی۔ کامیاب مصنف کا دوسرا روپ جو اپنی تصانیف کے لیے اچھا خاصا ہوم ورک کرتا ہے۔ زبیر سلیمانی کی سزا پڑھنے کے بعد اپنے پیارے پاکستان کے حالات کی طرف دھیان چلا گیا۔ مریم کے خان کا سیانا انتہائی خوبصورت تحریر تھی۔ کبھی کبھی زیادہ چالاک انسان بہت نقصان اٹھاتا ہے۔ باوزن ایک ہلکی پھلکی اور اچھی تحریر تھی۔ خزاں سے پہلے میں پختہ ترین عمر کا عشق دیکھا جس نے ایمی کو قتل پر مجبور کر دیا۔ اس دفعہ محی الدین نواب صاحب کی پارسائی تمام ڈائجسٹ پر سبقت لے گئی۔ نواب صاحب اپنا اسلوب تھوڑا ساجدا کر گئے ہیں اور یہ مجھے تو بہت پسند آیا ہے اور کسی کا پتا نہیں۔ ورنہ پہلے لگتا تھا ایک ہی کہانی کی دیگر اقساط کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک بہترین تحریر تھی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی صحرابہ صحرا بہت خوبصورت اور معلومات سے بھرپور تحریر ثابت ہوئی۔ ہمایوں کی زیادہ بادشاہی سفر میں ہی گزر گئی۔ اس دفعہ یقیناً بابر کی داستان پڑھنے کو ملے گی۔ حضرت حزقیلؑ کے ایمان افروز واقعات کا مطالعہ کیا۔ حضرت حزقیلؑ کے نام کے متعلق عربی مرکب یعنی قدرت اللہ کی قیاس آرائی بھی بہت خوب لگی۔ محفل شعر و سخن میں تفسیر عباس بابر، طاہرہ یاسمین اور محمد آصف کے اشعار بہت پسند آئے۔

✠ **تفسیر عباس بابر**، اوکاڑہ سے تبصرہ کر رہے ہیں ''سرورق سادہ مگر...... دل آویز تھا۔ دوشیزہ سرورق شرقی تہذیب و روایات کے پرچار کی اپنی سی کوشش میں مصروف عمل ہے۔ جون ایلیاء کا انشائیہ...... ایک اور دردانگیز نوحہ...... دعوت فکر دے گیا آپ کے خط میں آپ کے پراثر افکار و خیالات ہمیشہ خاصے کی چیز ہوتے ہیں پاکستان قدرتی آفات و بلیات سے دوچار ہے اللہ ہمارے حال اور حالات پر رحم فرمائے (آمین)۔ کراچی سے ادریس خان...... غالباً رواں سال میں دوسری دفعہ مسندِ صدارت کے لیے منتخب ہوئے ہیں بہت زیادہ مبارک باد...... میانوالی سے سید محمد رضا شاہ...... مستقل بننے کے لیے مستقل نظر انداز ہونا پڑتا ہے حوصلہ رکھیے...... طاہر پیر سے مدنی صاحب...... آپ دلنشین کو نہ پا کر خوش ہو رہے ہیں یا اظہار افسوس کر رہے ہیں علی پور سے محمد جاوید بلوچ، پرخلوص دعاؤں اور نیک تمناؤں کے لیے ازحد نوازش...... حسن ابدال سے ریاض بٹ...... دعا کریں کہ کوئی ابن مریم ہو اور ہماری آہوں وغموں، سسکیوں اور ہر درد کا مداوا کر دے...... محسن علی موئم ذیشان افتخار اور ہمایوں سعید...... تبصرہ پسند کرنے کے لیے بہت زیادہ شکریہ...... ویسے ذیشان افتخار صاحب...... ہماری معلومات کے مطابق بابر عباس کی اولاد جوان نہیں ہے بہر حال وہ ہم سے بڑے ہیں اور بہت زیادہ محترم بھی ہیں...... سرگودھا سے طاہرہ یاسمین...... آپ نے ثابت کر دیا کہ بھینس بھینس کی بہن ہوتی ہے۔ چلیں ہم نے آپ کی ماہا کو بخش دیا...... ان سے کہہ دیں کہ کھائیں پئیں عیش کریں۔ معزز و معتبر حضرات کو بلیک لسٹ میں دیکھ کر افسوس ہو رہا ہے بالخصوص حمیرا رضا...... راجا ثاقب نواز ثاقب...... اور حافظ آباد سے ماہا ایمان...... ویسے ماہا...... آپ کو بلیک لسٹ میں دیکھ کر ہمیں دکھ ہو رہا ہے اور یہ سب محکمۂ ڈاک والوں کی عنایت ہے۔ آغا فرید احمد خان اور بابر عباس...... آپ اچھے اور لائق بچوں کی طرح چلے آئیں آپ کو کچھ نہیں کہا جائے گا...... کہانیوں میں سب سے پہلے نباضِ دوراں...... محی الدین نواب کی پراثر اور فکر انگیز تحریر پارسائی سے آغاز کیا۔ اس دفعہ نواب صاحب نے نہایت منفرد اور اچھوتے موضوع پر قلم اٹھایا اور قلم توڑ دیا...... دنیا تہمت زنی پہ آجائے تو حضرت مریم جیسی پاک باز ہستی پر بھی...... حروف ملامت سے سنگ باری کر دیتی ہے۔ مولانا فضل کریم تو ایک دنیادار بندہ تھا خون کے خاص رشتوں کی تذلیل...... لیکن نیت کی بنیاد ناقص نہ ہو تو محنت، محبت امید اور نیکی رائیگاں نہیں جاتی...... انیلا کے مہرباں نے آنے میں دیر تو کر دی لیکن درست آیا...... کہانی کے ایمان افروز انجام نے متاثر کیا۔ ماضی کے آئینے میں ابتدائی صفحات پر حسبِ روایت ایک لازوال تحریر صحرابہ صحرا کے ساتھ، ڈاکٹر ساجد امجد کی آمد بھی خوب رہی۔ شیر شاہ سوری کا شمار ہماری پسندیدہ شخصیات میں ہوتا ہے۔ اسرار و تحیر سے بھرپور انوار صدیقی کی دلچسپ تحریر کشکول اس ماہ زبردست رہی۔ کترنوں میں صفحہ 143 پر ادارے نے شیر اور بکری کو ایک کر دیا ویسے دلچسپ ماجرا ہے ملک صفدر حیات کے تھانے سے ایک اور دل خراش واقعہ...... دنیا و جوزن اور حصول کی خاطر...... انسانیت کی تذلیل میں دل سے کوشاں ہے۔ طاہر جندرا کی ناحق موت نے افسردہ کر دیا ضیا باجوہ...... کے منفی طرز فکر نے ایک زندگی ایک گھر اور دو دل پامال کر دیے۔ اناڑی میں حالات کی سنگینی اور دریاؤں کی روانی قابلِ داد ہے اس ماہ نواب صاحب کافی سرگرم رہے، اکبر سندھو دلچسپی سے بھرپور اضافہ ہے انبیاء کرام کے سلسلے میں ایک ذی مرتبت نبی حضرت حزقیلؑ کی جدوجہد اور دین اسلام کی ترویج و بقاء کا ایمان افروز احوال نہایت معلوماتی اور دلچسپ تھا۔ مختصر تحریروں میں مددگار کے لیے کاشف زبیر کا نام ہی کافی ہے ایک دیمپائر کی اثر انگیز روداد محبت...... نے بہت متاثر کیا۔ ش صغیر ادیب کی دل گداز تحریر...... ناکام محبت کا پرفسوں قصہ زادِ راہ اور یقیناً کہ ایسا زادِ راہ لٹا دینا ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ منظر امام کی پرایا مال بھی دلچسپ مگر افسوس ناک تحریر تھی۔ تنویر ریاض کی انتساب بھی دلچسپ قصہ تھا۔ مریم کے خان کی بہترین تحریر سیانا...... سیانا کو ہمیشہ غلط فیصلہ اور غلط پلاننگ کرتا ہے۔ لاحاصل...... باوزن اور خزاں سے پہلے بھی اچھی تحریریں تھیں۔ بزم شعر و سخن...... قارئین کے جذبات و احساسات کا بھرپور اظہار ہے۔ انہی لفظوں کے ساتھ اجازت دیجیے نیک تمناؤں کے ساتھ......''

✠ **محسن علی موم**، بالاکوٹ سے چلے آرہے ہیں ''اکتوبر کا شمارہ ستمبر میں ملا سرورق پر موجود لڑکی نما عورت کچھ پسند نہیں آئی، کہیں اہل ...ل سے کسی نے اپنی تصویر تو نہیں بھیج دی خوش فہمی میں۔ جون ایلیا کا درد بھرا مرثیہ اداس کر گیا۔ محفل یاراں میں اس مرتبہ کی صدارت، ادریس ...ن کے حصے آئی، اتنا خوبصورت تبصرہ لکھنے پر مبارک باد جی۔ دانیال کا کڑ، لگتا ہے آپ کا ہاضمہ بڑا کمزور ہے جو آپ کو کچھ بھی ہضم نہیں ہوتا۔ تفسیر ...ی تسی گریٹ ہو۔ اتنی پیاری اردو، واللہ ہم تو آپ کے مرید ہو گئے ہیں۔ گناہ گاروں کی لسٹ میں آہوں کی آواز سن کر جھانک کے دیکھا تو سب سے زیادہ افسردہ ...ماہا ایمان کو پایا کوئی بات نہیں، قہر درویش بر جانِ درویش...... اب کچھ تبصرہ کہانیوں پر، ہمایوں کی داستان ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے پسند آئی البتہ شیر شاہ کا ...کچھ مختصر سا تھا۔ مددگار، ویمپائر پر بہت سی کہانیاں لکھی گئی ہیں لیکن اس طرز کی کہانی پہلی بار پڑھی، اچھی کہانی تھی۔ کشکول میں لیاقت کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ...بعید از قیاس ہے۔ سراج کا کردار انتہائی مضبوط ہے۔ آخر میں میڈم روبی افضل خان کے شکنجے میں بری طرح پھنس گئی اب دیکھنا یہ ہے کہ انسپکٹر سراج اسے ...ہا پاتا ہے یا نہیں۔ زادِ راہ میں شہاب اپنی حسرتوں کا جنازہ اپنے ہی کاندھے پہ اٹھا لایا ہے۔ یقیناً اب اس کے خیالوں میں وہی حسین چہرہ آباد رہے گا جس کا وہ ...کار رہا ہے۔ اقبالِ جرم ملک صاحب نے ایک بار پھر اپنی ذہانت کو لوہا منوایا اور ضیا باجوہ کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ انتساب پیٹرک نے آخر کامیاب مصنف ...ہ گر سیکھ ہی لیا اور انتساب بھی کیا خوب لکھا۔ سزا، پنے سے زیادہ طاقتور کو للکارنے کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور خاص کر وہاں جہاں جنگل کا قانون ہو۔ ...م وفن، میں ماہا ایمان کا شعر پسند آیا۔ سیانا جونی کی امیدوں پر پانی خوب پھرا، اور وہ بھی اس لیے کہ اس نے جارج کے سامنے بے پروائی دکھائی۔ اناڑی، اب ...ب جا رہی ہے۔ لیکے کی قسمت خراب ہے ایک نور جہاں نہیں مل رہی اور دوسرا وہ ہر جگہ بے وقوف بن رہا ہے۔ لاحاصل جیری کا انتظار رائگاں گیا۔ حضرت حزقیل ...ے ایمان تازہ ہو گیا۔ باوزن میں مائیکل نے آخر لیزا کو رام کر ہی دیا۔ لیزا کو پہلے عقل آجاتی تو شاید وہ فٹ بال نہ بنتی۔ خزاں سے پہلے، ایمی نے ہیلری کا پتا ...ب صاف کیا اور اپنی محبت کو پالیا۔ پارسائی، اکثر آنکھیں وہی کچھ دیکھتی ہیں جو انہیں دکھایا جاتا ہے۔ مولانا صاحب کو اس کے صبر کا پھل خوب ملا اور انیلا کو تو خوب ...طلوب تر۔''

✠ **ہمایوں سعید راج**، بنوں سے آرہے ہیں ''شاید ڈاکٹر انکل کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ اس بار دل کی دھڑکن بڑھانے یا روکنے والی ماہ جبیں کا عکس بنانے میں ناکام ہو چکے ہیں اسی لیے اپنے دستخط بھی مٹا دیے چلیں اس بار معاف کرتے ہیں آئندہ نسرین صاحبہ کو سرورق پہ مت سجانا۔ انکل جی نے تمام پریوں کو گیٹ سے باہر کھڑا رکھ کر محفل کو سونا سونا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ طاہرہ جی تو کسی طرح دیوار پھلانگ کے اندر آ گئی تھیں۔ مگر ماہا نے فقط ہونٹ کاٹنے اور میری طرف زخمی نظروں سے دیکھنے پر اکتفا کیا۔ حیدر بھائی ہمیں انہی خوابوں کے سنگ جینے دیجیے۔ عمران صاحب ہم سونے سے پہلے کوئی رومانٹک فلم یا ناول دیکھتے ہیں۔ نسوار کے نام سے بھی مجھے الرجی ہے۔ تفسیر صاحب سید ھا سیدھا کہیے تاکہ آپ دلنشیں کو مس کر رہے ہیں۔ دو بچوں کے باپ ہو سدھر جاؤ اب۔ جاوید صاحب! پہلے تو عورت جیسی ہستی کو چڑیل جیسے سستے نام دینے سے گریز کریں انہی کے طفیل آپ اس دنیا میں آئے ہیں۔ انہی کی بدولت گرم کھانا اور استری شدہ کپڑے نصیب ہوتے ہیں اور دوسری بات کہ عورت کی جگہ قدموں میں نہیں دل میں ہونی چاہیے۔ ایم ڈبل اے صاحب! تعریف کا شکریہ مگر میں نے کسی طرح کا طنز نہیں فرمایا تھا مجھے سچ مچ حاجن صاحبہ کی تلاش ہے۔ محسن صاحب ہمارے بارے میں اتنا مت سوچیے پگھل جاؤ گے۔ ذیشان صاحب آپ کا اندازِ گفتگو بے تحاشا معصومیت اور نرمی کے باعث مجھے آب دیدہ کر دیتا ہے، طاہرہ جی میں وضاحت دینے کا قائل نہیں ہوں میرے منہ سے چونکہ اقوال زریں جھڑتے ہیں اس لیے میں ایک بات بار بار نہیں کرتا۔ آل ٹائم گریٹ محی الدین نواب صاحب کی ایک اور معاشرتی کہانی پارسائی حد سے زیادہ پسند آئی معاشرے کے ہر پہلو پہ نواب صاحب گہری نظر رکھتے ہیں۔ پارسائی بھی ایسی ہی کہانی ثابت ہوئی۔ خدا نے انیلا اور مولانا کو ان کی پارسائی کا بہترین صلہ دیا۔ ملک صاحب کی کہانی نے بھی مایوس نہیں کیا۔ غزالہ کو خبر بھی نہ ہوئی اور اس کی وجہ سے ایک ہنستا مسکراتا ہر دل عزیز وجود خاک میں مل گیا۔ ملک صاحب کے اقبال جرم کروانے کے اسٹائل نے انہیں شاباشی دینے پر مجبور کیا۔ اناڑی میں رفیق صاحب نور کی بازیابی کے لیے پاگلوں کی طرح ادھر ادھر بھاگ رہا ہے دوسری طرف نیلم کے وجود کو نظرانداز کرنے میں ناکام لگ رہا ہے۔ کشکول میں لیاقت کا دوہرا کردار کنفیوز کر رہا ہے۔ اگر وہ اپنے گھر میں سو رہا تھا تو سراج کے ساتھ فرحین اور زرینہ کو بازیاب کس نے کروایا۔ شبنم اور میڈم روبی زخمی ناگنوں کی طرح دشمن کو ڈسنے کے لیے بے چین نظر آرہی ہیں۔ یہ جان کے خوشی ہوئی کہ افضل کی شیطانی خواہشات پر مٹی ڈالنے کے لیے سراج روانہ ہو چکا ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ مغل شہنشاہ ہمایوں اور مغلیہ سلطنت کے سب سے نامور خدمت گار بیرم خان کی کہانی بالکل یوں لگی گویا ہم تمام کرداروں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ الفاظ کی ایسی جادوگری پر ڈاکٹر ساجد امجد کو سلام۔ منظر امام کی پرایا مال بالکل مبنی برحقیقت لگی۔ مال و زر نے انسان کو ایسی پستیوں میں دھکیل دیا ہے جہاں انسانیت اور اخلاقی اقدار ناپید ہیں۔ سیانا غیر متوقع انجام کی دلچسپ کہانی تھی۔ شیلنر کی سادگی کے سامنے جونی کی تمام ...بات دھری کی دھری رہ گئی۔ لاحاصل بھی متاثر کن رہی۔ دو لالچیوں نے سب کچھ داؤ پر لگا کر بھی وہ نہ پایا جوان کے نصیب میں نہ تھا۔ کاشف زبیر کی ...ون پینے والی لڑکی کی کہانی غیر متاثر کن تھی۔ انتساب نے ابھی تک حیران رکھا ہے۔''

✠ **محمد فیضان غنی**، ہری پور ہزارہ سے لکھتے ہیں ''میں بی ایس کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ پچھلے سال سے سسپنس، جاسوسی اور سرگزشت کا مستقل قاری ہوں یہ تینوں میرے پسندیدہ رسائل ہیں، جن کے مطالعے سے میرے ذوقِ مطالعہ کو تسکین ملتی ہے اور معلومات میں بے حد اضافہ بھی ہوتا ہے۔ آج ...کسی بھی رسالے میں خط لکھ رہا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ اسے سسپنس کے قیمتی صفحات پر جگہ دے کر میری بھرپور حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ (...) اکتوبر 2011ء کا تازہ شمارہ مجھے 19 ستمبر کو بک اسٹال والے بھائی نے تھما دیا۔ سرورق حسینہ کا چہرہ کسی کے انتظار میں زرد پڑ چکا تھا۔ اب پتا ...یں ایسا ...بخار کی وجہ سے ہوا ہے یا میک اپ کی کمی کے باعث۔ اصل معاملہ تو ڈاکٹر صاحب ہی جانتے ہیں۔ اشتہارات سے بچ بچا کر محفل میں آئے ادریس صاحب کو کرسی صدارت پر قبضہ جمائے دیکھا دل کی گہرائی سے مبارک ہو۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر صحرابہ صحرا پڑھی مغلیہ دور کے بہت سے پوشیدہ پہلو اجاگر ...محلوں کی سازشوں سے لے کر سپاہ کے تصادم تک تمام واقعات زبردست انداز میں پیش کیے گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے اسی منفردانہ از

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے تاریخی واقعات پڑھنے کا مزہ آتا ہے اور تاریخی واقعات سے متعلق معلومات میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے۔ کاشف زبیر کے قلم سے ویمپائرز کی سنسنی خیز کہانی مددگار پسند آئی۔ اس میں ایک بات واضح تھی کہ عورت چاہے جس روپ میں ہو، مرد کے بغیر ادھوری ہوتی ہے۔ محی الدین نواب کے قلم سے کہانی پارسائی پڑھی اور ہمیشہ کی طرح یہ کہانی بھی دل کو بھا گئی۔ اس میں ہمارے معاشرے کے ایک اور بھیانک المیے کی عکاسی کی گئی تھی۔ جس میں دردانہ اور تہمیم جیسے درندے اپنے ناجائز مقاصد کے حصول کے لیے معصوم زندگیوں سے بے دریغ کھیلتے ہیں۔ منظر امام کی تحریر پرایا مال بھی دلچسپ تھی۔ بے اولاد جوڑے کے ساتھ اولاد کے حصول کے لیے پیش آنے والے واقعات اچھے اور پُرمزاح انداز میں پیش کیے گئے۔ ملک صفدر حیات کا کیس پڑھا۔ ملک صاحب کی ذہانت نے ایک بار پھر صحیح مجرم کو پکڑا، وہ بھی کسی چھتر ول کے بغیر۔ کاش اس ملک کی پولیس کا تمام عملہ ملک صاحب کی تقلید کرے تو یہاں جرم کا نام و نشان نہ رہے۔ میں نے اناڑی قسط نمبر 38 سے باقاعدہ پڑھنی شروع کی۔ پہلے پچھلی 5 اقساط میں توفیکا پترا اپنے اناڑی پن کی عکاسی کرتے نظر آیا اور اغوا کی بھول بھلیوں میں پھنسا رہا۔ میرے خیال میں اس داستان کو وائنڈ اپ کر دینا ہی بہتر ہوگا۔ اس کے مقابلے میں کشکول اچھی جا رہی ہے۔ اس پر تبصرہ کچھ اقساط بعد کروں گا۔ دانیال کاکڑ، تفسیر عباس بابر، ایم ڈبل اے اور ہمایوں سعید راج کے تبصرے بھی پسند آئے۔ حمیرا رضا قدرت اللہ نیازی صاحب اور ماہا ایمان کے نام بلیک لسٹ میں دیکھ کر افسوس ہوا اب دیکھیے میرے اس نامۂ خلوص پر کیا گزرتی ہے (آتے رہیے گا) محفل شعر و سخن میں تمام شعار اچھے تھے۔“

✠ **شارقہ سلجوق، جہانگیر آباد سے تبصرہ کرتی ہیں** ”سب سے پہلے تو یہ بتائیں کہ کیا کرسی صدارت پانے والے قاری کو ایک سال کے لیے شمارہ فری میں ملتا ہے (کس نے کہا) بہت خوبصورت سرورق دوپٹے کے ہالے میں مسکراتا چہرہ بہت پیارا اور پُرنور لگا۔ ادریس خان کرسی صدارت پر قابض نظر آئے شاید یہ آنٹی مدیرہ کے خوشگوار موڈ کا نتیجہ تھا ورنہ ان کے تبصرے سے کئی اچھے تبصرے شمارے میں موجود تھے۔ بہرحال ہماری طرف سے مبارک باد قبول ہو۔ صنف نازک کا صرف ایک خط؟ ارے کہاں غائب ہیں سب؟ خواجہ مدنی آپ کی مبارک باد کا شکریہ۔ صوبیدار حاجی عبدالحکیم صاحب واپسی کی آخری قسط دیکھ کر جھٹکا اس لیے لگا کہ نواب صاحب شمارے سے پھر غائب ہو جاتے تاہم اس دفعہ آخری صفحات پر پھر موجود ہیں اس لیے ان سے اب گلہ نہیں۔ آپ نے سیاست دانوں کا اچھا تجزیہ کیا اور یہ حقیقت بھی ہے کہ خالی دعوؤں کے علاوہ انہیں کچھ کرنا گوارہ نہیں۔ تفسیر عباس آپ مبارک باد دینے میں بھی ڈنڈی مار گئے خیر آپ کی مبارک باد قبول کی اور آپ کو بھی فرزند ارجمند کی پیدائش پر مبارک ہو۔ محمد جاوید بلوچ (علی پور) نام تو میرا ورنی ہو سکتا ہے لیکن میں ہرگز نہیں، آپ کے ریمارکس سخت برے لگے، بھائی ذیشان افتخار ڈھلوں اللہ آپ کو رہائی دے اور آپ نانا، دادا سب کچھ بنیں۔ آمین۔ ہمایوں سعید راج (بنوں) آپ کا مطالعہ کافی وسیع لگتا ہے کہ آپ نے ہمیں سلجوقی شہزادی کے نام سے پکارا۔ سلجوق خاندان نے برصغیر پر کافی عرصے حکومت کی تھی۔ طاہرہ یاسمین اس شمارے میں ہماری واحد نمائندہ ثابت ہوئیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف ساجد امجد کی صحرا بہ صحرا تاریخی کہانی اچھے انداز میں پیش کی گئی۔ ہمایوں کی دربدری نے رلا دیا۔ مسلمانوں کا ایک دوسرے سے جنگ کرنا ہی ہمارے زوال کا سبب ہے۔ بیرم خان جیسے وفادار سے بدگمانی اچھی نہیں لگی۔ مددگار میں کاشف زبیر ویمپائر کا کردار لے کر آئے۔ ایرک کو بوشر سے تو ڈر محسوس ہوتا تھا اور یہ جانتے ہوئے کہ ایلی انسانوں کا خون پیتی ہے اس سے دوستی ہو گئی۔ کشکول کی یہ قسط بھی لیاقت کی پراسرار صلاحیتوں کو آشکار کرتی نظر آئی جو اس کی نیک نیتی کی وجہ سے اس کو عطا ہوئیں۔ شیخ حامد کو بہت طاقتور دکھایا گیا ہے علیم احمد اور سراج جیسے افسران اس محکمے میں ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے کردار بہت پسند ہیں لیکن ابھی تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ اس کہانی کا مرکزی کردار کون سا ہے؟ زادِ راہ ناکام محبت کی کہانی ثابت ہوئی۔ شہاب نے درست کیا کہ سلطانہ سے ملے بغیر چلا گیا اور اپنے تصور میں نوجوان ترو تازہ سلطانہ کو زندہ رکھا۔ پرایا مال میں منظر امام نے ہونٹوں پر ہنسی بکھیر دی پرایا مال واقعی پرایا ہوتا ہے۔ اقبال جرم میں ملک صاحب نے بظاہر خودکشی نظر آنے والے قتل کا جس طرح سراغ لگایا وہ مزہ دے گیا۔ تنویر ریاض کی انتساب اوپن ثابت ہوئی۔ سیانا میں جونی کیمپ جو خود کو بہت چالاک سمجھ رہا تھا بری طرح مار کھا گیا۔ مسٹر شیلٹر سادہ سے آدمی تھے ان سے پوری کار کی بات کرتا تو وہ بھی اسی قیمت میں مل جاتی کیونکہ وہ تو اس کو کباڑ ہی بنا رہے تھے۔ تاہم جونی پر افسوس ہوا کہ منافع کا ایک موقع اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اناڑی میں نواب رفیق ایک بدلے ہوئے روپ میں سامنے آیا، نور کے اغوا نے گویا اس کو پاگل کر دیا ہے تاہم نواب رفیق کی اپنے باڈی گارڈز سے محبت نے متاثر کیا۔ رضوانہ ساجد حضرت حزقیل کے واقعات بیان کر رہی تھیں جو کافی معلوماتی ثابت ہوئے۔ باوزن ثمر عباس کی دلچسپ تحریر تھی۔ پارسائی میں نواب صاحب اپنے قلم کا جادو جگایا اچھی تحریر تھی، امام صاحب کے امیج کو انہوں نے جس طرح اجاگر کیا وہ اچھا لگا۔ محفل شعر و سخن میں احمد خان کراچی کا شعر اچھا لگا۔“

✠ **ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے لکھتے ہیں** ”سسپنس 20 ستمبر کو ملا۔ سب سے پہلے ٹائٹل گرل پر نظر پڑی۔ جہاں بڑی بے تابی سے کسی کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ میک اپ کیے ناز و ادا کے ہتھیاروں سے لیس کسی کے گویا قتل کا سامان ہے۔ انشائیہ تو ڈائجسٹ میں کس نگینے کی طرح ہوتا ہے استفادہ کرتے ہوئے آگے بڑھ کر اپنی اور سب کی بجی بزم میں شریک ہوئے سب سے پہلے اپنے خط پر نظر پڑی، بہت شکریہ۔ سب شرکا محفل اپنی اپنی آرا اور تبصروں کے ساتھ شریک ہیں۔ اس کے بعد اناڑی پر پہنچے جہاں حسبِ معمول نواب رفیق اپنے دیدہ و نادیدہ دشمنوں سے برسرِ پیکار ہیں۔ نت نئے پینترے بدلے جا رہے ہیں اور دشمنوں کی عیاریاں و مکاریاں بھی جاری ہیں۔ اس کے بعد کشکول شروع کی جو ذوق و شوق کے ساتھ پڑھی جا رہی ہے۔ تاریخی کہانی صحرا بہ صحرا مغلوں کی تاریخی واقعات سے مزین تھی۔ جہاں اور بہت سے تاریخی واقعات سے آگاہی ہوئی وہیں نظام سقہ کے واقعے سے بھی روشناس ہوئے۔ کاشف زبیر کی کہانی مددگار بھی اچھی تھی۔ ش صغیر ادیب کی زادِ راہ بھی اچھی تحریر تھی۔ شہاب کو ماضی اور حال کا آئینہ نظر آیا۔ وہ حال کی تصویر دیکھنے کی اپنے اندر جرأت نہیں پیدا کر سکا۔ منظر امام کی پرایا مال بھی اچھا تاثر لیے تھی۔ اولاد کی قدر کسی بے اولاد سے کوئی پوچھے کہ اولاد جیسی نعمت کتنی انمول ہے۔ اقبالِ جرم بھی بہتر تھی۔ تنویر ریاض کی انتساب بھی اچھی تھی۔ سزا زور آور اور کمزور کی کہانی تھی۔ شعر و سخن میں بھی شعروں کا انتخاب

ہوا تھا۔ مریم کے خان کی سیانا بھی اچھی لگی۔ لاحاصل سلیم انور کی کہانی بھی اچھی تھی۔ روحانی سلسلہ حضرت حزقیل علیہ السلام کے واقعات بھی معلومات میں اضافے کا سبب بنے۔ باوزن ثمر عباس کی دلچسپ تحریر تھی جس کے متعلق صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ عورت پیاز کی مانند ہے۔ رضوانہ منظر کی خزاں سے پہلے بھی اچھی لگی۔ پارسائی آخری صفحات کی خوبصورت کہانی جو آج کے معاشرے کی منہ بولتی تصویر تھی۔ جو نظریں دیکھتی ہیں یا کان سنتے ہیں کبھی کبھی وہ بھی غلط ثابت ہوتا ہے اور حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔“

✠ **یوسف مرزا، ملتان شریف سے محفل میں تشریف لائے ہیں** ”ماہ اکتوبر کا شمارہ ہاتھ میں ہے۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا۔ جس میں بہت کچھ سوچنے سمجھنے کو ملا۔ صفدر حیات کا کیس پڑھا اور ایک ہی نشست میں مکمل کیا۔ انوار صدیقی کشکول کا پلاٹ عمدہ اور جاندار ہوتا جا رہا ہے۔ سراج جیسے ایمان دار انسپکٹر ہمارے ملک میں ہو جائیں تو یقیناً جرائم کی روک تھام ہو سکتی ہے۔ ش صغیر ادیب کی زادِ راہ خوبصورت تحریر تھی۔ تنویر ریاض کی انتساب ایک عمدہ کاوش تھی۔ یقیناً یہ اسٹوری بہت سے ذہنوں پر اچھے نقوش چھوڑے گی۔ آخر میں اس رسالے کی وساطت سے اس عزم کا اظہار کرنا چاہوں گا کہ اس مشکل گھڑی میں بارشوں اور ڈینگی وبا سے جہاں پوری قوم اپنی متاثرہ ماؤں بہنوں اور بھائیوں کا ساتھ دے رہی ہے۔ حتی الوسع میں بھی ان کے ساتھ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک پاکستان اور اس میں بسنے والی تمام اقوام کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔“

✠ **حکیم سید محمد رضا، شاہ نورنگ میانوالی سے فرماتے ہیں** ”سسپنس ڈائجسٹ ماہ اکتوبر 2011 موصول ہوا۔ خط جلد لکھنے کی وجہ جناب محی الدین نواب کی کہانی پارسائی ہے۔ یہ کہانی نواب صاحب کی معرکۃ الآرا تحریر ہے۔ ایک نازک معاشرتی مسئلے کو زیرِ بحث لایا ہے۔ خاص کر کہانی کے یہ الفاظ کہ خدا تعالیٰ سب کچھ ہے مگر دکاندار نہیں ہے۔ وہ فوراً صلہ نہیں دیتا ہے۔ اس کی حکمت وہی جانتا ہے۔ کبھی برسوں بعد خوب صلہ دیتا ہے اور کبھی پلک جھپکتے ہی وارے نیارے کر دیتا ہے، دعا بھی تب قبول کرتا ہے جب انسان نماز قائم کرے اور اس کی بندگی کرے۔ ایسی شاہکار کہانی لکھنے پر نواب صاحب کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد۔ ساجد امجد صاحب کی صحرا بہ صحرا میں مغل بادشاہ ہمایوں کے واقعات اور ان کے عظیم مغل شہنشاہ بیٹے جلال الدین محمد اکبر اور بیرم خان جس نے ڈگمگاتی مغل سلطنت کو سہارا دیا کا انجام پڑھ کر افسوس ہوا۔ ایسی تاریخی کہانیاں ضرور شائع کیا کریں۔ کشکول انوار صدیقی کی ایک اچھی کاوش ہے۔ امید ہے یہ سلسلہ ایک بہتر سلسلہ ثابت ہوگا۔ ش صغیر صاحب کی زادِ راہ، منظر امام صاحب کا پرایا مال اچھی کہانیاں ہیں۔ ملک صفدر حیات کی اقبالِ جرم ایک اچھوتی معاشرتی کہانی ہے۔ قاتل کبھی بھی قانون کے شکنجے سے نہیں بچ سکتے ہیں۔ اناڑی کا نمبر بہتر ہے۔ ثمر عباس کی باوزن ایک دلچسپ کہانی ہے جو کہ مرد و زن کے ازدواجی رشتے کی عکاسی کرتی ہے۔ سسپنس ڈائجسٹ ایک لائبریری کی زینت رسالہ ہے۔ دوستوں کو یہ تحفتاً دیا جا سکتا ہے۔“

✠ **محمد جاوید بلوچ، تحصیل علی پور سے لکھتے ہیں** ”ماہ اکتوبر کا شمارہ 21 تاریخ کو ملا۔ سرورق کی خوبصورت خیالی حسینہ کی شرمیلی آتشی مسکراہٹ سے جان چھڑانے کے بعد فہرست پر پہنچا تو محی الدین نواب کی خوبصورت تحریر میری پارسا نگاہوں کی منتظر تھی۔ سسپنس ڈائجسٹ سے طویل وابستگی کے دور میں پہلی بار پارسائی جیسی مکمل اسلامی ماحول میں ڈھلی ہوئی تحریر پڑھنے کو ملی۔ اس کے بعد انشائیہ میں جون ایلیا کا قلمی جہاد پڑھا۔ کشکول میں شیخ حامد کا کردار اور سنسنی خیز اندازِ گفتگو بہت پسند ہے۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ اناڑی کو بے دلی سے آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ اسٹوری تقریباً حویلی کے مکینوں تک ہی رہ گئی ہے۔ فیکے پتر کو تو اب میرا بھی اغوا کرنے کو دل چاہتا ہے۔ صحرا بہ صحرا بھٹکنے والا آہنی اعصاب کا مالک بادشاہ ہمایوں کو اپنے بھائیوں کی غداری لے ڈوبی ورنہ ہمایوں کے مقابلے پر شیر شاہ زیادہ دیر نہ ٹھہر پاتا۔ بیرم خاں کی وفاداری نے بے حد متاثر اور انجام نے رلایا۔ ملک صفدر حیات ہینگ لگی نہ پھٹکری اور رنگ بھی آیا چوکھا کے مصداق ایک الجھا ہوا کیس اپنی بہترین حکمتِ عملی سے سلجھانے میں کامیاب ہوئے اگر غزالہ اخلاقی حدود سے تجاوز نہ کرتی تو دو گھر اجڑنے سے بچ جاتے۔ مددگار میں انسان اور ویمپائر کی محبت عجیب و غریب لگی۔ منظر امام کی پرایا مال اولاد سے محروم جوڑے کی پڑھ کر معلوم ہوا کہ پرایا مال پرایا ہی ہوتا ہے۔ محمد زبیر سلیمانی شہ زوری کی سینہ زوری اور کمزور کے کمزور پہلوؤں کو اجاگر کرنے والی نرم احساس سے بھرپور تحریر لائے۔ حضرت حزقیل کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کیا۔ دیگر کہانیاں بھی اچھی لگیں مجموعی طور پر شمارہ اچھا اور کچھ نیا پڑھنے کو بھی ملا۔ بزم شعر و سخن میں تینوں اشعار کے بعد ماہا ایمان تفسیر عباس اور بنی ایمان کے شعر اچھے لگے، عون عباس بابر غالباً تفسیر عباس کے بڑے بیٹے ہیں؟ اب آتے ہیں خطوط کی محفل کی جانب ادریس صاحب کا خط پہلے نمبر پر تھا۔ کہانیوں پر تبصرہ جاندار مگر محفل کی جان نوک جھونک سے یکسر خالی تھا لہٰذا تبصرہ بغیر چینی کے زردہ لگا۔ تفسیر عباس سسپنس کی چال روزِ اول سے ہی ٹھیک ہے مگر مال گاڑی کی یقیناً مشکوک ہے، لگتا ہے اس بار شہزادہ پیدا ہونے کی خوشی میں ماہا ایمان کی گوشمالی ... دل نشیں بیماری کی وجہ سے غائب ہیں۔ دانیال کاکڑ بات کو ہضم کرنے کے لیے دماغ کا ہاضمہ صحیح ہونا ضروری ہے۔ طاہرہ جی انیلا جیسے گوہر نایاب ... ہیں۔ صوبیدار صاحب آنسو پونچھنے کے لیے روز پیدل حاضرِ خدمت ہے جس طرح آپ نے واپسی کے اختتام پر شکر ادا کیا، اسی طرح آپ ... اختتام پر میں نے بھی شکر کا کلمہ پڑھا۔ محسن علی موم کو شارقہ سلجوق کو کرسی صدارت پر بیٹھا دیکھ کر خصوصی خوشی ہوئی، اسے کہتے ہیں بیگانے کی شادی میں عبداللہ دیوانہ۔ ماہا ایمان کو بلیک لسٹ میں دیکھ کر خوشی ہوئی اور نہ ہی افسوس، کسی کو بلیک لسٹ میں دیکھ کر خوش ہونا ایسی چھوٹی سوچ صرف ماہا ایمان کی ہی ہو سکتی ہے۔ بلیک لسٹ سے کس کو رستگاری ہے۔ کل تفسیر عباس تو آج ماہا ایمان کی باری ہے۔ ہمایوں سعید راج آپ نے شارقہ سلجوق اور ماہا ایمان کی ... تعریف کر ڈالی ہے۔ بہن نسرین اکیلے دل نہیں لگ رہا تھا جو ماہا کو بھی بذریعہ ڈاک بلوا لیا۔ ایم ڈبل اے خواجہ مدنی اور دیگر ساتھیوں کے بھی تبصرے اچھے لگے۔“

✠ **یاسمین ساحل، حافظ آباد سے لکھ رہی ہیں** ”اکتوبر کا رسالہ رنگوں کی بہار لے کر آیا، سب سے پہلے میں نے ڈاکٹر ساجد امجد کی کہانی پڑھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جو بہت پسند آئی۔ تفسیر بابر عباس کی اسلامی معلومات پر مبنی تحریر حضرت عمار بن یاسر کی شیطان سے جنگ نے معلومات فراہم کیں۔ انوار صدیقی کی کہانی کشکول بھی بہت اچھی لگی اور سسپنس دن دگنی رات چوگنی ترقی کی منازلیں طے کرتا جائے۔"

✠ **ریاض بٹ**، حسن ابدال سے محفل میں آئے ہیں "ماہ اکتوبر 2011ء کا شمارہ 20 ستمبر کی ایک شام کو ملا۔ اپنی محفل میں ادریس احمد خان کرسی صدارت پر براجمان نظر آئے۔ لفظوں کا استعمال خوب ہے۔ کہانیوں پر تبصرہ بھی ستائش کے قابل ہے۔ خواجہ مدنی صاحب خط لکھنے کی جرأت کرنے میں کافی تاخیر کردی۔ بہرحال آتے ہی چھا گئے۔ دانیال اتنا مختصر تبصرہ۔ زیادہ کنجوسی اچھی نہیں ہوتی۔ حیدر خان آپ سرورق کی حسینہ کے جھمکوں میں الجھ گئے۔ تفسیر عباس کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح طویل اور سُندر ہے۔ بھائی میرے کہنے کا مقصد بھی وہی تھا جو آپ نے کہا۔ بیٹے کی پیدائش پر بے حد مبارکاں..... صحرا بہ صحرا، گزری تاریخ سے روشناس کروا رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا شکریہ اتنی اچھی تحریر لکھنے پر۔ کشکول کی تیسری قسط میڈم روبی کے گرد زیادہ گھومی ہے اور گھماؤ پھراؤ نے ہمارے دماغ کو بھی خوب چکر دیے۔ افضل خان نے میڈم روبی کے لیے جال بچھا دیا ہے۔ ش۔ صغیر ادیب کی تحریر زادِ راہ بھی متاثر اور غمگین کرگئی۔ اسی لیے کچھ لوگ یہ کہتے ہیں۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

لوجی، اس بار منظر امام صاحب پرایا مال لے کر آئے۔ کچھ لوگ پرائے مال کو اپنا مال سمجھتے ہیں اور اس پر قبضہ کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں لیکن اس کے لیے ڈھیٹ اور بے شرم ہونا ضروری ہے۔ اقبالِ جرم ملک صاحب کی انوکھی تفتیش پر مبنی کہانی ہے اور جس طرح انہوں نے مجرموں سے اقبالِ جرم کروایا اس پر دل عش عش کر اٹھا۔ تنویر ریاض کی انتساب بھی پسند آئی۔ صفحہ بہ صفحہ بکھری کترنیں رسالے کو چار بلکہ آٹھ چاند لگا رہی ہیں۔ اشعار بھی اچھے ہیں۔ قارئین کا ذوق روز بروز نکھرتا جا رہا ہے۔"

✠ **طاہرہ یاسمین**، سرگودھا سے محفل میں آئی ہیں "بہت بہت شکریہ خط شائع کرنے پر مگر آپ نے میرے پچھلے خط کے جواب نہیں دیے تھے صرف ہاں یا نہ میں ہی تو جواب دینا تھا میں نے پورا ایک ماہ اس جواب کا شدت سے انتظار کیا کہ آپ پاکیزہ میں موجود تصویر والی ہی عذرا رسول ہیں ناں؟ (جی ہاں) اس ماہ کا شمارہ لیٹ ملا۔ ہزار کوشش کے باوجود پڑھ نہ سکی، بخار شدید تھا بہت مشکل سے یہ دن گزرے۔ کچھ آرام ملا تو چند کہانیاں پڑھیں۔ ٹائٹل بہت خوبصورت تھا۔ کپڑوں کے ساتھ میچ کرتی چوڑیاں لپ اسٹک اور رخسار پر ہاتھ رکھے گرل پیاری لگ رہی تھی۔ ادریس احمد خان، کرسی صدارت مبارک ہو بھئی اور ... آپ، کرسی بھی اور طویل تبصرہ بھی شان دار۔ خواجہ مدنی خوش آمدید محفل میں اور شکریہ کہ آپ کو میری تجویز پسند آئی۔ اقبال ... آپ ... اور اس میں بھی شکوہ کہ کشکول کے لیاقت حسین کو گولی لگی تو نشان کیسے ختم ہو گئے؟ حیدر خان بھائی میں نے ... ٹک پڑھا ... مبارک تک اب ... نائم لگاتی ہوں کہانی پڑھنے میں اتنا ہی ناں۔ عمران حیدر بلوچ جیل سرگودھا بھائی آپ کا کیا حال ہے؟ اس ماہ میں تبصرہ تفسیر عباس بابر کا بہت اچھا لگا۔ ایم ڈبل اے عقل آپ تھوڑی سی ادھار دیں گے مجھے بڑی باجی سمجھ کر کیونکہ آپ 21 میں ہو تو میں 25 میں ہوں تو آپ سے بڑی ہونے کے ناتے۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں اس لیے تمام قارئین اگر آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہو تو معافی چاہتی ہوں۔ ذیشان افتخار ڈھلوں جیل سرگودھا، آپ نے مجھے بہن کہا ہے۔ یہ بہن آپ کے لیے صدقِ دل سے دعا کرتی ہے کہ آپ کی تمام مشکلیں حل ہو جائیں۔ اس دفعہ اپنی فیورٹ بہن ماہا ایمان کو بلیک لسٹ میں پایا۔ بابر عباس گلیانہ بھئی آپ کدھر ہو آج کل محفل ادھوری ہے شیر صاحب آپ کے بغیر۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پڑھی کشکول شان دار۔ پھر اناڑی پڑھی اس دفعہ اچھی قسط تھی پھر اقبالِ جرم پڑھ کر تو مزہ گیا واہ ملک صاحب واہ کیا بات ہے آپ کی۔ پھر بہت دنوں بعد اپنے پسندیدہ محی الدین نواب کو پڑھا۔ پارسائی تمام شمارے کی نمبر 1 کہانی تھی۔ مدتوں یاد رہے گی بہت گہرا اثر چھوڑا اس کہانی نے۔"

✠ **راجا ثاقب نواز ثاقب**، رتی ٹبی، ساہیوال سے فرماتے ہیں "اکتوبر کا شمارہ ستمبر کے آخری ہفتے میں ملا۔ اب کی بار ذاکرجی کی حسینہ قدرے سادہ لگی۔ پس منظر میں جھلملاتی روشنی نے اس شہر کے حالات کی یاد تازہ کردی جسے اہلیانِ وطن منی پاکستان کے نام سے جانتے ہیں۔ جہاں آج لہو کے دیپ جلائے جاتے ہیں۔ تقریباً ہر لغت میں امن کا مطلب سکون ہی ہے۔ میرے دیس میں امن کا مطلب صرف اس پل کا وقفہ ہے، جب خلقِ خدا کو قتل نہ کیا جا رہا ہو۔ ایک طرف موت کا اندھا رقص جاری ہے تو دوسری طرف قہرِ خداوندی، کبھی سیلاب کے روپ میں تو کبھی مچھر کی شکل میں موجود ہے۔ انشائیہ نے بہت متاثر کیا۔ خطوط کی محفل میں تفسیر عباس بابر اور محمد جاوید بلوچ نمایاں رہے۔ تاریخی کہانی عبرت آموز رہی۔ مددگار میں کاشف زبیر نے انگریزی فلم کا ترجمہ کر ڈالا۔ زادِ راہ میں وصل کی گھڑی آتے آتے رہ گئی۔ پرایا مال میں چھپا درد، صرف بے اولاد والدین ہی سمجھ سکیں گے۔ اقبالِ جرم میں ملک صاحب رقابت کے جذبے کی بھینٹ چڑھنے والے طاہر جندرا کے قاتلوں کو بغیر مار پیٹ کے بے نقاب کرتے نظر آئے۔ انتساب کے انجام نے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ سزا ہمارے اردگرد پھیلے ماحول کی صحیح معنوں میں عکاسی کرتی نظر آئی۔ سیانا کے اختتام پر بے اختیار لبوں سے نکلا بے چارہ اینگل کار ڈیلر۔ لاحاصل، مختصر ترین مگر جامع ثابت ہوئی۔ حضرت حزقیلؑ کے اگلے حصے کا ابھی سے انتظار ہے۔ باوزن ان جیتے جاگتے انسانوں کی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے تھی جن کا تعلق چکاچوند روشنیوں کی دنیا سے ہوتا ہے اور یوں خزاں سے پہلے کے خوشگوار انجام کو پڑھ کر ہم آخری صفحات تک جا پہنچے۔ جہاں نواب صاحب حقیقی نوابوں کی طرح اپنی جاگیر پر راج کرتے نظر آئے۔"

✠ **حاجی اے حکیم**، شادرا ٹاؤن سے محفل میں تشریف لائے ہیں "میں آج کل اپنی زوجہ کے علاج کے سلسلے میں لاہور آیا ہوا ہوں۔

(اللہ آپ کو اور آپ کی زوجہ کو صحت اور سلامتی عطا فرمائے اور مزید کئی بہاریں دیکھنا نصیب کرے۔ آمین) اپنی عادت کے مطابق سب سے پہلے جون ایلیا صاحب کے انشائیے کا مطالعہ کیا۔ میں ہر روز ہر نماز میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کراچی کے بے گناہ لوگوں پر رحم فرما اور کراچی کو پہلے کی طرح عروس البلاد بنا دے۔ آمین۔ ناظم آباد کے ادریس احمد صاحب کرسی صدارت پر اپنے خوبصورت تبصرے کے ساتھ بڑی شان سے رونق افروز تھے۔ کہانیوں کی طرف بڑھنے سے پہلے میں محترم تفسیر عباس صاحب اور ریاض بٹ صاحب کا تہ دل سے مشکور ہوں کہ ان دونوں نے میرے خط کا حوالہ دے کر میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ اناڑی میں نواب صاحب نور کو بھول کر اب نورین کے معاملے میں اپنی ٹانگ پھنسا بیٹھے ہیں۔ حالانکہ جب ان کو نور کے اغوا کرنے والوں کا فون آگیا ہے تو ان کو سارے کام چھوڑ کر نور کو ست بدھائی لانے کی فکر کرنی چاہیے۔ کشکول میں انوار صدیقی صاحب نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ خطوں کے جواب کے بجائے ہم اناڑی کی جگہ سب سے کشکول کو پڑھا کریں جب تک ہم پوری قسط نہ پڑھ لیں ہم کسی اور کہانی کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ ان تینوں رسالوں کے قارئین کا تہ دل سے مشکور ہوں جن کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کے 25 سال قلم کا رشتہ قائم رکھا۔ میں مورخہ 25 اکتوبر کو اپنی پچھتر ویں سالگرہ منا رہا ہوں۔ (ماشاءاللہ! بہت بہت مبارک ہو) آپ نے میرے پانچ خطوط میں سے چار خطوط کو اشاعت کا شرف بخشا۔ اب میں آپ کو خط نہیں لکھوں گا کیونکہ میں نے اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ اور ہر سانس اللہ تعالیٰ کی یاد اور رسول اللہ ﷺ پر درود پاک پڑھنے کے لیے وقف کر دیا ہے۔" (ہم سے یوں ناتا نہ توڑیں۔ قارئین کی معلومات میں اضافے کے لیے نصیحت آمیز ارشادات اور اقوال ضرور بھیجیے)

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن خانیوال سے لکھتے ہیں "سرورق پر حسبِ معمول حسینہ براجمان تھی جس کی شخصیت کی خاص بات اس کے چہرے کی معصومیت تھی۔ اپنے خط کو شامل نہ دیکھ کر بے اختیار یہ مصرعہ گنگنایا

بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

مدیرہ آنٹی چینی زبان کو شاملِ نصاب کرنے کی خبر سنانے کے ساتھ ساتھ لاتعداد مسائل کا ذکر کر رہی ہیں۔ ہماری دعا ہے اللہ ان سب مسائل کو ختم فرمائے اور پاکستانیوں کی مشکلات ختم ہوں۔ ادریس احمد خان ناظم آباد سے کرسی صدارت پر براجمان نظر آئے۔ مدیرہ آنٹی کے شکر گزار ہیں کہ صنفِ نازک کو اس کرسی سے اٹھا دیا جو پچھلی دفعہ شارقہ کے اول نمبر کے خط پر اچھل کود مچا رہی تھیں۔ کہانیوں پر ادریس خان کا تبصرہ پسند آیا۔ حلیم ... محمد رضا شاہ کی میانوالی سے آمد ہوئی۔ خوش آمدید حکیم صاحب۔ حاجی عبدالحکیم فرام خانیوال اتنی جذباتیت اچھی نہیں ہوتی۔ تفسیر عباس بابر بھئی بیٹے کی ... لڑکی آپ مبارک ہو۔ میرا موبائل نمبر 0300-7890238 ہے۔ میں آپ سے موبائل پر رابطہ رکھنا چاہتا ہوں۔ ہمایوں سعید راج فرام بنوں بھئی وہ لڑکی آپ کے انتظار میں تھی اس لیے اسے چھوڑ کر ہم آگے بڑھ گئے۔ محفلِ یاراں کے بعد سب سے پہلے اناڑی پڑھی۔ واہ بھئی واہ اب تو فیکا پتر شیر جوانوں کی طرح دشمنوں کو اٹھانے میں لگا ہوا ہے لگتا ہے ہر قسط میں اغوا ہونے کی روٹین فیکے پتر نے ترک کر دی ہے تاہم نور کا اغوا ابھی تک معما بنا ہوا ہے۔ کشکول میں انوار صدیقی، لیاقت حسین کو سپرمین ٹائپ چیز بنا رہے ہیں۔ سراج اور علیم احمد کی جرائم پیشہ افراد کی بیخ کنی کی مشترکہ کوششیں پسند آرہی ہیں۔ لیاقت حسین بھی اپنی خفیہ صلاحیتوں کی بنا پر ان کی بھرپور مدد کر رہا ہے۔ شبنم کا کردار پہلے تو مشکوک لگ رہا تھا تاہم وہ بھی کیپٹن حامد کی ڈسی ہوئی ثابت ہوئی۔ صحرا بہ صحرا ڈاکٹر ساجد امجد کی ایک اور معلوماتی کاوش ثابت ہوئی ہمایوں کے بھائیوں کی غداری اور دھوکا دہی کے بارے میں پڑھا تو اندازہ ہوا کہ بادشاہ کیوں اپنے بھائیوں کو قتل کروا دیتے تھے۔ محی الدین نواب پارسائی کا تحفہ لے کر آئے ان کی کہانیاں پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کوئی ماہرِ نفسیات معاشرے کے افراد کے لاشعور میں چھپی باتوں اور خواہشات کو کھول کر بیان کر رہا ہو۔ شکر ہے کہ انیلا نے مولانا صاحب کے ساتھ کو سعادت سمجھا۔ کاشف زبیر کی مددگار بہت پسند آئی بوشرا اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود اس بات پر درست لگا کہ ایلی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ش صغیر ادیب کی زادِ راہ لاحاصل محبت کی ایک اور کہانی۔ بے چارہ شہاب ساری عمر سلطانہ کے خیالوں میں کھویا رہا اور اپنی بیوی کو خوش نہ رکھ سکا اور سلطانہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہی ہے۔ ایسی لاحاصل محبت سے اللہ بچائے۔ پرایا مال منظر امام کی ہنستی مسکراتی تحریر تھی۔ ملک صفدر حیات نفسیاتی چالوں سے اقبالِ جرم کرواتے نظر آئے۔ زن، زر اور زمین کی کہاوت ایک بار پھر سچ ثابت ہوئی اور طاہر جندرا کی موت کا سبب بھی انہی میں سے ایک چیز بنی۔ ضیا باجوہ کا ردِعمل غلط ہونے کے باوجود فطری محسوس ہوا کوئی بھی شخص ایسی بات مشکل سے ہی برداشت کرتا ہے۔ مریم کے خان کی سیانا میں جونی کو اس کی حد سے زیادہ چالاکی لے ڈوبی اور شیلٹر کی سادگی اسے گہری چوٹ دے گئی۔ سلیم انور کی لاحاصل بہت عام کہانی ثابت ہوئی۔ ثمر عباس کی باوزن بہت پسند آئی۔ مائیکل جونز کی بیوی سے محبت اور لیزا کے خیالات میں تبدیلی کہانی میں دلچسپی کا باعث بنے۔ رضوانہ منظر کی خزاں سے پہلے میں ہیلری اپنے تمام حاسدانہ جذبات سمیت ملکِ راہی عدم روانہ ہوگئی۔ ایمی نے ہیلری سے نجات کا اچھا حل سوچا۔ یہ کہانی پڑھ کر یورپ میں رہنے والے بوڑھے افراد کی بے بسی کا احساس بھی ہوا۔ حضرت حزقیلؑ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے ایک اور پیغمبر جو اللہ کا پیغام لے کر ... کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ محفلِ شعر و سخن میں سے محمد امجد ریاض چیچہ وطنی کا شعر بہت اچھا لگا۔ تفسیر عباس کے مراسلے بھی ... "

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

قاسم ... صدر ... لبنیٰ کنول، ایبٹ آباد۔ ضیا کریم، لاہور۔ آسیہ ضمیر، کراچی۔ راحیل نواب، ملتان۔ اقصیٰ اسحاق، کراچی۔ محمد بشارت ... الماس رضوان ... ملک خالد، کراچی۔ اطہر حسین، کراچی۔ احسان سحر، میانوالی۔ صوبیدار ذوالفقار علی بنگش، کوہاٹ۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

گزرا وقت کوئی بھی ہو، اپنا نشان ضرور چھوڑتا ہے... کچھ شخصیات کے گزر جانے کے نشان تاریخ کی یادگار نشانیوں میں ڈھل جاتے ہیں... کسے خبر تھی کہ سوتیلی ماں کے ظلم اور باپ کی بے اعتنائیوں کا شکار وہ ایک معصوم بچّہ تاریخ کا ایسا حصّہ بن جائے گا جسے آنے والی نسلیں سالوں یاد رکھیں گی۔ وہ بچّہ جس کا نام "فرید خان" تھا اسے زمانے کے نشیب و فراز نے "شیر خان" کا لقب دیا اور پھر آنے والے حالات کی بھٹی نے اسے ایسا کندن بنا ڈالا کہ "شیر شاہ سوری" کے نام سے تاریخ میں رقم ہو گیا... پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہمایوں جیسا بادشاہ سترہ ہزار خدمت گاروں کے ساتھ پناہ کی تلاش میں نکلا تو دریا کے پار پہنچتے پہنچتے برہنہ سر برہنہ پا تنہا کھڑا رہ گیا۔ یہی بادشاہت ہے اور یہی قسمت کی سکندری بھی... کہ ایک تنہا شخص جم غفیر میں ڈھل جاتا ہے اور کوئی بادشاہ سے فقیر بن کر تنہا رہ جاتا ہے... شیر شاہ سوری کو اس وقت کے شعرا نے اپنے کلام میں منصف مزاج، فیاض اور جلیل القدر حکمران بتایا... اور اس کے کارناموں نے ان شعرا کے کلام کو سچا ثابت کر دیا۔

جہدِ حاصل

ڈاکٹر ساجد امجد

فرید خاں نامی افغان نوجوان، جونپور کی ایک سڑک پر حیران کھڑا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ راستہ بھول گیا تھا بلکہ وہ اپنا مستقبل تلاش کر رہا تھا۔ وہ بارہ سال کی عمر میں اپنے باپ حسن خاں کی جاگیر سسرام سے بھاگ کر جونپور آ گیا تھا۔ سلطان سکندر لودھی کی حکومت کا بارھواں سال تھا اور جونپور اس کی عظیم الشان سلطنت کا صدر مقام تھا۔ پہلے جیسی خوش حالی تو نہیں رہی تھی لیکن مکینوں اور مدرسوں کی مالی حالت نہایت اچھی تھی۔ ان کے لیے جائدادیں اور زمینیں وقف تھیں۔ طالب علموں کو بود و باش اور کھانا مفت ملتا تھا۔ پٹھانوں کی حکومت تھی لہٰذا پٹھانوں کی قدر و منزلت بھی خوب ہوتی تھی۔ جونپور میں بھی افغانوں کے ہجوم نظر آتے تھے۔ خود اس کا باپ حسن خاں اپنے باپ کے ساتھ افغانستان سے ہجرت کر کے، بہلول لودھی کے عہدِ حکومت کے آخری دور میں ہندوستان آیا تھا اور بہت جلد اس نے اتنی ترقی کر لی کہ پرگنہ سسرام اس کی جاگیر میں آ گیا۔

حسن خاں کی جیب میں پیسے آئے تو اس کو شادیوں کی سوجھی۔ اعلیٰ افغان نسل کی بیوی گھر میں تھی جو فرید خاں کی ماں تھی۔ اس کی موجودگی میں وہ ایک ہندوستانی بیوی گھر لے آیا۔ یہ بیوی اتفاق سے بے حد حسین تھی لہٰذا حسن اس پر ایسا فریفتہ ہوا کہ فرید کی ماں کو بالکل ہی بھول گیا۔ فرید خاں اس وقت سوتیلی ماں کے مفہوم سے ناواقف تھا لیکن اپنی ماں کی طرف سے باپ کا رویہ دیکھ کر پریشان ہو جاتا تھا۔ دونوں میں جب تکرار ہوتی تو بیٹھ کر آنسو بہانے لگتا یا اٹھ کر بھاگ جاتا۔ واپس آتا تو اس کی ماں اسے گلے لگا کر خوب روتی۔

یہ لڑائیاں اس وقت سرحدی جھڑپوں میں تبدیل ہو گئیں جب حسن خاں کی چہیتی بیوی نے پہلے ایک بیٹے اور پھر دوسرے بیٹے کو جنم دیا۔ اب فرید خاں اس عورت کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ اسے یہ خوف ستانے لگا کہ حسن خاں فوجی زندگی گزارتا ہے۔ سکندر لودھی کی فتوحات میں اس کے ساتھ مارا مارا پھرتا ہے۔ اس کی زندگی کا کیا بھروسا۔ اگر کسی وقت اسے کچھ ہو گیا تو بڑا لڑکا ہونے کے ناتے فرید خاں اس کی جائداد کا وارث بن جائے گا۔

ایک دن حسن خاں گھر آیا تو وہ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب بھی ایسا ہوتا تھا تو منشا یہ ہوتی تھی کہ وہ اُسے منائے۔ حسن خاں اسے منانے کے لیے الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگا۔ کئی پشتو گیت بھی سنائے مگر وہ تھی کہ اسی طرح منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ غصہ تھا کہ ناک پہ دھرا تھا۔

''ہم افغان تو خوامخواہ میں بدنام ہیں غصہ تو تم ہندوستانیوں کو بھی خوب آتا ہے۔'' حسن خاں نے اپنی بیوی کے ناز اٹھاتے ہوئے کہا۔

''غصے کی تو بات ہی ہے۔'' حسن خاں کی بیوی نے کہا۔ ''تمہاری افغان بیوی میرے بچوں کو زندہ رہنے دے گی؟''

''اس کی کیا مجال کہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔''

''میں چاہتی ہوں آپ کی جاگیر میں سے جو حصہ میرا بنتا ہے وہ مجھے ابھی دے دیں تاکہ آپ کی افغان بیوی میرے ساتھ کوئی زیادتی نہ کرسکے۔''

''ایسا کبھی ہوا ہے کہ کسی افغان نے اپنے جیتے جی جاگیر بانٹ دی ہو۔''

''مجھے تو اپنا حصہ چاہیے۔''

''تمہارے علاوہ میری دو بیویاں اور بھی ہیں۔ کیا وہ اپنا حصہ طلب نہیں کریں گی۔ خاندان میں بڑا نفاق پیدا ہوجائے گا۔''

''مجھے اس کی پروا نہیں۔ انہیں کچھ دو نہ دو مجھے میرا حصہ چاہیے۔''

حسن خاں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بات ماننے کو تیار ہوگیا۔ اس نے اس ہندوستانی بیوی کو شرعی حصہ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی دے دیا۔ اپنی دوسری بیوی کو بھی اس نے بہت کچھ دیا۔ سب سے زیادہ نقصان میں فرید کی ماں رہی۔ حسن خان نے نہ اس کی پاسداری کی اور نہ ہی اس کو حسب مرضی حصہ دیا بلکہ اس دن کے بعد سے اس نے اپنی اس افغان بیوی سے بات کرنا بھی چھوڑ دی۔ فرید یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن وہ اتنا کم سن تھا کہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ جب باپ کے خلاف نفرت زیادہ بڑھ گئی تو وہ صرف اتنا کرسکا کہ اس نے یہ سوچے بغیر کہ اس کے بغیر اس کی ماں کیا کرے گی، خاموشی سے گھر چھوڑ دیا اور جونپور آگیا۔ مدرسوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ یہاں اسے رہنے کا ٹھکانا بھی مل سکتا تھا اور دو وقت کی روٹی بھی میسر آسکتی تھی۔ فرید عربی ادب کے مطالعے میں ہمہ تن مشغول ہوگیا۔ اس نے فقہ کا غور سے مطالعہ کیا اور دیگر مضامین بھی پڑھتا رہا۔ تیر اندازی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کی تربیت اس نے اسی وقت حاصل کرلی تھی جب وہ اپنے باپ کے ساتھ رہ رہا تھا۔ دلیری اسے اپنی نسل کی جانب سے ورثے میں ملی تھی۔

پانچ چھ سال اس مدرسے میں گزارنے کے بعد اس کا دل اکتا گیا۔ اب وہ عالم بن چکا تھا اور اسے کسی باعزت نوکری کی تلاش تھی۔ ایسی ملازمت جس میں وہ خوب دولت کما سکے۔ دولت اس لیے کہ وہ اپنے باپ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس کے بغیر بھی کچھ بن کر دکھا سکتا ہے۔

وہ بہت سی ٹھوکریں کھا چکا تھا اور اب تھک ہار کر ایک سڑک کے کنارے پریشان کھڑا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ سوچا تھا کہ سسرام واپس چلا جائے لیکن یوں خالی ہاتھ جانا اسے گوارا نہیں تھا۔ اب وہ ایک تومند نوجوان تھا۔ چہرے کی سرخی بتاتی تھی کہ وہ ایک مالدار اسامی ہے حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ اسی پریشانی کے عالم میں وہ شہر سے باہر نکل گیا اور نہ جانے کیوں ایک جنگل میں داخل ہوگیا۔ وہ ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ کچھ لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ ''اے نوجوان! تیرے پاس جو کچھ ہے ہمارے سامنے نکال کر رکھ دے۔''

''میرے پاس کیا رکھا ہے۔ مجھے تو دو وقت سے کھانا بھی نصیب نہیں ہوا ہے۔''

''ہم سے جھوٹ بولتا ہے۔ تلاشی دے۔''

''اگر میرے پاس کوئی ہتھیار ہوتا تو ہرگز تجھے تلاشی نہ دیتا۔ بہرحال تلاشی لے لے۔''

ان لوگوں نے تلاشی لی تو واقعی اس [illegible] کچھ نہیں نکلا۔ ان لوگوں کو مایوسی تو ہوئی لیکن اس نوجوان پر رحم بھی آیا۔

''تو اس جنگل میں کیا کر رہا ہے؟''

''بس یونہی راستہ بھٹک کر نکل آیا۔''

''تم کہیں حکومت کے جاسوس تو نہیں۔''

''میں ایک بے سہارا انسان ہوں۔ مجھے جاسوس مت سمجھو۔''

''تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے اس کا فیصلہ ہمارے گروہ کا سرغنہ کرے گا۔ تمہیں اس کے پاس چلنا ہوگا۔''

فرید خاں سمجھ رہا تھا کہ وہ رہزنوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے لیکن وہ مزاحمت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ چپ چاپ ان کے سرغنہ کے پاس چلنے کو تیار ہوگیا۔

اسے ایک ڈاکو نے اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھا لیا اور اس کے ہاتھ باندھ دیے گئے۔ یہ قافلہ چلا۔ کئی کچے پکے راستوں سے گزرنے کے بعد وہ مقام آگیا جہاں ان کا سرغنہ تھا۔ یہ ایک مضبوط جسم کا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ تیر کمان اس کے سامنے رکھا تھا اور وہ خود آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ فرید خاں کو اس کے سامنے کھڑا کردیا گیا۔

''کون ہے یہ لڑکا؟''

''یہ ہمیں جنگل سے ملا ہے۔ شاید جمال خاں کا آدمی ہو یا کسی اور کا جاسوس۔''

''ابھی پتا چل جاتا ہے۔''

سرغنہ نے فرید خاں سے سوال جواب شروع کر دیے۔ فرید خاں نے بچپن سے لے کر اب تک کے حالات اسے سنا دیے۔ سرغنہ بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ فرید خاں کسی کا جاسوس نہیں۔

''اس کے ہاتھ کھول دو۔ یہ لڑکا جاسوس نہیں ہے۔ یہ بہادر بھی ہے اور غیرت مند بھی۔ ایسے لوگوں کی ہم قدر کرتے ہیں۔ یہ بھوکا ہے، پہلے اس کے لیے کھانا لاؤ اس کے بعد باتیں ہوں گی۔''

فرید خاں اتنا بھوکا تھا کہ یہ سوچنے کی بھی فرصت نہیں تھی کہ یہ لوگ لوٹ مار کرتے ہیں اور انہی پیسوں سے یہ کھانا تیار کیا گیا ہوگا۔ کھانا آتے ہی اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔

کھانے کے بعد باتوں کا دور شروع ہوا تو سرغنہ نے اسے شیشے میں اتارنا چاہا۔ ''اب سکندر شاہ کی حکومت کی بہار لٹ چکی ہے۔ تمہیں کوئی باعزت نوکری نہیں ملے گی۔ کسی امیر نے نوکر رکھ بھی لیا تو چند ٹکے ہاتھ پر رکھ دے گا اور گاجر مولی کی طرح دشمن کے آگے ڈال دے گا۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ تم ہمارے ساتھ مل جاؤ۔''

''آپ لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ یہ کوئی اچھی کمائی تو نہیں۔''

''یہاں سب ایک دوسرے کو لوٹ رہے ہیں۔'' سرغنہ نے قہقہہ لگایا۔ ''دیکھتے نہیں سلطان سکندر کس طرح دوسروں کے مقبوضات پر قبضے کرتا پھر رہا ہے۔ کیا وہ لٹیرا نہیں۔ یہ طاقت کی دنیا ہے بھائی۔ جس کے پاس طاقت ہے اسی کا سب کچھ ہے۔ تم اپنی طاقت بڑھاؤ۔ میں یہ نہیں کہتا [illegible] ہمارے ساتھ رہنا۔ کیا خبر اتنی طاقت پکڑ لو کہ ایک [illegible]''

''[illegible]''

''[illegible] تمہاری طاقت [illegible] امرائے سلطنت تمہارے آگے [illegible] تم ان [illegible]''

فرید خاں عالم بنے جون پور آیا تھا اور اب اسے ڈاکو بننے کی تلقین کی جارہی تھی۔ وہ اتنی آسانی سے لوٹنے والا نہیں تھا۔ اس نے سوچنے کے لیے کچھ وقت طلب کیا اور واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا لیکن سرغنہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اس طرح نہیں۔ کچھ دن ہمارے مہمان رہو۔ اچھی طرح غور کرلو پھر چاہے چلے جانا۔''

فرید خاں کو رکنا پڑا۔ اس گھنے جنگل میں اسے رات کے وقت ان رہزنوں کے ساتھ لیٹنا پڑا تو تمام پچھلے واقعات ایک ایک کرکے اس کے سامنے آتے چلے گئے۔ میرے باپ کے پاس طاقت تھی اسی لیے وہ میری ماں پر ظلم کرتا تھا۔ سردار ٹھیک کہتا ہے، یہ دنیا طاقت کی ہے۔ یہاں رہ کر اگر کچھ دن میں تیراندازی کی مشق کروں تو مجھے چھوٹی موٹی جنگیں لڑنے کی تربیت ملتی رہے گی۔ یہ خیالات اپنی جگہ لیکن اس نے کچھ عرصہ مدرسے میں بھی گزارا تھا۔ مذہبی خیالات اس کے ذہن پر غالب تھے۔ رہزنی کوئی ایسا فعل نہیں تھا جسے وہ بہ آسانی قبول کرلیتا۔

وہ کئی دن اپنے آپ سے لڑتا رہا اور بالآخر اس گروہ کے ساتھ کام کرنے لگا۔ عالم بننے آیا تھا ڈاکو بن گیا۔ اس گروہ کے سرغنہ کو بہت جلد اندازہ ہوگیا کہ فرید خاں غیر معمولی انسان ہے۔ اسے گروہ میں شامل ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے لیکن اس کی بہادری سے اس کے ساتھی مرعوب ہونے لگے تھے۔ فرید خاں کی وجہ سے ان ڈاکوؤں کو بے حد کامیابیاں مل رہی تھیں۔

اس نے یہ سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا کہ یہ کام اچھا ہے یا برا۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس گروہ کے سرغنہ کا اچانک انتقال ہوگیا۔ اس کے ساتھیوں نے یک زبان ہوکر اسے اپنا سردار چن لیا۔ یہ فرید خاں کی زندگی کا ایک نیا دور تھا۔ اس نے اب چھوٹے چھوٹے ڈاکے ڈالنے کے بجائے بڑے بڑے سرکاری امرا کو لوٹنا شروع کردیا تھا۔ ہر طرف اس کی شہرت پھیلنے لگی تھی۔ اس کی گرفتاری کے لیے بڑے بڑے انعام مقرر ہوگئے تھے مگر اس نے عقلمندی یہ کی تھی کہ اپنا نام ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ لوگوں کو یہ تو معلوم تھا کہ کوئی افغان نوجوان ہے جو اتنے بڑے بڑے معرکے سر کر رہا ہے اور خوف کی علامت بن گیا ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ حسن خاں کا بیٹا فرید خاں ہے۔

ایک روز اس کا مقابلہ اپنے جیسے ہی ایک گروہ سے ہوگیا جو اس سے زیادہ طاقتور تھا اور اسی قسم کی مہم پر جارہا تھا۔ دونوں گروہ اس وقت کشتیوں میں سوار تھے کہ دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔ وہ گروہ طاقتور ثابت ہوا اور فرید کے گروہ کو شکست ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرید کا گروہ منتشر ہوگیا۔ فرید اپنی جان بچانے کے لیے دریائے گومتی کی ایک معاون ندی سیتی میں کود پڑا۔ اس حالت میں بھی وہ حاضر دماغ رہا اور اس نے اپنا اسلحہ اپنے قبضے میں رکھا۔ اس نے اپنے تیر کمان سر سے باندھ لیے اور تین کوس تیر کر اپنی جان بچائی۔

اس واقعے نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ اسے عبرت بھی ہوئی اور یہ احساس بھی کہ یہ ایک خطرناک کام ہے۔ وہ خطروں سے ڈرنے والا نہیں تھا لیکن پہلی مرتبہ اس میں گناہ کا احساس بیدار ہوا۔ اس کا گروہ منتشر ہوچکا تھا۔ وہ اسے پھر سے یکجا کرسکتا تھا لیکن اس نے سوچ لیا کہ اب وہ رہزنی کے پیشے کو خیرباد کہہ دے گا۔ کوئی اور باعزت نوکری ڈھونڈ لے گا۔

رہزنوں کے گروہ کے ساتھ رہ کر فرید خاں کو اتنا فائدہ ضرور ہوا تھا کہ اسے اپنی صلاحیتوں کا علم ہوگیا تھا۔ جب صلاحیتوں کا علم ہوجائے تو خود اعتمادی خود بخود پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کی یہی خود اعتمادی اسے اس دور کے ان امرا کے پاس لے گئی جو اس وقت جونپور میں تھے۔ بن لودی، ناصر خاں لوہانی اور تاج خاں سارنگ خانی اس کی خدمات سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ اب وہ اتنا خوش حال ہوگیا تھا کہ اس نے جونپور ہی میں رہتے ہوئے شادی بھی کرلی۔ اب وہ سسرام واپس جاسکتا تھا کچھ دن کے لیے ہی سہی لیکن اسے معلوم ہوا کہ اس کی ماں کا انتقال ہوچکا ہے۔ اب وہ وہاں جاکر کیا کرتا۔

وہ جونپور کے افغانوں میں ایک مشہور و معروف ہستی بن گیا تھا۔ جونپور کے بزرگ افغان اس کے والد کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ اسے اپنے پاس بلا کر پرگنوں کا انتظام اس کے سپرد کردیں لیکن حسن خاں اپنی بیوی سے اتنا ڈرتا تھا کہ وہ ان بزرگوں کے مطالبات کو ٹالتا رہا۔

☆☆☆

سلطان سکندر کی وفات کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا ابراہیم دہلی میں تخت نشیں ہوا لیکن کچھ ذی اثر امرا اس کے چھوٹے بھائی شہزادہ جلال خاں کو جونپور کا خودمختار حکمراں بنانا چاہتے تھے۔ اس ریاست میں دریائے گنگا کے مشرق سے لے کر بنگال کے مغرب تک کا سب علاقہ شامل تھا۔

اس آویزش کی وجہ سے حالات تیزی سے بدلنے لگے اور تمام سلطنت میں خوف و دہشت طاری ہوگئی جس طرح سروانی قبیلے کے سرداروں نے بہلول لودھی کی وفات کے بعد سکندر کی مدد کی تھی ٹھیک اسی طرح اب وہ سلطان سکندر کے دوسرے بیٹے کے مددگار بن کر میدان میں آگئے۔

سکندر کی وفات کی خبر سنتے ہی شہزادہ جلال خاں جونپور کو روانہ ہوگیا اور شہر پر قبضہ کرلینے کے بعد اعظم ہمایوں سروانی

کو اپنا وزیر مقرر کرلیا۔ ابراہیم بھی خاموش نہ رہا۔ اس نے فوراً اپنی سیاسی چالوں سے لوہانی اور لودی سرداروں کو جو سروانی سرداروں سے حسد رکھتے تھے، اپنی طرف ملا لیا۔ شہزادہ جلال خاں، جونپور سے اودھ کی طرف چل پڑا۔ ابراہیم نے عمر خاں سروانی کو شہزادہ جلال خاں کے تعاقب میں بھیجا لیکن وہ جلال خاں سے مل گیا۔ ابراہیم خاں نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے پہلے تو جونپور اور اس کے گردونواح کے علاقے کو فتح کرنے کا قصد کیا اور پھر آگے کے منصوبے بنائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ جونپور اور اودھ کی طرف روانہ ہوا اور تیزی سے کوچ کرنے لگا۔

حالات روز بہ روز تشویش ناک ہوتے جارہے تھے۔ دونوں بھائیوں کی یہ جنگی چالیں خانہ جنگی کی کیفیت اختیار کرتی جارہی تھیں۔ حسن خاں اور اس کی جاگیر کا فیصلہ اس خانہ جنگی کے انجام سے وابستہ تھا۔ حسن خاں فوجی زندگی گزار رہا تھا۔ سلطان سکندر کے ایک امیر جمال خاں نے اسے پانچ سو گھڑ سوار رکھنے کا حکم دیا تھا۔ اسے اس خانہ جنگی میں براہ راست ملوث ہونا پڑا۔ اب اس کے لیے مشکل ہوگیا کہ وہ جاگیر کی دیکھ بھال کرسکے۔ اسے ایک ایسے قابلِ اعتماد اور اہل آدمی کی ضرورت تھی جو اس کی طویل غیر حاضری میں اس کی جاگیر کو سنبھال سکے۔ وہ اب تک فرید خاں کی اہمیت سے انکار کرتا رہا تھا لیکن اب اسے یاد آیا کہ اس کا بیٹا فرید خاں مرد میدان بھی ہے اور حساب کتاب کا ماہر بھی۔ اگر اسے واپس بلا لیا جائے تو اسے جاگیر کے انتظام کی طرف سے فراغت مل جائے گی لیکن مسئلہ تھا تو اس کی بیوی کا۔ وہ یہ کبھی نہیں چاہتی کہ فرید واپس آجائے۔ اب وقت ایسا تھا کہ اسے بیوی سے بات کرنا پڑی۔

''تم جونپور کے حالات دیکھ رہی ہو؟'' حسن خاں نے ایک روز بیوی کو بٹھا کر سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میں گھر میں بیٹھنے والی ان حالات کو کیا سمجھوں گی۔''

''اسی لیے تو میں نے یہ بات چھیڑی ہے۔ جلال خاں اور ابراہیم کی تلواریں آمنے سامنے چمک رہی ہیں۔ پٹھانوں میں سخت پھوٹ پڑ گئی ہے۔ اس کا انجام نہ جانے کیا ہو۔ میں خود بھی اپنے سواروں کو لیے میدانوں میں دوڑتا پھر رہا ہوں۔''

''ہاں یہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔''

''دیکھ تو رہی ہو سمجھنے کی بھی کوشش کرو۔ میری طویل غیر حاضری کا نتیجہ کہیں یہ نہ نکلے کہ سسرام کی جاگیر ہی ہاتھ سے نکل جائے۔''

''مجھے کیا دھمکیاں دے رہے ہیں۔ جاگیر سنبھالنا آپ کا کام ہے میرا نہیں۔''

''بندی خدا کی اسی لیے تو تم سے مشورہ کررہا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ فرید خاں کو بلا کر جاگیر کا انتظام اس کے سپرد کردوں۔''

یہ سنتے ہی اس کی بیوی بھڑک اٹھی۔ ''اپنی سوکن کے سانپ کو میں ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کروں گی۔ سن لیا تم نے؟ اگر اسے واپس ہی بلانا تھا تو نکالا کیوں تھا۔ مجھے یقین ہے تم جونپور میں اس سے ملتے رہے ہو۔ اس کی مالی مدد بھی کرتے رہے ہو اور اب اسے یہاں بلانے کی باتیں کررہے ہو۔ اب تو وہ جوان ہوچکا۔ ہم سے گن گن کر بدلے لے گا۔''

''میں نے اسے اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا تاکہ تم خوش رہو اور گھر میں امن رہے لیکن اب ایسی مجبوری آگئی ہے کہ ہمیں مصلحت سے کام لینا ہوگا۔''

''ہائے میرا سلیمان۔ وہ تو ابھی اتنی طاقت بھی نہیں رکھتا کہ فرید خاں سے اپنا حق چھین سکے۔ فرید خاں ہر چیز پر قبضہ کرلے گا۔''

''دیکھو تم دل چھوٹا مت کرو۔ میں اسے ہمیشہ کے لیے نہیں بلا رہا ہوں۔ یہ میری چالاکی کا ایک دام ہے جس میں، میں اسے پھانس رہا ہوں۔ اپنا مطلب نکالنے کے لیے بلا رہا ہوں۔ جیسے ہی یہ شورش ختم ہوگی میں اسے نکال باہر کروں گا۔''

''وہ اتنی آسانی سے نکل جائے گا؟''

''یہ میرا کام ہے۔ تم بس اس وقت خوشی سے اجازت دے دو کہ میں اسے یہاں بلالوں۔''

اس کی بیوی نے اس کے بعد بھی نخرے دکھائے لیکن حسن خاں نے اسے کسی نہ کسی طرح منا ہی لیا۔ اب مرحلہ یہ تھا کہ فرید خاں کو کیسے راضی کیا جائے۔ اس کے لیے وہ بزرگ موجود تھے جو کب سے اصرار کررہے تھے کہ وہ فرید خاں کو واپس بلالے۔

حسن خاں جونپور آیا اور فرید خاں سے مل کر اپنی پیشکش اس کے سامنے رکھی لیکن فرید خان کا جواب وہی تھا جس کی توقع حسن خاں کررہا تھا۔ اس نے اس تجویز کو رد کردیا۔

حسن خاں اس کی طرف سے مایوس ہوکر بزرگ افغانوں اور فرید کے دوستوں کے پاس پہنچا۔ وہ اپنی ان کوتاہیوں کی طرف سے معذرت خواہ ہوا جو اب تک اس سے سرزد ہوتی رہی تھیں اور ان پر زور ڈالا کہ وہ فرید خاں کو راضی کریں کہ وہ پرگنوں کا انتظام سنبھالنے کو تیار ہوجائے۔

یہ دوست بیچ میں پڑے اور بالآخر فرید خاں ان پرگنوں کا انتظام سنبھالنے کو تیار ہوگیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جنوبی بہار میں جہاں اب ضلع شاہ آباد ہے اسی علاقے میں حسن خاں کی جاگیر کے پرگنے سسرام اور خواص پور ٹانڈہ تھے۔ چاروں طرف ہندوؤں اور راجپوتوں کی آبادی تھی۔ مسلمانوں کا تسلط پوری طرح قائم نہیں ہوسکا تھا۔

پرگنوں میں پہنچنے کے بعد فرید نے صورتِ حال کو بدلنا شروع کردیا۔ وہاں قانون کا نفاذ کیا اور نئے منصفانہ ضابطے بنائے اور ان کوتاہیوں کو دور کرنا شروع کیا جو اب تک روا رکھی جارہی تھیں۔

فرید نے نہایت جانفشانی سے شعبۂ زراعت کی بدعنوانیاں دور کرنا شروع کیں اور ایسی اصلاحات کیں جن سے مستقبل کی پریشانیاں دور ہوجائیں۔ اس نے زراعت کو اپنی حکومت کا سنگ بنیاد سمجھا اور انتظامی امور میں کاشت کار کے مفاد کو سب سے زیادہ ترجیح دی۔

سسرام کے بندوبست کے وقت اسے دو کام ایک ساتھ کرنے پڑے۔ ایک اصلاح کا اور دوسرا سپاہی کا۔ وہ مالی محکموں کے انتظام کا تقریباً ماہر ہوچکا تھا لیکن فوجی خدمات کا اسے کوئی تجربہ نہیں تھا البتہ زندگی کے شروع میں وہ ایک رہزن رہ چکا تھا لہٰذا وقت پڑنے پر اعلیٰ سپاہی بھی ثابت ہوا۔

فرید کے پاس جنگ کا کوئی سامان نہ تھا اور نہ اس کے والد کے اصطبل میں گھوڑے تھے۔ اس کے باوجود اس نے سرکش زمینداروں کو دبانے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

اس نے عاملوں کو حکم دیا کہ وہ دو سو زین فوراً تیار کرائیں۔ دونوں پرگنوں میں ایسے افغانوں اور خیل داروں میں جو تنومند مگر بے روزگار نوجوان تھے گنتی کروائی اور اپنے حضور میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ ان کے کھانے پینے کا خرچ خود ہی برداشت کرے گا اور جو باغیوں کا مالِ غنیمت نقد اور سامان کی شکل میں ان کے ہاتھ لگے گا اس میں وہ اپنا حصہ نہیں بٹائے گا۔ ان کو گھوڑے دینے کا بھی اس نے ذمہ لیا اور میدان جنگ میں نمایاں دلیری دکھانے پر ان کو جاگیریں دلوانے کا بھی وعدہ کیا۔

''اب اسے گھوڑوں کا بندوبست کرنا تھا۔ اس نے رعایا کو بلایا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے گھوڑے ان کو عاریتاً دے دیں۔ رعایا فوراً بہ خوشی تیار ہوگئی۔ گھوڑوں کے لیے زین اور سپاہی پہلے ہی میسر آگئے تھے۔ اس طرح ایک چھوٹا سا فوجی دستہ تیار ہوگیا۔

فرید کو دو قسم کے باغیوں کو سزا دینی تھی۔ پہلا طبقہ سرکش مقدموں کا تھا جو جاگیرداروں کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھا کر لگان دینا بند کردیتے تھے۔ فرید خاں تیاریاں مکمل کرنے کے بعد سرکش مقدموں پر ٹوٹ پڑا۔ مویشیوں املاک حتیٰ کہ بیوی بچوں کو بھی چھین لیا۔

ان باغیوں کو ایسے زبردست جاگیردار سے کبھی واسطہ نہیں پڑا ہوگا۔ انہیں اطاعت قبول کرنے کے سوا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا۔ بقیہ لگان ادا کیا اور مستقبل میں اپنی خیرخواہی اور وفاداری کی ضمانت دی۔ اس کے صلے میں فرید نے قیدیوں کو رہا کردیا۔

باغی زمینداروں سے ٹکرانا ذرا مشکل کام تھا۔ یہ زمیندار عملی طور سے خودمختار تھے۔ جنگلوں میں قلعے بنا کر رہتے تھے۔ ان کی سرکوبی کے لیے وافر مقدار میں اسلحۂ جنگ اور مزید سپاہیوں کی ضرورت تھی۔ فرید نے یہ کام نہایت دوراندیشی سے انجام دیا۔ اس نے اپنے رسالے میں مقامی ہندو کسانوں کو بھرتی کیا۔ رعیت کے لوگ حاضر ہوگئے۔ جن کے پاس گھوڑے تھے وہ گھوڑوں پر آئے۔ جن کے پاس گھوڑے نہیں تھے وہ ننگے پاؤں پیدل چل کر اس کے ڈیرے کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ فرید نے ایک نظر ان پر ڈالی اور بھانپ لیا کہ کون فوج میں بھرتی ہونے کے لائق ہے اور کس کو کاشت کاری کے کام پر چھوڑ کر آگے بڑھا جائے۔ اس نے نصف کو فوج میں بھرتی کرلیا اور باقیوں کو کاشت کرنے اور اپنے گھروں کی حفاظت کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

اس نے اس فوج کو ساتھ لیا اور کسی تجربہ کار جرنیل کی طرح آگے آگے چلتے ہوئے زمینداروں کے علاقے کی طرف روانہ ہوا۔ یہ زمیندار اتنے سرکش ہوچکے تھے کہ فرید خاں کے آنے کی خبر سن کر بھی اس کے مقابلے کے لیے نہیں نکلے۔ وہ جس وقت سامنے آئے گا اس وقت دیکھا جائے گا۔ ان زمینداروں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ فرید خاں نے کہیں فوجی تربیت حاصل نہیں کی لیکن قدرت کی طرف سے تربیت ضرور حاصل کرکے آیا ہے۔ فرید خاں نے ان زمینداروں پر اندھا دھند ہلہ بول دینے کے بجائے اس حکمت عملی سے کام لیا جو راستہ عموماً تربیت یافتہ فوجیں اختیار کرتی ہیں۔

اس نے قلعہ خام تیار کیا اور فوج کو اس کے اندر بہ حفاظت ٹھہرا دیا۔ پیدل سپاہیوں کو حکم دیا کہ گاؤں کے چاروں طرف کے جنگل کو صاف کردیں اور رسالہ کے سپاہیوں کو گاؤں کے چاروں طرف گشت لگانے اور فصل کو برباد کرنے، مویشیوں کو ہنکا لانے، عورتوں بچوں کو قید کرنے اور مردوں کو تلوار کے گھاٹ اتارنے کی ہدایت کی۔ جنگل صاف ہونے کے بعد وہ اپنی فوج کو گاؤں کے نزدیک لے آیا اور لشکر کے چاروں طرف خندق کھود لی۔ کچی دیواریں

ی مانند رلیں تاکہ لشکر محفوظ رہے۔

زمینداروں کی آنکھیں اب کھلیں۔ ان کا سامنا ایک ...بیت یافتہ فوج سے تھا۔ انہوں نے فرید خاں کے پاس ...دی دوڑائے۔ ''ہم اطاعت قبول کرتے ہیں اور بطور ...جانہ ایک کثیر رقم ادا کرنے کو تیار ہیں۔''

''ان باغیوں نے ایسے وعدے بہت سے ...اگیرداروں سے کیے ہیں۔ فرید خاں ان کے وعدوں کا ...عتبار نہیں کرتا۔ میں وہ نہیں جو عارضی فائدے کے لیے اپنے ...رادوں کو بدل دوں۔ میں نے ان زمینداروں کو جڑ سے ...کھاڑ پھینکنے کا عزم کر رکھا ہے۔''

اس نے سرکش زمینداروں کی اطاعت کو فریب سمجھا ...ور بلائے بے درماں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا۔ تمام باغیوں کو قتل کیا اور ان کے بیوی بچوں کو غلام بنا کر فروخت کردیا۔

اس کام سے لوٹا تو علاقے ویران ہوچکے تھے۔ اس نے اس ویران علاقے کو آباد کرنے کے لیے اپنے پرگنوں کے تمام حصوں سے آدمیوں کو بلا کر بسایا۔ جب دوسرے غداروں نے اس قتل و غارت گری کی داستان سنی تو ان کی عقل ٹھکانے آگئی اور فرید خاں نے جس سرکشی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا عزم کیا تھا وہ پورا ہوا۔

تقریباً چار سال بعد فرید کا باپ حسن خاں اپنے فرض منصبی سے چھٹی لے کر اپنی جاگیر پر واپس آیا اور ہر طرف سرسبز و شادمانی کا منظر دیکھا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

سکندر لودھی کا چھوٹا بیٹا جلال خاں قتل ہوچکا تھا اور تمام ملک پر سلطان ابراہیم کی حکومت قائم ہوچکی تھی۔ نسبتاً امن بھی قائم ہوچکا تھا لیکن حسن خاں کی جاگیر میں کچھ زیادہ ہی امن قائم تھا۔ یہ امن فرید نے اپنی اصلاحات اور حسنِ انتظام سے قائم کیا تھا۔ اس نے جاگیر کے جنوب اور جنوب مغرب میں بسنے والے زمینداروں کو نیست و نابود کرکے ان کے علاقے کو اپنی جاگیر میں ملالیا جس سے اس کا رقبہ دوگنا ہوگیا۔

حسن خاں یہ دیکھ کر حیران ہوگیا تھا کہ جن لوگوں پر فرید خاں نے سختی کی تھی وہ بھی اس کے حسنِ انتظام کی تعریف ...ر ہے تھے۔ حسن خاں نے جوش جذبات سے فرید خاں کو گلے لگالیا۔

''تم نے جس خوبصورتی سے جاگیر کی دیکھ بھال کی ...اس کا تقاضا ہے کہ میں تمہیں کبھی الگ نہ کروں۔ تم زندگی ...اس کا انتظام سنبھالے رہو۔''

''بابا جانی، آپ کا یہ اعتماد ہی میرے لیے بہت ...

اس کی نازک مزاج بیوی تک بھی یہ باتیں پہنچ رہی تھیں۔ وہ اس امید پر فرید خاں کو برداشت کررہی تھی کہ حسن خاں کے واپس آتے ہی اسے نکال دیا جائے گا لیکن اس کے سامنے تو اب منظر ہی دوسرا تھا۔ حسن خاں اس کے گن گا رہا تھا۔ اس کی بیوی نے اسے ورغلانے کے لیے اٹھتے بیٹھتے فرید خاں کی برائیاں شروع کردیں جب یہ برائیاں سنتے سنتے حسن خاں کے کان پک گئے تو ایک روز اس نے بیوی کو جھڑک دیا۔

''یہ کیا تم ہر وقت فرید خاں کی برائیاں کرتی رہتی ہو۔ کیا بگاڑا ہے تمہارا اس نے؟''

''آپ نے کہا تھا بہت جلد فرید کو نکال دو گے۔ اب نکالو تاکہ میرے بیٹے سلیمان کو اس کا حق ملے۔''

''جس خوبی سے فرید نے انتظام سنبھالا ہے سلیمان اس طرح کام نہیں چلاسکتا۔''

''مجھے معلوم تھا کہ میرے ساتھ بدعہدی کرو گے۔ اب مجھ سے کوئی تعلق مت رکھنا۔''

حسن خاں سمجھ رہا تھا کہ یہ محض دھمکی ہے لیکن جب بیوی نے ترک تعلق کرلیا تو وہ اس جدائی کی تاب نہ لاسکا۔ اس کی عمر ساٹھ سال ہوچکی تھی لیکن بیوی سے عشق میں کمی نہیں آئی تھی۔ اس نے بیوی کی ضد کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔

''اگر آپ نے فرید کو چلتا نہ کیا تو میں گلے میں پھندا ڈال کر مر جاؤں گی۔''

''فرید خاں کوئی بچہ نہیں ہے جو اسے اچانک نکال دوں۔ تم مجھے کچھ وقت دو۔ میں ایسے حالات پیدا کردوں گا کہ وہ یہاں سے جانے پر مجبور ہوجائے۔''

''میں آپ کو وقت دیتی ہوں لیکن یہ وقفہ اتنا طول نہ کھینچ لے کہ میرا صبر جواب دے جائے۔''

اس روز سے حسن خاں ایک دوسرا ہی انسان ہوگیا۔ فرید کی جانب سے اس کا رویہ بالکل ہی بدل گیا۔ اٹھتے بیٹھتے فرید کے انتظام پر نکتہ چینی کرتا رہتا تھا۔

فرید کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کس کی زبان بول رہا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سوتیلی والدہ کے جادو سے اپنے والد کو بچانا مشکل ہے۔ اس نے جاگیر کے انتظام میں دلچسپی لینا بند کردیا اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ اس نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

اس کے مستعفی ہونے کی خبر جیسے ہی رشتہ داروں تک پہنچی، عزیز و اقارب نے حسن خاں کو لعنت ملامت شروع کردی کہ ایک کنیز بیوی کے لیے وہ اپنے ہونہار لڑکے کو خود سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جدا کر رہا ہے۔ وہ یہاں سے نکل کر کہاں جائے گا۔ سلطنت میں تو ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی ہے۔

اس نے اپنی یادیں اور بیوی بچوں کو سسرام میں چھوڑا اور خود کسی منزل کا تعین کیے بغیر ایک مرتبہ پھر سسرام سے نکل کھڑا ہوا لیکن اب وہ کم سن طالب علم نہیں تجربہ کار سپاہی بن چکا تھا۔ اب وہ اپنے لیے خود راستہ بنا سکتا تھا۔

شاہی کے مزے آگرہ اور دہلی میں لوٹے جا رہے تھے۔ بہار میں تو شورش تھی لیکن یہ علاقے پرسکون تھے۔ اس نے قسمت آزمائی کے لیے آگرہ کا انتخاب کیا۔

وہ کانپور میں تھا کہ چند افغانوں نے اسے دعوت پر مدعو کیا۔ اس دعوت میں اس کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ فرید خاں میں قیافہ شناسی کا زبردست ملکہ تھا۔ اس شخص نے اسے بے حد متاثر کیا۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ یہ شخص اگر اس کا ساتھ دینے پر تیار ہو جائے تو وہ بڑے بڑے معرکے سر کر سکتا ہے۔ اس نے اپنے میزبانوں سے دریافت کیا کہ یہ شخص کون ہے؟ اسے یہ بتایا گیا کہ اس شخص کا نام شیخ اسمٰعیل ہے اور فرید خاں کی طرح سوری قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔

فرید خاں رات میں اس کے پاس گیا۔ شیخ اسمٰعیل، فرید خاں کی شہرت سن چکا تھا۔ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ فرید خاں خود اس سے ملنے آیا ہے۔

”میں قسمت آزمائی کے لیے آگرہ جا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔“

”کہاں چلوں۔ وہاں جہاں کوتاہ اندیش ابراہیم لودھی پٹھانوں کو بے عزت کر رہا ہے۔ فرعون بنا بیٹھا ہے، وہ چاہتا ہے سارے پٹھان ہاتھ باندھ کر دربار میں کھڑے رہیں۔ جو افغان سردار سلطان بہلول اور سکندر کے ساتھ ایک ہی مسند پر بیٹھنے کے عادی تھے، اب اس کے سامنے بیٹھ نہیں سکتے۔“

”یہ پٹھانوں کی کمزوری ہے۔“ فرید خاں نے کہا۔ ”اگر ہم آپس کے اختلافات بھلا کر متحد ہو جائیں تو مجال ہے ابراہیم خاں انہیں ذلیل کر سکے۔“

”یہ تو سب کو معلوم ہے لیکن انہیں متحد کرے گا کون؟“

”ہو سکتا ہے یہ کام میں کروں۔“ یہ کہتے ہوئے فرید خاں کا ہاتھ اپنی تلوار پر چلا گیا تھا۔ ”اگر انہیں متحد نہ کر سکا تو یہ بھی کر سکتا ہوں کہ ابراہیم خاں کے مقابلے پر خود کھڑا ہو جاؤں۔“

”کیوں ایسی بات منہ سے نکالتے ہو جو پوری نہ ہو سکے۔“

”کوئی بات ایسی نہیں ہوتی جو پوری نہ ہو سکے۔ ابھی تک لودھی خاندان حکومت کرتا رہا ہے اب یہاں سوریوں کی حکومت بھی ہو سکتی ہے۔“

فرید نے شیخ اسمٰعیل کو اپنے ساتھ آگرہ چلنے پر تیار کر لیا۔ چلتے وقت شیخ اسمٰعیل نے اپنے سالے حبیب خاں کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔

فرید پہلی بار آگرہ دیکھ رہا تھا۔ اس وقت آگرہ ویسا نہیں تھا جیسا کہ بعد میں مہذب مغلوں نے اسے بنا دیا۔ یہ ایک منتشر قصبہ تھا۔ جمنا کے مغربی کنارے مرتفع ٹیلے پر ایک اینٹوں کا بنا ہوا حصار تھا۔ اسی حصار کے کھنڈروں پر بعد میں اکبر نے لال پتھر کا ایک عالی شان قلعہ تعمیر کرایا۔

سکندر لودھی نے آگرہ کی بنیاد محض فوجی چھاؤنی کے لیے ڈالی تھی لیکن سیاسی ضرورت سے مجبور ہو کر سکندر لودھی اور بعد میں ابراہیم لودھی نے اپنی سلطنت کا دوسرا صدر مقام بنایا۔

فرید اس شہر میں اجنبی تھا لیکن جب کوئی ہمت کرتا ہے تو راستے خود بخود کھلتے جاتے ہیں۔ اس کی ملاقات اپنے ایک خاندانی کرم فرما جمال خاں سارنگ خانی کے بیٹے سے ہو گئی۔ اس کا نام دولت خاں تھا اور یہ بارہ ہزار گھوڑوں کا کمانڈر تھا۔

جب یہ ملازمت ذرا پختہ ہوئی تو فرید خاں نے اپنے والد کی جاگیر اپنے نام کرانے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ اسے یقین تھا کہ دولت خاں اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے اس کا حق اسے ضرور دلائے گا۔ اس نے دولت خاں کو آمادہ کرنے کے لیے یہ لالچ بھی دیا کہ اگر اس کی تقرری والد کی جاگیر میں ہو گئی تو وہ یا اس کا چھوٹا بھائی چار سو سوار کے رسالہ کے ساتھ سلطان کی خدمت میں حاضر رہے گا۔ اس نے یہ جواز بھی پیش کیا کہ اس کا والد بوجہ ضعیفی جاگیر کی دیکھ بھال کے لائق نہیں رہا ہے لہٰذا یہ جاگیر اس کے نام منتقل ہو جانی چاہیے۔

دولت خاں نے وعدہ کر لیا کہ وہ فرید کی یہ تجویز سلطان ابراہیم کے سامنے ضرور پیش کرے گا اور اس نے ایسا کیا بھی لیکن سلطان ابراہیم نے اسے بیک قلم مسترد کر دیا اور کہا کہ جو شخص اپنے والد کی شکایت کرتا ہے یقیناً وہ نیک انسان نہیں ہے۔

فرید مایوس ہو کر بیٹھ گیا تھا لیکن قسمت یاوری کر رہی تھی۔ اس واقعے کے کچھ ہی عرصہ بعد حسن خاں کا انتقال ہو گیا۔ دولت خاں نے ایک مرتبہ پھر اس کے لیے کوشش کی اور اس کی محنت رنگ لائی۔ یہ جاگیر فرید خاں کو مل گئی۔ شاہی فرمان اس کے ہاتھ میں تھا کہ وہ سسرام پہنچ گیا۔ اس عرصے

میں اس کا سوتیلا بھائی سلیمان جاگیر پر قبضہ کر چکا تھا لیکن فرید کے سسرام پہنچتے ہی سلیمان مقابلے کی تاب نہ لا کر چوند کے جاگیردار محمد خاں سوری کے پاس بھاگ گیا۔

محمد خاں سوری اپنی ممتاز حیثیت کی وجہ سے سوری قبیلے کا سردار سمجھا جاتا تھا لیکن فرید کے باپ کی طرف سے دل میں کچھ رنجش رکھتا تھا۔ یہ موقع اس کے خوب ہاتھ لگا۔ اس کی یہ دلی خواہش تھی کہ فرید اور سلیمان میں باہمی تنازع ہو جائے اور دونوں اس کے پاس ثالثی کے لیے حاضر ہوں۔

فرید خاں ان کچی گولیوں میں آنے والا نہیں تھا۔ اس نے ایک طرف محمد خاں سوری کو اپنا مربی تسلیم کیا اور اسے لکھا۔

”ابا جان کی زندگی میں اگر آپ کے اور ان کے درمیان جو بھی رنجش رہی ہو تو میں اسے مٹانے کو تیار ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ اپنی آیندہ زندگی میں آپ کی محبت و شفقت سے ہم کنار رہوں۔ میں اپنے بھائی نظام الدین کو آپ کی خدمت میں سلیمان کو بلانے کے لیے بھیج رہا ہوں۔ میں اس کو ایسی جاگیر دوں گا جس سے اس کو مکمل اطمینان حاصل ہو سکے لیکن اگر اس کا منشا ابا جان کی جاگیر میں حصہ کشی کرنا ہے تو میری زندگی میں تو اس کی امید کا بر آنا محال ہے۔“

اس تحریر کے ساتھ ہی فرید خاں نے اپنی بقا کے خیال سے کسی ایسے افغان سردار کی تلاش شروع کر دی جو محمد خاں سوری کے عتاب سے اسے بچا سکے۔

فرید خاں کے گرد و نواح میں بہار کے دریا خاں لوہانی کا لڑکا بہار خاں لوہانی ہی ایک ایسا قوی سردار تھا جو محمد خاں سوری سے اپنی طاقت منوا سکتا تھا اور اس کو مرعوب کر سکتا تھا۔ فرید خاں ایسے سنہرے مواقع ضائع کرنے والا نہیں تھا۔ وہ بہار خاں لوہانی کی ملازمت میں پہنچ گیا۔

فرید کی عملی قابلیت اور مال کے صیغے میں اس کے وسیع تجربے کی شہرت چار سو پھیل چکی تھی۔ مسلمانوں میں حساب داں ملتے کہاں تھے اور خصوصاً پٹھانوں میں۔ بہار خاں لوہانی نے نعمتِ خداداد کی طرح اسے گلے سے لگا لیا۔ فرید خاں نے بھی ایک خاص مصلحت کے تحت اس کی ملازمت میں دن رات ایک کر دیے۔

اب وہ بہار خاں کا ملازم نہیں معتمد بن کر ساتھ رہنے لگا تھا۔ وہ بہار خاں لوہانی کا جگری دوست کہلاتا تھا اور اس کے [illegible] انتظام کی شہرت پورے بہار میں پھیل گئی تھی۔

فرید کے حسنِ انتظام کی شہرت کے پہلو بہ پہلو یہ خبریں [illegible]ش کر رہی تھیں کہ مغلوں کا سردار ظہیر الدین بابر [illegible] ان پر حملہ آور ہو نے [illegible] لیے پنجاب کے راستے پر

گامزن ہو چکا ہے۔ دہلی میں سلطان ابراہیم لودھی بھی جنگ کی تیاریوں میں مشغول ہے۔ فرید کا آقا بہار خاں لوہانی اس جنگ کے فیصلے کا بے چینی سے منتظر تھا کیونکہ مغلوں کی فتح حمیتِ افغانی پر ایک کاری ضرب ہوتی۔

دولت خاں لودھی، سلطان ابراہیم کے دربار سے بھاگا ہوا امیر تھا۔ اس نے سلطان ابراہیم کی شکایتیں لکھ لکھ کر بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے راغب کیا تھا لیکن بدعہدی فطرت میں شامل تھی۔ بابر آ گیا تو اپنے بیٹوں کے ساتھ چالیس ہزار سواروں کی فوج لے کر مقابلے پر آیا لیکن شکست کھائی۔ بابر نے پنجاب پر قبضہ کر لیا۔

جاسوس دہلی کی جو خبریں لا رہے تھے ان سے معلوم ہوا تھا کہ سلطان ابراہیم ایک لاکھ سواروں اور مست جنگی ہاتھیوں کی ایک بڑی تعداد لے کر دہلی سے چالیس کوس پر، سرہند اور دہلی کے درمیان پانی پت کے مقام پر پہنچ گیا ہے۔

بابر پانی پت پہنچا تو اس کا لشکر غنیم کی فوج کے دسویں حصے کے برابر تھا۔ دشمن کی کثرت دیکھ کر ہمراہی گھبرا گئے لیکن بابر کے پائے ثبات میں لغزش نہیں تھی۔ اس نے ہر قیمت پر مقابلے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ان تیاریوں نے مشرقی صوبوں میں خوف اور تشویش کی لہر دوڑا دی تھی۔ آنے والے خطرے نے چند روز کے لیے تمام لوہانی، فارمولی اور دریائے گنگا کے مشرق میں رہنے والے افغانوں کو متحد کر دیا۔ انہوں نے بہار خاں لوہانی کی کمان میں دس لاکھ فوج منظم کی۔ افغانوں کی اس متحدہ فوج نے قنوج کے نزدیک دریائے گنگا کو پار کیا اور دوسری جانب ڈیرے ڈال دیے۔ وہ یہ دیکھنے کو ٹھہرے ہوئے تھے کہ پانی پت کی جنگ کا انجام کیا ہوتا ہے۔

پانی پت کے میدان میں یہ شور مچ گیا تھا کہ سلطان ابراہیم مارا گیا لیکن اس کی تحقیق نہیں ہو سکی تھی۔ اس کی لاش پر یا کٹے ہوئے سر پر ابھی تک کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔

بابری شہ سوار، پٹھانوں کے تعاقب میں پیامِ مرگ بنے ہوئے اپنے گھوڑوں کو دوڑا رہے تھے۔ اس تگ و دو میں بابر کی نظر سلطان ابراہیم کے کٹے ہوئے سر پر پڑی اور بہادر لشکریوں نے اپنی باگیں کھینچ لیں۔

ابراہیم کی موت کا سرکاری طور پر اعلان ہو گیا۔

یہ اعلان سنتے ہی مخبروں نے گھوڑوں کے رخ موڑے اور قنوج کی طرف دوڑ پڑے۔ پانی پت کی لڑائی کے تقریباً دس دن بعد یہ خبر بہار خاں لوہانی کے لشکر میں پہنچ گئی۔ اس خبر کو سنتے ہی افغان سردار خوشی سے اچھل پڑے۔ اب انہوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے حمیت افغانی کے لیے مغلوں سے لڑنے کا تہیہ کرلیا۔ ان کا خیال تھا کہ لودھیوں کی شکست کے بعد باقی افغان قبائل مغلوں کو شکست دے کر حکومت کریں گے یا کم از کم انہیں اپنے علاقوں تک نہیں آنے دیں گے۔ انہوں نے دریائے گنگا کے اس پار بہار خاں کے سر پر ہندوستان کا تاج رکھ دیا اور اسے سلطان محمد کا خطاب عطا کیا۔ بہار خاں کی تاج پوشی کے موقعے پر بااثر افغان سرداروں کے مرتبہ وجاگیر میں اضافہ ہوا۔ اسی موقعے پر فرید خاں کو بھی شیر خاں کا خطاب ملا۔ یہی شیر خاں بعد میں شیر شاہ سوری بن کر سامنے آیا۔

بابر نے ولایت بہار کی طرف کوچ کا حکم دے دیا۔

سلطان محمد کو جب چغتائی لشکر کے کوچ کرنے کی خبر ملی تو سلطان محمد پراسرار طور پر پیچھے ہٹ گیا۔ بہت دن تک وہ مفقود الخبر رہا اور پھر جمعیت فراہم کر کے شاہی لشکر پر اس وقت حملے کرنے شروع کر دیے جب وہ گنگا عبور کر رہا تھا۔ بابر نے اس کی روک تھام پر عسکری مرزا (بیٹا) کو مقرر کیا اور خود دریا عبور کرلیا۔ پٹھان بے فائدہ دوڑ دھوپ کر کے ناکام ونامراد فرار ہو گئے۔

جب سلطان محمد مشرق کی جانب پیچھے ہٹ رہا تھا تو شیر خاں اور محمد خاں سوری بھی اپنی اپنی جاگیروں کی حفاظت کے لیے اس سے جدا ہو گئے۔

محمد خاں سوری کے لیے یہ اچھا موقع تھا۔ پٹھانوں کے اتحاد کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ محمد خاں سوری کو موقع مل گیا کہ وہ شیر خاں (فرید) کے سوتیلے بھائی سلیمان سے کیا ہوا وعدہ پورا کرے۔ اس نے اپنا ایک سفیر شیر خاں کے پاس بھیجا اور پرزور مطالبہ کیا کہ وہ اپنے والد کی جاگیر میں سے کوئی سے دو علاقے سلیمان کے سپرد کر دے کیونکہ اس جاگیر میں اس کا بھی حصہ ہے۔

شیر خاں نے دوٹوک جواب دیا۔

''ہندوستان روہ (افغانستان) کا علاقہ نہیں ہے جہاں باپ کی جائداد اس کے بیٹوں میں مساوی تقسیم ہو جاتی ہے۔ میں اس جاگیر میں سے سلیمان کو کوئی حصہ نہیں دوں گا۔''

شیر خاں یہ بھی جانتا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ محمد خاں سوری اس انکار پر کس قسم کے ردعمل کا مظاہرہ کرے گا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی نظام کو حکم دیا کہ وہ تمام عزیز واقارب کو لے کر روہتاس کی پہاڑیوں میں چلا جائے اور روہتاس کے راجا سے استدعا کرے کہ وہ عارضی طور پر ان کو قلعے میں پناہ لینے کی اجازت دیدے۔

کچھ دنوں تک خط کتابت چلتی رہی اور پھر نوبت لڑائی کی آ گئی۔ محمد خاں سوری نے ایک فوج سلیمان کی مدد کے لیے روانہ کی۔ اس فوج نے شیر خاں کو شکست دے کر اسے جاگیروں سے بے دخل کر دیا۔

اس وقت تک مغل ہندوستان کے بیشتر علاقوں پر قابض ہوتے جا رہے تھے۔ ایک نئی طاقت تھی جو آسمانِ ہند پر طلوع ہو رہی تھی۔ شیر خاں اتنا زیرک تھا کہ اس ابھرتی ہوئی طاقت سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے قومیت کے لقب کو چھوڑا اور مغلوں کے پاس جانے کی سوچنے لگا۔ وہ اس مقصد کے لیے بنارس گیا اور اپنے سفیر کو جنید برلاس کے پاس آگرہ بھیجا تاکہ جنید برلاس اس بات کا اطمینان دلا دے کہ اگر فرید اس کے پاس آجائے تو اس کو کسی طرح کا ضرر نہ پہنچایا جائے گا۔

نووارد چغتائی امیروں میں سے ایک جنید برلاس بھی تھا جو بابر کے دربار میں نہایت اثر رسوخ رکھتا تھا۔

شیر خاں کا ستارہ مسلسل عروج کی طرف گامزن تھا۔ جنید برلاس اس سے اتنا خوش ہوا کہ اسے اور چند دوسرے افغانوں کو جو اس کے پاس آ گئے تھے، بابر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس خدمت کے دوران میں اسے اپنے عزائم کی تکمیل کی ایک موہوم سی امید بندھ گئی۔

وہ خاموشی سے چغتائی امیروں کے طور طریق اور نظم ونسق سے واقفیت حاصل کرتا رہا۔ ایک وہ تربیت تھی جو اس نے اوائل عمری میں رہزنوں کے درمیاں رہ کر حاصل کی تھی۔ ایک یہ تربیت تھی جو وہ مغل دربار میں رہ کر حاصل کر رہا تھا۔

ایک روز وہ چند پٹھان دوستوں کے ہمراہ اپنی قیام گاہ پر بیٹھا ہوا تھا تو بے باکی سے چند جملے اس کی زبان سے ادا ہو گئے۔

''چغتائی سلطنت کے رنگ ڈھنگ ایسے ہیں کہ ان کو ہندوستان سے نکال باہر کرنا کچھ مشکل نہیں۔''

''شیر خاں، تم ہوش میں تو ہو، چغتائیوں کی طاقت کو تم معمولی سمجھتے ہو کہ کوئی بھی آئے گا اور انہیں ہندوستان سے باہر نکال دے گا۔''

''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے بہت قریب سے حالات کو دیکھا ہے۔ مغل تزک واحتشام اور دھوم دھڑکے میں لگے رہتے ہیں۔ ان کے امیر بڑے آرام طلب اور تن پرور ہیں۔ وہ سارے معاملات کو اپنے راشی نوکروں پر چھوڑ کر عیش کرتے رہتے ہیں۔ اگر تقدیر وتدبیر ایک ہو جائیں تو ان کی سلطنت کو اکھاڑ دینا کچھ مشکل کام نہیں۔''

جس وقت وہ یہ باتیں کر رہا تھا۔ دو سائے دیوار سے لگے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ یہ سائے اندھیرے میں

اندھیرا بن کر غائب ہو گئے لیکن شیر خاں کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اس رات کی صبح ہوئی تو یہ الفاظ بابر تک پہنچ چکے تھے۔

''یہ شخص خطرناک ہے اس پر نظر رکھی جائے۔'' بابر نے حکم جاری کیا۔

انہی دنوں ایسا اتفاق ہوا کہ شیر خاں کو بابر کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھنا پڑا۔ دسترخوان پر ایک ایسا کھانا پیش کیا گیا۔ شیر خاں اس کھانے سے ناواقف تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے کس طرح کھایا جائے۔ کچھ مورخوں نے لکھا ہے کہ یہ سویاں تھیں۔ اسے کھاتے ہوئے جب ریش ودہن آلودہ ہونے لگے تو شیر خاں نے اس سے بچنے کے لیے کمر سے بندھی چھری نکالی اور سویاں کاٹ کاٹ کر کھانے لگا۔

دسترخوان پر کچھ ایسے لوگ تھے جو شیر خاں سے شاکی تھے اور اسے شرمندہ کرنے کے لیے بہانے ڈھونڈ رہے تھے۔ ان لوگوں نے بابر کو اس کی اس حرکت پر متوجہ کیا۔

''وہ یہ حرکت محض بے ادبی کے طور پر کر رہا ہے کیونکہ یہ شخص نہایت سرکش اور اوباش ہے۔''

بابر نے اپنے ایک وزیر کی توجہ اس طرف دلائی۔ ''میں نے ایک سے ایک عالی مرتبہ بہادر افغان دیکھا ہے لیکن آج تک کسی اور افغان نے مجھے متاثر نہیں کیا۔ یہ اپنے عزائم کا پہلے بھی اظہار کر چکا ہے اور اب اس سے یہ بے ادبی سرزد ہوئی ہے۔ میں تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ شیر خاں پر نگاہ رکھو۔''

وزیر نے شیر خاں کی جانب سے بابر کو یقین دلایا۔

''شیر خان نہایت نیک طبع اور نیک سرشت ہے۔ اس کے ساتھیوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں کہ اس کی جانب سے کسی قسم کا کوئی خدشہ پیدا ہو۔''

''میں پھر بھی کہتا ہوں کہ اس کی نقل وحرکت پر نظر رکھو اور ہو سکے تو اسے لشکر سے باہر کہیں رکھو۔''

شیر خاں تک یہ باتیں پہنچ گئیں۔ وہ جانتا تھا کہ بادشاہوں کے دلوں میں جب کوئی بات سما جائے تو پھر بڑی مشکل سے نکلتی ہے۔ وہ کوئی برا وقت آنے سے پہلے ہی لشکر سے فرار ہو گیا اور اپنی جاگیر میں جا کر بیٹھ گیا۔ (یہ جاگیر اس نے جنید برلاس کی مدد سے دوبارہ حاصل کر لی تھی)

اسے معلوم تھا کہ ابھی مغلوں کے ہاتھ اتنے لمبے نہیں ہوئے کہ اس کی جاگیر تک پہنچ سکیں۔ اس کے برخلاف مقامی پٹھان سرداروں سے دوستی رکھی جائے تو کم از کم یہ جاگیر تو بچی رہے گی۔

جاگیر پر پہنچنے کے بعد اسے اپنے محسن جنید برلاس کا خیال آیا جس نے اسے بابر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اسے جنید برلاس کی اجازت کے بغیر ہی فرار ہونا پڑا تھا۔ اس عذر خواہی کے لیے اپنے ایک آدمی کے ذریعے جنید برلاس کی خدمت میں تحائف بھیجے اور خط کے ذریعے یہ خیال ظاہر کیا۔

''اب نہ تو مجھے ہی مغلوں پر کوئی اعتماد رہ گیا ہے اور نہ ہی مغل میرا اعتبار کرتے ہیں لہٰذا وقت اور حالات کا تقاضا یہی ہے کہ میں سلطان محمد لوہانی (اس کا سابقہ آقا) کی خدمت میں چلا جاؤں۔''

سلطان محمد شاہ لوہانی عرف بہار خاں نے بہار میں جس ریاست کی بنیاد ڈالی تھی اس پر وہ صرف دو سال ہی حکمران رہ سکا اور اس کا انتقال ہو گیا۔

شیر خاں، بابر کے دسترخوان سے بھاگ کر سلطان محمد کے دسترخوان پر آ گیا تھا مگر ایک سال بعد ہی سلطان کا انتقال ہو گیا۔ لوہانی سرداروں نے اس کے نابالغ لڑکے جلال خاں کو سلطان جلال الدین کے نام سے تخت پر بٹھا دیا اور اس کی ماں کو اس کا نائب ومختار بنا دیا۔ حالات نے ایسی کروٹ بدل لی تھی کہ بہار کی حکومت کے لیے جلال خاں کو ایک کروڑ سالانہ خراج بابر کو ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کرنی پڑی۔

لوہانی سلطان جلال الدین اب مغل حکومت کا ایک باج گزار اور مالی بار سے لدا ہوا تھا۔ وہ ابھی نابالغ تھا۔ اس کی والدہ میں جو ریاست کا انتظام چلا رہی تھی اتنی صلاحیت نہیں رکھتی تھی کہ بکھرے ہوئے شیرازے کی تنظیم کر سکے۔ وہ سخت تذبذب میں تھی کہ بہار کے جو حصے اس کے قبضے میں ہیں کہیں وہ بدانتظامی کی نذر ہو کر ہاتھ سے نہ نکل جائیں۔ وہ ابھرتی ہوئی شورشوں کو بھی دیکھ رہی تھی اور ایک کروڑ سالانہ کا خراج ادا کرنے سے بھی قاصر تھی۔ اس ہنگامی حالت میں اسے شیر خاں کا خیال آیا۔ اس شخص نے اس کے خاوند بہار خاں عرف سلطان محمد کی ملازمت میں رہتے ہوئے نہایت عمدہ انتظامی لیاقت کا ثبوت دیا تھا۔ اس شخص کی شہرت اس نے سن رکھی تھی اسے دیکھا کبھی نہیں تھا لیکن اب اسے دیکھنا بھی تھا اور اس سے کام بھی لینا تھا۔ اس نے اسے بلوا بھیجا۔

اس کے سامنے ایک تنومند شخص کھڑا تھا جس کے رگ پٹھے نہایت مضبوط تھے۔ بڑھتی ہوئی عمر نے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ چہرے کو گھنی ڈاڑھی نے چھپایا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے روشنی نکل رہی ہو۔ یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ وہ بہادر ہے۔ بلکہ دو دو نے اسے ان حالات سے آگاہ کیا جن سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مشرقی صوبہ گزر رہا تھا۔ وہ احسانات یاد دلائے جو اس کے شوہر نے اس پر کیے تھے۔ شیر خاں سر جھکائے سن رہا تھا جیسے اسے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا لشکر تھا جسے وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ وہ سب باہر کھڑے اس کے منتظر تھے۔

شیر خاں اس سوچ میں گم تھا کہ جس مغل حکومت سے وہ بھاگ کر آیا تھا پھر اسی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ اس علاقے کے انتظامی معاملات سنبھالنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ مغل حکومت کا حمایتی بن جائے گا۔ وہ پٹھان جو مغلوں کے خلاف ہیں اس کے بھی خلاف ہو جائیں گے۔ کس کا ساتھ دیا جائے؟ یہ اتنا بڑا فیصلہ تھا کہ شیر خاں ہی کر سکتا تھا اور اس نے فیصلہ کر لیا۔ اس نے ملکہ دودو کی پیشکش کو قبول کر لیا۔

دو تین ماہ بعد ملکہ نے اسے اپنا نائب بھی مقرر کر دیا۔ اب شیر خاں کی حیثیت ایک معمولی جاگیردار کی نہیں تھی جس کے قبضے میں محض دو پرگنہ ہوں بلکہ وہ مغل حکومت کا ایک معتبر حمایتی تھا۔ اس کے ماتحت براہ راست یا بالواسطہ شاہ آباد کا سالم ضلع تھا۔ سلطان جنید برلاس جس کو بابر نے چنار کا علاقہ سونپ دیا تھا اس کا حاکم اعلیٰ تھا۔

شیر خاں اپنے انتظامات میں سخت گیر واقع ہوا تھا۔ وہ فوجی علاقہ داروں سے مال گزاری کی وصول یابی میں کسی قسم کی رعایت کا قائل نہیں تھا۔ اسے ایک کروڑ دام مغل خزانے کو وقت مقررہ پر بھیجنا پڑتا تھا اور وہ یہ کام خوش اسلوبی سے انجام دے رہا تھا۔

بہار کے لوہانیوں (پٹھان قبیلہ) کے سر پر ہر وقت موت کی دہشت چھائی رہتی تھی۔ انہیں ہمیشہ یہ خدشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں سلطان محمود لودھی جو تخت بہار کا دعوے دار تھا اور اس کے حمایتی ان کو دوبارہ بہار سے نہ بھگا دیں۔ وہ سب مل کر شیر خاں کے خلاف سازشوں کے جال بننے لگے۔ اسی اثنا میں ملکہ دودو کا انتقال ہو گیا۔

شیر خاں کو جیسے ہی یہ خبر ملی اس نے اپنے لشکر کو تیار رہنے کا حکم دے دیا۔ اس کے فوجی حیران تھے کہ یہ ریاست مغلوں کی باج گزار ہے۔ خراج برابر ادا کیا جا رہا ہے۔ پھر شیر خاں کو کس غنیم سے خطرہ ہے۔ شیر خاں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ کم سن جلال خاں کو بھی نہیں۔ پھر ایک دن اس نے ایک لوہانی افغان کو جلال خاں کی خواب گاہ کی طرف جاتے دیکھا۔ یہ اس طرح ممکن ہو سکا کہ اس نے پہرے داروں پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ جلال خاں کی حفاظت خود کر رہا تھا۔ اس نے جیسے ہی دیکھا کہ پہرے داروں کی ملی بھگت سے کوئی اندر آیا ہے وہ اس کے پیچھے ہو لیا۔ اس پختہ مکان میں جسے محل کہا جائے بہت سے کمرے تھے۔ کوئی نووارد یہ شناخت نہ کر سکتا تھا کہ جلال خاں کا کمرا کون سا ہے۔ یہ نووارد بھی ادھر بھٹکتا پھر رہا تھا کہ ایک اور شخص کہیں سے نمودار ہوا۔ پہلے آنے والے کے کان میں سرگوشی کر کے اسی طرف غائب ہو گیا جس طرف سے آیا تھا۔ اندھیرے کے باوجود شیر خاں کو اسے پہچاننے میں دقت نہیں ہوئی۔ نووارد اسی طرف جا رہا تھا جس طرف جلال خاں کی خواب گاہ تھی۔ جب وہ اس مصنوعی جھیل کے قریب پہنچا جو جلال خاں کے کمرے کو دوسرے کمروں سے جدا کرتی تھی تو شیر خاں اس کے سامنے آ گیا۔ وہ شخص ایک خنجر ہاتھ میں لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ شیر خاں نے اس کی کلائی اس مضبوطی سے پکڑی کہ وہ ششدر رہ گیا۔ اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ ”شیر خاں تم!“ اور خنجر اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ شیر خاں نے کہا۔ ”ہاں میں“ اور اتنی زور سے کہا کہ ادھر ادھر سے کئی پٹھان دوڑتے ہوئے آ گئے۔ شیر خاں اس وقت کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔

”مستان خاں پہرے پر ہے؟“

”شیر خاں میں یہیں ہوں۔“ ایک افغان پہرے داروں کے ہجوم سے نکل کر سامنے آ گیا۔

”اس شخص کو میں تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ صبح اسے میرے سامنے پیش کرنا۔“

”جو حکم۔“

جلال الدین کو خبر تک نہیں ہوئی کہ باہر کیا ہنگامہ ہو گیا۔

صبح ہوئی تو وہ لوہانی افغان شیر خاں کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ افغان تھا، بہادر تھا لیکن اس وقت وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

”تم نے کس کے کہنے پر قتل کا ارادہ کیا تھا؟“

”میرا کوئی ساتھی نہیں۔ میں نے غیرت قومی میں یہ قدم اٹھایا تھا۔ میں نہیں دیکھ سکتا کہ مغل ہم پر حکمرانی کریں۔“

”تو جھوٹ بولتا ہے۔ تیرے اور ساتھی بھی یہاں ہیں۔“

”افغان جھوٹ نہیں بولتے۔“

”موت کو قریب دیکھ کر بہت سے جھوٹ بولنے لگتے ہیں۔“

”میں ان میں سے نہیں ہوں۔“

”ابھی پتا چل جاتا ہے۔“ شیر خان نے کہا اور قریب کھڑے ہوئے لوگوں کو حکم دیا۔ ”عزرائیل خاں لوہانی کو

زنجیروں میں جکڑ کر میرے سامنے پیش کرو۔“

لوگ حیران تھے کہ یہ کیسا حکم ہے لیکن حکم پر عمل درآمد کرنا پڑا۔ کچھ ہی دیر بعد یہ مطلوبہ شخص بھی پابہ زنجیر اس کے سامنے پیش ہو گیا۔ اس سے جب پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے چند اور لوگوں کے نام بتا دیے۔ یہ شخص وہی تھا جسے شیر خاں نے رات کے وقت اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پہچان لیا تھا۔

یہ سب لوگ پیش ہوئے۔ شیر خاں نے ان سب کی گردنیں اڑا دینے کا حکم دیدیا۔

یہ ایسی وحشت ناک سزا تھی کہ سازشی عناصر کچھ دنوں کے لیے جہاں تھے وہیں دبک گئے۔ شیر خاں جانتا تھا کہ سازش دب گئی ہے، ختم نہیں ہوئی۔ وہ چوکنا تھا کہ پھر کوئی ایسی سازش سامنے نہ آ جائے۔

وہ ابھی اس اندرونی خلفشار میں الجھا ہوا تھا کہ والی بنگالہ اور حاکم بہار یعنی جلال خاں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے اور نوبت لڑائی پر جا کر ٹھہری۔

اس معرکے میں شیر خاں کے جوہر کھلے۔ یہ اسی کی حکمت عملی تھی کہ والی بنگالہ کو شکست ہوئی۔ مال غنیمت میں بہت سارا خزانہ شاہی لوازمات و نوادرات جو شمار سے باہر تھے شیر خاں کے ہاتھ آ گئے۔

اس فتح پر شیر خاں کی بہادری کا سکہ لوگوں کے دلوں پر جم گیا اور امور مملکت میں اس کے اقتدار اور قوت کو سب نے تسلیم کیا لیکن لوہانیوں کی ایک جماعت جو شیر خاں کے خلاف تھی اس کے قتل کی سازش میں مصروف ہو گئی۔ ان سازش کرنے والوں میں کچھ لوگ وہ بھی تھے جو جلال خاں کی بارگاہ میں موروثی تقرب رکھتے تھے۔ یہی لوگ جلال خاں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شیر خاں کی طرف سے اس کے کان بھرنے لگے۔

”آپ اپنی کم عمری کے سبب اقتدار کی بھول بھلیوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں جبکہ شیر خاں روز بروز طاقت پکڑتا جا رہا ہے۔ آپ کو راستے سے ہٹا کر اقتدار کا مالک بننے کا خواہاں ہے۔“

”شیر خاں کی طرف سے ہمیں تو ایسے شواہد نہیں ملے۔“

”وہ یہ کام بہت ہوشیاری سے کر رہا ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اس نے آپ کے قتل کی سازش کو بہانہ بنا کر کتنے لوہانیوں کے سروں کو تن سے جدا کر دیا۔ اس کے اردگرد سوریوں کا اجتماع ہو گیا ہے۔ وہ مغلوں سے بھی ساز باز کر رہا ہے۔ ابھی تو آپ خراج ادا کرتے ہیں۔ کسی دن بابر کی فوجیں آ کر آپ کو بے دخل بھی کر دیں گی۔ یہ شخص غیر قبیلے کا ہے اور مغلوں کے ساتھ مل چکا ہے۔ اسے راستے سے ہٹانا بہت ضروری ہے۔“

اسے اس انداز سے ورغلایا گیا کہ وہ بھی شیر خاں کے خلاف ہو گیا۔ اس نے اس جماعت کو اجازت دے دی کہ وہ شیر خاں کے خلاف جو چاہیں سلوک کریں۔

اس جماعت نے بے خبری میں شیر خاں پر حملہ کیا اور اسے گرفتار کر کے ایک قلعے میں جسے اس نے خود تیار کرایا تھا محصور کر دیا۔ شیر کو پنجرے میں بند کرنے والے مطمئن تھے کہ پنجرہ بہت مضبوط ہے۔ ہوا بھی ایسا ہی تھا کہ شیر خاں کا کوئی سپاہی اس کے اردگرد موجود نہیں تھا۔

جب پورا ایک مہینا اس قید تنہائی میں گزر گیا تو خود شیر خاں مایوس ہو گیا کہ اب اسے کبھی رہائی مل سکے گی۔ وہ پٹھانوں کی اس فطرت سے بھی واقف تھا کہ وہ زیادہ دن انتظار نہیں کر سکیں گے۔ کسی اور آقا کی تلاش شروع کر دیں گے یا جلال خاں کو ہی آقا تسلیم کر کے اس کے ساتھ رہنے لگیں گے۔ اسے مغلوں سے کچھ امید ہو سکتی تھی لیکن اس کی اسیری کی خبر باہر تک کیسے پہنچے۔

شیر خاں صرف شیر نہیں تھا۔ چیتے جیسی چالاکی بھی اس میں تھی۔ وہ برابر اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح اس قلعے میں اس کی موجودگی کی اطلاع باہر پہنچ جائے۔ بکنے والے ہر جگہ ہوتے ہیں، تگ و دو کے بعد اسے بھی ایک شخص مل گیا۔ یہ آدمی دوسرے تیسرے دن اس جگہ کی صفائی کے لیے آیا کرتا تھا جہاں شیر خاں کو قید کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہمیشہ کچھ سپاہی آتے تھے لیکن ایک روز وہ اکیلا آیا۔ اس کے ساتھ کوئی سپاہی نہیں تھا۔ شیر خاں کو موقع مل گیا۔ شیر خاں نے اس آدمی کی گردن دبوچ لی۔

”شور مچایا تو گردن توڑ کر یہیں پھینک دوں گا۔“

وہ شیر خاں کے مضبوط ہاتھوں کی تاب نہ لا سکا اور ہاتھ جوڑنے لگا۔ ”آخر مجھ غریب کو کیوں مارتے ہو۔ کیا چاہتے ہو مجھ سے؟“

”تو اپنے کپڑے اتار کر مجھے دے اور میرے کپڑے تو پہن لے۔“

”وہ بھلا کیوں؟“

”زیادہ بک بک کی ضرورت نہیں۔ جو کہتا ہوں وہ کر۔“

اس غریب نے وہی کیا جو اس سے کہا گیا تھا۔ شیر خاں نے اس کے کپڑے پہن لیے۔ اتفاق سے وہ قد و جسامت میں ویسا ہی تھا جیسا شیر خاں تھا۔ بدبو وغیرہ سے بچنے کے لیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک کپڑا بھی منہ پر لپیٹ لیتا تھا۔ شیر خاں نے بھی اپنا منہ کپڑے سے اچھی طرح لپیٹ لیا۔ اس کا ٹوکرا اور جھاڑو بھی اٹھالی اور باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر تو نے شور مچایا تو پلٹ کر آؤں گا اور تجھے مار ڈالوں گا۔

شیر خاں کی اس قلعے سے رہائی کی دیر تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے علاقے تک پہنچ گیا۔ اس نے لشکر جمع کیا اور لوہانیوں پر حملہ آور ہوگیا۔ جلال خاں کے پاس چھوٹی سی جماعت تھی جسے اس نے شکست دے کر مار بھگایا۔ جلال خاں کو بڑی بے سروسامانی اور پریشانی کی حالت میں بھاگنا پڑا۔

اس کامیابی کے بعد شیر خاں کے لیے سارا میدان صاف تھا۔ اس کو دوبارہ سارا خزانہ، جواہرات، ہاتھی اور بے شمار گھوڑے مل گئے اور وہ پوری سلطنت بہار اور اس کے توابعات کا بلاشرکت غیرے خودمختار حاکم بن گیا۔

تمام لوہانی سردار اس کے غضب سے بچنے کے لیے مہوبہ ضلع ہمیر پور میں چھپ گئے۔

☆☆☆

ولی عہد شہزادہ ہمایوں اپنی جاگیروں پر تھا کہ اسے سخت اور پراسرار بیماری نے گھیر لیا۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ حال یہ ہوا کہ مرنے کے قریب ہوگیا۔ اطبا نے علاج سے ہاتھ کھینچ لیا۔ بابر ان دنوں پنجاب گیا ہوا تھا۔ اسے جونہی خبر ہوئی وہ آگرہ پہنچ گیا۔ اس نے ہمایوں کو بھی آگرہ بلوالیا۔ ہمایوں اس طرح آگرہ پہنچا جیسے کوئی مردہ ہو۔ بابر نے اس کی حالت دیکھی تو جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ اسے تھوڑی دیر کے لیے یہ خیال بھی نہیں رہا کہ وہ بادشاہ ہے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ امرا اسے تسلیاں دے رہے تھے۔

ایک دن میر ابوالبقا نے جو اس زمانے کے ایک فاضل آدمی تھے، کہا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہزادے کی زندگی کسی صدقے کی طالب ہے جس کے بغیر موت ٹل نہیں سکتی۔ اگر بادشاہ سلامت ایسی کوئی چیز کہ اس سے زیادہ عزیز کوئی اور چیز نہ ہو بیٹے پر سے قربان کردیں تو امید ہے اللہ تعالیٰ شفا عطا فرما دے۔''

یہ تجویز پیش کی گئی کہ وہ قیمتی الماس جو سلطان علاؤ الدین کے جواہر خانے میں تھا اور جو آگرہ کی فتح کے دن شہزادہ ہمایوں کے ہاتھ آیا تھا، صدقے میں دے دیا جائے۔ اسے فروخت کرکے اس کی قیمت مستحقین میں تقسیم کردیں۔

بابر نے کہا۔ ''وہ پتھر کا ٹکڑا میری اور میرے بیٹے کی جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ ہمایوں کے بعد اگر مجھے کچھ عزیز ہے تو وہ میری اپنی جان ہے۔''

بابر خلوت میں گیا اور اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگی اور تین مرتبہ ہمایوں کے اطراف چکر لگا کر کہا، برداشتم برداشتم برداشتم (میں نے اس کی بیماری اپنے سر لے لی) بس اسی دن سے ہمایوں کی صحت کے آثار پیدا ہوگئے اور بابر عارضۂ جسمانی میں مبتلا ہوگیا۔

پہلے ہمایوں اور پھر بابر کی علالت کی خبریں عام ہوئیں تو باغی افغان سرداروں کو کھوئے ہوئے مشرقی صوبوں کو واپس لینے کا سنہری موقع ہاتھ آیا۔

جب یہ خبریں بیمار بادشاہ تک پہنچیں تو اس نے ہمایوں کو جو اَب صحت یاب ہوچکا تھا پٹھانوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا اور خود بستر سے لگا رہا۔

بابر کی حالت بگڑتی جارہی تھی۔ اس کی بیماری کے دوران میں شرقی علاقے میں حکومت کی عظمت کم ہونے لگی۔ اس کے احکامات کی وقعت یہ رہ گئی کہ جب قلعۂ چنار کے محافظ تاج خاں سارنگ خانی کے پاس اس کے تبادلے کا فرمان پہنچا تو اس کی تعمیل کرنے کے بجائے اس نے محض ''اطلاع پائی'' لکھنا کافی سمجھا۔

یہ قلعہ (چنار) بابر کے قبضے میں چلا گیا تھا کیونکہ تاج خاں نے مغلوں کی اطاعت قبول کرلی تھی لیکن وہ قلعے سے دست بردار نہیں ہوا تھا۔

اب بابر کے پاس نہ تو اتنا وقت تھا اور نہ اتنے وسیع ذرائع کہ وہ چنار جیسے قلعے پر بزور شمشیر قبضہ کرسکے۔ وہ بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

☆☆☆

چنار کے قلعے میں رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ تاج خاں کی کئی بیویاں تھیں۔ اس وقت بھی وہ کسی ایک بیوی کے ساتھ شب گزار کررہا تھا کہ اس کی بڑی اور پہلی بیوی کے کمرے سے شور کی آواز بلند ہوئی جیسے کوئی کسی بات پر تکرار کررہا ہو۔ اس میں اس کی بیوی لاڈو ملکہ کی آواز بھی شامل تھی۔ تاج خاں اپنے بیٹوں کی طرف سے فکرمند رہتا تھا جو اپنی سوتیلی ماں لاڈو ملکہ سے ہمیشہ الجھتے رہتے تھے۔ لاڈو ملکہ کے اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ دوسری بیویوں سے جو لڑکے تھے، انہیں یہ شکایت تھی کہ تاج خاں لاڈو ملکہ کو بہت چاہتا ہے اور وہ انہیں پیسے پیسے کو محتاج رکھتی ہے۔ اس وقت بھی ایسی ہی کسی بات پر تکرار ہورہی تھی۔

تاج خاں شب خوابی کے لباس میں، سرہانے رکھی تلوار اٹھا کر اس کمرے کی طرف دوڑا۔ اس کے بڑے بیٹے کے ہاتھ میں تلوار تھی اور وہ لاڈو ملکہ کو زخمی کرچکا تھا۔ بیٹے نے

باپ کے ہاتھ میں تلوار دیکھی تو سمجھ گیا کہ اب یہ تلوار اس پر اٹھے گی۔ اس سے پہلے کہ تاج خاں حملہ کرتا بیٹے نے تلوار چلائی اور تاج خاں کو قتل کردیا۔ محل میں کہرام مچ گیا۔ لاڈو ملکہ جو زخمی ہوچکی تھی شدت تکلیف سے نہیں بلکہ شوہر کی موت کے صدمے سے بے ہوش ہوگئی تھی۔ تاج خاں کے تینوں بھائیوں میں سے میر داد اس وقت وہاں موجود تھا۔ اس نے حالات کو اس طرح سنبھالا کہ فوج کے اعلیٰ افسروں کو فوری طلب کرلیا تھا۔ فوج کی کثیر تعداد لاڈو ملکہ کی حمایت میں تھی لہٰذا فوج نے کسی بغاوت کے پیدا ہونے سے پہلے محل کا انتظام سنبھال لیا۔ تاج خاں کا قاتل بیٹا گرفتار کرلیا گیا۔

تاج خاں نے اپنے تین بھائیوں میر احمد، میر داد، میر اسحٰق کو اپنا نائب بنایا تھا لیکن ان میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ قلعۂ چنار کی حفاظت کرسکیں۔

شیر خاں اس وقت قلعۂ چنار کے قریب ہی تھا۔ اس کی آنکھیں کب سے قلعۂ چنار پر لگی ہوئی تھیں۔ تاج خاں کی وفات نے اسے یہ موقع دے دیا۔ اس نے خفیہ طور پر تینوں بھائیوں سے رابطے شروع کردیے۔

''قلعۂ چنار پر بابر کی نگاہیں برابر لگی ہوئی ہیں۔ بابر تاج خاں سے زیادہ خوش بھی نہیں تھا کہ یہ قلعہ اس کی بیوہ کے پاس رہنے دے گا۔ اگر اس قلعے پر میرا تصرف ہو تو میں اس کی حفاظت پر کمربستہ ہوجاؤں گا۔ تم لوگ جس طرح رہتے ہو رہتے رہو۔''

تاج خاں کے تینوں بھائی اس بات پر متفق تھے کہ چونکہ لاڈو ملکہ ایک عورت ہے، وہ چنار کے قلعے کی زیادہ عرصے تک حفاظت نہیں کرسکتی۔ اگر قلعے کو شیر خاں کے سپرد کر دیا جائے تو مغلوں کی بری نظر سے محفوظ رہے گا۔

تینوں بھائی شیر خاں کے حق میں ضرور تھے لیکن شیر خاں بہت جلدی میں تھا۔ وہ سوچنے کے لیے وقت دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مطلب برآری کے لیے تینوں بھائیوں کو بھاری رقم ادا کی اور وہ تینوں اس بات پر راضی ہوگئے کہ وہ تاج خاں کی بیوی کو مجبور کریں گے کہ وہ شیر خاں کو قلعے کا محافظ بنا دے۔

یہ تمام کارروائیاں نہایت خفیہ طریقے سے انجام پارہی تھیں۔ تاج خاں کے بیٹوں کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے پائی تھی کہ اندر اندر کیا انتظامات ہورہے ہیں۔ وہ تو یہی سوچ رہے تھے کہ انتظامات بوڑھی ملکہ کے ہاتھ میں ہیں۔ کسی وقت بھی چھین لیے جائیں گے۔ فوج کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی ان لڑکوں کے ساتھ تھا اور انتظار کررہے تھے کہ ملکہ کے حامی کمزور پڑیں تو وہ اقتدار پر قبضہ کرلیں۔

ملکہ نے چند شرائط طے کرنے کے بعد شیر خاں کو قلعے پر قبضہ کرنے کی دعوت دے دی۔ شیر خاں بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھا اور اس سے پہلے کہ تاج خاں کے بیٹوں یا ان کے حامیوں کو خبر ہو، اس نے قلعے پر قبضہ کرلیا۔ اب اسے اس ارادے پر عمل کرنا تھا جس کا اظہار اس نے اب تک کسی کے سامنے نہیں کیا تھا۔ اس نے تاج خاں کے بھائی میر احمد کو اپنے حضور میں طلب کیا اور اس کے کانوں میں وہ باتیں ڈالیں جو وہ اس وقت سے سوچ رہا تھا جب سے تاج خاں سارنگ خانی کے انتقال کی خبر سنی تھی اور اسی لیے وہ قلعۂ چنار کے قریب آکر قیام پذیر ہوگیا تھا اور اپنی کوششوں سے قلعے کا محافظ بھی بن گیا تھا۔ اب اس کی نگاہیں قلعے کی مالکن لاڈو ملکہ پر لگی ہوئی تھیں۔ اس لیے نہیں کہ ملکہ جوان تھی۔ اسے خوبصورت تو کہا جاسکتا تھا لیکن وہ جوان ہرگز نہیں تھی۔ شیر خاں کی عمر اس وقت 44 سال تھی۔ دوسری طرف لاڈو ملکہ شیر خاں کی والدہ سے عمر میں کچھ ہی کم ہوگی۔ شیر خاں کو اس کے حسن و جمال یا ڈھلتی عمر سے غرض نہیں تھی۔ اسے تو یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اس کے پاس بے پناہ دولت ہے۔ شادی کے بعد یہ سب دولت اس کی ہوجائے گی۔

اس نے میر احمد کو اعتماد میں لیا۔ ''آپ کس خیال کے آدمی ہیں؟ آپ کے خیال میں کیا بیوہ عورت کو شادی کرلینی چاہیے؟''

''اسلام میں کوئی ایسی ممانعت نہیں کہ بیوہ عورت شادی نہ کرے۔''

''آپ کی بھاوج بھی بیوہ ہوچکی ہیں۔''

''اب وہ شادی کی عمر سے گزر چکی ہیں۔''

''اگر پھر بھی کوئی شادی کرنا چاہے؟''

''یہ پھر ان کی مرضی ہے کہ وہ کیا چاہتی ہیں۔''

''میں ان سے شادی کا خواہش مند ہوں۔''

''وہ آپ سے تو بہت بڑی ہیں۔''

''میں اس کے باوجود شادی کررہا ہوں۔''

''میں آپ کا پیغام ان تک پہنچا دوں گا۔''

''صرف پیغام نہیں پہنچانا ہے بلکہ میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ آپ انہیں سمجھائیں۔''

میر احمد نے یہ پیغام لاڈو ملکہ تک پہنچایا اور اس شادی کے فوائد بتا کر اسے قائل کرنے کی کوشش کی اور وہ اس کوشش میں کامیاب رہا۔

اس شادی کا فائدہ شیر شاہ کے حسب منشا نکلا۔ اس کے پہلے شوہر کا سارا مال و متاع سلطنت کا ساز و سامان اور قلعہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چنار کی چابیاں غرض سب کچھ شیر خاں کے ہاتھ آ گیا۔

لاڈو ملکہ نے اپنے شوہر کو بطور پیشکش 15 عدد نایاب جواہر، سات من موتی اور ڈیڑھ سو من سونا دیا۔ اس طرح اس نے آئندہ جنگوں کے لیے سرمایۂ کثیر حاصل کرلیا۔ تنہا چنار کا قلعہ ہی ایسا نادر و نایاب تحفہ تھا جس کے سامنے تمام ہیرے جواہرات ہیچ تھے جو اس کو ملکہ سے ملے تھے۔

شیر خاں نے چنار پر گنہ کو فوراً اپنے تصرف میں کرلیا اور اس علاقے میں اپنی طاقت بڑھالی۔

ابھی وہ لاڈو ملکہ کی دولت سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ غازی پور کے ناصر خاں لوہانی کا انتقال ہوگیا۔ یہ سلطان ابراہیم لودھی کے زمانے میں باغی تھا لیکن اس کی وفات کے بعد قوم پرست بن گیا۔ وہ مرتے مرتے مر گیا لیکن بابر اسے زیر کرنے میں ناکام رہا۔ گوہر گوسائیں اس کی آخری بیوی اور لاولد تھی۔ ناصر خاں کی وفات کے بعد اس کے بیٹے فرید خاں نے جو اس کی ایک دوسری بیوی کے بطن سے تھا، بابر کی اطاعت قبول کرلی۔ بابر نے اس کے عوض میں اس کے والد کی جاگیر کا ایک حصہ اس کو دے دیا۔ صرف جاگیر ہی کا بٹوارہ نہیں ہوا بلکہ خیالات کا بھی بٹوارہ ہوگیا۔ اس کا سوتیلا بیٹا فرید خاں مغلوں کا اطاعت گزار ہو چکا تھا۔ وہ کسی وقت بھی جاگیر کا بقیہ حصہ مغلوں کے حوالے کرسکتا تھا۔ گوہر گوسائیں کے رتبے میں بھی فرق آ گیا تھا۔ اسے اپنے مرتبے اور جاگیر دونوں کی حفاظت کرنی تھی لیکن اب اس کے پاس اتنی طاقت نہیں رہی تھی۔ اسے ایک محافظ اور سرپرست کی تلاش تھی۔ مشرقی علاقوں میں اگر کسی کے پاس طاقت تھی اور وہ مغلوں کے خلاف بھی تھا تو وہ شیر خاں تھا۔ شیر خاں، گوہر گوسائیں کا شناسا بھی تھا کیونکہ وہ اس کے مرحوم شوہر ناصر خاں کی خدمت میں رہ چکا تھا۔ گوہر گوسائیں نے اپنے چند آدمیوں کو اعتماد ہی لیا اور انہیں قلعۂ چنار کی طرف رخصت کردیا۔ ان لوگوں کے پاس ایک ایسا پیغام تھا جو کسی غیبی امداد سے کم نہیں تھا۔ گوہر گوسائیں نے اس کے سامنے نکاح کی تجویز پیش کی تھی۔

شیر خاں کو معلوم تھا کہ ناصر خاں لوہانی نے مرتے وقت کثیر دولت چھوڑی ہے۔ اگر وہ گوہر گوسائیں کی پیشکش قبول کرلے اور اس سے شادی کرلے تو تمام دولت اس کے ہاتھ آجائے گی۔

ہندوستان میں یہ عام رواج ہو چلا تھا کہ متمول عورتیں اپنی ضعیفی کے دنوں میں ایسے کم سن اور بے سروسامان لڑکوں سے شادی کرلیتی تھیں جو ان کے پوتوں کی عمر کے برابر ہوتے تھے۔ یہ رواج اتنا عام ہوگیا تھا کہ آگے چل کر اکبر بادشاہ کو ایسی شادیاں روکنے کے لیے ایک قانون نافذ کرنا پڑا۔

شیر خاں نے گوہر گوسائیں کی تجویز قبول کرلی۔ گوہر اپنے ساتھ تین سو من سونا لے کر آئی۔ ان دو شادیوں نے اس کا ستارہ عروج پر پہنچا دیا۔ اس کا شمار صاحبِ دولت وفراست افغانوں میں ہونے لگا۔ اب اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ ایک بڑی فوج ملازم رکھ سکتا تھا۔ ابھی وہ یہ تیاریاں کر ہی رہا تھا کہ بابر اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔

شیر خاں نے مغلوں کی اعلانیہ مخالفت میں کوئی پیش قدمی نہیں کی تھی لیکن بابر کے انتقال نے منظرنامہ ہی بدل دیا۔ اب وہ چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پسنے لگا۔ ایک طرف سلطان محمد لودھی (سلطان سکندر کا بیٹا جو اب تک جنگلوں میں چھپا ہوا تھا) اور دوسری جانب بابر کا جانشین ہمایوں اس کے دشمن بن گئے۔

شیر خاں کو ان دونوں طاقتوں سے نمٹنا تھا لیکن اس کے پاس اتنی طاقت نہیں تھی۔ اس کی جیت اسی میں تھی کہ وہ ان دونوں کو بے وقوف بناتا رہے۔

بابر کی وفات سے قبل ہی شیر خاں کے مخالف قبیلوں نے سلطان محمد لودھی کو بلوا بھیجا جو بنگال کے جنگلوں میں چھپا ہوا تھا اور اس کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ پہلے جونپور پر قبضہ کیا جائے اور پھر دہلی پر زور آزمائی کی جائے۔

سلطان محمد بہار پہنچا تو شیر خاں میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ اس کا مقابلہ کرتا۔ کیونکہ تمام پٹھان سردار سلطان سے مل گئے تھے۔ سلطان نے بہار کے علاقے کو اپنے افغان سرداروں میں تقسیم کردیا اور شیر خاں سے یہ کہا کہ جب جونپور کا علاقہ مغلوں سے چھین لیا جائے گا تو بہار کا علاقہ جو اس نے بنگالیوں کو ہرا کر اپنے قبضے میں کرلیا ہے اسے واپس کردیا جائے گا۔

سلطان نے شیر خاں کے ہمراہ کوچ کیا اور جب جونپور کے نزدیک پہنچ گئے تو فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ یہ فوج کثیر تعداد میں تھی اور آگرہ میں بابر حالتِ نزع میں تھا۔ مغلوں کے حوصلے پست ہوگئے۔ وہ جونپور کا قلعہ خالی کرکے چل دیے۔ سلطان نے کچھ روز جونپور میں قیام کیا اور اس کی فوج نے آگے بڑھ کر لکھنو اور اس کے قرب وجوار کا علاقہ فتح کرلیا۔

بابر کے بستر کے چاروں طرف سنسنی خیز خبروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا لیکن اسے کچھ نہیں بتایا جا رہا تھا۔

پٹھانوں کے حوصلے بلند تھے کہ بابر کا انتقال ہوگیا۔ اس کی جگہ ہمایوں تخت نشیں ہوا۔ ابھی وہ چین کی سانس بھی نہیں لینے پایا تھا کہ اسے پٹھانوں کی نقل وحرکت کا علم ہوا۔ اس نے جنگ کی مناسب تیاریاں شروع کردیں۔ سلطان محمد

لودھی اور اس کے فوجی سرداروں کا خیال تھا کہ مغل فوج برسات کے موسم میں کوئی حرکت نہیں کرے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغل فوج جب تک ان کے سر پر نہیں آ گئی، ان کو ہمایوں کی نقل وحرکت کی خبر ہی نہ ہوسکی۔ سلطان محمد تیزی سے جونپور سے چلا۔ لکھنو کے نزدیک دونوں طرف کی فوج ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوگئیں۔

شیر خاں کے لیے اچھا موقع تھا کہ وہ سلطان محمد سے اپنی جان چھڑا لے۔ اس نے ہمایوں کے پاس پیغام بھیجا۔

''میں وہ مسکین ہوں جسے مغلوں نے خاک سے اٹھا کر سرفراز کیا۔ میں بدرجہ مجبوری سلطان بن سکندر کے ساتھ ہوں لیکن لڑائی کے میدان میں ہتھیار نہیں اٹھاؤں گا اور میں ہی افغان فوج کی شکست کا باعث بنوں گا۔''

ہمایوں کی طرف سے خاطر خواہ جواب آیا۔

''تم سلطان کے خیمے میں رہنے کی وجہ سے پریشان نہ ہو۔ اگر تم نے میرے کام میں مدد کی تو تمہارا رتبہ بلند کردیا جائے گا۔''

لڑائی مقدر بن چکی تھی۔ سلطان محمد لودھی کو اپنی فتح کا یقین تھا۔ شیر خاں جیسا جنگجو (بظاہر) اس کے ساتھ تھا۔ صف آرائی کے بعد باقاعدہ جنگ شروع ہوئی۔ شیر خاں پہلے ہی طے کرچکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ جیسے ہی جنگ شروع ہوئی اس نے اپنی فوج کو ساتھ لیا اور اپنے راستے چل دیا۔ سلطان کو بری طرح شکست ہوئی۔ اس کے نہایت اہم سردار مارے گئے۔ یہ وہ سردار تھے جن کے دم سے بغاوت پنپ رہی تھی۔ سلطان واپس بہار کی طرف لوٹ گیا۔

اب اس کے پاس نہ خزانہ تھا نہ جاگیر کہ جس سے فوج کو مسلح کرتا۔ اس نے پٹنہ میں سکونت اختیار کرلی اور تخت وتاج سے دست بردار ہوکر گوشہ گیر ہوگیا۔

سلطان محمد کی فوج کو درہم برہم کرنے کے بعد ہمایوں نے گنگا اور گھاگرا کے درمیانی علاقوں سے افغانوں کو بھگانا شروع کردیا اور نظام سلطنت کو ازسرنو مرتب کیا۔

شیر خاں اپنی جاگیروں میں بیٹھا منتظر تھا کہ ہمایوں کا کوئی سفیر آئے گا اور اسے انعام واکرام کی نوید سنائے گا۔ یہ سفیر آیا ضرور لیکن اس کے پاس کوئی اور ہی پیغام تھا۔

''چنار کے قلعے کو بامصالحت ورضامندی ہمایوں کو سونپ دیا جائے۔''

اس نے مغلوں سے دوستی چاہی تھی لیکن ہمایوں کے اس مطالبے نے اسے مغلوں کے خلاف کردیا۔ سلطان محمد لودھی کا خطرہ ٹل چکا تھا اس لیے وہ اب بہ آسانی مغلوں کے مطالبے کو ٹھکرا سکتا تھا۔ اس نے انکار کردیا اور تیزی سے چنار کی طرف بھاگا۔ اس نے چنار کی تمام شہری آبادی کو شہر خالی کرنے اور جھاڑ کھنڈ کے جنگلات میں بسنے کا حکم دیا۔ ان میں اس کے اپنے بیوی بچے بھی شامل تھے۔

شیر خاں کے محل میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس کی بیویاں اور بچے جھاڑ کھنڈ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ شیر خاں انہیں ہدایات دے رہا تھا۔ تسلی کے فقرے اس کی زبان پر تھے۔ شہر کی حالت بھی محل سے مختلف نہیں تھی۔ لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر جنگلوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔

یہ بھگدڑ مچی ہوئی تھی کہ چند سرداروں کی معیت میں ہمایوں کی فوج قلعے کا محاصرہ کرنے کے لیے آپہنچی۔ شیر خاں نے اپنے لڑکے جلال خاں کو ایک فوجی دستے کے ساتھ قلعے کی حفاظت کے لیے چھوڑا اور خود دریائے گنگا اور پہاڑی علاقے کے درمیان جا کر بیٹھ گیا۔

محاصرے کو کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ہمایوں بذات خود اس مہم کی کمان سنبھالنے آپہنچا۔ اس کے آتے ہی مغلوں کے حملے شروع ہوگئے لیکن اس قلعے کا محلِ وقوع ایسا تھا کہ اس کو فتح کرنے کے لیے ضروری تھا کہ دریائی بیڑے کی مدد سے گنگا پار سے آنے والی قلعے کی رسد بند کردی جائے۔ زمین کا وہ پتھریلا ٹکڑا جس سے ہوکر قلعے کے بائی دیوار تک پہنچا جاسکتا تھا مشکل سے سو گز چوڑا تھا اس لیے کثیر تعداد میں فوج لے کر حملہ کرنا بے سود تھا۔

شیر خاں زیادہ دوری پر نہیں تھا۔ اس تک اس سارے تماشے کی کارروائی پہنچ رہی تھی۔ وہ تاک میں تھا کہ کوئی موقع آئے اور وہ ہمایوں سے اپنی شرائط پر صلح کرلے۔

تین مہینے گزر چکے تھے۔ آگرہ سے ہمایوں کی غیر حاضری نے دشمنوں کے حوصلے بڑھا دیے تھے۔ ہمایوں کو یہ خبریں تواتر سے مل رہی تھیں کہ بہادر شاہ گجراتی کی نیت میں فتور آگیا ہے اور وہ آگرہ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ یہ خبر ایسی تھی کہ ہمایوں کے ہوش اڑ گئے اور وہ واپس جانے کا سوچنے لگا۔ یہی وہ موقع تھا جب شیر خاں اس پر مصالحت کے لیے دباؤ ڈال سکتا تھا۔ اس نے اپنا سفیر ہمایوں کے پاس بھیجا اور صلح کی یہ شرط رکھی کہ چنار کا قلعہ اس کے قبضے ہی میں رہنے دیا جائے۔ اس کے عوض وہ اپنے بیٹے قطب خاں کو خدمت شاہی میں بھیج دے گا۔ بادشاہ نے اصرار کیا کہ وہ بڑے لڑکے جلال خاں کو اس کے ہمراہ بھیجے لیکن شیر خاں نے انکار کردیا۔ ہمایوں اس وقت اتنا مجبور تھا کہ شیر خاں کی پیشکش کو ٹھکرا نا سکا اور قطب خاں کو ہمراہ لے کر محاصرہ اٹھا لیا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی آگرہ کی منزل آئی نہیں تھی کہ قطب خاں شاہی کیمپ سے نکل بھاگا اور ٹھوکریں کھاتا ہوا باپ کے پاس پہنچ گیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ہمایوں اس مفرور قیدی کا پیچھا ضرور کرتا لیکن اسے جلد از جلد آگرہ پہنچنا تھا۔

ہمایوں کی اس ناکامی سے افغانوں کے حوصلے ازسرنو بلند ہوگئے۔ وہ لوہانی سردار جو شیر خاں کے خلاف آمادۂ بغاوت ہوگئے تھے اب انہیں شیر خاں کی مدد و رہنمائی کی ضرورت پڑنے لگی۔

شیر شاہ واحد افغان سردار تھا جو مغلوں سے رواداری اور وفاداری کا عزم کیے ہوئے تھا۔ ہمایوں نے اسے بھی اپنا دشمن بنالیا اور منتشر افغانوں کو یہ موقع دے دیا کہ وہ اس کے پرچم تلے جمع ہوجائیں۔ دوسرا موقع بنگال کے حاکم سلطان محمود شاہ نے دے دیا جب اس نے شیر خاں اور بہار کی لوہانی ریاست کی طرف رخ کیا۔ مونگیر کے حاکم قطب خاں محمود کی کمان میں ایک فوج مونگیر میں جمع ہونے لگی۔

اب بہار کو بچانے والا شیر خاں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ شیر خاں نے اپنے خزانے کے منہ کھول دیے۔ افغانوں کی ایک فوج تیار کی اور لوہانیوں کے ایک طبقے کو اپنے ساتھ آنے کے لیے آمادہ کرلیا۔ اس نے جنگ ٹالنے کے لیے بنگال کے سلطان کو خط لکھا اور جنگ سے باز رہنے کی اپیل کی لیکن محمود شاہ نے اس درخواست کو ایک کان سے سنا دوسرے کان سے اڑا دیا۔ شیر خان کو اپنی درخواست کی وقعت کا اندازہ اس وقت ہوا جب قطب خاں نے ایک کثیر تعداد فوج کے ساتھ سرحد پار کرلی۔

شیر خاں کو دارالحکومت کو حملے سے بچانے کے لیے حملہ آور فوج کا سدراہ بننا پڑا۔

شیر خاں نے فیصلہ کیا کہ وہ کھلے میدان میں آکر قطب خاں کا مقابلہ نہیں کرے گا بلکہ اسے پریشان کرتا رہے گا۔ بنگال کی فوج جس سمت بھی پیش قدمی کرتی شیر خاں کے سپاہی گھوڑوں پر سوار کسی دوسری سمت نکل جاتے۔ جب کئی دن اسی طرح گزر گئے اور لڑائی کی نوبت نہیں آئی تو قطب خاں کو یقین ہوگیا کہ شیر خاں میں اس سے مقابلے کرنے کی طاقت نہیں لہٰذا اسے بہار کی سرحد سے باہر کردیا جائے چنانچہ وہ متواتر شیر خاں کا پیچھا کرتا رہا۔

ایک روز شیر خاں چپ چاپ اپنی فوج کی صف بندی کرکے قطب خاں پر ٹوٹ پڑا۔ خوب جم کر لڑائی ہوئی، بنگال کی فوج نہایت پامردی سے مقابلہ کررہی تھی لیکن ایک طرف سے آنے والے تیر نے قطب خاں کا کام تمام کردیا۔ اس کے مرتے ہی اس کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ بے شمار خزانہ، ہاتھی، توپ خانہ، میدان جنگ ہی میں چھوڑ دیا۔

شیر خاں کی اس غیر متوقع کامیابی سے لوہانی سردار حسد کی آگ میں جلنے لگے۔ بہار کا نابالغ حاکم جلال خاں بھی اب بالغ ہونے کے قریب تھا اور شیر خاں سے آزاد ہونا چاہتا تھا لیکن شیر خاں اب اتنا مضبوط ہوچکا تھا کہ اس سے جان چھڑانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ شیر خاں کے مخالفوں کی سازش کا حصہ بن جائے۔

شیر خاں بھی چوکنا ہوگیا تھا۔ وہ جب بھی دربار میں حاضر ہوتا یا کسی کام سے باہر نکلتا تو چار سو گھڑسوار اس کے ہمراہ ہوتے۔ اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد ان لوہانی سرداروں نے ایک اور ترکیب نکالی۔ جلال خاں ان سے ملا ہوا تھا لہٰذا وہ جان بوجھ کر علیل ہوگیا۔ شیر خاں کو اس کی مزاج پرسی کے لیے محل میں جانا تھا۔ منصوبہ یہ بنایا گیا تھا کہ جب وہ جلال خاں سے رخصت ہوکر ایک دروازے سے نکل کر دوسرے دروازے میں داخل ہوتو اسے قتل کردیا جائے۔

ان لوہانی سرداروں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو شیر خاں سے اخلاص رکھتے تھے۔ انہوں نے شیر خاں کو لوہانیوں کے ارادے سے آگاہ کردیا۔ شیر خاں مختلف حیلے بہانوں سے جلال خاں سے ملاقات کو ٹالتا رہا اور پھر جلال خاں کو اس منصوبے سے آگاہ کردیا۔

''بعض لوہانی سردار میرے خلاف ہیں اور مجھے نقصان پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں۔ اگر آپ مجھے اپنا خیرخواہ سمجھتے ہیں تو آپ لوہانیوں کو تاکید کردیں کہ میرے خلاف آپ کے خیالات پراگندہ نہ کریں اور مجھے نقصان پہنچانے کے لیے منصوبے نہ بنائیں اور نہ آپ کو ان کی شکایتوں پر غور کرنا چاہیے۔

براہ کرم مجھے اپنے محل کے اندرونی حصے میں طلب نہ کریں۔''

جلال خاں زمانہ سازی کے فن سیکھ چکا تھا۔ اس نے بظاہر شیر خاں کو تحفظ دینے کے لیے اسے حکم دیا کہ وہ اپنی جاگیر کی طرف روانہ ہوجائے تاکہ وہ مغلوں کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھ سکے۔ بنگال کے سلطان کا مقابلہ وہ خود کرے گا۔ جلال خاں نے ایک دربار کیا اور شیر خاں کو ایک گھوڑا اور خلعت دے کر رخصت کردیا۔

اس طرح وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔ بعدازاں انہیں کوئی بھی موقع ایک دوسرے سے ملنے کا نہیں ملا۔

شیر خاں کے رخصت ہوتے ہی جلال خاں اور اس

کے لوہانی مددگار بہار سے چل دیے۔ شیر خاں کے لیے میدان خالی ہوگیا۔

جلال خاں اور اس کے لوہانی ساتھیوں نے پہلے ہی سے منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اس منصوبے کے مطابق انہوں نے فوج ضرور کیا لیکن اپنا مال و متاع لے کر وہ بنگال کے علاقے میں داخل ہوگئے اور محمود شاہ کی پناہ میں چلے گئے۔ مقصد یہ تھا کہ محمود شاہ کی فوج ان کے لیے شیر خاں سے بہار کو چھڑا لے گی اور وہ اترائے ہوئے گھر واپس آجائیں گے۔

شیر خاں حالات پر نظر رکھے ہوئے تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر بنگال اور دہلی آپس میں مل گئے تو کیا گل کھلے گا؟ اس نے پورے جوش و خروش سے فوج کو مسلح و مرتب کرنا شروع کردیا۔

بنگال کے سلطان نے اس مہم کا سربراہ قطب خاں کے بیٹے ابراہیم خاں کو بنایا تھا۔ قطب خاں پہلی مہم میں مارا گیا تھا اور اب اس کا بیٹا سامنے تھا جس کے دل میں بہار کی فتح کا جذبہ بھی تھا اور باپ کے انتقام کا غصہ بھی۔ جنگ کا مرکز مونگیر کے قلعے کو بنایا گیا۔

شیر خاں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اس سے پہلے کہ بنگال فوج قلعۂ مونگیر سے باہر نکل آئے۔ وہ خود اس پر حملہ کردے۔

وہ ایک کثیر تعداد فوج جمع کرکے بہار کے علاقے کو عقب میں چھوڑتے ہوئے بنگال کی فوج کے روبرو آیا اور اپنے لشکر کے چاروں طرف ایک مٹی کا قلعہ کھڑا کرلیا جو اس کا طریقۂ کار تھا۔ وہ اس وقت بنگال کی حدود میں تھا۔

شیر خاں اور ابراہیم خاں کی فوج ایک دوسرے کے مقابل اس طرح صف آرا تھیں کہ کوئی فریق دوسرے پر دفعتاً حملہ آور نہیں ہوسکتا تھا۔ بنگال کی فوج کے دائیں بازو پر دریائے گنگا تھا اور پشت کی جانب مونگیر کا قلعہ تھا۔

چھوٹی چھوٹی جھڑپیں شروع ہوچکی تھیں لیکن جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن جب شیر خاں کو یہ اطلاع ملی کہ کمک آنے والی ہے تو اس نے تاخیر ضروری نہیں سمجھی۔ شیر خاں نے اپنے وکیل کے ذریعے ابراہیم خاں کے پاس پیغام بھیج دیا۔

''میں اب تک جنگ سے اس لیے گریز کرتا رہا کہ مجھے یہ امید تھی کہ شاید صلح ہوجائے۔ براہ عنایت کل صبح تشریف لائیے تاکہ ہم لوگ قسمت آزمائی کرلیں۔''

ابراہیم خان نے اس کا جواب مثبت دیا۔ ''میں نے بھی سنا ہے کہ کل میدان کارزار گرم ہو۔'' اب کیا تھا شیر دل خان نے اپنی فوج کو آراستہ کرنے کا حکم دے دیا۔

فجر کی نماز کے بعد وہ اپنے لشکر سے مخاطب ہوا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"غنیم کے پاس پیادہ فوج، توپ خانہ اور ہاتھی زیادہ تعداد میں ہیں اس لیے اب نیا طریقۂ جنگ اختیار کرنا ہوگا۔ یہ سامنے جو دو پہاڑیاں ہیں، میں ان کے عقب میں فوج کے ایک بڑے حصے کے ساتھ موجود رہوں گا۔

تھوڑے سے چنیدہ جرار سپاہی جن کو جنگ کا تجربہ ہے انہیں غنیم کی راہ شکست تیار کرنے کے لیے آگے بھیجوں گا۔ یہ تیروں کی بوچھار کر کے حملہ آور ہوں گے اور پھر پیچھے ہٹیں گے۔"

جنگ کا آغاز ہوا تو افغان رسالہ آگے بڑھا اور دشمن پر تیروں کی بوچھار کر دی لیکن فوراً ہی ان کی صفیں ٹوٹ گئیں اور الٹے قدموں بھاگنے لگے۔

یہی وہ فریب تھا جس کا جادو چل چکا تھا۔ غنیم یہ سمجھا کہ افغان میدان چھوڑ رہے ہیں۔ انہوں نے توپ خانہ اور پیدل فوج کو پیچھے چھوڑ کر افغانوں کا تعاقب شروع کر دیا۔ بھاگنے والے اسی طرف بھاگے جس طرف شیر خاں اپنی فوج کے ساتھ چھپا ہوا تھا۔ تعاقب کرنے والے بھی گویا شیر کے منہ میں پہنچ گئے۔ شیر خاں نے اپنے جوہر دکھانے شروع کیے۔ وہ افغان طریقۂ جنگ یعنی رکاب سے رکاب ملا کر ابراہیم کے لشکر پر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑا۔ ابراہیم خاں کو اتنی مہلت بھی نہ مل سکی کہ وہ اپنی فوج کو ازسرنو منظم کر سکے۔

چند گھنٹوں کے مقابلے کے بعد ابراہیم خاں کی فوج بھاگنے لگی لیکن وہ خود اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔ یہاں تک کہ وہ لڑتے لڑتے مارا گیا۔

یہ ایسی فتح تھی جس نے شیر خاں کی قسمت ہی بدل دی۔ اگر یہ فتح نہ ہوئی ہوتی تو معمولی جاگیردار کا لڑکا... (شیر خاں) یونہی گوشہ گمنامی میں پڑا رہتا۔ اس فتح نے اسے تخت و تاج کی تلاش میں سرگرداں کر دیا۔

اس فتح سے شیر خاں کو بہار پر حکومت کرنے کے سب قانونی و جائز اختیارات حاصل ہو گئے۔ جلال خاں بہار سے بھاگ کر اور اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کی غرض سے محمود شاہ سے اعانت طلب کرنے کے بعد افغان عوام کی نظروں سے گر گیا۔ اس کے برعکس عوام شیر خاں کو مسیحا سمجھنے لگے۔ اس نے اپنی قوم کو دو مرتبہ فتح سے ہم کنار کیا تھا لہٰذا اب وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ اگر مغلوں سے کوئی انہیں نجات دلا سکتا ہے تو وہ شیر خاں ہے۔ اس کی بہادری کے سکے بھی جم گئے اور اس کی مقبولیت میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا۔ اب وہ بہار کا بے تاج بادشاہ تھا۔

وہ بنگالی فوج کی اس شکست کے بعد اپنا وقت اپنے علاقے کے انتظام میں صرف کرنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قلیل عرصے میں رعایا کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہو گئی اور انتظام سلطنت عروج پر پہنچ گیا۔ منتشر افغان قوم اس کے پرچم تلے متحد و منظم ہو گئی۔

پے در پے فتوحات نے شیر خاں کا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔ اب اس کی نظریں مونگیر پر تھیں کیونکہ سلطنت کی مزید توسیع میں مونگیر کا قلعہ سدراہ تھا۔ اس قلعے کی فتح کے بعد بنگال پر حملہ کرنے کا راستہ کھل سکتا تھا۔

وہ ابھی تیاری کر رہا تھا کہ اسے خبریں ملیں کہ دارالسلطنت میں جنگی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ان خبروں نے اسے سراسیمہ کر دیا۔ ہمایوں نے بنگال فتح کرنے کے لیے فوج کشی کا حکم دے دیا۔

شیر خاں کی یہ سراسیمگی اس وقت خوشی میں بدل گئی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ بہادر شاہ گجرات میں مغل سلطنت کو تہ و بالا کرنے کا در پردہ منصوبہ بنا رہا ہے۔ شیر خاں کی خوشی کا سبب یہ تھا کہ اب ہمایوں کا گجرات کی طرف متوجہ ہونا لازمی تھا۔

بہادر شاہ نے یہ طے کیا کہ افغانوں کو ساتھ لے کر مغلوں کے خلاف صف آرا ہوا۔ چنانچہ اس نے شیر خاں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ دونوں مل کر مغلیہ حکومت کے خلاف جہاد کریں۔ مشرق سے شیر خاں حملہ کرے اور مغرب سے گجرات کی فوج آگرہ اور دہلی پر فوج کشی کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے سوداگروں کے ذریعے شیر خاں کے پاس رقم بھیجی اور اس کو ساتھ ملنے کی دعوت دی۔ شیر خاں نے روپیا تو جمع کر لیا لیکن نہ جانے کے لیے بہانہ بنا دیا۔ اس نے مغلوں کے خلاف بہادر شاہ کے دام سیاست میں پھنسنا مناسب نہیں سمجھا۔

شیر خاں سے اس موقعے پر غلطی ہو گئی۔ اس نے گجرات کے بہادر شاہ کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس نے اپنی فوج کا رخ مشرق کی جانب موڑ دیا اور بنگال فتح کرنے کے ارادے سے چل پڑا۔

ہمایوں کے رخصت ہوتے ہی بہادر شاہ کا سپہ سالار تاتار خاں ایک طوفان کی طرح آگرہ پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے چالیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ بیانہ تک کے سارے علاقے کو روند ڈالا۔ اس وقت ہمایوں پرگنہ کالپی میں پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔

تاتار خاں نے جلد بازی کی تھی۔ ہمایوں ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ خبر سنتے ہی واپس پلٹ پڑا۔ تاتار خاں اس کے لشکر کی آمد کی خبر سن کر بھاگ کھڑا ہوا۔

بہادر شاہ نے ہمایوں کو خط لکھا اور تاتار خاں کے فعل کی ذمے داری سے صاف انکار کر دیا۔ سادہ لوح ہمایوں نے اس معذرت کا یقین کر لیا اور آگرہ کے زرفشاں باغ سے ایک مرتبہ پھر مشرق کی طرف روانہ ہوا۔

اس مرتبہ بھی اسے راستے ہی میں بہادر شاہ سے الجھنا پڑ گیا۔ ہمایوں بہادر شاہ سے الجھا ہوا تھا اور شیر خاں اس کی طرف سے بے فکر ہو کر بنگال کی طرف بڑھ رہا تھا۔

شیر خاں بنگال کو فتح کرنے کے ارادے سے پہاڑوں کے دامن سے گزرنے والے عام راستے کے بجائے جنگل کے ایسے راستے سے داخل ہوا جہاں اس سے پیشتر کوئی انسان نہیں پہنچا تھا اور دفعتاً گوڑ کے سامنے پہنچ گیا جو بنگال کا دارالحکومت تھا۔ اس شہر کی مستحکم قلعہ بندی کو دیکھ کر شیر خاں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ شیر خاں سوچ رہا تھا اس شہر کو فتح کرنے میں اتنا عرصہ ضرور لگ جائے گا کہ ہمایوں بھی منزلیں مارتے ہوا یہاں تک پہنچ جائے گا۔ محمود شاہ نے اس کا کام آسان کر دیا۔ وہ شیر خاں کو گوڑ کے سامنے دیکھ کر ایسا گھبرایا کہ صلح کی گفت و شنید شروع کر دی۔

صلح کی شرط یہ طے ہوئی کہ محمود بطور نذرانہ شیر خاں کو 13 لاکھ طلائی سکے ادا کرے گا اور کول سے سکری گلی تک کا تمام علاقہ جو 90 میل لمبا اور 30 میل چوڑا تھا شیر خاں کی تحویل میں کر دے گا۔

یہ علاقہ محمود نے اس کے ہاتھ میں رکھ کر گویا بنگال کی کنجی اس کے حوالے کر دی۔

شیر خاں بہار لوٹ آیا اور اپنی فوج لے کر چنار کی جانب چل دیا تاکہ اس سرحد پر صورت حال کا جائزہ لے سکے۔ وہ اگلے ایک سال تک بہار سے باہر کہیں نہیں گیا۔

بہادر شاہ گجراتی کے انتقال کے ساتھ ہی ہمایوں کے پیروں کی زنجیریں ٹوٹ گئیں۔ اب وہ آگرہ سے باہر نکل سکتا تھا۔ شیر خاں ہمایوں اور محمود کی متحدہ فوجوں سے بچنا چاہتا تھا۔ اس نے نہایت جلد بازی میں محمود شاہ سے کیا ہوا معاہدۂ صلح توڑ دیا۔

اس نے جلال خاں کو اپنی فوج لے کر مشرقی اور مغربی بنگال پر قبضہ کرنے کے لیے بھیج دیا اور خود گنگا عبور کر کے شمالی بنگال اور گوڑ کا محاصرہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

وہ گوڑ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا کہ اسے خبر ملی، ہمایوں جمنا عبور کر کے گوڑ کی طرف جانے کے بجائے چنار کی طرف چل پڑا ہے۔ شیر خاں نے گوڑ کا محاصرہ اپنے سپہ سالاروں کے حوالے کیا اور خود چنار چلا گیا تاکہ اپنے بیوی بچوں اور خزانے کو وہاں سے ہٹا سکے۔

اس کا اندازہ ٹھیک تھا۔ ایک مہینے بعد ہی ہمایوں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چنار کا محاصرہ شروع کر دیا۔

اس قلعے کا محاصرہ تین مہینے تک جاری رہا اور بالآخر یہ قلعہ شیر خاں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ شیر خاں اپنا خزانہ اور بیوی بچوں کو پہلے ہی یہاں سے نکال لے گیا تھا لیکن یہ سوال اپنی جگہ تھا کہ وہ عورتوں اور خزانے کو کہاں محفوظ کرے۔ بالآخر قلعہ روہتاس میں اسے پناہ مل گئی۔

ہمایوں چنار میں بیٹھا تھا اور وہ روہتاس میں تھا کہ اسے گوڑ کی فتح کی خبر ملی۔ اس کے بیٹے جلال خاں اور سپہ سالار خواص خاں نے گوڑ پر قبضہ کر لیا تھا۔ حاکم بنگال محمود شاہ ہمایوں کے پاس پناہ گزیں ہونے کے لیے گوڑ سے بھاگ نکلا تھا۔

جب ہمایوں کو یہ خبر ملی کہ شیر خاں نے بنگال فتح کر لیا ہے تو اس کے جواب میں اس نے روہتاس فتح کرنے کا اعلان کر دیا۔ حملے سے پہلے صلح کا پیغام دینا بھی ضروری تھا۔

شاہی ایلچی شیر خاں کے پاس پہنچ گیا۔

''شاہی چتر، بنگال کا تخت اور خزانہ ہمایوں کے پاس روانہ کر دو۔ اس کے بدلے میں چنار، جونپور یا کوئی بھی تمہاری پسندیدہ جگہ تمہیں دے دی جائے گی۔''

شیر خاں نے ہمایوں کے سفیر سے کہا۔ ''اگر بادشاہ بنگال کی فتح کا ارادہ ہمیشہ کے لیے ترک کر دے تو میں بہار کا علاقہ بادشاہ کے سپرد کرنے کو تیار ہوں۔ بہار اور بنگال کی سرحد بھی وہی رہے گی جو سلطان سکندر کی حکومت میں تھی۔ میں جملہ شاہی نشانات وغیرہ بھی بادشاہ کی خدمت میں بھیج دوں گا اور بنگال کا دس لاکھ روپے سالانہ دیتا رہوں گا بشرطیکہ بادشاہ آگرہ واپس چلا جائے۔''

ہمایوں نے یہ شرائط تسلیم کر لی تھیں۔ شیر خاں کو اپنی رضامندی سے آگاہ بھی کر دیا تھا کہ سلطان محمود کا عریضہ پہنچ گیا۔

''افغانوں نے گوڑ کے قلعے پر قبضہ ضرور کر لیا ہے لیکن ملک ہنوز میرے تسلط میں ہے۔ بادشاہ سلامت شیر خاں کے وعدے پر اعتبار نہ کریں بلکہ فوج کو اس جانب کوچ کا حکم صادر فرمائیں۔ میں بھی اس مہم میں بادشاہ کا معاون و مددگار رہوں۔''

یہ درخواست موصول ہوتے ہی ہمایوں بھول گیا کہ اس نے شیر خاں کی شرائط مان لی تھیں۔ اس نے اپنی فوج کو بنگال کی طرف کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ ایک دوسرے دستے کو جھاڑ کھنڈ کی طرف روانہ کر دیا جہاں اس وقت شیر خاں مقیم تھا۔ شیر خاں کو مغل فوج کی نقل و حرکت کا علم فوراً ہو گیا۔ اس نے ہمایوں کے سفیر کو تحائف دے کر رخصت کیا۔ وہ خود گھڑسوار لے کر خفیہ طور پر گوڑ کے لیے روانہ ہو گیا۔

شیر خاں کا غصہ اس وقت دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے ہمایوں کی سب شرائط کو تسلیم کر لیا تھا محض بنگال کی واپسی سے انکار کیا تھا۔ بحیثیت باج گزار ہمایوں کو خراج دینے کو بھی تیار تھا لیکن ہمایوں نے اس کے اعتماد کو پاش پاش کر دیا۔ وہ بادشاہی طاقت سے مرعوب تھا۔ بادشاہ سے کسی قسم کی لڑائی لڑنا پسند نہیں کرتا تھا لیکن یہ لڑائی اس کے سر تھوپ دی گئی۔

شیر شاہ کی کوشش یہ تھی کہ شاہی فوج سے پہلے بنگال پہنچ جانا چاہیے لہٰذا اس نے اس علاقے کے اندرونی حصے میں سے ہو کر تیزی سے کوچ کیا تاکہ وہ مغلوں کے ہراول دستے سے آگے نکل جائے۔

وہ مغل فوج سے بچتے بچاتے گوڑ تک پہنچ گیا۔ مغل فوج بھی قریب پہنچ چکی تھی۔ مغلوں کی توپوں کی گھن گرج سے بے نیاز ہو کر اس نے اپنی رسم تاج پوشی ادا کی۔ اس نے فرید الدین ابوالمظفر شیر شاہ کا لقب اختیار کیا۔

بنگال کو دہلی سلطنت میں شامل کرنے والا پہلا بادشاہ سلطان التمش تھا۔ اس کے ٹھیک 300 سال بعد شیر خاں کو اول و آخر یہ امتیاز حاصل ہوا کہ وہ اپنے نام کا سکہ جاری کرے۔ اب وہ خان کے مرتبے سے بلند ہو کر ''شیر شاہ سوری'' بن چکا تھا۔

مغل فوجیں قریب آ رہی تھیں۔ شیر شاہ ابھی کسی جنگ میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ہمایوں کی نگاہوں سے بچ کر فرار ہو گیا۔

چار دن بعد بنگال کے دارالسلطنت گوڑ میں ہمایوں بادشاہ جلوہ افروز ہو گیا۔

شیر شاہ نے اپنی فوج سسرام اور روہتاس میں جمع کر لی اور برسات کے ختم ہوتے ہی مغلوں کے خلاف جارحانہ کارروائی شروع کر دی۔ بہار پر از سرِ نو تسلط حاصل کیا۔ بنارس پر قبضہ کیا۔ کچھ دیر جونپور کے سامنے ڈٹا رہا اور پھر قنوج کو اپنے تصرف میں کر لیا۔ ہمایوں کے جس کسی حاکم نے مزاحمت کی، موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

اب صرف دو ہی مقام شیر شاہ کی نگاہوں میں ٹھہرے ہوئے تھے یعنی چنار اور جونپور۔ اس نے ان دونوں علاقوں کا محاصرہ کر لیا۔

وہ مغل جو اس وقت آگرہ میں تھے، بادشاہ کی جانب سے ناامید ہو چکے تھے۔ جو مغل بنگال میں تھے انہیں احساس ہو گیا کہ وہ قید ہو چکے ہیں۔

شیر شاہ کی فتوحات جاری تھیں۔ ادھر آگرہ میں ہمایوں کے ایک بھائی مرزا ہندال نے بغاوت کر دی۔ ہمایوں پہلے

ہی شیر شاہ کی فتوحات سے سراسیمہ ہو چکا تھا۔ آگرہ کی بغاوت نے اس کے ہوش اڑا دیے۔ اس نے اپنے ایک افسر جہانگیر قلی بیگ کو پانچ ہزار فوج دے کر گوڑ کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا اور خود آگرہ کے لیے روانہ ہو گیا۔

اب ہمایوں کی حالت ایسی تھی جیسے کوئی دشمن کو پیٹھ دکھا کر بھاگتا ہے۔ شیر شاہ نے پہلے تو بڑی ہوشیاری سے شاہی لشکر کو آگے نکل جانے دیا اور پھر ان کے عقب میں چھاپا مار کارروائیاں شروع کر دیں۔ گویا چوہے بلی کا کھیل شروع ہو چکا تھا۔ مغل بار بار راستہ بدلتے تھے۔ کہیں نہ کہیں شیر شاہ کے سپاہی عقب سے حملہ آور ہو جاتے اور نقصان پہنچا کر غائب ہو جاتے تھے۔ یہاں تک کہ شاہی توپ خانہ بھی شیر شاہ کے قبضے میں چلا گیا۔ ہمایوں کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اب وہ اس دلدل سے کبھی نہیں نکل سکے گا۔ اس کے بھائیوں کی بے وفائی نے بھی اسے بہت مایوس کیا تھا۔ اس کے بار بار بلانے پر بھی وہ اس کی مدد کو نہیں پہنچے تھے۔

ہمایوں اب اتنا عاجز آ گیا کہ کوئی راستہ نہ دیکھ کر شیر شاہ کے پاس صلح کا پیغام بھیجنے پر مجبور ہو گیا لیکن اب شیر شاہ اپنی جنگی حکمت عملی اور طاقت کا ایسا مظاہرہ کر چکا تھا کہ اب صلح اس کی شرائط پر ہو سکتی تھی۔ اس نے شرط رکھی کہ چنار کا قلعہ مع قلعے کا مشرقی علاقہ اس کو دے دیا جائے۔ ہمایوں نے شیر خاں کو چنار سونپ دینا مناسب نہ سمجھا اور صلح کی شرط رد کر دی۔

صبح کی ٹھنڈی ہوا مغلوں کو لوریاں دے کر سلا رہی تھی کہ افغان ان پر ٹوٹ پڑے۔ افغانوں نے ہرچند یہ چاہا کہ زرہ بکتر پہن کر صف آرا ہو جائیں لیکن شیر شاہ کے سپاہیوں نے یہ موقع ہی نہیں دیا۔ ہزاروں قتل ہوئے باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہمایوں باقی ماندہ فوج کے ہمراہ چنار کی طرف بھاگا۔ مصیبت نے یہاں بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ تین دن بعد ہی شیر شاہ کی آمد کی خبر سن کر اسے چنار سے بھی بھاگنا پڑا۔

شیر شاہ کی فوجیں پیچھے لگی ہوئی تھیں اور ہمایوں بھاگتا پھر رہا تھا۔ اسے پناہ دینے یا مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ شیر شاہ نے الٰہ آباد تک ہمایوں کا تعاقب کیا اور پھر بنگال پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے پلٹ گیا۔

گوڑ میں مغل نمائندہ جہانگیر قلی خاں موجود تھا۔ شیر شاہ نے قلی خاں کے قتل کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ 6 ہزار مغل بھی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

شیر شاہ نے اب وہ سوچا جو اس سے پہلے نہیں سوچا تھا۔ ہمایوں کو عبرت ناک شکست دینے کے بعد اس کی نگاہیں دہلی اور آگرہ کی طرف اٹھیں۔ اب تک وہ دفاعی جنگ لڑتا رہا تھا لیکن ہمایوں نے اسے موقع دے دیا کہ وہ شہنشاہِ ہند بننے کے خواب دیکھے۔ اس نے بنگال کے انتظامات درست کیے۔ اپنے ایک امیر خضر خاں کو بنگال کا حاکم مقرر کیا اور خود ہمایوں کو اس کے گھر میں گھس کر مارنے کے ارادے سے چل پڑا۔

دہلی کے دربار میں اس خوشی کا جشن منایا جا رہا تھا کہ بادشاہ سلامت بخیر و عافیت شیر شاہ کے پنجے سے جان چھڑا کر واپس آ گئے ہیں۔ اسی اثنا میں یہ خبر موصول ہوئی کہ شیر شاہ گنگا کے مغرب میں آ گیا ہے۔

ہمایوں نے تمام تر مشکلات کے باوجود ایک عظیم الشان فوج اکٹھی کر لی تھی۔ توپ خانے کی طاقت کہیں زیادہ تھی۔ تمام تیاریاں مکمل کرنے کے بعد ہمایوں نے قنوج کی جانب کوچ کیا جہاں افغانوں نے اپنی فوج جمع کر رکھی تھی۔

ہمایوں کی فوج پر شیر شاہ کا خوف طاری تھا۔ اس کے سپاہی بھوجپور کے گھاٹ سے آگے نکل کر آہستہ آہستہ دریا کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ ان کا ارادہ تھا کہ منزل بہ منزل قنوج تک پہنچ جائیں۔ قنوج کے نزدیک دونوں جانب کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف بستہ کھڑی تھیں۔ مغل فوج کے سامنے دریائے گنگا اور عقب میں قنوج تھا۔

دونوں فوجوں کے درمیان دریائے گنگا حائل تھا۔ دونوں فریق گنگا پار کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ اسی کشمکش میں ایک ماہ گزر گیا بالآخر شیر شاہ کا وکیل شاہی لشکر میں آیا۔

شیر شاہ نے پیغام بھیجا تھا۔ ''یہ اعلیٰ حضرت کی مرضی پر منحصر ہے کہ یہ طے کر لیا جائے کہ آیا میں گنگا پار کر کے لڑوں یا گھاٹ کا راستہ چھوڑ دوں تاکہ شاہی فوج گنگا پار کرے۔''

بادشاہ نے بذریعہ وکیل خبر دی۔ ''شیر شاہ کو گھاٹ کا راستہ چھوڑ دینا چاہیے تاکہ شاہی فوج دریا پار کر کے لڑائی کا بگل بجا دے۔''

شیر شاہ گھاٹ چھوڑ کر کئی کوس پیچھے ہٹ گیا۔ بادشاہ نے گنگا پر پل بنوایا اور دریا پار کر لیا۔

شیر شاہ نے پیچھے ہٹ کر بلگرام کے مقام پر حسب دستور خندق کھودی اور اس کو قلعہ بند کر لیا۔ توپ خانہ اور توپچی مقرر کر دیے۔

یہ تیاریاں ہو چکیں تو ایک امیر مرزا حیدر نے ایک تجویز پیش کی۔ ''ہمارے لیے مناسب ہو گا کہ ہم توپوں کو سامنے جمائیں اور تقریباً پانچ ہزار بندوقچی توپوں کے ساتھ کھڑے ہوں۔ اگر شیر خاں حملہ کرنے کے لیے باہر آ جائے تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس مقام سے بہتر جگہ توپوں کے لیے نہیں ہوسکتی۔ اگر وہ مورچوں کے اندر رہتا ہے تو ہم دوپہر تک اسی طرح جمے رہیں گے اور پھر اپنے مقام پر لوٹ آئیں گے۔ دوسرے روز بھی ہم ایسا ہی کریں گے۔"

امیر مرزا نے یہ تجویز پیش ضرور کی لیکن یہ شاید دوسروں کے لیے تھی۔ وہ خود کسی سازش کا شکار ہوگیا تھا اور ہمایوں کا ساتھ چھوڑ گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی کئی اور امیر بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ پھر تو ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ عام سپاہی تک سوچنے لگے تھے کہ اپنے وطن لوٹ چلو اور آرام کرو۔ ایک مصیبت اور ہوئی کہ اچانک بارش شروع ہوگئی۔ ہمایوں کی فوج جہاں تھی وہاں کیچڑ ہوگئی۔ شیر خاں دس بارہ ہزار سواروں کے ساتھ نکلا اور حملہ آور ہوگیا۔ شاہی فوج حوصلہ پہلے ہی ہار چکی تھی۔ سپاہی خوف زدہ ہوکر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔

دشمن کی کمانوں سے ایک تیر بھی نہیں نکلا تھا کہ مغل فوج تتر بتر ہوگئی۔ چالیس ہزار فوج دس ہزار افغان فوج کے سامنے بھاگ کھڑی ہوئی۔

شیر شاہ کو فتح نصیب ہوئی۔

مغل فوج بے تحاشا دریا کی جانب بھاگی اور پل پر چڑھ کر دریا پار کرنا چاہا۔ مصیبت کبھی اکیلی نہیں آتی۔ یہی یہاں بھی ہوا کسی کو صبر نہیں تھا۔ سب ایک ساتھ پل پر چڑھ گئے۔ بمشکل پل کے درمیان تک پہنچے ہوں گے کہ پل ٹوٹ گیا۔ کچھ کچل کر مر گئے کچھ ڈوب کر مر گئے۔

ہمایوں جس کے پاس دوپہر تک سترہ ہزار خدمت گار تھے، دریا کے پار پہنچا تو برہنہ سر برہنہ پا کھڑا تھا۔ ایک مصاحب نے جو زندہ بچ گیا تھا اپنا گھوڑا اس کی خدمت میں پیش کردیا۔

ہمایوں تقریباً 9 دن میں دہلی پہنچا پھر آگرہ آگیا۔ آگرہ سے فتح پور سیکری چلا گیا۔ شیر شاہ آگرہ پہنچا۔ دہلی پر بھی اس کے آدمیوں کا قبضہ ہوچکا تھا لہٰذا اب کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جو اسے پناہ دے سکتی۔ وہ لاہور کی طرف بھاگا لیکن لاہور میں بھی اسے رہنا نصیب نہیں ہوا۔ شیر شاہ کے فوجی دستے اس کے تعاقب میں تھے۔ بھائیوں کا سلوک بھی اچھا نہیں تھا۔ وہ سندھ کی طرف گیا اور پھر قندھار کی طرف نکل گیا۔ ایسی عبرت ناک سزا کسی کو نہیں ملی ہوگی۔

شیر شاہ نے آگرہ پہنچ کر اپنے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا۔ ضروری بندوبست کے بعد اس نے دہلی کی طرف فاتحانہ قدم بڑھایا۔

اس کی جاگیر سسرام سے دہلی بہت دور معلوم ہوتی تھی۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ فرید خاں سے شیر خاں اور شیر شاہ سوری بن گیا تھا۔ مغلوں کو نیست و نابود کر پٹھانوں کی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس کے قدموں میں تھی۔

جب اس کا قافلہ دہلی میں داخل ہورہا تھا ایک ضعی کہتی پھر رہی تھی۔ "آخر دہلی کو اس کا شوہر مل گیا۔ ایسا ش جو اپنی عورت کی حفاظت بھی کرسکتا ہے اور پرورش بھی۔"

اس نے مغلوں کو سلطنت بدر کردیا تھا لیکن اہل کے دل میں اس کے لیے کوئی نفرت نہیں تھی۔ اس کی آ جشن منایا جارہا تھا۔ شعرا اپنے شعروں میں اس کی تعریف رہے تھے۔ ملک محمد جائسی اس زمانے کا شاعر اعظم تھا۔ ا نے بھی شیر شاہ کو اپنی ہندی شاعری میں خراج تحسین ادا ک شاعر موصوف نے اپنی مشہور کتاب پدماوتی 947 ہجری شروع کی تھی۔ یہ شیر شاہ کی تخت نشینی کا سال تھا۔ جائسی شیر کا درباری شاعر نہیں تھا اور دنیاوی سرپرستی سے بے نیاز لیکن اس نے شیر شاہ کو منصف مزاج، فیاض اور جلیل الق حکمران بتایا۔

فیروز تغلق کی موت کے ساتھ دہلی کی شان اور اس حکومت کا جلال خاں ختم ہوچکا تھا۔ امیر تیمور کے ہاتھوں اس سہاگ اجڑ چکا تھا۔ لودھی حکمرانوں نے کوئی دہلی آباد نہیں کی ہی ہمایوں کی جدت طبع کوئی نئی دہلی آباد کرسکی حالانکہ اس۔ "دیں پناہ" کے نام سے ایک شہر کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس شہر کو بھ اس کی سلطنت کی طرح شیر شاہ نے خاک میں ملا دیا۔

تخت نشیں ہونے کے بعد شیر شاہ کے کندھوں پر یہ ذ داری آگئی کہ وہ دہلی سلطنت و دہلی دارالسلطنت دونوں دوبارہ زندہ کرے۔ شیر شاہ یہ دونوں کام بہ یک وقت کرنا چاہ تھا۔ اس کام کے لیے اس نے وہی جگہ منتخب کی جو ہمایوں پسند کر چکا تھا۔ اس شہر کا نام شیر گڑھ عرف حضرت دہلی رکھا گیا۔

آج پرانے قلعے کی فصلیں اور اس کے اندر کے کچھ کھنڈرات اس شہر کی کہانی اپنی خاموش زبان سے کہہ رہے ہیں۔

نئے نظام حکومت کا مقصد رعایا کا اعتماد حاصل کرنا تھ چنانچہ جب شیر شاہ کو یہ معلوم ہوا کہ اس کے سپہ سالاروں نے غریبوں پر کیا ظلم توڑے ہیں تو اس نے ان کو سزا دینے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا۔ آگرہ میں داخل ہونے والے سپہ سالار برہم جیت کو سخت فہمائش کی۔ دہلی میں داخل ہونے کے بعد اس کا سب سے پہلا کام فاتح جنرل ناصر خاں کا تنزل کرنا تھا کیونکہ اس نے سنبھل کی رعایا اور خدمت گاروں کے ساتھ جارحانہ سلوک کیا تھا۔ شیر شاہ نے دہلی سے لکھنو تک کے تمام

فوجدار حاجی خاں سروانی کو مقرر کردیا اور اس کے ناصر خاں کو سنبھل کا نائب فوجدار بنا دیا۔ اسی لیے وہ کی رعایا میں اتنا ہر دل عزیز اور کامیاب حکمران بن سکا۔

شیر شاہ کو معلوم ہوا کہ ہمایوں، بھائیوں کی ناچاقی کی سے لاہور سے نکل گیا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہمایوں سندھ یا کشمیر پہنچ جائے۔ اسے اس کو مجبور کرنا تھا کہ وہ ہندوستان کی سرحدوں سے کہیں دور جائے پناہ ڈھونڈ لے۔ اس نے ارادہ کیا کہ وہ ہمایوں کا تعاقب کرتا رہے گا۔ اس نے اپنی حدودِ سلطنت بڑھانے کا کام چھوڑ کر پنجاب جانے کا عزم کیا۔ اس کا ایک سپہ سالار خواص خاں سرہند میں ڈیرے ڈالے بیٹھا تھا۔ اس نے اسے حکم دیا کہ وہ ستلج پار کر جائے پھر وہ خود بھی ستلج پہنچ گیا۔ سرہند کا بندوبست کرنے کے بعد جالندھر پہنچا۔ لاہور پہنچا اور پھر اپنے آدمیوں کو پنجاب بھر میں پھیلا دیا۔ ایک فوجی دستہ ملتان کی جانب روانہ کیا۔ اس کو یہ پیش بندی کرنی تھی کہ ہمایوں نمک کی پہاڑی کے راستے کشمیر نہ چلا جائے۔ وہ لاہور سے بھیرہ گیا اور پھر خوشاب پہنچا۔ یہاں بھی اس نے قیام کیا اور تمام قابل فوجی افسروں کو فوجی دستوں کے ساتھ مغلوں کی تلاش میں اطراف و جوانب بھیجا۔ اس نے تمام فوجی افسروں کو ہدایت کی تھی کہ مغلوں سے لڑائی کی نوبت نہ آئے۔ بس انہیں آگے کی طرف دھکیلتے رہو جب تک کہ وہ سلطنت کی حدود سے باہر نہ چلا جائے۔ ساتھ ساتھ وہ ہمایوں کے بھائیوں خاص طور پر کامران مرزا کی گوشمالی بھی کرتا رہا۔

ہمایوں جو کل تک بادشاہ تھا اب بے یار و مددگار پنجاب بھر میں بھاگتا پھر رہا تھا۔ کہیں جائے پناہ نہیں تھی۔ جہاں پاؤں ٹکاتا، شیر شاہ کے فوجی دستے تعاقب کرتے ہوئے آجاتے، اسے آگے بھاگنا پڑتا۔ یہاں تک کہ وہ روہڑی (سندھ) پہنچ گیا۔

اب منظر نامہ یہ بن گیا تھا کہ ہمایوں سندھ میں تھا، کامران کابل میں اور مرزا حیدر کشمیر میں۔ شیر شاہ کو ان تینوں کے متعلق غور کرنا تھا۔ وہ تقریباً دو ماہ خوشاب میں رہا۔ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ان میں سے جو جہاں ہے اسے وہیں مصروف رہنے دے اور انہیں اس طرح متحد نہ ہونے دے اور وہ پنجاب پر تسلط حاصل کرنے کے لیے کوئی منصوبہ بنا ملیں۔ البتہ ہمایوں کی سندھ میں موجودگی باعث تشویش تھی تھا۔ راجپوتانہ بدظن تھا اور گجرات ناقابلِ اعتبار اور یہ والی سندھ سے ملحق تھے۔

پنجاب پر مکمل تسلط کے بعد شیر شاہ کو اپنی سرحدوں پر دھیان دینا لازمی ہوگیا یعنی کابل، کشمیر اور سندھ۔ ان پر تسلط کے بعد ہی ہندوستان کی سلطنت محفوظ اور اس کی قدرتی سرحدیں معقول ہوسکتی تھیں۔

شیر شاہ نے گکھڑ علاقے کو تباہ و برباد کر ڈالا اور آس پاس کے علاقے کا دورہ کر کے ایک جگہ تلاش کی جہاں اس نے ایک قلعہ تعمیر کرایا۔

شیر شاہ کی فوج نمک کی پہاڑیوں کے سلسلے میں اندر تک گھس گئی اور اس نے سلطنتِ مغلیہ کے صوبہ کابل کی سرکار پاکھلی اور سرکار سوات کو زیر تسلط کرلیا۔

اس کے بعد اس نے بالآخر اپنی توجہ ملتان کی جانب مبذول کی۔ یہاں ایک ماہ کے قیام کے بعد وہ لاہور واپس آگیا۔ اس نے پنجاب کے انتظامی امور کو مکمل کردیا اور لاہور سے ملتان تک ایک سڑک بنوانے کا کام شروع کیا۔ یہ سڑک اٹک سے دہلی جانے والی گرانڈ ٹرک سڑک سے جو کہ لاہور سے گزرتی تھی مل جاتی تھی۔

شیر شاہ کی نظر میں سڑکوں کے جال کی وہی اہمیت تھی جو تسخیر ممالک اور جنگی فتوحات حاصل کرنے کے لیے اس کے توپ خانے اور تربیت یافتہ فوج کی تھی۔ اس نے سڑکوں کا ایک جال بچھا کر بنگال کو شمالی ہندوستان کی آخری حد تک ملا دیا۔ شیر شاہ بنگال کی تجارت کو فروغ دینا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے دو طریقے اختیار کیے۔ پہلا سڑکوں کے ذریعے مال کی آمد و رفت محفوظ ہو اور دوسرا یہ کہ مال پر ٹیکس وصول کرنے کا طریقہ آسان کردیا جائے۔

ہمایوں کی طرف سے مطمئن ہوتے ہی شیر خاں اپنی حدود سلطنت کی توسیع کے کاموں میں مشغول ہوگیا۔ وہ آگرہ سے گوالیار کی طرف روانہ ہوا۔ قلعہ دار ابوالقاسم ہمایوں کی طرف سے وہاں متعین تھا۔ وہ خدمت میں حاضر ہوا اور گوالیار شیر شاہ کے قبضے میں آگیا۔

گوالیار کے بعد شیر شاہ مالوہ کی طرف بڑھا۔ بہادر شاہ کے انتقال کے بعد مالوہ لاوارث ہوگیا تھا کیونکہ اس کا وارث جو محض ایک نابالغ لڑکا تھا صرف نام کا بادشاہ رہ گیا تھا۔ ہمایوں بھی مالوہ کا خیال چھوڑ کر بہار کی بغاوت کو دبانے میں مصروف ہوگیا۔ اس طرح مالوہ کا میدان بالکل صاف ہوگیا۔ اب کوئی نئی طاقت یہاں اپنے پیر جما سکتی تھی۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے ملو خاں جو خلجیوں کا غلام تھا ترقی کر کے امیر بنا اور پھر یہاں حکومت کرنے لگا۔

شیر شاہ کی ہیبت ایسی طاری تھی کہ وہ جونہی مالوہ کی طرف بڑھا مالوہ کے حاکم ملو خاں نے اطاعت قبول کرلی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے استقبال کے لیے خدمت میں حاضر ہوگیا مگر جب مالوہ پر شیر شاہ کا قبضہ ہوگیا تو ملوخاں اس کے لشکر سے فرار ہوگیا۔ غالباً وہ گجرات کی طرف بھاگا تھا۔

شیر شاہ نے اپنا ایک سفیر گجرات بھیجا اور خود مانڈو اور دھار کی جانب چل دیا۔ اس نے ان دونوں پر کسی لڑائی کے بغیر قبضہ کرلیا۔

ایک سال بعد آگرہ میں خبر پہنچی کہ قلعہ رائے سین میں پورن مل نامی راجپوت نے بغاوت کردی ہے اور دو ہزار بالغ و نابالغ ہندو اور مسلمان لڑکیوں کو رقاصہ بنا کر اپنے محل میں ڈال رکھا ہے۔ شیر شاہ نے اس کی سرکوبی کے لیے قلعہ رائے سین کا محاصرہ کر لیا۔

اس قلعے کا محل وقوع ایسا تھا کہ کسی بھی فوج کے لیے اس کا محاصرہ ناممکن نہ تھا۔ صرف ناکا بندی کی جاسکتی تھی۔ دشمن ہمہ وقت بیدار و ہوشیار رہتا تھا جس کی وجہ سے نہ تو قلعے پر سیڑھیاں لگائی جاسکتی تھیں اور نہ سرنگ بنائی جاسکتی تھی۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ قلعے پر گولہ باری کی جائے۔ شیر شاہ نے گولہ باری کا حکم دے دیا۔

موسم برسات سر پر تھا۔ مارواڑ کی مہم اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس سے پریشان ہوکر اس نے پورن مل سے صلح کی گفتگو شروع کردی۔ پورن مل نے جو شرطیں پیش کیں، شیر شاہ نے وہ مان لیں۔ یہ شرط بھی مان لی کہ وہ افغان پڑاؤ کو قلعے سے دو منزل دور لے جائے گا۔

چار ہزار راجپوت مع اپنے عیال و اطفال و ساز و سامان کے رائے سین کے قلعے سے نیچے اترے اور ٹھیک اس مقام پر خیمہ زن ہوئے جہاں ایک روز قبل شیر شاہ مقیم تھا لیکن اس موقعے پر اس نے ایسی حرکت کر ڈالی جو ہرگز اسے زیب نہیں دیتی تھی۔ اس نے ایک افغانی دستے کو ان پر حملہ کرنے کی اجازت دے دی۔ بہادر راجپوت بہادری سے لڑے لیکن ایک بھی زندہ نہ بچا۔ خود پورن مل بھی مارا گیا۔

رائے سین پر قبضہ کرنے کے بعد شیر شاہ نے ایک مضبوط فوج قلعہ میں تعینات کی اور خود آگرہ واپس آ گیا۔ آگرہ پہنچنے کے بعد اس نے مارواڑ کی تسخیر کا منصوبہ بنایا۔ آگرہ و دہلی میں غیر معمولی تیاریاں ہونے لگیں اور چار مہینے سے بھی کم عرصے میں 80 ہزار گھڑسوار، پیادے، توپ خانہ، جنگی ہاتھی مارواڑ کی مہم کے لیے تیار ہوگئے۔

جب وہ مارواڑ پر اپنی فوجیں لے کر گیا تو اجمیر کی سرحد پر مارواڑ کے راجا مالدیو سے جو پچاس ہزار سوار لے کر آیا تھا ایک ماہ تک مقابلہ ہوتا رہا۔ جب شیر شاہ نے دیکھا کہ اس ملک کی فتح کھلے میدان میں مشکل ہے تو اس نے ا
چال چلی۔ اس علاقے کے اکثر زمیندار ایسے تھے جو مال
سے دشمنی رکھتے تھے۔ شیر شاہ نے ان زمینداروں کو ا
ساتھ ملالیا۔ اس کے علاوہ مالدیو کے امیروں کے نام ہن
زبان میں خطوط لکھوائے۔ ان خطوط میں ایسی تحریریں تھ
جن سے معلوم ہوتا تھا کہ راجا کے امیروں اور شیر شاہ میں
ربط ضبط ہوگیا ہے اور وہ مالدیو کے خلاف سازشوں میں
ہوئے ہیں۔ شیر شاہ نے اپنے زر خرید زمینداروں کی مدد
ایسا انتظام کرایا کہ وہ خطوط مالدیو کے ہاتھ پڑ گئے۔ مالد
کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس سازش کے جا
سے نکلنے کے لیے اس نے فرار ہونے کا ارادہ کرلیا لیک
نوبت ایسی آگئی کہ اسے جنگ کرنی پڑی۔ اس نے پٹھانو
پر ایسا سخت حملہ کیا کہ کئی ہزار آدمی خاک و خون میں لت پ
ہوگئے۔ شیر شاہ کا لشکر پسپا ہوتے ہوئے مدافعانہ جنگ لڑ
تھا۔ پٹھان منتشر ہونے ہی والے تھے کہ جلال خاں جلواتی
بڑا دلیر اور شجاع تھا دور دراز راستہ طے کرکے اپنے لشکر کو
کر اجانک محاذ پر پہنچ گیا۔ سارا نقشہ ہی بدل گیا۔ وہ برق
آسمان کی طرح راجپوتوں پر ٹوٹ پڑا۔ راجا مالدیو نے ا
تبدیلی کو دیکھا تو اپنے امیروں کو چھوڑ کر رات کے اندھیر
میں جودھپور کی طرف فرار ہوگیا۔

مالدیو کے امیروں نے اس کی پروا نہیں کی کہ ان
راجا ان کا ساتھ چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ وہ بہادری سے لڑتے
رہے۔ میدان جنگ لاتعداد راجپوت سرداروں کی لاشوں
سے پٹا پڑا تھا۔

شیر شاہ کو فتح ملی تو راجا مالدیو کے تمام نامور امیر و سردار میدان جنگ کی زمین پر موت کی آغوش میں میٹھی نیند سو رہے تھے۔

اس فتح کے بعد شیر شاہ نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ ایک حصہ اس کے سپہ سالار خواص خاں کی کمان میں مالدیو کے تعاقب میں جودھپور کے لیے روانہ ہوا اور دوسرا دستہ شیر شاہ کے ساتھ اجمیر فتح کرنے کے لیے چل دیا۔

مالدیو کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ خواص خاں آرہا ہے تو وہ اپنی مستورات اور ساز و سامان کو لے کر جودھپور سے جنوب مغرب کی جانب قلعہ سیوان میں چلا گیا۔

خواص خاں صرف اتنا کرسکا کہ اس نے جودھپور پر قبضہ کرلیا اور اردگرد کے علاقوں کو فتح کرتا پھرا۔ شیر شاہ نے آگے بڑھ کر اجمیر کا محاصرہ کرلیا۔ یہ محاصرہ چل ہی رہا تھا کہ شیر شاہ کو معلوم ہوا مالدیو سیوان سے نکل کر اس کی فوج کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عقب میں آگیا ہے۔ اس نے اپنے لڑکے عادل خاں کو اس محاصرے پر متعین کیا اور خود مالدیو کے تعاقب میں چل پڑا۔

شیر شاہ نے مالدیو کو آبو کی پہاڑیوں میں گھیر لیا۔ ان پہاڑیوں پر بارہ گاؤں آباد تھے۔ سب سے اونچی چوٹی پر اچل گڑھ واقع تھا۔ یہاں تک غنیم کی رسائی محال تھی۔ شیر شاہ کا توپ خانہ بھی اوپر نہیں جاسکتا تھا۔ اس حالت میں دونوں فریق صلح کے لیے راضی ہو گئے۔ مالدیو نے اپنے سفیر کو ایک پنڈت کے ساتھ صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے شیر شاہ کے پاس بھیجا۔ شیر شاہ نے پنڈت کو روانہ کر دیا اور سفیر کو اپنے پاس رکھ لیا۔ شیر شاہ کے اس رویے سے مالدیو کے دل میں شکوک پیدا ہوئے لہٰذا وہ شیر شاہ کی نظروں سے بچ کر مغرب کی جانب سانچور بھاگ گیا۔ شیر شاہ بھی اس کے پیچھے روانہ ہوا۔ خود تو مالدیو کے قلعے جالور پر حملہ آور ہوا اور خواص خاں کی فوج کو جو سیوان میں مقیم تھی سانچور کی جانب مالدیو کے تعاقب میں جانے کا کام سونپا۔

خواص خاں نے سانچور پر قبضہ کر لیا لیکن مالدیو گرفتار نہ ہو سکا۔

جالور پر شیر شاہ کا قبضہ ہو گیا۔ ایک عرصے سے یہ مقام باغی اور سرکش پٹھانوں کا صدر مقام بنا ہوا تھا، لہٰذا جالور کی کڑی ناکابندی کی گئی۔

مارواڑ کی مہم بخیر وخوبی ختم ہو چکی تھی۔ شیر شاہ نے بادشاہوں کے بادشاہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کی درگاہ پر حاضری دی۔ بڑی دیر تک سر جھکائے کھڑا رہا۔ درگاہ سے باہر آیا تو جیسے خزانے کا منہ کھل گیا اعلیٰ پیمانے پر خیرات تقسیم کی۔

اس وقت شیر شاہ کو یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اب اس دارفانی سے اس کے آخری سفر کی تیاریاں اس کے انتظار میں ہیں۔

وہ مارواڑ کے بندوبست کے لیے اجمیر میں ٹھہرا رہا۔ اس نے برہم جیت گوڑ کو اجمیر کا فوج دار مقرر کیا۔ کیونکہ وہ راجپوت تھا۔ راجپوت کو راجپوت سے لڑانا ہی بہتر تھا۔ خواص خاں کو مارواڑ کی مختلف چوکیوں پر تعینات فوج کا اعلیٰ سپہ سالار مقرر کیا۔

یہ اور اس جیسے دوسرے بندوبست کرنے کے بعد اپنی فوج لے کر سانبھر کی جانب گیا اور شمال مغرب میں کچاون تک جا پہنچا۔ یہ علاقہ جودھپور کا ایک قصبہ تھا اور فوجی نقطہ نظر سے بہت اہم تھا۔ یہ علاقے راٹھوروں کی فوجی چوکیاں تھیں۔ اجمیر پر قبضہ رکھنے کے لیے ان علاقوں سے دشمن کا صفایا کرنا بہت ضروری تھا۔

وہ کئی ماہ تک راجپوتوں کی بیخ کنی اور ان علاقوں کے بندوبست میں مشغول رہا۔ مارواڑ کی تسخیر اور وہاں کے نظم ونسق سے فراغت پانے کے بعد چتوڑ کے قلعے پر لشکر کشی کا ارادہ کیا۔

وہ میواڑ کو سرنگوں کرنے کے لیے چتوڑ کی طرف بڑھا تو اسے امید تھی کہ راجپوتوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کافی لمبا اور شدید ہوگا لیکن چتوڑ نے ماضی میں ایسی جنگیں لڑی تھیں کہ ان کی ضربات سے، ابھی تک سنبھل نہیں پایا تھا۔ رانا سانگا اور بابر کے درمیان ہونے والی جنگ نے جو کسی طرح بھی جنگ پانی پت سے کم نہیں تھی، اس علاقے کو زبردست نقصان پہنچایا تھا۔ یہاں کے راجپوت بہادر ہونے کے باوجود ابھی کسی فوری جنگ کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

شیر شاہ ابھی چتوڑ سے بارہ میل کے فاصلے پر تھا کہ چتوڑ کا قلعہ دار مہارانا اودے سنگھ کی طرف سے شیر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ قلعے کی کنجیاں اس نے شیر شاہ کے قدموں میں رکھ دیں۔

”مہارانا کی جانب سے یہ قلعہ آپ کو مبارک ہو۔“

”خود مہارانا کہاں ہے؟“

”وہ کسی جنگ سے بچنے کے لیے روپوش ہو گئے ہیں۔“

”جب قلعہ ہمیں مل گیا تو ہم جنگ کیوں کریں گے؟“

”راجپوتوں کے لیے علاقہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا لیکن ان کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ کسی کی اطاعت قبول کریں۔ قلعہ چتوڑ آپ کو مبارک ہو لیکن رانا آزاد رہنا چاہتے ہیں۔“

”مجھے اس سے غرض نہیں کہ اسے اپنی اطاعت پر مجبور کروں لیکن میں علاقے فتح کرنے سے ہاتھ نہیں کھینچ سکتا۔“

شیر شاہ محض چتوڑ پر قناعت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو ایک نعمت تھی جو اسے راستے میں پڑی مل گئی تھی۔ اس نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ وہ اردگرد کے علاقوں پر فوج کشی کریں۔

”یہ علاقے نہ تو اتنی مال گزاری ادا کرتے ہیں کہ میری سلطنت کو کچھ فائدہ ہوگا اور نہ ان علاقوں میں کوئی قابل ذکر چیز پیدا ہوتی ہے لیکن یہاں سرکشی ضرور پیدا ہوتی ہے۔ یہاں کسی بھی وقت کوئی طوفان اٹھ سکتا ہے جو دہلی و آگرہ کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔ میں نے اس سرکشی کو دبانے کے لیے راجپوتوں سے خطرناک جنگ مول لی ہے۔ اپنے بعد آنے والوں کے لیے آسانی پیدا کی ہے۔ اب دہلی کے حکمرانوں کو سرکش راجپوتوں کا تعاون حاصل رہے گا۔“

مہارانا اودے سنگھ اپنی آزادی کی حفاظت کی خاطر ناقابل عبور گھاٹیوں میں چلا گیا۔ شیر شاہ نے اس کا پیچھا نہیں لیا اور اس کو وہاں خودمختار رہنے دیا اور بالآخر ان شرائط پر مصالحت ہو گئی کہ سکہ وخطبہ شیر شاہ کے نام جاری رہے گا اور قبضہ رانا کا رہے گا۔

چتوڑ اور اس کے گردونواح کا علاقہ چتوڑ سرکار میں شامل کر دیا گیا۔ اب چتوڑ ایک شاہی علاقہ ہو گیا اور خواص خاں کے بھائی شمس خاں کی کمان میں وہاں ایک فوج اور بندوقچیوں کی ایک پلٹن رہنے لگی۔

اس طرح دس مہینے تک شیر شاہ مارواڑ فتح کرنے اور راجپوتانہ کے باقی علاقے کو زیر کرنے میں مصروف رہا۔ اس کے بعد طویل جنگ کامیابی کے ساتھ ختم ہوئی۔

اس مہم کے خاتمے کے بعد اسے آگرہ چلے جانا چاہیے تھا لیکن یہاں سے وہ اپنے بیٹے عادل خان کے پاس رن تھنبور چلا گیا۔ کچھ دن اس کے گردونواح میں شکار سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اسی شکار کے دوران میں اسے دو خیال آئے ایک کالنجر کی فتح کا خیال تھا، دوسرا علاقہ دکن کو اپنے تصرف میں لانے کا۔ وہ کالنجر کے قریب ہی تھا اس لیے اس مہم پر اسے پہلے جانا تھا۔

اس وقت عادل خاں (اس کا بیٹا) اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ عادل خاں کی یہ ہمت تو نہیں تھی کہ باپ سے یہ پوچھ سکے کہ وہ یہاں شکار کھیلنے آیا ہے یا آئندہ کے منصوبوں پر غور کرنے لیکن وہ یہ ضرور کہہ سکا کہ اب اسے آگرہ جا کر وہاں کے بندوبست کی فکر کرنی چاہیے۔ یہی وہ سوال تھا جس کے جواب میں شیر شاہ نے اپنے منصوبے سے اسے آگاہ کیا۔

”اس ریگستان میں مجھے ہر وہ کامیابی ملی جو میں نے چاہی۔ اب مجھے کالنجر کے دشوار گزار قلعے کو فتح کرنا ہے اس لیے بھی کہ تمہارا باپ ایسے دشوار کاموں سے خوش ہوتا ہے اور اس لیے بھی کہ ہمایوں جیسا جلیل القدر بادشاہ کالنجر کی مہم ادھوری چھوڑ کر جونپور کی طرف واپس پلٹ گیا تھا۔ میں اس ادھوری مہم کو پورا کروں گا۔ بندیل کھنڈ کے راجپوت اعلیٰ صفات کے نہیں ہیں لیکن عیاری میں مشہور ہیں۔ کالنجر کے قلعے کی مضبوطی بھی ضرب المثل ہے۔ میں اس کی مضبوطی کو بھی مسمار کرنا چاہتا ہوں۔“

”کالنجر پر حملے سے قبل ضروری معلومات ہمارے پاس ہونی چاہئیں۔“ عادل خان نے کہا۔

”تم کیا سمجھتے ہو۔ میں اس طرف سے غافل رہا ہوں میں نے کچھ جاسوسوں کو کالنجر کی طرف بھیجا ہے۔ میں انہی کے انتظار میں یہاں دن گزار رہا ہوں۔“

عادل خاں کو اب معلوم ہوا کہ اس کا باپ سیر و شکار میں کیوں مشغول ہے۔

شیر شاہ کے جاسوس کالنجر کے متعلق پوری معلومات لے کر آگئے تھے۔

انہوں نے بتایا۔ ”جس وسیع پہاڑ پر کالنجر کا قلعہ واقع ہے، وہ سطح سمندر سے تقریباً 1230 فٹ بلند ہے۔ اس کا محیط چار یا پانچ میل ہے۔ اس پہاڑ اور نزدیک سے نزدیک پہاڑی کے درمیان 1200 گز چوڑی ایک خندق ہے۔ اس کی دیواریں میدان سے عموداً اٹھی ہوئی ہیں جن کی اونچائی ڈیڑھ سو فٹ سے زیادہ ہے اور ناقابل رسائی ہے۔ قلعے کے چاروں طرف فصیل ہے۔ اس فصیل پر چڑھنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ جہاں ایسی قدرتی گنجائش ہے بھی وہاں مزید ایک دیوار بنا دی گئی ہے۔ اس مورچہ بند پہاڑی تک پہنچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ بھی پہاڑی کی ڈھال پر سے ترچھا ہو کر جنوب مشرق کی سمت پہنچتا ہے۔“

یہ تفصیلات ہی ایسی تھیں کہ شیر شاہ کی جنگجو طبیعت میں ابال سا آگیا۔ بابر و ہمایوں جس مہم میں ناکام رہے ہیں اسے میں پورا کروں گا۔

”سامان سلطانی تیار کیا جائے۔“

آس پاس سے ہاتھی اور لشکر طلب کیا گیا۔ بخشیوں کو حکم ہوا کہ فوج کا معائنہ کریں۔ اسی ہزار سوار اور دو ہزار مست ہاتھی شمار میں آئے۔ سراپردہ شاہی کو باہر لایا گیا اور نصب کر دیا گیا۔ عادل خاں کو گلے لگا کر الوداع کیا۔ وہ سعادت مند اپنے علاقے رن تھنبور کی طرف چلا گیا اور خود شاہ مالوہ کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ یہاں سے وہ گھوارا گھنڈ گیا۔ اس مقام کو اس نے مستقل فوجی چھاؤنی بنانے کے لیے پسند کیا اور ایک پہاڑی پر پتھر کا ایک قلعہ بھی تعمیر کرایا۔ اس مقام کو فوجی چھاؤنی بنانے کا مقصد یہ تھا کہ کالنجر میں لڑنے والی فوج کو رسد مہیا کی جا سکے۔

برسات کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ اپنی فوج لے کر باندہ کی جانب چل دیا۔ اس نے کالنجر کو ایک طرف چھوڑ دیا۔ اس کے لشکری حیران تھے کہ وہ کالنجر چھوڑ کر کس طرف چل دیا لیکن یہ تو وہ جانتا تھا کہ کالنجر جانے سے پہلے کالنجر کے قلعے کے چاروں طرف کے علاقے کا تفصیلی جائزہ لینا ضروری ہے۔ قلعے کا محاصرہ کرنے سے قبل بندیل کھنڈ کے باقی حصے کو فوجی وسیاسی کمک سے محروم کرنا ضروری تھا۔ اس کا یہ دورہ اسی کوشش کا حصہ تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ وحشت ناک خبر بھی اس کے پاؤں نہیں پکڑ سکی کہ میرٹھ میں بغاوت ہوگئی ہے۔ عالم خاں میانہ اس بغاوت کا علم بردار ہے۔ اس کے استقلال کا باعث اس کی انتظامی پختگی تھی۔ اس نے اپنے فوج داروں کو حکم دے رکھا تھا کہ سلطنت کے جس گوشے میں بھی بغاوت ہو فوج دار، اس کے حکم کا انتظار کیے بغیر اس پر قابو پانے کے لیے فوراً سخت قدم اٹھائیں، اس وقت بھی یہی ہوا۔ سرہند کے فوج دار نے شیر خاں سے اجازت لینا ضروری نہیں سمجھا۔ اس نے فوراً باغی عالم خاں کے خلاف فوج کشی کی اور اس کو مغلوب کرلیا۔ شیر شاہ کو صرف یہ اطلاع ملی کہ بغاوت پر قابو پالیا گیا ہے۔

اس اثنا میں شیر شاہ قلعے کے نواح میں پہنچ گیا تھا اور محاصرہ شروع ہوچکا تھا۔ امرا میں مورچے تقسیم کیے گئے۔ مزدوروں کو کام سے لگا دیا کہ سرنگیں کھودنا شروع کردیں۔ توپوں کو بلندی پر نصب کرنے کے لیے مینار بننا شروع ہوگئے۔ سرنگیں قلعے تک پہنچ گئیں اور مینار اتنا بلند ہوگیا کہ اس کی چوٹی سے قلعے کا اندر کا حصہ بخوبی دکھائی دینے لگا۔

یہ کام اتنے آسان نہیں تھے۔ جنگل صاف کرکے توپ خانے کے لیے راستہ بنانا آسان نہیں تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ مقامی مزدور دستیاب نہیں تھے۔ سات مہینے تک سپاہی اور لشکر کے دوسرے آدمی رات دن محنت کرتے رہے۔ دو ہزار کاریگر توپ ڈھالنے کے کام میں متواتر مشغول تھے۔ مزدوروں پر روزانہ خزانے کا ایک بڑا حصہ صرف ہورہا تھا۔ اتنا عرصہ پورا مارواڑ فتح ہونے میں بھی نہیں لگا تھا جتنا یہاں صرف تیاریوں میں لگ گیا تھا۔ اس کا سبب بندیل کھنڈ کی ساخت تھا۔ پورے بندیل کھنڈ میں اونچی نیچی پہاڑیاں تھیں اور ناقابل عبور جنگل۔ ان لوگوں نے پہاڑی چشموں پر بند باندھے ہوئے تھے۔ دشمن کے حملے کے وقت یہ بند ان کی حفاظت کرتے تھے۔ ان بندوں کو توڑ کر دشمن کو پانی سے محروم کیا جاسکتا تھا یا دشمن کے لشکر کو رات ہی رات میں پانی کے سیلاب میں بہایا جاسکتا تھا۔ شیر شاہ کو ان تمام مشکلات کا دفاع کرنا تھا۔

شیر شاہ کے فوجی مقام کھجورا سے یہ مقام دور نہیں تھا لیکن اس پہاڑی علاقے میں فوجیں سیدھ میں سفر نہیں کرسکتیں۔ ان کو جگہ جگہ پہاڑیوں کو عبور کرنے کے لیے چکر کاٹ کر جانا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ خدشہ الگ رہتا تھا کہ کیا خبر کس پہاڑ کے پیچھے فوج چھپی ہو اور اچانک نمودار ہوجائے۔

جب زر کثیر خرچ ہوچکا۔ تیاریاں مکمل ہوگئیں۔ دشمن تک رسد پہنچنے کے تمام راستے بند کردیے گئے تو شیر شاہ نے **22 مئی 1545ء** کو حملے کا دن مقرر کیا۔ شیر شاہ لکڑی کے مینار پر چڑھا جو اس کی فوج نے تعمیر کیا تھا اور کمان سے چھوڑ کر حملہ شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ اس ایک تیر کے ہوتے ہی ہزاروں تیر اس کے تعاقب میں روانہ ہوئے محافظ قلعے کی فصیل پر ڈٹے رہے۔ شاہی لشکر نے قلعے کو سانپ کی طرح ہر طرف سے گھیر کر جنگ شروع کردی۔

سرنگوں میں بارود کے تھیلے بھر دیے گئے تھے۔ پہلی سرنگ پھٹی تو اس سے قلعہ کا ایک برج گر گیا لیکن غنیم نے موقع نہ دیا کہ شیر شاہی فوج اندر آسکے۔ تیروں کی ایسی باڑ ماری اور بندوقوں سے ایسی آگ برسائی کہ مست ہاتھیوں کو بھی ہمت نہ ہوئی کہ ادھر کا رخ کرتے۔

جب دوسری طرف سرنگ کو اڑایا گیا تو اس قلعے کے دو برج آسمان کی طرف اڑ گئے۔ ان دو برجوں کے ایک ساتھ اڑنے سے قلعے کے اندر سراسیمگی پھیل گئی۔ راجا کالنجر اس صورت حال کا بغور مشاہدہ کررہا تھا۔ اسے یقین ہونے لگا کہ بہت جلد قلعہ فتح ہوجائے گا۔ اس نے فوراً اپنے وکیل کو شیر شاہ کے پاس روانہ کیا اور صلح کے لیے خراج ادا کرنے کا عہد کیا لیکن مشیت ایزدی شیر شاہ کو کسی اور طرف لے جارہی تھی۔ اس دور کی جنگوں کا اخلاقی قاعدہ یہ تھا کہ ایک فریق جب صلح کے لیے تیار ہو تو اپنی یا اس کی شرائط پر صلح کرلی جائے لیکن شیر شاہ نے راجا کی اس پیشکش کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اس کے پیچھے اس کی وہ محنت بھی تھی جو سات مہینے سے کر رہا تھا۔ اب وہ ہر قیمت پر قلعہ فتح کرنے کا خواہاں تھا۔

اس نے قلعے کے حصول کی کوشش بدستور جاری رکھی۔

جب شیر شاہ نے دیکھا کہ تیروں کی بارش بے اثر ہے تو اس نے اپنے سپاہیوں کو ''حقہ'' (ایک بھدی شکل کا ہاتھ گولا جیسے موجودہ زمانے کا ہینڈ گرنیڈ) لانے کا حکم دیا تاکہ وہ راجپوتوں پر پھینکے جائیں۔ حقوں کے ڈھیر لگا دیے گئے۔ شیر شاہ اس ڈھیر کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کے سپاہی ان حقوں میں فیتہ لگا کر قلعے کے اندر پھینکنے میں ہمہ تن مصروف تھے۔ اچانک ایک حقہ قلعے کی دیوار سے ٹکرا کر واپس آگیا اور حقوں کے انبار میں گر گیا جس سے تمام حقوں میں آگ لگ گئی۔ دھماکے اس زور سے ہوئے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ شیر شاہ کے ساتھ دوسرے امرا بھی کھڑے تھے۔ وہ بروقت وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے لیکن شیر شاہ آگ کی لپٹوں میں گھر گیا۔ جب اسے باہر نکالا گیا تب قریب قریب آدھا جل چکا تھا۔ اسے پالکی میں ڈال کر سراپردہ شاہی میں لایا گیا۔ اطبا اس کے گرد جمع ہوگئے۔

[illegible]لموں پر دہی لگایا گیا۔ امیر و سردار سب اکٹھے ہوگئے تھے۔ شیر شاہ نے بہ مشکل ایک آنکھ کھولی۔ دیکھا کہ سب امیر اس کے گرد جمع ہیں۔ عیسیٰ خاں حاجب قریب ہی کھڑا تھا۔ اسے قریب بلایا۔

''میری زندگی کا اب کوئی بھروسا نہیں۔'' شیر شاہ نے نحیف آواز میں کہا۔ ''اس سے پہلے کہ میری آنکھیں بند ہوں مجھے قلعے پر قبضے کی خوش خبری سنا دو۔''

عیسیٰ خاں نے شیر شاہ کا یہ حکم سب امیروں کو سنا دیا اور حکم دیا کہ قلعے پر چاروں جانب سے حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلینا چاہیے۔

یہ سن کر شیر شاہ کی فوج قلعے پر ٹوٹ پڑی۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوسکا تھا کہ شیر شاہ پر کیا گزر گئی۔ فوج کو تو بس یہ معلوم تھا کہ اس ویرانے میں پڑے پڑے سات مہینے گزر گئے ہیں۔ آر یا پار۔ جو فیصلہ ہوتا ہے ہوجائے۔ قلعے کے اندر بھی کسی کو نہیں معلوم تھا کہ شیر شاہ موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

شیر شاہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تکلیف برداشت کر رہا تھا لیکن زندہ تھا کہ فتح کی خوش خبری ابھی نہیں آئی تھی جب کوئی شخص مزاج پرسی کے لیے خیمے میں آتا تو اسے فوراً جا کر لڑنے کا اشارہ کرتا۔

شیر شاہ کے سپاہیوں نے دیوار پر یورش کردی۔ آمنے سامنے کی لڑائی کا وقت آگیا تھا۔ چاقو اور خنجروں سے جھڑپیں ہونے لگیں۔ راجپوتوں نے ایسی بہادری سے لڑنے والے نہیں دیکھے ہوں گے جیسے یہ افغان ثابت ہورہے تھے۔ قلعے کے اندر گھر گھر میں لڑائی ہوئی اور بالآخر راجا کرت سنگھ فرار ہوگیا۔ قلعے پر شیر شاہ کا قبضہ ہوگیا۔

شیر شاہ کے بعض مقرب یہ خوش خبری سنانے اس کے پاس آئے اور اسے فتح کی خوش خبری سنائی۔ یہ سنتے ہی جیسے وہ اپنی تمام تکلیف بھول گیا۔ اس کے چہرے پر مسرت و اطمینان کی جھلک دکھائی دی۔

''اللہ تیرا شکر ہے۔ یہ میری آخری خواہش تھی۔'' اس کی زبان سے نکلا۔ پھر اس نے امیروں کو قریب بلایا۔ اس کی آواز نہیں دور سے آرہی تھی۔

''دو حسرتیں میرے دل میں رہ گئی ہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا ''ایک یہ کہ میرا ارادہ تھا کہ لاہور کو ویران کردوں کیونکہ [illegible] مغلوں کے راستے میں ہے کہ جو وہاں آتا ہے [illegible] سامان مل جاتا ہے۔ دوسرا ارادہ میرا یہ تھا کہ سمندر [illegible] جہاز تیار کروں اور جو سامان ضروری ہو اس میں [illegible] ایسا مضبوط بناؤں کہ طوفانی ہوا بھی اسے پاش پاش نہ کرسکے تاکہ لوگ بہ آسانی مکہ معظمہ جائیں اور حج ادا کریں اور انہیں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔''

ایک حسرت وہ اور اپنے ساتھ لے جارہا تھا اور وہ تھی فتح دکن کی آرزو۔ اس حسرت کو بیان کرنے کی شاید فرصت نہ ملی اور وہ بے ہوش ہوگیا۔

شیر شاہ کی یہ حالت دیکھی تو امرا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ یہ ڈر تھا کہ اگر شیر شاہ کی وفات کی خبر عام ہوگئی تو لشکر میں بھگدڑ نہ مچ جائے۔ اس خبر کو پوشیدہ رکھا گیا تھا لیکن بحث یہ ہورہی تھی کہ آخر کب تک اس خبر کو پوشیدہ رکھا جائے گا؟ اس موقعے پر امرا بھی دو حصوں میں بٹ گئے۔ کچھ کا خیال تھا کہ بڑا بیٹا عادل خاں ہے اس لیے اسے تخت پر بیٹھنا چاہیے کچھ جلال خاں کے حق میں تھے اور لطف یہ تھا کہ دونوں ہی اس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔

شیر شاہ کی حکومت میں نہ تو حق بڑے بیٹے کو دیے جانے کا اصول تھا اور نہ کوئی انتخاب کرنے والا تھا اور نہ کوئی چناؤ کا واضح اصول۔ شیر شاہ کا نہ تو کوئی وزیر اعلیٰ تھا اور نہ مجلس وزرا۔ اسی لیے شیر شاہ کی وفات کو مدنظر رکھتے ہوئے فوج کے افسر اور امیر ہی آپس میں صلاح مشورے کررہے تھے۔

شیر شاہ مزید دو دن موت و زیست کی کشمکش میں رہا اور پھر اس نے اس دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔ امرا کے اجلاس اب بھی جاری تھے۔ آخر یہ اصول وضع کیا گیا کہ دولت و سلطنت حاضر کو ہی دستیاب ہوتی ہے۔ اس اصول کی روشنی میں یہ طے پایا کہ دونوں شہزادوں کو خطوط لکھے جائیں۔ ان میں سے جو پہلے پہنچ جائے، تخت اسی کا ہوگا چنانچہ دونوں کو خط لکھے گئے۔ ایک خط عادل خاں کے پاس بھیجا گیا جو اس وقت رن تھنبور میں تھا۔ دوسرے خط کو جلال خاں کے پاس بھیجا گیا جو پٹنہ میں تھا۔ صرف پچاس میل کے فاصلے پر۔

جلال خاں پہلے پہنچ گیا۔ امرا نے آگے بڑھ کر استقبال کیا اور دربار میں لائے۔ دربار شاہی کو آراستہ اور ہاتھیوں کو زر و زیور سے آراستہ کیا اور جلال خاں نے تاج شاہی سر پر رکھا۔

شیر شاہ کی لاش ابھی تک خیمے میں رکھی ہوئی تھی۔ اسے عارضی طور پر کالنجر کے نزدیک دفن کردیا گیا۔ بعد میں اس کو سسرام کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔

جلال خاں قلعہ کالنجر کی فصیل تلے باپ کے تخت پر بیٹھا اور اسلام شاہ کا لقب اختیار کیا جو پٹھانوں کی زبان پر آکر سلیم شاہ ہوگیا۔

جشن تاج پوشی سے نمٹ کر اس نے عادل خاں کو خط

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لکھا۔

”تم دور تھے اور میں قریب۔ تمہارے آنے تک فتنے کے سدباب کے لیے تخت پر بیٹھ گیا ہوں۔ میرے لیے بجز تمہاری فرماں برداری اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ جس وقت آگرہ پہنچوں گا تاج وتخت تمہارے سپرد کر کے دوسرے امرا کی طرح دست بستہ تمہارے تخت کے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا۔“

اسلام شاہ نے قلعہ کالنجر احمد خاں سوری کو عطا کیا اور خود آگرہ کے لیے روانہ ہوا۔ راستے میں اسے خبر ملی کہ عادل خاں کے بیٹے محمود خاں نے آگرہ پر چھاپہ مارا لیکن قلعہ کے افسر اور سپاہی قلعے میں پناہ گزیں ہو گئے اور یوں محمود خاں کی تخت پر قبضے کی کوشش پوری نہیں ہوئی۔ اب اسے جلد از جلد آگرہ پہنچنا تھا۔ یہی محمود خاں راجپوتانہ کے سرداروں کے پاس بھی گیا کہ اسے اس کا حق دلایا جائے۔ اس کے دادا کے تخت کے وارث اس کے والد عادل خاں ہیں نہ کہ جلال خاں۔ اسے یہاں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ کوئی اس کا ساتھ دینے پر تیار نہیں ہوا۔

اسلام شاہ نہایت کروفر سے آگرہ میں داخل ہوا۔ خواص خاں اس کے باپ شیر شاہ کا نہایت بااعتماد سپہ سالار تھا۔ وہ جب دربار میں حاضر ہوا تو اسے اپنے بازوؤں میں بھر کے سینے سے لگا لیا۔

عادل شاہ ابھی تک برہم تھا۔ اسے اسلام شاہ کی طرف سے لکھا گیا خط مل گیا تھا لیکن اس کا دل صاف نہیں ہوا تھا وہ دربار میں آتے ہوئے خوف زدہ تھا۔ بالآخر اسلام شاہ کے پاس اس کا خط پہنچا۔

”میں دربار میں آنے کو تیار ہوں۔ شرط یہ ہے کہ خواص خاں، قطب خاں اور جلال بن جالو میرے پاس آئیں اور یقین دلائیں کہ ملاقات کے بعد مجھے صحیح سلامت واپس آنے دیں گے۔“

یہ امیر نیک نیتی کے ساتھ رن تھنبور چل دیے تا کہ دونوں بھائیوں میں جنگ کی نوبت نہ آئے۔

یہ امیر اس قسم کی کوششیں ضرور کر رہے تھے لیکن اسلام شاہ منصوبہ بنا چکا تھا کہ اسے ملاقات والے دن ہی قتل کر دیا جائے۔

اسلام شاہ نے اپنے دربانوں کو حکم دے دیا تھا کہ عادل خاں سے ملاقات کے وقت وہ ان تین سرداروں کے سپاہیوں کو دربار میں داخل نہ ہونے دیں۔

عادل خاں آگرہ پہنچا تو خواص خاں وغیرہ کے سپاہی بھی زبردستی اندر گھس آئے۔ اسلام شاہ نے اپنی تجویز ناکام ہوتے دیکھا تو فوراً بہروپ بدل لیا۔ مسند سے اترا اور عادل خاں کو تخت پر بٹھا دیا۔

”آپ بادشاہ ہیں۔ میں تو آپ کے نائب کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اب میں آپ کی امانت آپ کو سونپ رہا ہوں۔“

عادل خاں نے دوبارہ اسلام شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔

”اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔ یہ تخت آپ کو مبارک ہو۔“

خواص خاں وغیرہ نے اسے بیانہ کی جاگیر دینے کی عرضداشت پیش کی اور اس کی روانگی کی اجازت حاصل کر لی۔ بیانہ کی جاگیر اسے دے دی گئی اور خواص خاں اسے اپنی حفاظت میں لے کر نکل گیا۔

ابھی دو ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ اسلام شاہ نے اپنے ایک سردار غازی خاں کو سونے کی زنجیر دے کر عادل شاہ کے پاس بھیجا کہ وہ اسے گرفتار کر کے لے آئے لیکن عادل خاں نے اسی زنجیر میں غازی خاں کو جکڑ کر اسلام شاہ کے پاس بھیج دیا۔ اس واقعے نے دونوں بھائیوں کے درمیان خانہ جنگی کی کیفیت پیدا کیے رکھی۔ خواص خاں نے عادل خاں کی طرفداری کی تھی لہٰذا وہ بھی معتوب ہوا اور بالآخر اسلام شاہ کے ہاتھوں پھانسی پر لٹکایا گیا۔

اسلام شاہ کے بعد عادل خاں کو حکومت ملی۔ اس کے بعد سکندر شاہ، شیر شاہ کا جانشین ہوا۔ یہی وہ بادشاہ ہے جس کے عہد حکومت میں جلاوطن بادشاہ ہمایوں دوبارہ ہندوستان آیا اور پٹھانوں کی حکومت ختم کر کے دوبارہ مغلوں کا اقتدار بحال کیا۔

شیر شاہ کے بعد اس کے کسی جانشین میں بھی یہ صلاحیت نہیں تھی جو اس طوفانی انسان کی فتوحات کو آگے بڑھاتا۔

شیر شاہ نے ایک معمولی سے جاگیردار سے ترقی کر کے ہندوستان کے اقتدار پر قبضہ کیا۔ اس کی حکومت صرف چھ سال رہی اگر وہ مزید دس برس زندہ رہ جاتا تو اتنے کام کر جاتا کہ مغل بادشاہ اکبر کو دس برس تک کچھ کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

ماخذات

شیر شاہ سوری، کالکا رنجن قانون گو۔ تاریخ شاہی، احمد یادگار۔ منتخب اللباب، خافی خاں۔ طبقات اکبری (جلد دوم)، خواجہ نظام الدین احمد

کالے راستے

ایم اے راحت

شراب ہو یا شباب ... انسانی عقل کا جنازہ نکالنے میں انہیں کمال حاصل ہے... اور اس جنازے کے شرکاء تماشائی بن کر ماہر تجزیہ نگاروں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتے ہیں مگر... اس سے پہلے ہوتا کچھ یوں ہے کہ محبت میں جب کسی کا مان ٹوٹ جائے تو بے اعتباری کی گرد میں ہر رشتہ دھندلا جاتا ہے... اس دلکش منظر پر بھی جب دھند چھائی تو تمام رستے بھی اپنی شناخت کھو بیٹھے... ایسے میں اگر کوئی بہک جائے اور چلتے چلتے مسافر بھٹک جائے تو منزلیں بھی اپنا نشان کھو دیتی ہیں۔

دلفریب موسم کی سحرانگیزی اور... نفس کی شرانگیزیوں کا احوال

دفتر خالی ہو چکا تھا۔ بارش کی وجہ سے سب لوگ جلدی اٹھ گئے تھے لیکن اسے گھر جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہاں تھا ہی کون، صرف ایک نوکر اور...... اور بس۔

وہ سست رفتاری سے کار ڈرائیو کرتا رہا، پھر ایک ... مڑا تو ایک سفید ہاتھ اس کے سامنے لہرا گیا۔ اس نے حسب عادت اس طرف نگاہ بھی نہیں کی۔ ... وہ نظر انداز کر دیتا تھا۔ امن پسند انسان تھا اس لیے الجھنوں سے بچنے کی کوشش کرتا تھا، بارہا لڑکیوں نے اس سے لفٹ مانگی تھی لیکن اس نے ہمیشہ انہیں نظر انداز کر دیا تھا، اس لیے نہیں کہ وہ مغرور تھا بلکہ الگ تھلگ رہنے کا خیال اسے ان باتوں سے روکتا تھا۔ اخبارات کی خبریں بھی اسے اس نیکی سے باز رکھتی تھیں، بعض اوقات ایسی کوئی نیکی مصیبت بھی بن جاتی تھی۔

اس وقت بھی اس نے سفید ہاتھ پر توجہ نہیں دی تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن اتفاق سے عقب نما آئینے پر نگاہ جا پڑی تھی۔ لفٹ مانگنے والی آئینے کی زد میں تھی، وہ بڑی مایوسی سے کار کو دیکھ رہی تھی۔ سفید لباس میں ملبوس اس کا چہرہ تو نظر نہیں آیا لیکن ہر انداز سے بے بسی عیاں تھی۔ نجانے کیوں اس کا پاؤں بریک پر جا پڑا...... کار سست ہوتے ہوئے بھی کافی دور نکل آئی تھی لیکن پھر اس نے کلچ پر پاؤں رکھ کر اسے روک ہی لیا، ایک لمحے کے لیے ذہن میں کشمکش ہوئی، پھر اس نے کار ریورس گیئر میں ڈال دی اور کلچ چھوڑنے لگا۔

بے بس چہرہ کھل اٹھا تھا۔ وہ خود بھی آگے بڑھنے لگی۔ سفید رنگ کی ہی ایک فائل سینے سے لگی تھی، چند ساعت بعد وہ قریب پہنچ گئی۔

''بیٹھ جاؤں؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''بیٹھو...... کہاں جاؤ گی؟'' اس نے کہا اور لڑکی جلدی سے عقبی دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

''معاف کیجیے گا، کپڑے بھیگے ہوئے ہیں، آپ کی سیٹ بھیگ جائے گی۔''

''کہاں جاؤ گی؟'' اس نے کار آگے بڑھاتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

''یہ سڑک شاد باغ جاتی ہے۔ اس سے پہلے کوئی آبادی نہیں ہے اس لیے آپ یا تو شاد باغ جائیں گے یا اس سے آگے۔ مجھے شاد باغ چھوڑ دیں۔''

''ہوں......'' اس نے آہستہ سے کہا اور نگاہیں سامنے جما دیں۔

''آپ نے مجھے دیکھا نہیں تھا یا آگے جا کے رحم آگیا؟'' اس نے پوچھا، لہجے میں شوخی اور بے باکی نمایاں تھی۔

''بے دھیانی میں تھا۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''بڑا ظلم کرتے اگر آپ نکل جاتے...... ایک گھنٹے سے پہلے کوئی بس نہ آتی اور اس وقت تک بارش نجانے کیا قیامت ڈھاتی۔ کمبخت اس روٹ پر صرف تین بسیں ہیں جو اپنی مرضی سے آتی جاتی ہیں۔ ذرا سی دیر ہوگئی بارش کی وجہ سے اور بس نکل گئی۔ سوچ رہی تھی کہ واپس کالج کی عمارت میں چلی جاؤں لیکن گھر والے پریشان ہوتے اس لیے ہمت کرلی۔''

''پڑھتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، سیکنڈ ایئر کی طالبہ ہوں۔'' وہ باتیں کرنے کی شوقین معلوم ہوتی تھی۔

''لیکن بی بی۔ اس طرح لفٹ مانگنا نقصان دہ بھی ثابت ہوسکتا ہے۔''

''میں بہت بہادر ہوں، جوڈو جانتی ہوں۔'' اس نے معصومیت سے کہا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل لڑکی کا سراپا وہ دیکھ چکا تھا۔ دبلی پتلی، نازک اندام 16، 17 برس سے زیادہ نہیں ہوگی۔

''خوب۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''غلط نہیں کہہ رہی۔ روزانہ کسی سے لفٹ تھوڑی ہوں، آج بارش کی وجہ سے پریشان ہوگئی تھی۔''

''ہاں۔ آیندہ خیال رکھنا، ممکن ہے دوسرا بھی ماسٹر ہو۔''

''اللہ مالک ہے۔ اب روز بارش تھوڑی ہوتی ہے۔'' اس نے اطمینان سے کہا اور پھر بولی۔ ''شادباغ آگیا۔ اگلے چوراہے پر روک دیں۔''

''گھر کتنی دور ہے؟''

''چوراہے سے زیادہ دور نہیں ہے اور پھر یہ تو علاقہ ہے۔'' اس نے مردانہ وار کہا۔

''ضرورت محسوس کرو تو گھر چھوڑ دوں؟''

''ارے باپ رے، ماموں بلوٹ ماسٹر ہیں۔ ا کے آگے جوڈو بھی نہیں چلتے۔'' اس نے شرارت آمیز اند میں آنکھیں مٹکا کر کہا۔

''اچھا۔'' وہ بولا۔

''بس پلیز، اسی جگہ۔'' لڑکی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور اس نے کار کی رفتار سست کر کے اسے روک دیا۔

''احسان مند ہوں، خدا حافظ۔'' وہ دروازہ کھول کر نیچے اترتے ہوئے بولی اور پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھ گئی۔

ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا کہ رک کر لڑکی کو جاتے ہوئے دیکھے۔ اس کی چال بڑی خوبصورت تھی لیکن پھر اسے مناسب محسوس نہیں ہوا۔ غیر شریفانہ حرکت تھی۔ چنانچہ وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ لیکن آج گھر پہنچ کر بھی اسے عجیب محسوس ہوا تھا۔ لڑکی کی صورت کئی بار اس کی تصور میں ابھری۔ معصوم، شوخ سی، جوڈو جانتی ہوں۔ روز بارش تھوڑی ہوتی ہے۔ کئی جملے اس کے کانوں سے ٹکرائے اور اس کے دل سے کچھ نئی آوازیں ہم آہنگ ہوئیں۔

''کیا ان الفاظ میں...... اس سوچ میں بچپن نہیں تھا؟ بچپن اور میں خود...... اس کے تصور میں اپنا چہرہ ابھرا۔ جسے وہ ہر روز آئینے کے سامنے بال سنوارتے ہوئے دیکھتا تھا۔ کیا میں اس کی کمسنی سے ہم آہنگ ہوسکتا ہوں۔ وہ مسہری سے اتر گیا۔ اس سے قبل چہرے پر ایسی گہری نگاہ کبھی نہیں ڈالی تھی لیکن آج...... آج اس نے بہت غور سے خود کو دیکھا۔

بالہہ اس طور دلکشی کا حامل نہیں تھا۔

وہ آئینے کے سامنے سے تھوڑا سا ہٹ گیا۔ اپنے قریب اس نے لڑکی کو کھڑا کیا اور اپنا موازنہ اس سے کرنے لگا۔ اسے خود ہی شرم آگئی...... ''اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ مجھے اس کے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچنا چاہیے۔ میں اس کے قابل نہیں ہوں۔''

لیکن دنیا میں صرف وہی تو نہیں ہے۔ میں غیر شادی شدہ ہوں، اگر چاہوں تو بہت سی لڑکیاں جو میری عمر اور چہرے سے مناسبت رکھتی ہوں، میرے قریب آسکتی ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی شریک زندگی منتخب کیا جاسکتا ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے، اس نے اپنے خالی مکان کا جائزہ لیا جس میں داور کے علاوہ کوئی بھی تو نہیں تھا۔ اگر...... اس مکان میں، کسی وجود کا اضافہ کردیا جائے تو...... تو اس کا حسن بے پناہ بڑھ جائے گا۔

کیوں نہ چچا سے تذکرہ کروں...... لیکن چچی...... چچی خوفزدہ ہوجائیں گی کہ اب ان کی آمدنی بند ہوجائے گی۔ وہ ہرگز یہ نہ ہونے دیں گی۔ اونہہ...... اس کی ضرورت بھی کیا ہے، جو کچھ کرنا ہے، خود ہی کرلیا جائے۔

تو پھر...... دفتر کی لڑکیوں کے چہرے نگاہوں میں گھومنے لگے۔ نہ جانے کیوں اس نے آج تک اس طرح نہ سوچا تھا۔ زندگی کا ایک رخ یہ بھی تو ہے۔ بہرحال پہلے تلاش...... اس کے بعد کچھ اور سوچیں گے گویا اس نے ابتدا کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا کہ اب اسے بھی کسی مخلص ساتھی کو شریک زندگی بنالینا چاہیے۔

دفتر کی طرف کار دوڑاتے ہوئے بھی وہ یہی سوچ رہا تھا۔ لیکن شام تک فائلوں میں کھو کر اس کے ذہن سے یہ خیالات نکل چکے تھے۔ کام کے معاملے میں وہ ہمیشہ مستعد تھا اور یہی اس کی خوبی تھی۔

لیکن جب نادیہ اس کے کمرے میں آئی تو وہ چونک پڑا۔

خاموش طبع، خوش لباس، صورت شکل بھی بری نہیں تھی۔ اس نے ایک نظر نادیہ کو دیکھا جو اس کے سامنے کچھ فائلز رکھ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے، میں دیکھ لوں گا۔ آپ چند ساعت بیٹھیں۔'' اس نے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ آج اس کی آواز سپاٹ نہیں تھی۔ لہجے میں اخلاق بھی تھا۔ ورنہ اس سے قبل اس نے کبھی نادیہ کو بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ اس کی شکل بھی غور سے نہیں دیکھی تھی۔ اگر کچھ کاغذات لانے میں دیر بھی ہوجاتی تو نادیہ کھڑی رہتی چنانچہ آج بھی نادیہ نے یہی سمجھا کہ وہ غلطی سے یہ الفاظ کہہ بیٹھا ہے۔ وہ کھڑی رہی اور یہ بات محسوس کر کے بھی وہ فائل کی ورق گردانی کرتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کہے؟ پھر اس نے گردن اٹھائی۔

''ارے آپ کھڑی ہیں، بیٹھ جایئے۔''

''ٹھیک ہوں جناب۔'' نادیہ نے جواب دیا۔

''بس چند منٹ۔ پلیز آپ بیٹھ جایئے۔'' اس نے دوسری فائل اٹھاتے ہوئے کہا لیکن اپنے الفاظ کا ردعمل نادیہ کے چہرے پر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بہرحال نادیہ بیٹھ گئی۔

''اب کیا کہوں؟'' وہ سوچ رہا تھا لیکن نادیہ...... کیا ابتدا اسی سے کی جائے۔ جلد بازی کی کیا ضرورت ہے، پہلے غور تو کرلیا جائے۔ اسے ٹھیک سے دیکھ تو لیا جائے۔ اس نے سوچا اور پھر اس نے وہ فائل نکال لی جس سے کاغذات نکالنے تھے۔ اس کے بعد وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''مس نادیہ، یہ کام کب تک کرلیں گی؟''

''جب آپ حکم دیں جناب۔'' نادیہ نے کہا۔

''میں وقت کا تعین تو نہیں کرسکتا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نادیہ کو اس کے رویے پر شدید حیرت ہوئی تھی۔ بہرحال وہ خوش بھی تھی جس کا اندازہ اس کی آواز سے ہوتا تھا۔

''آپ حکم دیں جناب میں کمپیوٹر بھی بن سکتی ہوں۔''

''نہیں...... آپ انسان ہیں کمپیوٹر تو نہیں ہیں۔ آپ اپنی سہولت سے یہ کام شروع کریں۔ ہاں جتنے کاغذات ہوجائیں۔ وہ مجھے ضرور پہنچادیں۔''

''جی بہتر۔'' نادیہ نے کہا اور اٹھ گئی۔ پھر جب وہ مڑ گئی تو اس نے عقب سے اس کا بھرپور جائزہ لیا۔ نادیہ کی کمر بہت چوڑی تھی اور چال بھی غیر دلکش تھی، اس کے علاوہ وہ ایک کلرک تھی، دس ہزار تنخواہ پانے والی۔

کینسل...... کینسل...... اس نے اپنے آپ سے کہا اور نادیہ کو ذہن سے نکال پھینکا۔ آج ہی اس نے ایملی کو بھی غور دیکھا۔ سانولی لیکن دلکش۔ ہر لحاظ سے نادیہ سے اچھی تھی لیکن کرسچن تھی۔ اسے کوئی حیثیت نہیں دی جاسکتی تھی لیکن رومانس...... رومانس میں کیا حرج ہے۔

ساڑھے چار بجے نادیہ آگئی۔ اس نے سارے کاغذات اس کے سامنے رکھ دیے اور داد طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کتنے ہوگئے؟'' اس نے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"سب کردیے جناب!" نادیہ نے جواب دیا اور اس نے نگاہیں اٹھا کر نادیہ کو دیکھا۔ بلاشبہ اس نے نادیہ کو اپنی فہرست سے نکال دیا تھا۔ اس کے باوجود نادیہ صنف نازک تھی، کیا ضروری ہے کہ اس سے خوش اخلاقی بھی نہ برتی جائے۔ اس نے اپنے ذہن میں تبدیلیاں محسوس کی تھیں۔

"بہت شکریہ مس نادیہ...... کافی کام سمیٹ لیا آپ نے۔" وہ نرم لہجے میں بولا۔

"اور کوئی حکم سر؟" نادیہ نے پوچھا۔

"نہیں، باقی کل۔" اس نے جواب دیا اور نادیہ اجازت لے کر باہر چلی گئی۔ اس نے کاغذات سمیٹ کر فائل بند کردی۔ پھر باتھ روم جا کر چہرہ درست کیا اور بال وغیرہ سنوار کر باہر آگیا۔ کار اسٹارٹ کی اور چل پڑا۔ آج موسم صاف تھا۔ سست رفتاری سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس نے سوچا کہ زندگی واقعی گھر اور دفتر تک محدود نہیں رہنی چاہیے اور پھر ایک اچھے مستقبل کے لیے دوڑ دھوپ بھی تو ضروری ہے۔ اس کے جو دوست ہیں، وہ بھی فیملی والے ہیں۔ کسی سے کھلے ملے گا تو دوسرے راستے بھی نکلیں گے۔ ہاں معمولات میں تھوڑی سی تبدیلی ضروری ہے اور وہ اس تبدیلی کے طریقے پر غور کرنے لگا۔

لیکن اسی وقت اس کی نگاہ اس سفید لباس پر پڑی، وہی کل والی لڑکی...... جوڑوا ایکسپرٹ...... حالانکہ وہ اسے ذہن سے نکال چکا تھا۔ اس نے سوچ کا انداز بدل دیا تھا۔ لیکن نجانے کیوں...... اس کا پاؤں بریک پر جا پڑا۔ اس نے کار کی کھڑکی سے گردن نکال کر لڑکی کو اشارہ کیا اور لڑکی اسے دیکھنے لگی، وہ آگے نہیں بڑھی تھی۔ تب اس نے کار پیچھے کی اور اس کے قریب پہنچ گیا۔

"موسم ٹھیک ہے، میں انتظار کرلوں گی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"ناراض ہوگئی ہو کیا...... کوئی گستاخی ہوگئی مجھ سے؟" وہ صاف دلی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"یہ بات نہیں ہے، میں چلی جاؤں گی۔"

"بہتر...... اگر تمہیں اعتراض ہے۔" اس نے کہا۔

"سنیے......" وہ مسکرا کر بولی اور وہ رک گیا۔ "بیٹھ جاؤں؟" لڑکی نے شرارت سے پوچھا اور اس نے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔

"ایک بات کہوں، آپ یقین کرلیں گے؟" وہ کار میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کرلوں گا۔"

"آج بھی اتفاق سے بس نکل گئی مگر میں آپ کا ا نہیں کر رہی تھی۔"

"کیا تمہارے خیال میں، میں نے اس انداز سوچا ہوگا؟"

"یہ نہیں کہہ سکتی لیکن گنجائش تو ہے۔"

"تب پھر تم یہ بھی سوچ سکتی ہو کہ میں بھی تمہاری میں اسی وقت ادھر سے گزروں گا۔"

"ایں......" لڑکی چند ساعت سوچتی رہی، پھر ہنس پڑ

"ارے ہاں یہ چانس بھی تو ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"بلکہ تمہارے بارے میں تو یہ بھی سوچا جا سکتا ہے تمہیں میرے آنے کا کوئی علم نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے، تمہیں نہیں معلوم ہوگا کہ کل میں اتفاقاً یہاں سے گزرا تھا یا یہ معمول ہے جبکہ میں تمہارے بارے میں جان چکا ہوں کالج میں پڑھتی ہو اور یہی وقت تمہاری چھٹی کا ہے۔"

"ارے واہ، آپ نے تو میری پوزیشن بالکل صا کردی۔"

"جی ہاں...... تاکہ آپ فضول باتیں نہ سوچیں۔" ا نے کہا اور لڑکی چند ساعت خاموش رہی پھر مسکرا کر بولی۔

"ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں نہیں سوچیں گے لیکن کیا آپ واقعی شاد باغ سے کہی آگے رہتے ہیں؟"

"ہاں...... کینٹ ایریا میں۔"

"اوہ...... تب تو آپ ہمارے ذرا دور کے پڑوسی ہیں۔ میری ایک پھوپی بھی کینٹ ایریا میں رہتی ہیں، دو تی باران کے ہاں جا چکی ہوں۔"

"گڈ...... کیا نام ہے تمہارا؟"

"نبیلہ!" لڑکی نے جواب دیا۔ "اور آپ کا......؟" وہ فوراً بولی۔

"جمال شاہ۔" اس نے جواب دیا۔

"کینٹ ایریا میں کس طرف رہتے ہیں؟"

"کوٹھی نمبر اٹھائیس۔"

"ارے...... کوٹھی نمبر پچیس میں تو میری پھوپی رہتی ہیں۔ کیا آپ عبدالرحمٰن کو جانتے ہیں جو ماسٹر بر کمپنی میں ملازم ہیں؟"

"نہیں۔ وہاں میری کسی سے جان پہچان نہیں۔"

"اونچی سوسائٹی میں یہی ایک بری بات ہے، لوگ ایک دوسرے سے ناواقفیت کو اپنی شان سمجھتے ہیں جبکہ ہمارے شاد باغ کے کسی مکان کے سامنے کھڑے ہوکر آپ

ں ہ ہا پوچھ لیں، آپ کو آپ کی مطلوبہ جگہ پر ہی پہنچایا جائے گا۔"

"ہاں، یہ حقیقت ہے۔" جمال شاہ نے اعتراف کیا۔

"بس پلیز یہیں اتار دیں۔" نبیلہ نے شاد باغ کے وراہے پر پہنچ کر کہا اور اس نے بھی کار روک دی۔

"نبیلہ......" وہ آہستہ سے بولا۔

"جی؟"

"دیکھو۔ اگر کوئی بری بات تمہارے ذہن میں نہ آئے، تو میں ایک پیشکش کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ دفتر سے میری چھٹی اسی وقت ہوتی ہے، تم میرا انتظار کرلیا کرو۔ تمہیں یہاں ڈراپ کرنے میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"حرج تو کوئی نہیں ہے اور مجھے کسی کی پروا بھی نہیں ہے۔" نبیلہ نے بے باکی سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے پھر کل......"

"خدا حافظ۔" وہ کار سے اتر کر بولی۔ اور جمال شاہ نے کار آگے بڑھادی۔ لیکن اس وقت پھر اس کی ذہنی کیفیت بدل چکی تھی۔ وہ نبیلہ کے بارے میں ہی سوچتے ہوئے گھر پہنچا تھا اور پھر رات کو بستر پر لیٹ کر بھی وہ اسے نظر انداز نہ کرسکا۔ اسے اس کی بے باکی پسند آئی تھی۔

لیکن دوسری صبح آئینے میں خود کو سنوارتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اپنا فیصلہ بدل ڈالا۔ وہ کسی طور نبیلہ کے قابل نہیں ہے۔ زندگی کی ساتھی درکار ہے تو بہت سی ایسی لڑکیاں مل جائیں گی جو نبیلہ سے کہیں زیادہ خوبصورت، کہیں زیادہ خوش مزاج ہوں گی۔ پھر اس معصوم لڑکی کے بارے میں ہی کیوں سوچا جائے۔ رہا معاملہ اس سے کیے ہوئے وعدے کا تو ضروری تو نہیں ہے کہ کسی نوخیز کلی کو بھونرے کی نگاہ سے ہی دیکھا جائے۔

اس فیصلے نے اسے کسی حد تک مطمئن کردیا۔ لیکن نجانے کیوں اس کے ذہن پر عورت سوار ہوگئی تھی۔ چنانچہ آج دفتر میں ایملی پر اس نے خاص طور سے نظر عنایت کی۔ ایملی نے بھی اس بات کو محسوس کرلیا تھا۔ تقریباً چار بجے وہ اس کے آفس میں آئی تھی۔ "میرے لیے کوئی کام تو نہیں ہے سر؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں...... ایملی...... بس اب کوئی کام نہیں ہے۔"

"اگر آپ کی اجازت ہو تو چلی جاؤں؟"

"اگر کوئی خاص کام ہو تو چلی جاؤ۔ ویسے چند منٹ اور رکو تو میں تمہیں تمہاری مطلوبہ جگہ چھوڑ دوں گا۔"

"اوہ، نہیں سر! آج میرے منگیتر کی سالگرہ ہے، پاسکل سے میں بچپن سے محبت کرتی ہوں اور بہت جلد ہم دونوں کی شادی ہوجائے گی۔ پاسکل خود مجھے لینے آئے گا۔"

"اوہ...... تب پھر آپ جائیں۔" اس نے پرخلوص لہجے میں کہا۔ فطرتاً وہ برا انسان نہیں تھا۔

"شکریہ سر!" ایملی نے کہا اور وہ باہر نکل گئی۔ ممکن ہے ایملی نے اسے باز رکھنے کے لیے ہی یہ کہانی سنائی ہو۔ شام کو پانچ بجے دفتر سے نکلتے ہوئے نبیلہ یاد آگئی لیکن اب اس یاد کے ساتھ کوئی الجھن نہیں تھی۔

آج وہ نبیلہ سے کچھ زیادہ ہی بے تکلفی سے ملا۔ "ہیلو نبیلہ۔ میں لیٹ تو نہیں ہوا؟"

"بالکل نہیں۔" نبیلہ نے بھی بے تکلفی سے کار کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گئی۔ اس نے کار آگے بڑھادی۔

"کوئی نئی خبر......؟"

"کوئی خاص نہیں۔ ویسے میری سہیلیاں آج پوچھ رہی تھیں کہ میں بس میں کیوں سوار نہیں ہوئی؟"

"کیا جواب دیا تم نے؟"

"ارے پچاس جواب ہوتے ہیں۔ اس میں الجھن کی کوئی بات تو نہیں تھی۔" اس نے جواب دیا اور پھر راستے میں کئی باتیں ہوئیں، پھر اس نے نبیلہ کو چوراہے پر اتارا اور خود گھر پہنچ گیا لیکن آج کی شام نبیلہ کے نام نہیں تھی، آج وہ بہت پرسکون تھا۔

دوسرے دن دوپہر کو اس کے دوست ارسلان کا فون آگیا۔ "یار بڑے بے مروت انسان ہو، مصروف تو ہم بھی ہیں لیکن ایسے بھی نہیں، کیا کرتے رہتے ہو؟"

"کچھ نہیں یار۔ میں خود بھی سوچ رہا تھا۔ بہت دن ہوگئے، ملاقات نہیں ہوئی۔"

"بہت خوب۔ دوستوں سے ملاقات کے لیے بھی سوچتے ہو؟"

"آؤں گا...... پرسوں آؤں گا۔"

"جی نہیں، آپ کل آئیں گے۔"

"کل......؟"

"ہاں۔"

"شام کو؟"

"ہاں تقریباً سات بجے۔ آپ کی بھابی جان کی سالگرہ ہے اور اگر آپ نہ آئے تو تعلقات ختم ہوجائیں گے۔" ارسلان نے جواب دیا۔

"ایک شرط پر۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"کہو، کہو......"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بھابی سے کہہ کر میری بھی شادی کرا دو۔''

''کل ہی لو...... سہرا وغیرہ خریدتے لانا۔ کھڑے کھڑے ہو جائے گی۔'' وہ بولا اور جمال شاہ ہنسنے لگا۔

''یہ بات ہے تو میں آرہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا اور فون بند کر دیا۔ اس دوران نادیہ اندر آگئی تھی۔ اس نے کچھ خطوط اس کے سامنے رکھ دیے اور کھڑی رہی۔

''شکریہ مس نادیہ! بس اور کوئی کام نہیں ہے۔'' اس نے نادیہ کی طرف دیکھے بغیر کہا اور وہ واپس مڑ گئی لیکن اس کے انداز میں عجیب سی کیفیت تھی۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ بہار صرف ایک دن کے لیے کیوں آئی تھی۔

نادیہ کے جانے کے بعد وہ ارسلان کے فون کے بارے میں سوچنے لگا۔ کوئی تحفہ بھی خریدنا ہوگا۔ کل ذرا جلدی اٹھ جاؤں گا۔ اس نے فیصلہ کیا۔ پھر حسبِ معمول شام کو نبیلہ کو ڈراپ کرنے کے بعد گھر پہنچا۔

دوسرے دن وہ جلد ہی دفتر سے اٹھ گیا۔ واپسی میں بازار گیا، وہاں سے ایک خوبصورت اور قیمتی لاکٹ خریدا اور پھر کچھ وقت ایک ریستوران میں گزارا تاکہ نبیلہ کو اس کے کالج سے لے سکے۔ نبیلہ حسب معمول اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اب وہ اطمینان سے دروازہ کھول کر اس کے نزدیک ہی بیٹھ جاتی تھی اور راستے بھر باتیں کرتی رہتی تھی۔ نبیلہ کو چھوڑ کر وہ گھر پہنچا اور پھر ایک خوبصورت لباس پہن کر ٹھیک وقت پر چل پڑا۔

اپنے چھوٹے سے خوبصورت بنگلے میں ارسلان نے اس کا استقبال کیا۔ دوسرے بہت سے مہمان بھی جمع تھے۔ سالگرہ ہوئی اور قہقہے ابھرنے لگے۔ ارسلان ایک زندہ دل نوجوان تھا اور اس کے دوست بھی خوب تھے۔ کئی نئے لوگوں سے تعارف ہوا۔ پھر مہمان رخصت ہونے لگے لیکن ارسلان نے جمال کو روک لیا۔

''یار تمہاری کون سی بیوی انتظار کر رہی ہوگی۔ رک جاؤ اب کل جانا۔ رات کو فرصت سے باتیں ہوں گی۔'' ارسلان نے کہا اور وہ مان بھی گیا...... سالگرہ میں کئی خوب صورت لڑکیاں بھی نظر آئی تھیں۔

پھر ارسلان اور اس کے دو بے تکلف دوست اور ان کی بیگمات سب ایک جگہ بیٹھ گئے اور خوش گپیاں ہونے لگیں۔

''یار یقین کرو۔ ہم میں تم سب سے زیادہ خوش قسمت ہو۔'' ارسلان نے کہا۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ تم نے شادی نہیں کی۔''

''کیا شادی انسان کی ضرورت نہیں؟''

''ہے، لیکن ایسی ضرورت جس کے پورا ہونے : گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔''

''آخر کیوں؟''

''اس لیے کہ شادی کے بعد انسان بڑی بڑ نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے، تنہا ہو تو زندگی میں عیش عیش ہوتے ہیں۔''

''تعجب ہے، میں تو تنہا صرف بور ہوتا رہتا ہوں۔''

''اس لیے کہ یاروں سے مہینوں میں ملتے ہو، آ روزانہ آجایا کرو تو......'' ارسلان نے کہا اور اس کے دل دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

''تو؟'' اس نے پوچھا۔

''ایسے نہیں شاگردی اختیار کرو۔ اس کے بعد تمہار حالت زار پر توجہ دی جاسکتی ہے۔''

''شاگردی اختیار کرنے کے کیا طریقے ہوں گے؟'' اس نے نڈھال لہجے میں پوچھا۔

''ہوں...... بچہ کافی پریشان معلوم ہوتا ہے، اچھ ٹھیک ہے فی الحال تمہیں صرف یہ کرنا ہے کہ روزانہ شام کو سات بجے یہاں پر حاضری دینا ہوگی۔''

''بہت بہتر۔'' جمال نے جواب دیا۔

''فی الحال یہیں سے ابتدا کرو اور صرف آج اجازت دی جاسکتی ہے، کل سے معمولات پر عمل کیا جائے گا۔''

''جی بہتر۔'' جمال شاہ ہنستے ہوئے بولا۔

پھر کافی رات گئے اسے بہ مشکل واپسی کی اجازت مل سکی تھی۔

دوسرا دن چھٹی کا تھا، صبح دیر تک سوتا رہا کیونکہ رات بہت دیر تک جاگا تھا۔ تقریباً پونے گیارہ بجے داور نے ہی اسے اٹھایا تھا اور ناشتے کے لیے کہا تھا۔ چنانچہ داور کے کہنے سے اٹھنا پڑا۔

چھٹی کا دن بے اعتدالی کا دن ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ دوپہر کا کھانا تو گول ہی ہو چکا تھا...... شام کو چائے پی جس سے طبیعت کو کسی قدر فرحت محسوس ہوئی اور پھر وہ ارسلان کی طرف جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

آج تو نبیلہ سے ملاقات نہیں ہوگی۔ اس نے سوچا اور ایک لمحے کے لیے وہ اس کے خیالات میں کھو سا گیا۔ نبیلہ جسے وہ اس حیثیت سے نکال چکا تھا جس کے تحت اس نے پہلی بار نبیلہ کو [illegible] تھا۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا

ا نبیلہ سے ایک چھوٹی سی ملاقات اس کی زندگی پر بہت گہرا اثر چھوڑ گئی تھی۔ نبیلہ کی خوبصورت باتوں سے متاثر ہو کر ہی اس نے عورت کے بارے میں سوچا تھا اور یہ بھی اس کی اپنی سوچ تھی کہ نبیلہ چونکہ چھوٹی عمر کی ہے اس لیے اس کی طرف اس قسم کی نگاہ ڈالنا مناسب نہیں ہے۔ خاص طور سے اس جیسے شخص کے لیے۔ حالانکہ نبیلہ کے انداز سے یہ پتا چلتا تھا کہ وہ جمال شاہ سے کافی متاثر ہے۔

اس کے باوجود جمال شاہ اپنے ذہن میں نبیلہ کے لیے برا ارادہ نہیں پاتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر یہ معصوم لڑکی بہک بھی گئی تو اسے سنبھالنے کی کوشش کرے گا۔

شام کو ساڑھے چھ بجے وہ ارسلان کے مکان پر تھا۔ یہاں مشتاق، فاروق، ارسلان کے کچھ اور دوست بھی موجود تھے۔ گفتگو کا موضوع شاید وہی تھا کیونکہ ارسلان اسے دیکھتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

''لو...... میرا ذہین ترین شاگرد آگیا۔ کم از کم سعادت مند تو ہے، آؤ، بیٹے آؤ۔ میں نے تمہارے لیے سارے انتظامات کر لیے ہیں۔''

ارسلان بہت بے تکلف آدمی تھا۔ ارسلان نے اس کا باقی لوگوں سے تعارف کرایا۔ حالانکہ ان لوگوں سے ایک دن پہلے ملاقات ہو چکی تھی۔ اس کے بعد ارسلان نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا خیال ہے، پھر چلیں......؟''

''بالکل چلو۔'' جمال شاہ نے بھی اپنی کار وہیں چھوڑ دی اور ارسلان کی بڑی کار میں بیٹھ کر وہ سب چل پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد کار ایک خوبصورت عمارت کے باہر رک گئی۔ عمارت کے قریب پہنچ کر وہ سب اتر گئے۔ پھر ایک عمدہ ٹائلز کی روش سے گزر کر اندر عمارت کے دروازے تک پہنچ گئے جہاں باوردی چوکیدار کھڑا ہوا تھا۔ اس نے شیشے کا ایک بڑا دروازہ کھول دیا اور وہ سب اندر داخل ہو گئے۔ اندر داخل ہوتے ہوئے جمال شاہ چونکا ضرور تھا۔

جمال شاہ کو اس ماحول سے واسطہ تو نہیں پڑا تھا لیکن بہر حال وہ اجنبی بھی نہیں تھا۔ دنیا دیکھے ہوئے تھا اور یہ جانتا تھا کہ یہ بار ہے۔ ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں ہلکی سی الجھن پیدا ہوئی لیکن پھر اس نے سوچا کہ یہ لوگ جس انداز سے زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں، تو میں کیوں ان سے پیچھے رہوں۔

نجانے کیوں یہ باغیانہ خیالات اس کے ذہن میں [illegible] گئے تھے۔ ان لوگوں نے ایک میز سنبھال لی تھی۔

''پی ہے کبھی؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''نہیں! ابھی نہیں......''

''پارسا بن رہے ہو؟''

''استاد کے سامنے جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔'' جمال شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، بچے کے لیے ذرا ہلکی منگواؤ اور صرف تین پیگ۔'' ارسلان نے کہا اور ویٹر کو اشارہ کر دیا، ویٹر نزدیک آگیا اور ارسلان اسے آرڈر دینے لگا۔ اس نے ویٹر سے کہا۔ ''شرمیلا کہاں ہے؟''

''موجود ہیں جناب!'' ویٹر نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس سے کہو...... ارسلان صاحب بلاتے ہیں۔''

ویٹر نے ادب سے گردن جھکائی۔

''استاد۔'' اس نے ارسلان کو مخاطب کیا۔

''کیا۔ کہو کیا بات ہے؟''

''پی لوں گا تو گھر کیسے جاؤں گا؟''

''آج بہت ہلکی ہوگی اور اس کے باوجود تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' ارسلان نے کہا۔

شراب کے پہلے پیگ نے اس کے منہ کا ذائقہ خراب کر دیا۔ دوسرے پیگ پر شرمیلا آگئی۔ شوخ آنکھوں اور مسکرانے پر گالوں میں گڑھے پڑ جانے والی خوبصورت لڑکی۔ خوبصورت لباس اور اس سے اٹھتی ہوئی نفیس خوشبو سے اس کے خوش ذوق ہونے کا پتا چلتا تھا۔

''ہمارے نئے دوست۔ جمال شاہ، قابل احترام...... پہلی بار پی رہے ہیں اور جمال، یہ ہیں ہماری بہترین دوست شرمیلا۔''

''پلیز...... نائس ٹو میٹ یو۔'' شرمیلا نے اپنا نرم و گرم ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور دیر تک نہ چھوڑا۔ جمال کا بدن بھی گرم ہونے لگا۔

''پی چکے ہیں؟''

''پہلا پیگ۔'' ارسلان نے جواب دیا۔

''برا کیا...... اگر میرے ہی ہاتھ سے افتتاح ہوتا تو لطف ہی دوسرا ہوتا۔ خیر اب سہی۔'' اس نے جمال شاہ کے لیے ایک جام بنایا۔

''اوہ شرمیلا...... خیال رکھو، نیا پنچھی ہے۔''

''ان کی پرواز میں کمی نہ ہوگی۔ ہم شرابیوں کی دعا ہے۔'' شرمیلا نے ہنستے ہوئے پیگ جمال شاہ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جمال شاہ کو پہلا ہی پیگ سرور دینے لگا تھا۔
اب اس کے ذہن میں عجیب عجیب خیالات آرہے تھے۔ شرمیلا اسے آسمان سے اتری ہوئی حور لگ رہی تھی۔ اس نے شرمیلا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور شرمیلا اسے دیکھنے لگی۔
"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"
"میں تمہیں شاد کردوں گی۔" شرمیلا نے کہا۔
"تو لے جاؤ اسے...... تمہیں بخشا۔" ارسلان نے مسرور لہجے میں کہا اور شرمیلا گہری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ "ارے یاروں پر جان نچھاور...... یہ رکھو......" ارسلان نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر شرمیلا کے پرس میں ٹھونس دیے۔
اسے نہیں معلوم تھا کہ شرمیلا اسے کس طرح اور کہاں لے گئی۔ کوئی ہوش ہی نہ رہا تھا۔ ہاں صبح کو وہ ایک اجنبی بیڈروم میں تھا اور اس انداز میں تھا کہ...... خود ہل گیا۔ اسے خود سے شرم محسوس ہونے لگی۔ وہ جلدی سے اٹھ گیا اور پھر فوراً تیار ہو کر کمرے کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ دروازے سے نکلتے ہی اس کی مڈبھیڑ شرمیلا سے ہوگئی۔ رات میں اور اس وقت میں بہت فرق تھا، اس وقت وہ منحوس شکل لگ رہی تھی، اسے دیکھ کر مسکرائی۔
"ہیلو...... جمال شاہ۔"
"میں جانا چاہتا ہوں۔"
"ارے ناشتا وغیرہ نہیں کرو گے۔ چلے جانا ایسی بھی کیا جلدی ہے۔"
"سوری۔ مجھے پہلے ہی دیر ہوگئی ہے۔ دفتر بھی جانا ہے۔" اس نے معذرت آمیز انداز میں کہا، اس دوران میں اس نے ایک بار بھی شرمیلا سے نظریں نہیں ملائی تھیں اور اس کی اس کیفیت پر شرمیلا مسکرا رہی تھی۔
"جیسی تمہاری مرضی۔" اس نے کہا اور پھر وہ باہر تک اسے چھوڑنے آئی۔ جب وہ دروازے سے باہر نکلنے لگا تو بولی۔ "اب تمہیں کلب کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں جمال...... ہم دوست تو بن ہی چکے ہیں، جب دل چاہے چلے آنا۔"
"بہتر۔" اس نے جواب دیا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ پھر ایک ٹیکسی لے کر ارسلان کے مکان کی طرف چل پڑا۔ ارسلان تو موجود نہیں تھا۔ اس کی بیوی نے جمال کو کار کی چابی دی اور بتایا کہ ارسلان جاتے ہوئے یہ چابی اسے دے گیا تھا۔ گھر جانے کے بجائے وہ سیدھا دفتر کی طرف چل پڑا۔
گو لباس وغیرہ درست نہیں تھا۔ دفتر کے کئی لو نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس سے پہلے کبھی وہ اس حا میں دفتر نہیں آیا تھا۔ آج پہلی بار دفتر کے کام میں اس کا نہیں لگ رہا تھا اور ذہن میں عجیب خیالات آرہے تھے۔ ان خیالات سے پیچھا چھڑانے کے لیے خود کو کام میں مش رکھنا چاہتا تھا۔ نادیہ کے آنے پر بھی اس نے گردن اٹھائی۔ ویسے مخصوص خوشبو سے اس نے پہچان لیا تھا کہ نادیہ ہے۔ اس نے اپنے سامنے رکھی فائل بند کی پھر انداز میں مسکرا کر بولا۔
"فرمائیے مس نادیہ؟"
"کوئی کام نہیں ہے سر! میں آپ کی خیریت معا کرنے آئی تھی۔"
"کیوں مجھے کیا ہوا ہے؟"
"آپ شکل سے بیمار معلوم ہو رہے ہیں۔"
"اوہ......" وہ آہستہ سے بولا۔ "ہاں مس ناد میرے سر میں درد ہے۔"
"چھٹی کرلی ہوتی سر! آپ اب بھی فائلوں میں الجھ ہوئے ہیں۔" نادیہ کے لہجے میں بڑی اپنائیت تھی۔ اس لہجے نے اسے متاثر کیا اور وہ کسی قدر نرم ہوگیا۔
"چھٹی کرکے کیا کرتا مس نادیہ...... تنہا انسان ہوں گھر پر بھی پڑے رہ کر کیا کرتا۔" نادیہ نجانے کیوں خاموش ہوگئی، چند ساعت کی خاموشی کے بعد بولی۔
"آپ کے لیے چائے یا کافی منگواؤں سر؟"
"آج تو ناشتا بھی نہیں کیا میں نے۔"
"میں ابھی بھجواتی ہوں۔" نادیہ جلدی سے باہر کی طرف چلی گئی۔ اس کے باہر نکل جانے کے بعد بھی وہ دروازے کو گھورتا رہا۔ اسے رات کے واقعات کا بڑا رنج تھا۔
دوپہر کو مس ایملی تشریف لائیں، کسی کام سے ہی آئی تھیں۔ جمال شاہ کو دیکھ کر کافی دیر تک خاموش کھڑی رہیں۔
"فرمائیے مس ایملی؟"
"سر! یہ کچھ کاغذات ہیں لیکن آپ کچھ بیمار لگ رہے ہیں؟"
"نہیں، میں ٹھیک ہوں۔" اس نے کاغذات اپنے سامنے سرکا لیے۔ اس نے ایملی کی صورت دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔
"سر! کیا میری کسی بات سے آپ کو دکھ ہوا ہے؟"

"مس ایملی! براہ کرم آپ پہیلیاں نہ بجھوائیں، کیا کہنا چاہتی ہیں، صاف صاف کہیں۔" اس نے خشک اور ...درے لہجے میں کہا۔
"دراصل سر! میں محسوس کر رہی ہوں کہ ممکن ہے میری ...ہ سے آپ کسی الجھن کا شکار ہوں۔"
"اوہ......" جمال شاہ نے گہری سانس لی، ایملی کی بات اب اس کی سمجھ میں آئی تھی لیکن اس بات سے وہ ...راغ پا نہیں ہوا بلکہ اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
"مس ایملی! تشریف رکھیے اور فرمائیے کہ آپ میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہیں۔"
اس کے انداز سے ایملی گھبرا گئی۔ پھر وہ قدرے بدحواس لہجے میں بولی۔ "مم...... میرا کوئی غلط مطلب نہیں ہے سر...... سوری......" اور تیزی سے باہر نکل گئی۔
"بے وقوف غالباً سوچ رہی ہے کہ اس کے عشق میں ناکام ہو کر میری یہ حالت ہوئی ہے...... اونہہ۔"
شام تک وقت ایسی ہی فضول باتوں میں گزرا۔ کام بھی پوری دلجمعی سے نہیں ہوا تھا۔ پانچ بجنے والے تھے، چنانچہ وہ باہر نکل آیا اور کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھا تو اچانک ہی نبیلہ کا خیال آگیا۔ وہ چونک پڑا تھا، نبیلہ اب تک اس کے ذہن سے محو رہی تھی۔ اس کا سراپا جمال شاہ کی نگاہوں میں گھوم گیا۔
کار اس چوراہے تک پہنچ گئی تھی جہاں اسے نبیلہ نظر آتی تھی۔ چند ساعت کے بعد اس نے دور سے سفید لباس کو دیکھ لیا۔ وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اچانک نبیلہ کو دیکھ کر اسے بے حد خوشی ہوئی تھی۔
کار آہستہ آہستہ نبیلہ تک پہنچ کر رک گئی۔ نبیلہ نے مسکراتے ہوئے اسے سلام کیا اور پھر وہ دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔
دوسرے ہی لمحے وہ بھی اسے دیکھ کر چونک پڑی۔
"جمال صاحب خیریت؟" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
"جی ہاں بالکل خیریت ہے نبیلہ۔"
"نہیں، کوئی خاص بات ضرور ہے۔ آپ...... آپ ...ھ پریشان سے...... کچھ بیمار سے نظر آرہے ہیں؟"
"اب اس میں میرا کیا قصور ہے مس نبیلہ...... دراصل ...یں نے شیو نہیں بنایا۔ رات کو نیند پوری نہیں ہوسکی، اس کی ...ہ سے یہ حلیہ ہوگیا ہے۔" جمال شاہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
"اوہو...... یہ بات ہے۔" نبیلہ مطمئن ہوگئی۔ پھر بولی۔ "کل تو میں آپ کی طرف گئی تھی۔"
"میری طرف؟" وہ حیرت سے چونک پڑا۔
"جی ہاں، کل ممانی جان، پھوپی کے ہاں گئی تھیں، میں بھی ان کے ساتھ ہی تھی۔ ممانی جان سے میں نے کہا کہ یہاں میری ایک سہیلی رہتی ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، پھر بولی۔ "آپ ناراض تو نہیں ہوئے؟"
"نہیں......" جمال شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پھر کیا ہوا؟"
"بس ہوتا کیا...... آپ کے ہاں پہنچی تو ایک شخص باہر نکلا، کہنے لگا صاحب نہیں ہیں۔"
"مجھے بڑا افسوس ہے مس نبیلہ! آپ وہاں گئیں اور مجھ سے ملاقات بھی نہ ہوسکی۔"
"اس میں افسوس کی کیا بات ہے جمال صاحب! کل نہ سہی پھر سہی۔" نبیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"ہاں۔ ہاں ضرور تشریف لائیے۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی۔" جمال شاہ نے خلوص سے کہا۔
بس اب اس لڑکی کے بارے میں کوئی برا خیال ابھرتا ہی نہیں تھا۔ نجانے کیوں جمال شاہ کو اس سے عقیدت سی ہوگئی تھی۔ نبیلہ کی باتوں سے بھی اس قسم کا اظہار نہیں ہوتا تھا کہ وہ جمال سے ایک مرد ہونے کی حیثیت سے متاثر ہوئی ہے۔
"اب آپ گھر جا کر اپنا حلیہ درست کریں...... مجھے بالکل اچھے نہیں لگ رہے۔"
"بہت بہتر۔" اس نے بھی مسخرے پن سے جواب دیا۔ حسبِ معمول چوراہے کے قریب نبیلہ اتر گئی اور وہ آگے بڑھ گیا۔
جمال شاہ اپنے خیالوں میں گم گھر پہنچ گیا۔ چائے پینے کے دوران میں اس کے ذہن میں پھر وہی خیالات آگئے۔ تب اس نے سوچا۔
"ارسلان گری ہوئی حیثیت کا مالک نہیں ہے۔ سوسائٹی میں ایک مقام ہے، کیا شرمیلا کے ساتھ وہ نہیں گیا ہوگا؟ کیا اس کا دوست۔ سب ہی تو پیتے ہیں۔ سب ہی تو زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میں کیوں شرم سے کٹا جا رہا ہوں، یہ تو زندگی کی حقیقتیں ہیں، اعلیٰ سوسائٹی کا حصہ ہے۔"
اور اس نے محسوس کیا کہ ان خیالات نے اس کے ذہن کے بوجھ میں کمی کردی تھی۔ رات کو بھی سکون سے سویا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور دوسری صبح وہ ہشاش بشاش تھا۔ شیو بنا کر غسل کیا۔

آج دفتر میں کوئی خاص احساس ذہن میں بیدار نہیں ہوا۔ نادیہ اور ایملی دونوں ہی سے ملاقات ہوئی تھی لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ ہاں دوپہر کو ارسلان کا فون آیا اور اس نے ریسیور اٹھالیا۔

''مسٹر جمال شاہ۔''

''خادم ارسلان ہے۔''

''اوہ...... ارسلان...... خیریت؟''

''یہاں خیریت ہے، تم سناؤ۔''

''تمہاری دعا ہے۔''

''صرف دعا...... یا دوا بھی کارآمد ہوئی ہے؟''

''دونوں۔''

''بہت خوب...... آج کس وقت آرہے ہو؟''

''آج؟''

''ہاں، وعدہ بھول گئے؟''

''نہیں...... لیکن ارسلان...... دوسرے دن پریشانی ہوتی ہے۔''

''کیسی پریشانی؟''

''دفتر جانے کی...... کیوں نہ چھٹی کا دن رکھا جائے؟''

''جمال شاہ!'' ارسلان نے ڈانٹ کر کہا۔ ''زبان کھولتے ہو، استادوں کے سامنے۔''

''اوہ۔ معاف کیجیے گا استاد...... لیکن......''

''اس کا حل بھی سوچ لیا جائے گا۔ ویسے بھی آج کلب کا پروگرام نہیں ہے۔''

''پھر؟''

''ٹھیک سات بجے تم میرے محل پر پہنچ جاؤ۔''

''جی بہتر، تعمیل ارشاد ہوگی۔'' اس نے کہا اور ارسلان نے بائے کہہ کر فون بند کردیا۔ ریسیور رکھ کر مسکرانے لگا۔

سارے کام حسب معمول رہے۔ نبیلہ کو اس کی جگہ چھوڑا اور سات بجے سے پہلے ہی تیار ہوکر باہر نکل آیا۔

ارسلان کے ساتھ اس کے دوسرے دوست بھی تھے۔ جمال شاہ کا استقبال بہت پرتپاک انداز میں کیا گیا۔ وہ سب تیار تھے، اس کے پہنچتے ہی ارسلان نے کہا۔

''کیوں بھئی! چائے وغیرہ کا پروگرام ہے یا چلیں؟''

''میرا خیال ہے، چلو۔ فرخ منتظر ہوگا۔''

''اداس ہوگا بے چارہ۔'' ریاض نے کہا۔

''تب پھر چلو باقی کام اس کا ہے۔'' ارسلان نے کہا۔

''دونوں گاڑیاں لے چلتے ہیں۔'' فرید بولا اور تھوڑی دیر کے بعد دونوں کاریں ایک سڑک پر دوڑ رہی تھیں ارسلان، جمال شاہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی کار ریا چلا رہا تھا۔

''فرخ کی شادی کی سالگرہ ہے۔ اس کے والد بخش بہت بڑے مل اونر تھے۔ اپنی زندگی میں بے کنجوس، فرخ نے اس سے قبل کبھی سالگرہ نہیں منائی، ا نے تو اپنی شادی کی کوئی عمدہ پارٹی بھی نہیں دی تھی۔ ا لیے آج وہ ساری کسر پوری کررہا ہے کیونکہ محمد بخش خدا پیارے ہوچکے ہیں۔''

''خوب۔ تو میں تو بن بلایا مہمان رہا۔'' جمال شاہ۔ کہا۔

''فرخ بے تکلف دوست ہے۔ یہ خیال ذہن میں لاؤ۔''

وہ سب فرخ کی خوبصورت کوٹھی میں داخل ہوگئے فرخ بلاشبہ انتہائی خوش مزاج نوجوان تھا۔ اس کی بیوی بھ اس سے کم نہیں تھی۔ وہ سارے لوازمات یہاں موجود تھے ج ایک جدید ترین پارٹیوں میں ہوتے ہیں۔ رقص وسرود شراب وکباب، قہقہے، ہنگامے...... جمال شاہ نے بھی پی لی۔ کئ لڑکیاں بھی اس کے قریب آئیں۔ ان میں نسرین بھی تھی جو اس کے بہت قریب آگئی تھی۔ اس نے شراب پینے کے بعد نہایت بے تکلفی سے جمال شاہ کو بوسہ بھی دیا لیکن آج جمال نارمل ہی رہا۔ رات تین بجے اس نے اجازت طلب کرلی۔ ذہن پر سرور طاری تھا لیکن ڈرائیونگ میں اسے کوئی دقت نہیں پیش آئی اور وہ گھر پہنچ گیا اور اس کے بعد یہ معمول بن گیا۔ دوسرے یا تیسرے دن کوئی نہ کوئی پروگرام بن جاتا۔

نبیلہ کا معمول بھی وہی تھا۔ اسے نبیلہ سے ایک عجیب سی انسیت ہوگئی تھی۔ کہیں بھی ہوتا، پانچ بجے نبیلہ کو اس کے گھر کے قریب چوراہے پر ضرور چھوڑ دیتا۔ پھر ایک دن نبیلہ اس کے گھر پہنچ گئی۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے بڑی محبت سے نبیلہ کی خاطر مدارات کی۔ نبیلہ خود ہی اس کے پورے گھر میں گھومتی رہی۔ اس نے کچن میں جاکر کھانا پکانے میں بھی مدد کی اور پھر دوپہر کا کھانا بھی اس کے ساتھ کھایا۔

نبیلہ کے والدین مرچکے تھے۔ ماموں اور ممانی نے پرورش کی تھی۔ ممانی کی بھی ایک بیٹی تھی لیکن وہ اسے بھی اپنی بیٹی شبانہ کی طرح ہی چاہتی تھیں۔

پھر نبیلہ چلی گئی اور اس نے شراب کی بوتل نکال لی۔

اب وہ روزانہ پینے لگا تھا۔ اس کے بغیر اسے سکون نہیں ملتا تھا۔ گناہ وثواب کا تصور اس کے ذہن سے مٹ چکا تھا۔ شراب پینے کے بعد اسے کسی ساتھی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ وہ اکثر سخت بے چین ہوجاتا تھا۔ ایسے میں اسے خیال آتا کہ اگر اس کی شادی ہوگئی ہوتی تو......

چچا، چچی کو اس نے رقم بھیجنا بند کردی تھی۔ اسے اب ان لوگوں پر غصہ آنے لگا تھا۔ آخر یہ خراج وہ کب تک ادا کرتا رہے گا۔ کوئی ٹھیکا لیا ہوا ہے۔ نبیلہ اسی دوران کئی بار اس کے گھر آچکی تھی اور وہ یہاں آکر بہت خوش ہوتی تھی۔

یہ چھٹی کا دن تھا۔ موسم ابر آلود تھا اور اس کے بدن میں انگڑائیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ ارسلان کو فون کیا تو اس کی بیوی نے جواب دیا کہ وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ ریاض اور دوسرے لوگوں سے اتنی دوستی نہیں تھی۔ بہرحال اس نے فیصلہ کیا کہ وہ گھر پر ہی رہے گا...... لیکن کوئی ساتھی...... کوئی حسین ساتھی، شراب کی تلخی، جلن دور کرنے کے لیے کسی ساتھی کی طلب شدت رکھتی تھی اور وہ بڑی بے چینی محسوس کررہا تھا۔

''آہ...... زندگی کس قدر تنہا ہے، میں کتنا اکیلا ہوں۔'' اس نے سوچا اور اسے خود پر رحم آنے لگا۔ گھر سے باہر کی دنیا میں بے شمار وقتی ساتھی موجود ہیں لیکن یہ ساتھی...... خود اپنا مذاق ہوتے ہیں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اپنے نہیں ہیں، انہیں ہماری ذات سے دلچسپی نہیں ہے۔ بس وہ سکون کے تاجر ہیں۔ معاوضہ لیتے ہیں، قربت بخش دیتے ہیں...... بس۔

وہ نشست گاہ میں پہنچ گیا۔ شراب نکالی اور سامنے رکھ لی اور پھر شراب کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا۔ شراب اس کے ذہن پر اثر کرتی رہی لیکن سکون اب بھی نہیں ملا تھا۔ ایک بے چینی، بے کلی، اب بھی باقی تھی۔ گھٹائیں امڈ امڈ کر آرہی تھیں اور موسم بڑا سرور انگیز ہوگیا تھا۔

آج اس نے کچھ زیادہ پی لی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ سارے احساسات شراب میں ڈوب جائیں، کوئی محرومی، کوئی طلب باقی نہ رہے لیکن اچانک نجانے کون آگیا تھا؟ بیل کئی بار بجی۔ تب اس نے شراب کی بوتل الماری میں بند کردی۔ ہونٹ خشک کیے اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

لیکن جونہی دروازہ کھولا، اس کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ ایک حسین نسوانی وجود اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''یہ سونے کا وقت ہے۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ آپ شاید ہی گھر پر ملیں۔'' نبیلہ کی آواز ابھری۔

''آؤ......'' اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ آج نبیلہ سے اس کی انسیت، اس کا احساس بدل گیا تھا۔ یہ وہ معصوم اور نوخیز لڑکی نہیں تھی جس کے لیے وہ اپنے ذہن کے خانوں میں تبدیلیاں کرچکا تھا اور اس نے اچھے عورت کی حیثیت سے دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس کے لیے ایک مقدس جذبہ بن گئی تھی، وہ جذبہ جسے کوئی نام نہیں دیا گیا تھا سوائے اس کی نسوانیت کی حفاظت کے لیکن شراب نے اس سے اس کے وہ خیالات چھین لیے۔ اسے ہمت بخش دی اور اس وقت تو اسے کسی حسین ساتھی کی شدت سے ضرورت محسوس ہورہی تھی۔

چنانچہ اس کی نگاہوں کے انداز بدل گئے۔

''سو گئے تھے آپ؟'' نبیلہ نے حسب معمول بے تکلفی سے پوچھا اور گھر میں داخل ہوگئی۔ اس کے ذہن میں کوئی جھجک نہیں تھی۔ وہ پہلی بار یہاں نہیں آئی تھی۔ اول تو وہ فطرتاً بے باک تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ کئی بار جمال شاہ کے گھر آچکی تھی۔ اس کے ساتھ کار میں سفر کرچکی تھی۔ ایک مرتبہ بھی اس نے جمال شاہ کے انداز میں کوئی خامی نہیں پائی تھی۔ پھر وہ شک کیسے کرسکتی تھی۔

''سویا نہیں تھا۔'' جمال شاہ نے جواب دیا۔

''آنکھیں تو یہی بتاتی ہیں۔''

''اوہ...... آنکھوں پر اعتبار مت کیا کرو نبیلہ۔''

''خوب...... خوب موسم ہی شاعری کا ہے۔ آپ کا کیا قصور۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی اور وہ خود بھی ہنسنے لگا پھر اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا تھا۔

''بیٹھو......'' اس نے کہا اور وہ بے تکلفی سے اپنا پرس رکھ کر بیٹھ گئی۔

''تو پھر کیا کررہے تھے جناب؟''

''اپنی الجھنوں سے نبرد آزما تھا۔''

''الجھنوں سے؟''

''ہاں۔''

''یہ اچانک کون سی الجھنیں پیش آگئیں؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''زندگی بذات خود بہت بڑی الجھن ہے نبیلہ!''

''اوہ...... یہ موسم انسان کو شاعرانہ ذوق ضرور بخش دیتا ہے لیکن اس شاعری میں یاسیت نہیں شامل ہونی چاہیے۔''

''وجہ ہے اس کی؟''

''کیا وجہ ہے، مجھے بتایئے۔'' نبیلہ نے اس انداز میں کہا جیسے وہ وجہ جاننے کا بہت بڑا حق رکھتی ہو۔

''تمہارے ماموں ممانی کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا ہے؟''

''بہت اچھا۔ وہ مجھے خود سے الگ نہیں سمجھتے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کیا وہ تمہارے مستقبل کے بارے میں سوچتے ہیں؟''

''کیوں نہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ میں ایک اچھی زندگی حاصل کرلوں۔''

''تب تم میرا درد نہیں سمجھ سکتیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مجھ میں اور تم میں فرق ہے۔ تم ایک خوش مزاج لڑکی ہو، اچھا گھر اور اچھی زندگی، اچھے ساتھی رکھتی ہو، اس کے برعکس میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرا ماضی زیادہ خوشگوار نہیں ہے اور حال بھی۔ تنہائی کی زندگی میرے لیے موت ہے۔ اس خوشگوار موسم میں بھی میں تنہائیوں میں گرفتار ہوں۔'' اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اوہ...... جمال صاحب، آپ...... آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ آپ خود اپنے بارے میں سوچیے۔ ایک اچھی شریک زندگی آپ کی تنہائی دور کردے گی۔''

''میں اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہا۔ نبیلہ مجھے کسی ایسے ہمدرد کی ضرورت ہے جو...... جو میرے بارے میں سوچے، میرے لیے کچھ کرے اور یوں لگتا ہے جیسے...... جیسے...... میری زندگی میں ایسا کوئی ہمدرد نہ ہو۔''

''ایسی بات تو نہیں ہے جمال صاحب...... کیا آپ مجھے بھی اپنوں میں نہیں سمجھتے؟'' نبیلہ ہمدردی سے بولی۔

''تم...... تم میرے لیے کیا کرسکتی ہو؟'' جمال کی آنکھوں میں آگ جل اٹھی۔ نبیلہ اس وقت اسے ایک حسین دوشیزہ نظر آرہی تھی۔ شراب کی آگ اس کے رگ و پے میں سلگ رہی تھی۔ سارے پاکیزہ خیالات جل گئے تھے۔ وہ اس وقت صرف ایک دوشیزہ تھی، ایک نوجوان دوشیزہ......

''آپ کے لیے اپنے دل میں ایک عقیدت رکھتی ہوں، ایک ایسا مقام، ایک ایسا جذبہ رکھتی ہوں جمال صاحب! جو بہت بلند ہوتا ہے۔ شاید میں آپ کے لیے سب کچھ کرسکتی ہوں۔''

''سب کچھ؟'' اس نے نبیلہ کو جلتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔

''ہاں سب کچھ۔'' نبیلہ نے جواب دیا اور وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے بدن میں سرور انگیز لہریں دوڑ رہی تھیں۔ شراب اس کے ذہن کو شکنجے میں کستی جارہی تھی۔ تب وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ آگے بڑھا اور اس نے نبیلہ کا بازو پکڑلیا۔

''آؤ...... اٹھو۔'' اس نے کہا اور نبیلہ مسکراتے ہوئے اٹھ گئی۔ وہ اس کے ساتھ ڈرائنگ روم سے نکل آیا۔ خواب گاہ میں پہنچ گیا اور پھر اس نے خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ نبیلہ بھونچکا سی ہوکر اسے دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔

''کیا سمجھیں؟'' اس نے خون آلود نگاہوں سے نبیلہ کو گھورا۔

''میں...... میں کچھ نہیں سمجھی۔'' وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

''اپنا وعدہ پورا کرو...... سمجھیں۔ تم نے کہا تھا کہ تم میرے لیے سب کچھ کرسکتی ہو۔ اس موسم نے میرے ذہن میں آگ لگادی ہے۔ میں...... میں تمہیں طلب کرتا ہوں، اپنا وعدہ پورا کرو۔''

''جمال شاہ......'' نبیلہ کے منہ سے چیخ سی نکل گئی۔

''جمال صاحب...... یہ آپ...... آپ کو کیا ہوگیا ہے؟''

''میں کسی اپنے کی تلاش میں سرگرداں ہوں نبیلہ...... دیکھنا چاہتا ہوں کون میرے لیے کیا کرسکتا ہے۔ بولو...... تمہارا کیا جواب ہے؟''

''جمال صاحب، آپ...... آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ میں تو آپ کو عظیم انسان کی حیثیت دیتی آئی ہوں۔ آپ تو شرافت میں میرا آئیڈیل ہیں۔''

''یہ سب خوبصورت الفاظ ہیں نبیلہ، انسان کچھ ضرورتوں کا غلام ہے اور یہ ضرورتیں اس کی مجبوری ہیں۔ ابھی تم دعویٰ کررہی تھیں۔ میں تمہارا امتحان لے رہا ہوں۔'' شراب نے جمال شاہ کو بہت دلیر بنادیا تھا۔

''جمال صاحب! کیا ایک امتحان لینے کے لیے آپ مجھے، اپنی ہمدرد کو قتل کردیں گے؟ جمال صاحب! مجھے دنیا کا زیادہ تجربہ نہیں ہے لیکن عورت اسی وقت تک خود پر ناز کرسکتی ہے جب تک وہ پاکباز ہو۔ جب وہ بچی سے جوان ہوتی ہے، اس کے ذہن میں کوئی محبوب بھی ہوتا ہے اور جمال صاحب مجھے یہ الفاظ نہیں ادا کرنے چاہئیں کیونکہ میرے دل میں آپ کے لیے بڑا احترام ہے۔ بالکل اسی مانند آپ پر اعتماد ہے جتنا اپنے کسی بڑے بھائی پر، اپنے باپ پر اور چچا پر کرسکتی ہوں۔ اسی اعتماد کے سہارے میں بے وقوفی میں یہاں چلی آتی تھی اور جمال صاحب یہ اعتماد چند لمحات میں پیدا نہیں ہوگیا تھا۔ ایک عرصہ لگا ہے مجھے یہ اعتماد پیدا کرنے میں...... مجھے آپ کے سامنے ایسے جملے نہیں کہنے چاہئیں لیکن آپ نے مجبور کردیا ہے۔ ہر لڑکی کے ذہن میں ایک محبوب

ہوتا ہے اور...... اور وہ اسے اپنا شوہر بنانے کے بعد پورے طور سے خود کو اس کے حوالے کرکے خوشی محسوس کرتی ہے۔ اگر آپ پر کچھ وحشتیں مسلط ہوگئی ہیں تو سوچیں...... غور کریں، نبیلہ کے دل میں آپ کے لیے محبت تھی، انسیت تھی۔ اس لیے وہ یہاں آجاتی تھی۔ آپ اس معصوم اور بے غرض محبت کا یہ صلہ دینا چاہتے ہیں۔''

''لیکن یہ دعویٰ خود تم نے کیا ہے نبیلہ کہ تم میرے لیے سب کچھ کرسکتی ہو۔ یہ دعویٰ کرنے کے بعد تمہاری یہ باتیں بے معنی ہیں۔''

''اگر آپ کی کوئی چھوٹی بہن ہوتی تو وہ اس سے زیادہ دعوے کرسکتی تھی لیکن اس وقت کیا آپ اس سے بھی یہی سب کچھ کہتے؟''

''میں نہیں جانتا کیونکہ میری کوئی چھوٹی بہن نہیں ہے۔''

''مجھے سمجھ لیں۔ گناہ کے خیال کو ذہن سے نکال دیں۔''

''نبیلہ! بارش کی دعا پوری ہوئی ہے، ضرورت گناہ نہیں ہوتی۔ میری دعا میری تنہائی تمہیں یہاں لائی ہے اور اس وقت تم صرف ایک نوجوان لڑکی ہو، صرف ایک نوجوان لڑکی۔''

''جمال صاحب! میں آپ کی بہن ہوں...... میں آپ کی بیٹی کی عمر کی ہوں جمال صاحب آپ کی بیٹی۔''

''میری کوئی بیٹی نہیں ہے۔''

''جمال صاحب...... میں نے آپ کو کیا سمجھا تھا اور آپ کیا نکلے؟ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی...... اس سلوک پر...... اگر آپ کی کوئی بیٹی ہوتی۔ وہ بھی آپ کو گولی مار دیتی۔ مجھے جانے دیں جمال صاحب! میرے دل میں کوئی اور ہے۔ میری منگنی ارشد سے ہوچکی، میں اسے دل سے چاہتی ہوں۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے گیا ہے۔ میں...... اس کی امانت ہوں۔ جمال صاحب! اگر بہن اور بیٹی کے لفظ سے آپ کے کان ناآشنا ہیں تو میں آپ کو انسانیت کا واسطہ دیتی ہوں۔''

''بکواس مت کرو۔'' جمال شاہ اب دیوانہ ہوگیا تھا۔ شراب کا نشہ اس پر چڑھ رہا تھا۔

''لیکن میں تمہاری بھینٹ نہیں چڑھوں گی کتے۔ میں لڑ رہی ہوں لیکن مرنا تو جانتی ہوں، مر تو سکتی ہوں۔''

''تو مر جاؤ......'' جمال شاہ نے کہا۔

نبیلہ نے اس کے بازو میں دانت گاڑ دیے تھے۔

جمال شاہ نے تلملا کر اس سے اپنا بازو چھڑایا۔ وہ قوی ہیکل تھا اور شراب کے نشے میں غرق تھا۔ اس نے نبیلہ کو اٹھا کر مسہری پر پٹخا لیکن نشانہ خطا ہوگیا۔ نبیلہ مسہری کے بجائے نیچے جاگری۔ اس کی نازک گردن ایک طرف مڑ گئی...... ایک ہلکی سی آواز اس کے منہ سے نکلی اور پھر وہ بری طرح تڑپنے لگی۔

جمال شاہ نے جھک کر اسے دوبارہ اٹھایا اور بستر پر پٹخ دیا لیکن خوف اور تکلیف سے نبیلہ کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔ وہ مسہری پر بھی تڑپ رہی تھی۔

''اداکاری مت کرو نبیلہ۔'' جمال شاہ نے کہا۔ لیکن نبیلہ اب سرد ہوتی جارہی تھی، پھر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں اور بدن ساکت ہوگیا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا جسے دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ اس کا نشہ کم ہونے لگا۔ اس نے نبیلہ کو جھنجوڑا...... لیکن معصوم لڑکی نے جان دے دی تھی۔ وہ اپنے اعتماد کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ جمال شاہ کا سارا نشہ ہرن ہوگیا۔ اسے احساس ہوگیا کہ نبیلہ مرچکی ہے اس نے اس کی نبض دیکھی، آنکھیں دیکھیں اور اس کے پورے بدن سے پسینا پھوٹ پڑا۔

''آہ یہ مر کیسے گئی...... آہ...... آہ...... یہ مر کیسے گئی......'' اس نے تھوک نگلا۔ پھر اس نے نبیلہ کے پورے بدن کو ٹٹولا۔ گردن اٹھائی، تب اسے احساس ہوا کہ نبیلہ کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

شراب کا سارا نشہ اتر چکا تھا۔ اسے احساس ہورہا تھا کہ اس نے کیا، کیا ہے۔ اس نے خون کردیا ہے؟ ایک گھناؤنا قتل...... اس نے اعتماد کا قتل کردیا ہے۔ اس نے پوری دنیا پر تھوک دیا ہے، وہ مجرم ہے...... آہ یہ جرم......

اس کا سارا وجود پگھل رہا تھا۔ وہ اپنی مکروہ فطرت کے بارے میں سوچ رہا تھا...... آہ، یہ کیا ہوگیا، یہ میں نے کیا کیا...... نبیلہ...... وہ معصوم وجود! نبیلہ کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ در و دیوار اس کی ترجمانی کررہے تھے۔

''میں آپ کی بیٹی ہوں۔''

''میں آپ کی بہن ہوں۔''

''اگر آپ کی بیٹی ہوتی تو وہ بھی آپ کو گولی ماردیتی۔''

''اللہ مجھے جانے دیں۔''

''خون...... خون...... خون۔''

''پھانسی...... پھانسی...... پھانسی......'' بے شمار آوازیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں اور اس کا دل بیٹھا جارہا تھا۔

''می لارڈ! نبیلہ معصوم تھی۔ ملزم جمال شاہ نے اسے ورغلا کر اپنے گھر بلایا اور اس کی عصمت لوٹنے کی کوشش کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن اس معصوم لڑکی نے جان دے دی۔"

"تم قاتل ہو اس لیے عدالت...... دفعہ تین سو دو۔ تمہیں موت کی سزا دیتی ہے۔"

"آہ...... آہ......" اس نے دونوں کان بند کر لیے۔ سامنے ہی نبیلہ اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے گھور رہی تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیختے ہوئے یہاں سے بھاگ نکلے۔ لیکن...... لیکن موت کا پھندا...... آہ، موت کا پھندا اسے اپنے حلق پر تنگ ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی زبان باہر نکلی پڑ رہی تھی۔

"اب کیا کروں...... اب کیا کروں؟" اس نے وحشت سے چاروں طرف دیکھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے دیواریں بھی اس پر نفرین کر رہی ہوں۔ جیسے وہ اسے دھمکی دے رہی ہوں کہ وہ اس کا راز کھول دیں گی۔

"راز...... ہاں راز چھپانا ضروری ہے۔ دیواروں کی زبان کہاں ہوتی ہے، وہ اس کا کیا بگاڑ سکیں گی؟ لیکن...... اب کیا، کیا جائے۔ آہ...... اب کیا، کیا جائے...... میں قاتل ہوں، میں قاتل ہوں۔" وہ خود سے دہشت زدہ تھا۔ "آہ، نبیلہ...... نبیلہ...... تم میرے ہاتھوں ماری گئیں۔ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ شراب...... ہاں شراب...... نے میرے حواس چھین لیے تھے۔ وہی تو بول رہی تھی میرے اندر۔ آہ...... کاش میں شراب نہ پیتا...... کاش نبیلہ یہاں نہ آتی۔"

"نبیلہ......!" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ وہ نبیلہ کی لاش سے لپٹ گیا۔ اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ لیکن اب یہ آنسو نبیلہ کو زندگی نہیں دے سکتے تھے۔ "میں، میں ارسلان کو قتل کر دوں گا۔ میں ریاض اور دوسرے لوگوں کو بھی قتل کر دوں گا۔ انہوں نے ہی مجھے اس ذلیل شے کا عادی بنایا ہے۔ میں...... میں......"

"لیکن...... لیکن انہیں قتل کر کے بھی کیا ملے گا۔ دنیا کی کوئی عدالت انہیں مجرم ثابت نہیں کر سکتی۔ قتل میں نے کیا ہے، پھانسی بھی مجھے ہو گی۔"

"نہیں...... نہیں میں مرنا نہیں چاہتا۔ موت اگر خاموشی سے آجائے تو...... ٹھیک ہے لیکن یہ رسوائی کی موت...... یہ موت مجھے گوارہ نہیں ہے، مجھے...... مجھے بھاگ جانا چاہیے، مجھے...... فوراً یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔"

اس کی ذہنی حالت دیوانوں کی سی تھی۔ ضمیر پوری طرح جاگ رہا تھا اور اب ایسے نشتر چلا رہا تھا کہ پورا وجود پھوڑا بن گیا تھا۔ پورا جسم انگارے کے مانند دہک رہا تھا۔ دماغ ابلا پڑ رہا تھا۔

وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ کئی گلاس ٹھنڈا پانی پی... منہ دھویا۔ حواس مجتمع کر کے انتہائی جدوجہد کی اور پھر ایک... صوفے پر گر پڑا۔ سر تھام لیا۔

"میرے معبود...... میرے معبود میں سزاوار ہوں... لیکن میں اس رسوائی سے نہیں مرنا چاہتا...... لیکن میں... کروں۔" اس کے منہ سے رندھی ہوئی آواز نکلی۔ آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

پھر اسے داور یاد آگیا جو چھٹی لے کر گیا تھا...... کہیں داور واپس نہ آجائے۔ اس طرح تو یہ راز کھل جائے گا۔ اسے کیا پڑی ہے کہ وہ یہ راز چھپائے...... اوہ...... وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ اسے یہ لاش چھپا دینی چاہیے۔ کسی کو کیا خبر...... رات کی تاریکی میں وہ یہ لاش کہیں پھینک دے گا ہاں اس طرح...... یہ راز...... راز رہے گا۔

"لیکن...... لیکن......" اس کے ذہن پر ہتھوڑے برس رہے تھے۔ پھر کسی قدر حواس قائم ہوئے۔ "کسی کو کیا معلوم کہ وہ یہاں آئی تھی۔ ہاں اس بارے میں تو کوئی نہیں جانتا۔ پھر کیوں نہ خاموشی سے اس لاش کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ کسی ندی...... یا کسی ویرانے میں لاش پھینک دی جائے۔ کوئی نشان نہ چھوڑا جائے تو کسی کو کیا پتا چلے گا۔"

وہ اٹھا...... جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا تھا۔ اب اپنی زندگی بچانے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ رونے اور پچھتانے کے لیے تو عمر پڑی ہے۔ دل کو کچھ اور تقویت ہوئی، وہ اٹھا اور ایک راہداری میں ٹہلنے لگا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ فوری طور پر نبیلہ کی لاش ڈکی میں چھپا دے۔ تب وہ واپس نبیلہ کی لاش کے قریب پہنچ گیا۔

لاش کو دیکھ کر پھر اس کا کلیجا منہ کو آنے لگا۔ لیکن پھر اس نے دل مضبوط کیا اور نبیلہ کے لباس کی تلاشی لی۔ وہ سادہ لڑکی کسی زیور سے آراستہ نہیں تھی صرف اس کا پرس تھا جسے کھول کر دیکھنے پر صرف چند روپوں کے علاوہ کچھ نہ نکلا۔ وہ باہر نکل آیا۔ کار کو دروازے کے بالکل قریب لے آیا۔ اس کی ڈکی کا لاک کھول دیا اور پھر اندر جا کر نبیلہ کی لاش کو اٹھا لایا۔

"مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ نبیلہ...... میں نے ظلم کیا ہے، اس کے علاوہ اور کیا کہوں۔ سارے الفاظ مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔" وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولا اور پھر نبیلہ کی لاش لے کر باہر نکل آیا۔ اس نے لاش ڈکی میں رکھی۔ نبیلہ کا پرس بھی رکھا اور ڈکی بند کر دی۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے ڈکی کو لاک کر دیا۔ نبیلہ کا پرس بھی اس نے لاش کے ساتھ ہی رکھ دیا تھا۔ پھر وہ اندر آ گیا۔

اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ یہ جو کچھ ہوا تھا، اس کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ نجانے کس طرح وہ خود کو قابو میں کیے ہوئے تھا۔ اذیت کے یہ لمحات بڑے جان لیوا تھے۔ ہر لمحہ یوں لگتا تھا جیسے دل اچھل کر حلق میں آجائے گا۔ ذرا سی آہٹ پر آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا تھا۔

پھر جب بیل بجی وہ پورے بدن سے کانپ گیا۔ اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ کوشش کے باوجود وہ کھڑا نہ ہو سکا۔ نہ جانے کون ہے۔ نہ جانے کون ہے۔ لیکن باہر کا دروازہ بند نہیں تھا۔ آنے والا اندر داخل ہو گیا اور پھر وہ اس کے پاس بھی پہنچ گیا...... یہ داور تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔

"داور...... مجھے پانی پلاؤ۔" اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ چند ساعت کے بعد وہ پانی لے کر آگیا اور جمال نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے داور کے حوالے کر دیا۔

"اور لاؤں صاحب؟"

"بس۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"صاحب طبیعت خراب ہے کچھ؟"

"ہاں...... کوئی خاص بات نہیں۔ بس سینے میں درد ہو رہا ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ڈاکٹر صاحب کو لاؤں؟" داور نے ہمدردی سے کہا۔

"ارے نہیں داور ایسی کوئی بات نہیں۔ تم جلدی آگئے؟"

"ہاں۔ صاحب بس شادی میں شریک ہو گیا۔"

"ٹھیک ہے۔ آرام کرو......"

"کھانا تیار کروں صاحب؟"

"نہیں...... کھانا نہیں کھاؤں گا میں۔ ذرا جانا بھی ہے، تم میرے کپڑے وغیرہ نکال دو۔"

"بہت اچھا صاحب!" داور نے کہا اور باہر نکل گیا۔ وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ جیسے کوئی بڑا خطرہ ٹل گیا ہو۔ داور نے لباس تیار کرنے کی اطلاع دی اور وہ باتھ روم میں چلا گیا۔

ٹھنڈے پانی کی پھواروں کے نیچے وہ دیر تک بیٹھا پھر باہر نکل آیا۔ بال وغیرہ خشک کیے اور پھر لباس پہننے لگا۔ اس کے بعد وہ باہر نکل گیا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا۔ اب اسے پوری ہمت سے کام لینا ہے۔ دو ہی باتیں تھیں یا تو خودکشی کر لے یا پھر ہمت سے کام لے کر جان بچائے۔ ابھی تک اس کے ذہن میں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ اس لاش کو ٹھکانے لگا سکے۔ وہ ویرانوں میں گھومتا رہا اور پھر ایک ٹوٹے پل کے نزدیک جگہ چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا، اس نے ڈکی کھولی اور نبیلہ کی لاش نکال لی۔ اس کا پرس ہاتھ میں لیا اور آنسو بہاتے ہوئے پل کے نیچے پہنچ گیا۔

"آہ نبیلہ میرا آخری ظلم...... میں تجھے کفن بھی نہیں دے سکا۔ نبیلہ! میں تجھ سے معافی نہیں مانگوں گا کیونکہ میرا جرم قابل معافی نہیں ہے۔ تیرا میرا فیصلہ ضرور ہو گا۔ خدا کے حضور بھی میں اپنے جرم کی معافی نہیں مانگوں گا کیونکہ میں نے ناقابل معافی جرم کیا ہے۔"

اس نے نہایت احترام سے لاش کو ایک جگہ رکھا اور اس کا پرس اس کے نزدیک رکھ دیا اور آنسو بہاتے ہوئے واپس چل پڑا۔

اسی وقت دور سے ایک روشنی اس پر پڑی اور وہ اچھل پڑا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے کار کی طرف چھلانگ لگائی۔ روشنیاں برق رفتاری سے اسی طرف آرہی تھیں۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور پوری رفتار سے چھوڑ دی لیکن اچانک ہی اس کے کانوں میں سائرن کی آواز گونجی اور اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر کانپ گئے۔ یہ کوئی پیٹرول کار تھی اور سائرن بجا کر اسے رکنے کا اشارہ کر رہی تھی، اس نے روشنیاں بجھا دیں تاکہ کار کا نمبر نوٹ نہ کیا جا سکے۔ اس کے ساتھ ہی ایکسی لریٹر پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا اور کار رفتار پکڑنے لگی۔ سوئی ستر سے گزر کر اسی اور پھر نوے پر پہنچ گئی۔ روشنیاں کافی پیچھے رہ گئی تھیں۔

"ممکن ہے، کار رک گئی ہو...... وہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ میں وہاں کیا کر رہا تھا۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ پہلے وہ مجرم کو پکڑنا پسند کریں گے۔ صورت حال بگڑ گئی ہے اور...... اور شاید سزا کا دور شروع ہو گیا ہے۔"

پھانسی کا پھندا اس کے پیچھے..... دوڑ رہا تھا اور وہ پوری قوت سے کار دوڑا رہا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے اس نے سوچا کہ کار کا نمبر دیکھ لیا گیا ہو۔ پولیس اس جگہ کو ضرور دیکھے گی اور...... اور اسے نبیلہ کی لاش مل جائے گی۔ کار کے نمبر سے اس کے بارے میں آسانی سے پتا چل جائے گا اور پھر پولیس اس کے گھر پہنچ جائے گی اور داور سے اس بات کی تصدیق ہو جائے گی کہ نبیلہ یہاں آئی تھی۔

"آہ...... پھندا تیار ہو گیا ہے اب کیا کروں؟" جمال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاہ نے اپنی جیب ٹٹولی، اتفاق ہی تھا کہ عادتاً اس نے اپنا پرس جیب میں ڈال لیا تھا۔ پرس میں کافی رقم موجود تھی ''کچھ کرنا ہوگا، کچھ کرنا ہوگا۔''

پولیس کار کو وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا اور اب وہ شہر کے ایک بارونق علاقے میں تھا۔ اس نے ایک سنیما ہاؤس کے سامنے کار روک دی اور پھر نیچے اتر آیا۔ کار کی چابی ایک گٹر میں پھینک دی اور پھر وہاں سے کافی دور آ کر ایک ٹیکسی روکی اور اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔

اب یہ جگہ چھوڑ دینا ہی مناسب ہے۔ اس کی تقدیر ہمیشہ کے لیے تاریک ہو چکی ہے، اب وہ ایک مجرم ہے، قاتل ہے۔ پولیس اسے قبر میں بھی نہیں چھوڑے گی۔ اسٹیشن پہنچ کر اس نے ٹیکسی کا بل ادا کیا اور اندر پہنچ گیا۔ سب سے پہلی ٹرین کا وقت دیکھا جو صرف دس منٹ کے اندر روانہ ہونے والی تھی۔ اس نے جلدی سے ٹکٹ خرید لیا اور ٹرین میں جا بیٹھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بہت تیز تھیں اور اس وقت تک وہ بے سکون رہا جب تک ٹرین چل نہ پڑی۔

کمپارٹمنٹ میں بہت سے لوگ تھے۔ ان کی نگاہیں اس کے بدن میں چبھ رہی تھیں لیکن اس نے خود کو سب سے لاتعلق کر لیا اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔

ابتدا میں کچھ گہما گہمی رہی اور اس کے بعد مسافر اونگھنے لگے۔

ساری رات وہ عجیب سی کیفیت میں رہا۔ آنکھ جھپک جاتی اور عجیب عجیب خواب نظر آنے لگتے، وہ چونک پڑتا اور پھر دیر تک نیند نہ آتی۔ رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ صبح کو ناشتا کرنے کو بھی دل نہ چاہا۔ اسٹیشن آتے اور گزرتے رہے۔ اس وقت دن کے دو بجے تھے جب ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی اور وہ باہر جھانکنے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے انداز میں وحشت آ گئی۔ اس نے کچھ پولیس والوں کو ریل کے ڈبوں میں جھانکتے ہوئے دیکھا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی کی تلاش میں ہیں۔

اور یہ تلاش..... اس کے ذہن میں دھماکے ہونے لگے، ممکن ہے، اس کا راز کھل گیا ہو۔

وہ بری طرح بدحواس ہو گیا تھا۔ کیا، کیا جائے..... اب کیا، کیا جائے؟ اس نے سوچا اور دوسرے ہی لمحے وہ وحشت زدہ ہرن کے مانند اٹھ کر کمپارٹمنٹ کے دوسرے حصے کی جانب بڑھا اور نیچے اتر گیا۔ اس کے بعد اس نے بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا حالانکہ یہ ایک احمقانہ حرکت تھی۔ اگر کوئی اس کی طرف متوجہ نہ ہوتا تب بھی اسے بھاگتے دیکھ کر ضرور متوجہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ اس نے انتہائی برق رفتاری سے ایک طرف ہوا جنگلا پھلانگا اور دوسری طرف پہنچ گیا۔

ٹرین کی سیٹی کی آواز اس کے کانوں میں گونجی تھی پھر وہ چل پڑی لیکن وہ مسلسل بھاگ رہا تھا۔ حتیٰ کے وہ دور نکل آیا۔

یہ ایک چھوٹا سا پہاڑی شہر تھا۔ چھوٹی چھوٹی گلیاں کچے پکے مکانات تھے۔ وہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے گیا اور تنے سے ٹیک لگا کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اس کا سینہ دھونکنی بنا ہوا تھا۔ پھیپھڑے پھٹے جا رہے تھے۔ دوڑنے کی وجہ سے تنفس خراب ہو گیا تھا۔

درخت کے سائے میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد وہ بیٹھ گیا اور اس نے درخت کے تنے سے ٹیک لگانے کے بعد آنکھیں بند کر لیں۔

اب کیا، کیا جائے۔ اب کیا، کیا جائے؟ پوری زندگی ہی دکھ بن کر رہ گئی ہے۔ اب تو اسی طرح پولیس سے چھپ چھپ کر یونہی دوڑتے رہنا ہوگا..... لیکن کب تک، آخر کب تک؟ اس نے پریشانی سے سوچا۔

تب اسے نقاہت کا احساس ہوا۔ کھانا کب سے نہیں کھایا تھا۔ زندگی گزارنے کے لیے یہ لوازمات تو ضروری ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے حواس بحال کیے۔

''جب موت سے بچ کر زندگی کی تلاش میں بھاگے ہو، تو پھر زندگی کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑو جمال شاہ.....'' اس نے خود کو سمجھایا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

پہاڑی شہر کے چھوٹے چھوٹے بازاروں میں کھانے پینے کی ایسی چیزیں تو مل ہی سکتی تھیں جن سے وہ پیٹ کی آگ بجھا سکتا۔ ہاں، نہ تو یہاں عمدہ ہوٹل تھا اور نہ ہی کھانے پینے کا کوئی اچھا انتظام، چنانچہ اس نے چند چیزیں خریدیں اور ایک جگہ پہنچ کر انہیں کھانا شروع کر دیا۔

اس کی کیفیت ایک ایسے انسان کی سی تھی جو ہوش وحواس سے عاری ہو اور زندگی کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے پانی تلاش کیا۔ جلد ہی اسے پانی مل گیا اور پانی پینے کے بعد وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ ذہن پر غنودگی سی طاری تھی۔ سایہ دار جگہ تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور اس نیند نے اسے کافی سکون بخشا۔

اس وقت وہ بے یار و مددگار ایک درخت کے نیچے سو رہا تھا۔ ایک ایسا انسان جس نے زندگی اس قدر تکلیف دہ نہیں گزاری تھی۔ گو اس کا واسطہ کچھ تکلیف دہ حالات سے پڑا تھا

لیکن اس کے بعد زندگی ایسی ڈگر پر آ گئی تھی جہاں سکون ہوا کرتا تھا لیکن یہ سکون کے راستے اس کی غلط کاریوں کی وجہ سے بھٹک گئے تھے۔

جاگا تو شام ہو چکی تھی۔ سورج چھپ گیا تھا۔ اس چھوٹے سے شہر میں تو زندگی ہی نہیں تھی۔ چنانچہ بہتر یہی ہے کہ یہاں سے آگے بڑھا جائے۔ اس نے سوچا۔

پھر اس نے اپنے حلیے پر غور کیا۔ عجیب سا حلیہ ہو رہا تھا۔ اسے کوئی شریف انسان نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میلا کچیلا لباس، الجھے ہوئے بال اور چہرے پر تیمی برس رہی تھی۔ یہ بری بات نہیں ہے۔ اس نے سوچا۔ اس طرح میں دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ سکتا ہوں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے حلیے کو مختلف انداز میں تبدیل کرتا رہے گا۔ کیوں نہ وہ یہ ملک ہی چھوڑ دے..... اور یہ خیال اس کے لیے سنسنی کا باعث تھا۔ ہاں، کیوں نہ یہ ملک چھوڑ دیا جائے۔ یہ بہتر رہے گا اور اس طرح ممکن ہے کہ زندگی پر سے یہ خطرات بھی ٹل جائیں۔ ہاں، اپنی زندگی کی حفاظت کرنا ہی ہر ذی روح کا فرض ہے۔ وہ مجرم تھا لیکن اس کے باوجود وہ خود کو زندگی سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کافی دیر تک غور و خوض کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ ہوش وحواس قائم رکھنے کی انتہائی ضرورت ہے ورنہ کتے کی موت مارا جاؤں گا۔ رات کو تقریباً دس بجے وہ اس چھوٹے سے اسٹیشن پر پہنچ گیا اور گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ اسٹیشن پر اس نے معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ٹرین آنے میں تھوڑی دیر تھی۔ وہ ایک سرحدی علاقے کی جانب جانا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرین آ گئی اور وہ ٹرین میں سوار ہو گیا۔ وہ سفر کرتا رہا۔ سوچوں کے لامحدود تانے بانے اسے الجھا رہے تھے۔ میں ہر حال میں خود کو مضبوط رکھوں گا اور ہمت سے کام لوں گا۔ اس نے سوچا۔

ٹرین چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر رکتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔ رات گزر رہی تھی اور وہ سونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن چونکہ دن میں سو چکا تھا اس لیے فوری طور پر نیند بھی نہیں آئی۔

پھر ایک طویل مسافت طے کر کے وہ مطلوبہ شہر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد اس نے اپنے ذہن میں کچھ نئے منصوبے بنائے۔

پہلے جیب میں تھے چنانچہ اس نے اپنا حلیہ تبدیل کرنے کے بارے میں سوچا۔ سب سے پہلے ہیئر ڈریسر کے ہاں جا کر اس نے اپنے بالوں کے اسٹائل میں تبدیلی کرائی۔ اس کے بعد ایک ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان سے کچھ لباس خریدے۔ اس طرح اس کے حلیے میں کچھ تبدیلی ہو گئی تھی۔ اس نے آنکھوں پر چشمہ بھی لگا لیا اور اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ ایک نگاہ دیکھنے والا اسے پہچان نہ سکے گا اور یہ سوچ اس کے لیے اطمینان کا باعث تھی۔

وقت کافی گزر چکا تھا اور اس کے احساسات کی شدت کم ہو گئی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں کسی قدر بحال ہو گئی تھیں۔ چنانچہ سب سے پہلے اس نے کسی ہوٹل میں کمرا حاصل کرنے کی کوشش کی اور پھر درمیانے درجے کے ایک ہوٹل کے کمرے میں مقیم ہو گیا۔

ہوٹل کا یہ کمرا بے حد پرسکون تھا۔ اب تک کا ایک ایک لمحہ اس نے وحشت کے عالم میں گزارا تھا۔ لیکن اب اسے کسی قدر سکون محسوس ہو رہا تھا۔ تاہم وہ کمرے سے نہیں نکلا۔ کھانا بھی کمرے ہی میں منگوا لیا۔ اب وہ صرف آئندہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب کیا کرنا چاہیے؟ ملک چھوڑنے کا خیال اس کے ذہن میں پوری طرح جاگزیں ہو گیا تھا۔ وہ اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ رقم بھی اتنی نہیں تھی کہ وہ اعلیٰ پیمانے پر کچھ کر سکتا۔

افسوس..... زندگی کیسی مصیبت میں آ پڑی ہے۔ رات کو اس خاموشی سے اکتا کر وہ باہر نکلا اور پھر شہر کے بازاروں میں گشت کرنے لگا۔ تقریباً دس بجے واپس آیا اور ابھی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جا ہی رہا تھا کہ اس کے کمرے سے تیسرے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکی باہر نکل آئی۔

دوپہر کے ہی لمحے اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وہ نبیلہ تھی ہاں وہ نبیلہ تھی۔

''نبیلہ!'' اس نے خوفزدہ سی آواز میں پکارا اور لڑکی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ ''نبیلہ..... تم زندہ ہو.....؟'' وہ لرزتے قدموں سے اس کے قریب پہنچ گیا۔ دوسرے ہی لمحے لڑکی نے ایک خوفزدہ سی چیخ ماری اور غڑاپ سے کمرے میں گھس گئی۔

''کیا بات ہے؟'' اندر سے ایک بھاری آواز ابھری۔

''باپو..... باپو..... وہ ایک پاگل..... پاگل.....'' لڑکی نے کہا۔

''کہاں ہے، کیا کہہ رہا ہے؟''

''کہتا ہے نبیلہ..... تم زندہ ہو؟''

''ہوں..... دیکھتا ہوں۔ ابھی اس کا پاگل پن دور کر دوں گا۔'' اس نے یہ آوازیں سنیں لیکن وہ لڑکی..... نبیلہ ہی تھی..... اس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ پھر ایک قوی ہیکل ہاتھ نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اکیلا سمجھا تھا لڑکی کو..... غنڈے..... بدمعاش.....'' ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔

''مم..... میں..... مجھے غلط فہمی..... یہ نبیلہ..... یہ نبیلہ کی.....'' اسے احساس ہوگیا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، اس طرح تو وہ خود کو پھنسا رہا تھا۔

''میں ابھی تیری ساری غلط فہمی دور کیے دیتا ہوں۔'' اس بار کے گھونسے نے اس کی آنکھوں کو تاریک کر دیا تھا۔ پھر کئی لاتیں اس کے بدن پر پڑیں، ضربیں شدید تھیں لیکن اس کے منہ سے آواز بھی نہیں نکل سکی۔

پھر قوی ہیکل ہاتھ نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے اٹھایا۔ ''جاؤ پولیس کے حوالے نہیں کر رہا، آیندہ کسی کو مت چھیڑنا۔'' اسے باہر دھکیل دیا گیا اور وہ بری طرح گر پڑا۔

دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ یہیں پر پڑا رہے لیکن تماشا بن جائے گا۔ وہ اٹھا اور اپنے کمرے میں آکر مسہری پر گر پڑا۔

''یہ کیا تھا..... نظر کا دھوکا..... ہاں نبیلہ اس کے حواس پر سوار ہے لیکن یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔ اس طرح تو..... اس طرح تو..... وہ خود اپنے راز کھول کر پھنس جائے گا۔'' اس نے سوچا۔

اور پھر وہ سونے کی کوشش کرنے لگا، بدن دکھ رہا تھا لیکن دوسری صبح حالت بہتر تھی، نہا دھو کر باہر نکل آیا۔ وہ ملک چھوڑنے کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ نجانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا۔ ہوٹل واپس جانے کا خیال بھی نہ آیا۔ پھر ایک علاقے میں اس نے آوارہ گرد بچوں کا ایک گروہ دیکھا اور نجانے کیا سوچ کر ان کی طرف بڑھ گیا۔

یہی مختلف مشاغل میں مصروف تھے۔ دنیا کی فکروں سے آزاد۔ کیا میں ان میں شامل ہوسکتا ہوں؟ اس طرح زندگی بچ جانے کی امید بھی ہوجائے گی اور..... تنہائی بھی دور ہوجائے گی۔ اس نے ایک شخص سے بات کی۔ نجانے کس ملک کا باشندہ تھا۔ انگریزی روانی سے بول رہا تھا اور اس کا نام ڈگلس تھا۔

اس نے ڈگلس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''ہاں..... دنیا کے ہنگاموں سے تنگ آئے ہوئے انسانوں کو نجات کا راستہ ہی ڈھونڈنا چاہیے۔ یہاں سکون ہے، بے فکری ہے۔'' ڈگلس نے نہایت خوش اخلاقی سے کہا۔

''تو مجھے اپنے گروپ میں شامل کرلو۔'' اس نے التجا کی۔

''بس ہم میں شامل ہونے کے لیے کسی خاص چیز کی ضرورت نہیں پڑتی..... خود کو دنیا کے ہنگاموں سے الگ کرلو۔ دم لگاؤ اور عیش کرو، کچھ مال ہے؟'' ڈگلس نے پوچھا اور اس نے اپنا پرس نکال کر ڈگلس کے حوالے کر دیا۔

''کیا دنیا اس قدر اعتماد کی جگہ ہے؟'' ڈگلس نے پو
''میں اس کی حقیقت بھول بیٹھا ہوں۔'' اس نے ج
دیا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''جمال..... جمال شاہ۔''

''میرے لیے مشکل ہے، وکٹر کہہ لوں تمہیں۔ میرا
دوست تھا وکٹر، نمونیہ سے مر گیا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے جواب دیا اور پھر رات کو نے زندگی میں پہلی بار چرس پی اور ہنگاموں میں شریک ہوگ خود کو بھول جانے کا بہترین ذریعہ اور وہ خود کو بھول گیا تھا۔ زندگی اسے بہت پسند آئی تھی۔

ڈگلس بلاشبہ بہت اچھا ساتھی ثابت ہوا تھا۔ رات ہنگاموں کے بعد وہ پڑ کر سو گیا جہاں دوسرے آوارہ گرد سو۔ ہوئے تھے۔ چرس کے نشے نے اسے ہوش و حواس سے بیگا کر دیا تھا اور یہ بے گانگی اسے کافی دلکش لگی تھی۔

دوسری صبح جب وہ جاگا تو ذہن بھاری بھاری سا لیکن ڈگلس کی صحبت اور اس جیسے دوسرے لوگوں کی دلچسپیا اس کے لیے بہت بہتر ثابت ہوئیں۔ وہ ان دلچسپیوں میں کھو گ تھا۔

تین دن تک وہ اس گروہ میں شامل رہا۔ ڈگلس کے بارے میں اسے کافی معلومات حاصل ہوچکی تھیں..... وہ یقیناً ایک بہترین انسان تھا پھر اس نے ڈگلس سے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ باہر جانا چاہتا ہوں۔''

''کہاں؟'' ڈگلس نے پوچھا۔

''جہاں تم جاؤ..... مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہے۔ بس میں بھی اپنی دنیا کو بھول جانا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، ہمارا پروگرام یہاں سے مری لنکا جانے کا ہے لیکن کیا تمہارے پاس پاسپورٹ ہے؟''

''نہیں، میرے پاس کوئی پاسپورٹ نہیں ہے۔''

''نہیں ہے۔'' ڈگلس پر خیال انداز میں ٹھوڑی کھجانے لگا اور پھر اس نے چونک کر جمال شاہ کی صورت دیکھی۔ چند لمحات وہ اسی طرح دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''حیرت انگیز، واقعی حیرت انگیز.....'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''بس مطلب کی بات نہ کرو..... تم تیاری کرلو، ہم بہت

لد یلون کے لیے روانہ ہوجائیں گے۔''

''میں کیسے مسٹر ڈگلس! میرا پاسپورٹ اور دوسرے ازمات؟''

''میں نے تمہیں بتایا ناں کہ اتفاقات بعض اوقات یب عجیب کہانیاں ترتیب دیتے ہیں۔ میں نے تمہیں اپنے دوست وکٹر کے بارے میں بتایا تھا ناں جو مر گیا؟''

''ہاں۔''

''تم..... اگر تمہارے بال بڑھ جائیں تو تم وکٹر سے کافی شابہت رکھتے ہو۔ اس کا پاسپورٹ تمہارے کام آسکتا ہے۔''

''لیکن جس جگہ وکٹر کا انتقال ہوا تھا۔ اس جگہ اس کا اسپورٹ اور دوسرے کاغذات کو جمع نہیں کیا گیا؟''

''نہیں۔ ہم نے اس کی اطلاع بھی کسی کو نہیں دی۔ مر گیا ور ہم نے اسے قبر میں دفن کر دیا۔''

''اوہ.....'' اس نے گہری سانس لی۔ ''لیکن میرے ال.....؟''

''اوہ..... تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مسٹر وکٹر! بال ڑھ بھی سکتے ہیں اور تبدیل بھی کیے جاسکتے ہیں۔ ڈاڑھی کٹوائی بھی جاسکتی ہے۔ کوئی مشکل بات تو نہیں ہے اور تم اس بات کی فکر مت کرو۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔''

''جیسی آپ کی مرضی.....'' اس نے شانے اچکائے، یہ ام بھی بہتر طریقے سے ہوگیا تھا۔ ورنہ وہ سوچ رہا تھا کہ ملک سے باہر نکلنے کے لیے پاسپورٹ کا حصول اس جیسے شخص کے لیے بہت مشکل ہے کیونکہ وہ مجرم تھا اور کسی ایسی جگہ نہیں جاسکتا تھا جہاں اس کی شناخت کی جاسکے۔

تقریباً ایک ہفتہ ڈگلس اور اس کا گروہ یہاں پر رہا۔ آوارہ گرد سب اپنے اپنے رنگوں میں مصروف تھے، کوئی کسی کی مداخلت نہیں کرتا تھا۔ سب ایک دوسرے سے بے خبر تھے۔

ڈگلس کو اس نے چونکہ اپنی ساری رقم دے دی تھی اس لیے وہ مکمل طور پر اس کا خیال رکھ رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ فطری طور پر بھی ایک اچھا انسان تھا۔ گروہ میں لڑکیاں بھی تھیں جو عجیب انداز میں اس کی طرف راغب ہوئیں لیکن وہ تو بالکل ہی تبدیل ہوگیا تھا۔ ان کی تحریک جمال کے اندر کوئی جذبہ پیدا نہیں کرتی تھی اور وہ خاموشی سے اور ویران نگاہوں سے انہیں دیکھتا رہ جاتا۔ نبیلہ اس کی زندگی کا زخم بن گئی تھی اور وہ اسے ہر وقت تکلیف دیتا رہتا تھا۔ ہاں، اس وقت جب یہ خیال اس کے ذہن پر طاری ہوتا تو وہ نبیلہ سے بے نیاز ہوجاتا تھا۔

پھر وہ وہاں سے روانہ ہوگئے۔ وہ ڈگلس کے ساتھ تھا اور ڈگلس ہر لحاظ سے اس کا مربی اور نگران تھا۔ وہ اپنی خودارادی بالکل کھو چکا تھا۔ ڈگلس کے اشاروں پر چلنا اس کا معمول بن چکا تھا۔ سری لنکا میں ایک جگہ انہوں نے پڑاؤ کیا۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر چوڑی سی ایک نہر بہہ رہی تھی جس میں آبی مکانات تیر رہے تھے۔ ان مکانوں میں زندگی بڑی مجہول مجہول سی تھی۔ چراغ جلتے تھے اور ان کی روشنی میں بیمار چہرے اکثر نظر آجاتے تھے۔

یہیں اس کی ملاقات اروشی سے ہوگئی۔ میلی سی دھوتی میں ملبوس مدقوق سی لڑکی، جس کے چہرے کے نقوش اچھے خاصے تھے۔ اس کی آواز کافی پرکشش تھی، نجانے کیوں وہ اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھنے لگی اور وہ اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' اس نے پوچھا۔

''اروشی۔'' اس نے جواب دیا۔

''کہاں رہتی ہو؟''

''سامنے پانی میں میرا مکان ہے۔'' اس نے سامنے ہی ایک چھوٹے سے بجرے کی طرف اشارہ کیا۔

''اوہ..... پانی میں رہتی ہو؟''

''ہاں.....''

''کیا کرتی ہو؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''کچھ نہیں بابو..... رات کو آؤ ناں۔'' اس نے عجیب سے انداز میں جمال شاہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''رات کو.....؟''

''ہاں..... ہم تمہاری راہ دیکھیں گے۔'' اس نے کہا اور وہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ عجیب و غریب حالات سے گزر رہا تھا۔ ذہن میں جنس کا کوئی خاص تصور نہیں تھا۔ پھر بھی نجانے کون سی قوت اسے اروشی تک لے گئی۔

پانی کے بجرے میں اس کا بوڑھا باپ موجود تھا۔ اس نے جمال شاہ کا استقبال کیا۔ اروشی اندر اس کا راستہ دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ پرخلوص انداز میں مسکرائی اور اس کے ساتھ جمال شاہ نے جو رات گزاری۔ اس پر وہ حیران رہ گیا۔

اروشی بلاشبہ ایک ایسی عورت کی حیثیت رکھتی تھی جو خالص گھریلو اور ہر قسم کی مصیبت سے دور ہوتی ہیں لیکن نجانے کیوں اسے گندی زندگی گزارنا پڑ رہی تھی۔ جمال شاہ نے اس سے اس کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔

''اروشی تم یہ زندگی کیوں گزارتی ہو؟''

''کیا کریں، پیٹ پالنے کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔'' اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا اور وہ پرسوچ نگاہوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

''اپنی زندگی کسی سے وابستہ کیوں نہیں کرلیتیں اروشی! کسی سے شادی کیوں نہیں کرلیتیں؟'' پرانی خواہشیں پھر عود کر آئی تھیں۔

''شادی..... ہمارے ہاں شادی نہیں ہوتی بابو! ہم انسان تھوڑی ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس ہے ہی کیا۔ یہ ایک مکان اور بس..... اگر کسی روز گاہک نہ ملے تو دوسرے دن فاقہ کرنا ہوتا ہے۔''

''کوئی مرد تمہارا سہارا نہیں ہے؟''

''ہوتا تو شاید ہم بھی عام انسانوں جیسے ہوتے۔''

''مجھے اپنا سہارا بناؤ گی؟'' اس نے پوچھا۔

''ایں.....'' وہ چونک پڑی۔

''میں تم سے شادی کروں گا اور تمہارا بوجھ اٹھاؤں گا۔'' اس نے کہا اور وہ اس طرح بے یقینی کے انداز میں اسے دیکھنے لگی جیسے اپنی اس بات پر وہ خود ہی ہنس پڑے گا۔

''بابو.....''

''جواب دو اروشی..... میں تم سے مذاق نہیں کر رہا۔''

''ہمیں ایسے خواب نہ دکھاؤ بابو.....''

''تب پھر کل صبح اس خواب کو حقیقت بنا دو۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور درحقیقت اس نے یہی کیا۔ ڈنگلس اور اس کے ساتھیوں کو اس نے خاموشی سے چھوڑ دیا تھا اور اپنا حلیہ بھی بدل لیا۔

اروشی کی حالت عجیب تھی۔ اس نے اپنا بجرہ کاروبار کی نہر سے ہٹا لیا اور جمال کے ساتھ خوشی خوشی فاقے کیے لیکن بہت جلد وہ بازار میں نکل آیا۔ پہلے مچھلیوں کے ٹوکرے ڈھوئے، رکشا چلایا۔ پھر سمندر سے سیپیاں نکالنے والی ایک فرم میں ملازمت مل گئی۔ اس کی زندگی کو ایک وقتی سکون مل گیا تھا۔ اب وہ شدید محنت کرتا تھا۔ اروشی کی رنگت بھی تبدیل ہوگئی تھی۔ پانی کے مکان کو بیچ کر انہوں نے کچھ اور رقم ملا کر ایک مکان خرید لیا اور سکون کی زندگی بسر کرنے لگے۔

لیکن یہ سکون دائمی نہیں تھا۔ جب بھی نبیلہ یاد آتی تو اس کے ذہن کے زخموں میں سوزش ہونے لگتی۔ وہ کرب سے تڑپتا رہتا۔ کسی کل سکون نہیں ملتا تھا۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالنا پڑتا تھا..... اروشی اس کی اس کیفیت سے پریشان ہوجاتی تھی لیکن وہ تو بیچارن تھی، وہ تو اسے دیوتا مانتی تھی۔ وہ بھلا کوئی باز پرس کیسے کرسکتی تھی۔

پھر ایک سال کے بعد اروشی کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی اور اس کا بوڑھا باپ مرگیا۔ بچی کا نام اروشی کی پسند سے منیشا رکھا گیا۔ ان کے حالات اب کافی بہتر ہوگئے تھے۔ جمال نے خود سمندری مصنوعات کی تجارت شروع کردی تھی۔ اس طرح سے اب وہ ایک مقامی شہری ہی بن گیا تھا۔ لوگ بھول گئے کہ وہ کہیں باہر سے آیا تھا۔

منیشا کی پرورش اچھی طرح ہونے لگی۔ ان کے پاس اب کافی رقم جمع ہوگئی تھی اور اب وہ کھاتے پیتے شہریوں میں شمار ہونے لگے تھے لیکن سکون ..... حالانکہ اس واقعے کو نو سال گزر چکے تھے۔ لیکن نبیلہ آج بھی اس کے ذہن میں زندہ تھی اس کی معصومیت سوال بن کر اس کے سامنے آجاتی تھی اور اس سوال کا اس کے پاس جواب نہ تھا۔

آٹھ سالہ منیشا بے حد ذہین تھی۔ اپنی ماں کی ہم شکل پڑھنے لکھنے میں بے حد تیز اور لباس بھی مقامی ہی استعمال کرتی تھی۔ لیکن اسے دیکھ کر اس کا ہیجان اور بڑھ جاتا۔

''میں تمہاری بیٹی ہوں، جمال شاہ..... میں تمہاری بہن ہوں۔'' نبیلہ کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگتے۔

اور نتیجے میں وہ منیشا سے خوفزدہ رہنے لگا۔ وہ پیار سے اس کی گردن میں بانہیں ڈالتی تو اسے لگتا جیسے اس نے منیشا کی گردن توڑ دی ہو اور..... اور اس کے منہ سے خون نکل رہا ہو۔ کئی بار خوف سے چیخ پڑا اور پھر اسے عجیب عجیب خواب نظر آنے لگے۔ اب اکثر وہ خواب میں منیشا کو دیکھتا۔ جس کی قمیص اس نے پھاڑ دی ہوتی اور منیشا اس کے ہاتھوں میں دم توڑ دیتی۔

اروشی اس کی اس کیفیت سے پریشان تھی اور جوں جوں منیشا بڑی ہوتی جارہی تھی، اس کی وحشت بڑھتی جارہی تھی۔ ہر لمحے کی اذیت، ہر لمحے کا کرب اس نے محسوس کیا کہ منیشا اس کی اس کیفیت سے لرزیدہ ہوتی جارہی ہے۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھتی اور اس کا دل شدت غم سے پھٹنے لگتا تھا۔ آہ..... اس کے گناہ کی سزا کتنی طویل تھی اور یہ خواب..... یہ خواب بھیانک سے بھیانک ہوتے جارہے تھے۔ ہر وقت منیشا اس کے ہاتھوں قتل ہوتی رہتی تھی۔

صبح جب وہ اس کے سامنے آتی تو وہ وحشت سے سفید پڑ جاتا۔ اس کی صحت خراب ہوتی جارہی تھی۔ اروشی اس کے لیے بے حد پریشان رہتی۔ وہ ساری ساری رات جاگتا رہتا تاکہ وہ بھیانک خواب نہ دکھائی دے۔ سوچتا رہتا کہ کیا کروں اور جب وہ بالکل ہی بے قابو ہوگیا تو اس نے ایک فیصلہ کیا۔

نبیلہ کو قتل کرنے کے بعد میں ایک طویل زندگی گزار چکا ہوں۔ اب مجھے..... مجھے اس جرم کی سزا بھگتنا چاہیے۔ ہاں مجھے سزا ملنا ضروری ہے یہ سزا ہی میرے دکھوں کا علاج ہوگی۔

گو یہ فیصلہ دیر سے ہوا تھا لیکن نجانے کیوں اس فیصلے کے بعد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے سکون مل گیا تھا۔ اس نے اس پر عمل کرنے کے لیے کارروائی شروع کردی۔

سب سے پہلے اس نے اپنی بیش قیمت جائداد اپنی بیٹی منیشا کے نام کردی اور اسے اپنے تمام مفادات کا نگراں بنادیا۔ اب وہ ایک مطلق العنان کی حیثیت سے اس کی ساری جائداد کی مالک تھی اور اپنی تمام تر زندگی بہتر طور پر گزار سکتی تھی۔

اس کے بعد اس نے اروشی سے کہا کہ وہ ایک طویل عرصے کے لیے باہر جانا چاہتا ہے۔ کچھ کاروباری معاملات ہیں لہٰذا وہ نہایت سکون سے اپنی بچی کے ساتھ زندگی گزارے۔

اروشی جو اس کی دیوانی تھی اور جسے اس نے مصیبت کے گہرے غاروں سے نکال کر عزت کی بلندیوں پر بٹھادیا تھا۔ وہ اسے بے پناہ چاہتی تھی اور وہ اس کے اس طرح جانے پر بہت پریشان تھی لیکن اس نے اروشی کو تسلیاں دیں اور کہا کہ بہرحال اسے آرام وہ زندگی گزارنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ وہ سکون سے زندگی گزارے اور وہ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد واپس آجائے گا۔

اروشی اس کے معاملات میں زیادہ دخل نہیں دیتی تھی۔ وہ رو کر خاموش ہوگئی اور اس نے ساری تیاریاں مکمل کرلیں۔ ایک طویل عرصے کے بعد اس نے اپنے وطن واپسی کا پروگرام بنایا اور بالآخر ایک جہاز اسے لے کر چل پڑا۔

اپنے وطن پہنچنے کے بعد اس نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ رات بھر سوچنے کے بعد پولیس ہیڈکوارٹر پہنچ گیا۔ وہاں اس نے اپنا تعارف کرایا اور کہا۔

''میں جمال شاہ ہوں۔'' پولیس آفیسر نے اس سے کافی رکھائی سے گفتگو کی تھی۔

''فرمائیے جناب۔ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''آج سے تقریباً دس سال پہلے میں نے ایک قتل کیا تھا۔'' اس نے جواب دیا اور پولیس آفیسر چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''قتل......؟''

''ہاں...... میں آپ کو اس قتل کی تفصیلات بتاتا ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر نبیلہ کے بارے میں ساری تفصیلات بتانا شروع کردیں۔

پولیس آفیسر اس کی شکل دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے سے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ اسے پاگل سمجھ رہا ہو۔ بہرصورت ساری تفصیلات سن کر وہ مسکرانے لگا اور بولا۔

''تو پھر اب آپ کس لیے تشریف لائے ہیں؟''

''کیوں، کیا قاتل کو سزا نہیں ملنی چاہیے؟''

''ضرور ملنی چاہیے...... لیکن محترم دس سال پہلے میں اس محکمے میں آیا بھی نہیں تھا۔ بتائیے اب میں آپ کی کیا کرسکتا ہوں؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے، اس قتل کی فائل ضرور ہوگی۔'' اس نے کہا۔

''لیکن دس سال تک آپ کہاں رہے؟''

''بس یوں ہی اپنے ضمیر سے چھپتا پھرا تھا لیکن کوئی کب تک ضمیر کی کسک سے محفوظ رہ سکتا ہے۔''

''بے شک! لیکن اب میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''مجھے سزا دی جائے۔'' اس نے کہا۔

''خوب، کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ یہ سزا کہیں اور حاصل کرلیں؟'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں میں آپ سے درست کہہ رہا ہوں۔ آپ ا... فائل کی تلاش کریں اور جب میں مجرم ثابت ہوجاؤں تو مجھے... دی جائے۔''

''بہت بہتر۔ اس وقت تک آپ کا قیام کہاں ر... گا؟'' پولیس انسپکٹر نے پوچھا۔

''قانون کے مطابق تو مجھے حوالات میں ہونا چاہیے۔''

''جی نہیں۔ میرا خیال ہے، آپ کوئی بیکار آدمی ہیں ا... اس طرح حوالات میں آکر اپنے نان ونفقہ کا بندوبست کر... چاہتے ہیں۔ اب آپ تشریف لے جائیں اور اپنا ایڈریس نوٹ کرادیں۔ اگر آپ قاتل ثابت ہوگئے تو میں آپ کو فون کر دوں گا۔''

اس وقت تو وہ وہاں سے چلا آیا لیکن اس کے بعد بھی و... مستقل انسپکٹر کی جان کھاتا رہا اور انسپکٹر اس بات پر مجبور ہوگیا کہ وہ پرانی فائل نکلوائے۔ آخرکار خاصی تگ ودو کے بعد پولیس انسپکٹر نے فائل نکلوائی اور اسے فون کیا۔

''مسٹر...... کیا نام بتایا تھا آپ نے؟ جمال شاہ......!''

''جی......''

''براہ کرم ذرا میرے پاس تشریف لے آئیں۔'' اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''بہتر ہے، میں پہنچ رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ اس کے دل میں سکون کی ایک لہر اٹھی تھی۔ جس کا احساس رگ وپے میں سرایت کرگیا تھا اور وہ پولیس ہیڈکوارٹر پہنچ گیا۔ پولیس انسپکٹر نے اس کا استقبال کیا۔

''جی۔ یہ وہ فائل ہے، جو ایک کالج کی طالبہ مس نبیلہ کے قتل کے سلسلے میں ترتیب دی گئی تھی۔ اس کے قاتل کو آج ...ے چھ سال پہلے سزائے موت ہوچکی ہے۔ چار سال تک اس ...لیس چلا تھا۔ اس کے بعد وہ سزا پاگیا۔''

''قاتل؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''لیکن وہ کون تھا؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''اس کا ایک عزیز تھا جو اس کا رشتہ چاہتا تھا لیکن اس کا ...شتہ نہ ملنے پر اس نے لڑکی کو قتل کرکے اس کی لاش کسی جگہ چھپا ...ی، بعد میں اس نے اعتراف جرم بھی کرلیا تھا۔''

''یہ غلط ہے انسپکٹر، یہ غلط ہے آفیسر...... یہ غلط ہے، اس کو ...ں نے قتل کیا تھا۔ افسوس کہ ایک بے گناہ کو پھانسی دی گئی۔''

''اچھا جناب...... اب آپ شرافت سے اس بات کو مان ...جائیے اور آئندہ اس جگہ کا رخ مت کیجیے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''میں سزا چاہتا ہوں انسپکٹر۔ آپ نے کسی بے گناہ کو پھانسی دے دی۔ اس کا قاتل میں ہوں۔'' اس نے چیخ کر کہا ...ور پولیس انسپکٹر کا گریبان پکڑ لیا۔ دوسرے ہی لمحے پولیس ...نسپکٹر کا ڈنڈا اس کی کمر پر پڑا اور پھر کئی پولیس والوں نے اسے ...ارنا شروع کردیا۔ ان لوگوں نے اسے مخبوط الحواس سمجھ لیا تھا۔ ...اس کی ایک نہ چل سکی اور پولیس والوں کی طرف سے اسے ایک دماغی اسپتال میں داخل کردیا گیا۔

لیکن وہ دماغی مریض تو نہیں تھا۔ یہاں اس کا کیا علاج ہوتا، ایک سال تک اسے دماغی اسپتال میں رہنا پڑا۔ اکثر اس پر دورے پڑنے لگے تھے۔

''ارے ظالمو، قاتل میں ہوں۔ تم نے کس بے گناہ کو سزا دے دی۔ آہ اب میری گردن پر دو خون ہوگئے۔ نجانے کون موت کے گھاٹ اتر گیا۔'' اور اس بات پر اسے خوب مار پڑتی، کوئی یقین نہیں کرتا تھا۔

تب ایک دن اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ ''ڈاکٹر...... اب میں ٹھیک ہوں۔''

''واقعی......''

''ہاں...... مجھے اجازت دے دو۔''

''نبیلہ کو کس نے قتل کیا تھا؟''

''جس نے قتل کیا تھا۔ اسے سخت سزا مل چکی ہے، براہ ...کرم مجھے جانے دو۔'' لیکن کئی دن تک اسے مزید اسپتال میں ...رکھا گیا اور پھر بالآخر اجازت مل گئی۔ وہ اسپتال سے نکل آیا ...لیکن اب اس کے سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔ وہ واپس سری لنکا ...نہیں جانا چاہتا تھا۔ اب تو اس کے دل پر دو زخم ہوگئے تھے۔ ...پھر اس نے ریلوے لائن پر لیٹ کر خودکشی کی کوشش کی لیکن ...اسے گرفتار کرلیا گیا اور خودکشی کے الزام میں سزا ہوگئی۔

دوسری بار زہر کھایا اور پھر ایک سال کی سزا کاٹی۔ موت بھی اس سے نفرت کرتی تھی۔ پھر وہ کئی سالوں تک سڑکوں پر پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرتا رہا۔ لوگ اس پر قہقہے لگاتے لیکن وہ ارسلان اور ریاض کی تلاش میں تھا جنہوں نے اسے شرافت کے راستے سے ہٹا کر یوں دربدر کردیا تھا۔ اگر وہ اسے مل جاتے تو وہ انہیں قتل کردیتا۔

یوں تقریباً سات سال گزر گئے اور سات سال کے بعد اس کے ذہن میں خیالات کا ایک اور جھونکا آیا۔ اس نے واپس اروشی کے پاس جانے کا پروگرام بنالیا۔ اپنا حلیہ درست کیا۔ پاسپورٹ وغیرہ درست کرایا اور چل پڑا۔

اس کا مکان جوں کا توں تھا۔ رات کی تاریکی میں وہ اپنے مکان میں داخل ہوگیا۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ منیشا کی خوابگاہ اس کے سامنے تھی۔ اس کے دل میں محبت کے سوتے پھوٹ پڑے۔ اس نے دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہوگیا۔

منیشا شب خوابی کے لباس میں مست نیند سو رہی تھی۔ وہ جوان ہوگئی تھی۔ جوانی کے آثار اس کے بدن پر نمایاں تھے۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر جھکا لیکن دوسرے ہی لمحے منیشا بجلی کی طرح تڑپی اور پھر اس نے تکیے کے نیچے سے پستول نکال لیا۔

اس نے دونوں ہاتھ آگے کیے لیکن دوسرے ہی لمحے منیشا کے پستول سے دو فائر ہوگئے اور دونوں گولیاں اس کے پہلو میں اتر گئیں۔

''ذلیل...... کمینے انسان، تو یہاں تک آگیا۔ لیکن کیا سمجھا تھا تو نے مجھے۔'' منیشا کی آواز بھرا گئی۔

''منیشا...... میری بچی۔'' وہ زمین پر گر گیا اور منیشا اس کی آواز سن کر چونک پڑی۔

''پاپا...... پاپا۔'' اس بار اس کی آواز ایک دلخراش چیخ بن گئی۔ وہ اچھل کر اس سے آلپٹی۔ ''پاپا...... پاپا...... یہ کیا ہوگیا...... یہ کیا ہوگیا...... میرے پاپا...... میرے پاپا...... میں...... میں نے یہ کیا، کیا...... وہ...... وہ کمینہ اکثر میرا پیچھا کرتا تھا۔ ایک دوبار اس نے مجھے اپنی کار میں لفٹ دی ہے پاپا...... مگر اب اس کی حقیقت مجھ پر کھل گئی تھی۔ میں سمجھی اس وقت اس نے یہاں گھسنے...... کی جرأت کی ہے پاپا......'' وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

''اس نے کہا تھا...... اگر تمہاری بیٹی ہوتی تو وہ...... بھی تمہیں گولی مار......'' اسے ایک بڑی سی خون کی قے ہوئی اور پھر اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ شاید اس کی بددعا پوری ہوچکی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

کشکول

انوار صدیقی

قسط نمبر: 04

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتور کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میڈم روبی کو ہر گزرنے والا لمحہ احساس دلا رہا تھا کہ اس کے دشمنوں کے ہاتھ اس سے کہیں زیادہ لمبے ہیں۔ اس نے شمپین کی سیل بند بوتل اپنے ہاتھوں سے کھولی تھی لیکن افضل خان نے یقیناً پوری پلاننگ پہلے سے کر لی ہوگی۔ ہر ممکن صورتِ حال پر غور کیا ہوگا۔ سیل بند بوتلوں میں بھی بے ہوشی کی دوا پہلے سے شامل کرالی ہوگی۔

موجودہ صورت حال نے شدت سے احساس دلایا تھا کہ اس نے شبنم کے سمجھانے کے باوجود افضل خان سے محتاط رہنے کی بات نظر انداز کر کے ایسی غلطی کی تھی جس کا اب کوئی تدارک ممکن نہیں تھا۔ وہ ایک ایک لقمہ سنبھل سنبھل کر لے رہی تھی۔ ساتھ ہی اپنے ذہن کو پوری طرح جاگتے رہنے پر بھی مجبور کر رہی تھی۔

''کیا بات ہے مائی سویٹ ہارٹ؟'' افضل خان نے اس سے بڑی لگاوٹ سے پوچھا۔ ''جشنِ صحت کے اس خوشگوار موقعے پر تم کچھ بجھی بجھی سی نظر آ رہی ہو۔''

''افضل خان.....'' روبی نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری خوشی کی خاطر میں یہاں آ گئی لیکن اس وقت بھی مجھے کچھ تکان سی محسوس ہو رہی ہے۔''

''ایٹ..... ڈرنک..... اینڈ بی ہیپی۔'' افضل خان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔ ''پریشان مت ہو، ہم اس وقت کسی ویرانے میں نہیں، ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں بیٹھے ہیں جہاں چٹکی بجاتے ہم ہر قسم کی امداد اور آرام طلب کر سکتے ہیں۔''

''یو آر رائٹ لیکن.....'' روبی نے اپنی ذہنی غنودگی کے پیش نظر کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ ''مناسب ہوگا کہ میں فوراً گھر پہنچ کر ڈاکٹر کو دکھاؤں، جشنِ صحت تم جب چاہو دوبارہ منا سکتے ہو۔''

''ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو.....''

''کہیں تمہیں پچاس لاکھ ایڈوانس دینے والی بات بری تو نہیں لگی؟'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

''نان سنس'' روبی نے تیزی سے کہا۔ ''پچاس لاکھ یا دس کروڑ بھی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، تم سے جو بات ڈن ہوگئی ہے میں اس سے پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ تم آج ہی اپنا بینک اکاؤنٹ نمبر دو۔ رقم کل شام تک جمع کرا دی جائے گی۔''

''کم آن ہنی!'' افضل خان نے اسے باتوں میں الجھانے کی کوشش کی۔ ''میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔''

''مم..... میں اب گھر جاؤں گی۔'' روبی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا پھر وہ اٹھی تو لڑکھڑا کر رہ گئی۔ ''بے ہوشی کی دوا تیزی سے اپنا کام کر رہی تھی، اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش میں دیوار کا سہارا لیا تو افضل خان نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر پوچھا۔

''اتنی جلدی کہاں جانے کا ارادہ ہے؟''

''افضل خان!'' روبی نے اس بار بدلے ہوئے انداز میں کہا۔ ''مجھے تم سے اس کی توقع نہیں تھی۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''تم نے شاید وہ بات یاد نہیں رکھی جو میں نے تم سے تمہارے اپارٹمنٹ میں کہی تھی۔'' روبی نے اپنے ڈوبتے ذہن پر قابو پاتے ہوئے نفرت سے کہا۔ ''دشمن کے مقابلے پر تم میرے لیے زیادہ آسان ٹارگٹ ہوگے۔ تم نے میرے ساتھ دھوکا کر کے اچھا نہیں کیا۔''

''تیر کمان سے نکل جائے تو واپس نہیں آیا کرتا میری جان۔'' افضل خان تیزی سے اپنی کرسی سے اٹھ کر روبی کے قریب پہنچ گیا۔ ''رہا اچھے اور برے کا سوال تو میں نے اس پر کبھی سنجیدگی سے غور کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس لیے میرا مشورہ ہے اب تم خود کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کرو۔ اسی میں بہتری ہے۔ آج تم پوری طرح میرے ڈسپوزل پر ہو اس لیے.....''

''خبردار، میرے قریب آنے کی کوشش مت کرنا .....'' روبی نے حقارت سے اسے متنبہ کیا لیکن افضل خاں پرانا کھلاڑی تھا، وہ محسوس کر رہا تھا کہ شکار جال میں پھنس چکا ہے۔ اب اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ کوئی واویلا کر سکے اس لیے اس نے آگے بڑھ کر بڑی بے تکلفی سے روبی کی خوبصورت کمر کے گرد اپنے ہاتھوں کا حلقہ تنگ کر دیا۔ جواب میں روبی نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن اس کا ذہن چکرا کر رہ گیا۔ وہ بہ مشکل اتنا کہہ سکی۔

''پلیز افضل خان..... مجھے جانے دو، اس نیکی کے عوض میں تم کو منہ مانگی رقم.....''

''دستخط شدہ لیٹرز اور بلینک چیک ہاتھ میں ہو تو خالی جگہ پر کسی بھی رقم کا اندراج کیا جا سکتا ہے۔'' افضل کی گرفت اور تنگ ہوگئی۔ وہ روبی کو آہستہ آہستہ اس خوبصورت بیڈ کی طرف لے جا رہا تھا جہاں اس خوبصورت ناگن کا زہر کشید کرنے کا پروگرام تھا۔ روبی اس کے مضبوط بازوؤں میں کسمسا رہی تھی۔ افضل خان کے اندر کا شیطان اس کے حسین، گدرائے اور مہکتے جسم کے قرب سے بے چین ہو رہا تھا۔

روبی کو بیڈ پر لٹا کر وہ خود بھی اس کے قریب بیٹھ گیا، ہراتے لہجے میں بولا۔

''تم نے اپنی دانست میں شمپین کا آرڈر دے کر ے بھڑکتے جذبات کو کچلنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ بھول گئی ں کہ شکاری شکار سے زیادہ ہوشیار ہوتا ہے۔''

''میری بات مان لو افضل، مجھے برباد مت کرو۔'' بی کی آواز رندھ گئی، وہ سمجھ رہی تھی کہ چند لمحوں بعد وہ بے ں سے دوچار ہو جانے کے بعد پوری طرح اس درندے ے رحم و کرم پر ہوگی جو اپنی من مانی کرنے سے دریغ نہیں ے گا۔

''برباد نہیں کروں گا جان من۔'' افضل خان نے اس ے دونوں ہاتھوں پر گرفت جما کر اس کے مخروطی ہونٹوں کا ں چومتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم میرے لیے اب ایسا سین اور چلتا پھرتا بینک ہوگی جس کے اسٹرانگ روم میں کبھی یش کی کمی نہیں ہوتی۔''

روبی، افضل کے مضبوط ہاتھوں کے حصار میں کسی پنچھی ی طرح پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ اس کی قوت مدافعت رفتہ رفتہ دم ڑ رہی تھی، آنکھوں میں اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ وہ صرف سوس کر سکتی تھی کہ افضل خان کے غلیظ ہاتھ بڑی بے باکی ے اس کے جسمانی نشیب و فراز پر ادھر ادھر حرکت کر رہے تھے، اس کی گرم گرم سانسیں اسے اپنے چہرے پر محسوس ور ہی تھیں مگر وہ بے بس تھی۔

''مائی سویٹ ہنی!'' افضل خان بہکی بہکی آواز میں ولا۔ ''ابھی تم کچھ کچھ ہوش میں ہو۔ اگر اجازت دو تو تمہیں س لباس کی قید سے بھی آزاد کر دوں، کچھ انجوائمنٹ تم بھی کر لو ورنہ ہوش گم ہو جانے کے بعد پھر تالی ایک ہاتھ سے ہی بجے گی لیکن بجے گی ضرور۔''

روبی کے کانوں میں جیسے کسی نے کھولتا ہوا گرم گرم میسہ انڈیل دیا ہو، افضل خان کے بے ہودہ جملوں کو سن کر ایک آخری بار زور لگا کر پھڑ پھڑانے کی کوشش کی پھر اس کا ہن گھپ اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ افضل خان کے مکروہ ونٹوں پر بڑی گھناؤنی مسکراہٹ پھیل کر گہری ہوتی چلی گئی، س نے اٹھ کر کمرے کی تیز روشنیاں بند کر دیں۔ شکار اب ی طرح اس کے رحم و کرم پر تھا۔ بے ہوشی کے بعد بھی بی کے سانسوں کا زیر و بم محسوس کر کے افضل خان کے جسم ے چیونٹیاں لپٹ گئیں۔ اس نے ایک ایک کر کے روبی کا س اتارنا شروع کیا۔ اس کے اپنے خون کی گردش بھی تیز ی تھی۔ وہ ایک مشکل ٹارگٹ تھی جس کو تصویروں کی شکل میں محفوظ کرنے کا حکم اسے بگ باس نے دیا تھا۔ اسی بہانے وہ اپنی ہوس..... مٹانے اور مستقبل کا پروگرام بھی طے کر چکا تھا، اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔

جہاں آڈینس ہوں، وہاں پردہ اٹھوانے کی خاطر لوگ سیٹیاں بجانا شروع کر دیتے ہیں مگر..... اس وقت وہ تنہا تماشائی تھا، آہستہ آہستہ پردہ ہٹا کر پوری طرح ایک ایک پیش منظر کا لطف لے رہا تھا۔ پوری رات پڑی تھی، برابر کے کمرے میں وہ خوش قسمت بھی تھا، جس کو شیر کا پیٹ بھر جانے کے بعد لکڑ بھگے کا کردار ادا کرنا تھا اور افضل خان کو اس کی تصویریں اور مووی بنانی تھی، پہلے وہ جی بھر کر اپنی بھوک مٹانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ آہستہ آہستہ بے نقاب ہوتے حسین جسم پر ''مخصوص'' کا لیبل چسپاں کر دیتا۔ کسی کو اس کے خوبصورت وجود کو چھونے کی اجازت نہ دیتا لیکن وہ شیخ حامد کا حکم نہ ماننے کی بھیانک سزا بھی جانتا تھا۔ اس لیے اس کا حکم ماننے پر مجبور تھا۔

وہ بڑی مہارت سے اس خوابیدہ حسن کی ملکہ کے جسم کو آہستہ آہستہ برہنہ کرنے کے عمل میں مصروف تھا کہ اس کا موبائل گنگناتے ہوئے بیدار ہوگیا۔ وہ کباب میں ہڈی برداشت نہیں کر سکتا تھا لیکن کال بگ باس کی بھی ہو سکتی تھی اس لیے اس نے اسکرین پر نظر ڈالنا ضروری سمجھی، ایک نیا نمبر دیکھ کر وہ چھلا گیا۔ اس نے ایک لمحے کو سلسلہ منقطع کرنے کا سوچا مگر کسی تجسس نے اسے کال اٹینڈ کرنے پر مجبور کر دیا۔

''ہیلو۔'' اس نے مدھم آواز میں کہا، اس کی خمار آلود نظریں اس وقت بھی روبی کے جسم پر منڈلا رہی تھیں۔

''جتنی جلدی ممکن ہو کمرے سے باہر نکلو اور لفٹ کے بجائے اس راستے سے فرار ہونے کی کوشش کرو جو ایمرجنسی کے وقت استعمال کیا جاتا ہے۔''

''کون بول رہا ہے؟'' افضل خان نے ایک اجنبی کی آواز سن کر سوال کیا۔

''بلیک ٹائیگر!'' دوسری جانب سے تحکمانہ انداز اختیار کیا گیا۔ ''میرے حکم پر فوری عمل کرو ورنہ بگ باس..... بائی۔''

دوسری جانب سے بگ باس کے حوالے کے ساتھ ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ افضل خان کا دماغ جھلا کر رہ گیا۔ اس نے اسی نمبر کو ملانے کی کوشش کی لیکن کسی نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ اس کی نظریں روبی کے نیم عریاں جسم پر منڈلا رہی تھیں۔ ابھی آدھا پردہ اٹھا تھا۔ کھیل بھی شروع نہیں ہوا تھا، وہ ایک عجیب شش پنج میں مبتلا تھا جب اس کے محتاط ذہن کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک گوشے میں بگ باس کا کہا ہوا ایک جملہ ابھرا۔
''تم حرف آخر نہیں ہو...... میرے کچھ اور بھی خفیہ لوگ ہیں جو تمہاری ایک ایک حرکت پر نظر رکھتے ہیں۔ مجھے سب کی کارکردگی کی رپورٹ ملتی رہتی ہے۔ کبھی ڈبل کراس کرنے کی حماقت بھول کر بھی نہ کرنا۔'' اس جملے کے ابھرتے ہی افضل خان کو بلیک ٹائیگر کا پیغام یاد آیا تو اس کی چھٹی حس بھی بیدار ہوگئی۔ اس حکم پر عمل نہ کرنے کی صورت میں وہ کسی چوہے کی طرح کسی پنجرے میں بھی قید ہوسکتا تھا۔ اس نے فوری طور پر اپنے بچاؤ کو روبی کے آدھے برہنہ جسم پر ترجیح دی، بڑی تیزی میں اپنی چیزیں سمیٹ کر کمرے سے باہر نکلا، اس نے دوسرے کمرے میں جا کر لکڑ بھگے کو بھی ہوشیار کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی اور تیزی سے اس راستے پر لمبے لمبے قدم اٹھانے لگا جو صرف ایمرجنسی کے وقت استعمال کیا جاتا تھا۔

پندرہ منٹ بعد سراج نے روم نمبر چار سو آٹھ میں قدم رکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ لیاقت حسین نے اسے فون پر جو اطلاع دی تھی وہ غلط نہیں تھی۔ میڈم روبی کی حالت دیکھ کر وہ یہ بھی سمجھ گیا کہ غالباً افضل خان کو ریڈ کی اطلاع مل گئی ہوگی۔ اس نے فوری طور پر آگے بڑھ کر اوڑھنے والی شال میڈم کے جسم پر ڈال دی۔ پھر کچھ دیر بعد ہی اس علاقے کے تھانے کا انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ آگیا۔ میڈم روبی کو بستر پر بے ہوشی کے عالم میں دیکھ کر وہ بھی چونکا تھا۔ کمرے میں میزوں پر کھانے کی سجی ڈشیں اور گول میز پر شراب و کباب کا اہتمام دیکھ کر اس کے لیے بھی موقعے کی نزاکت کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے سراج کی طرف دیکھا تو سراج نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''آپ سپاہیوں کو باہر تعینات کردیں تاکہ کوئی بھی غیر متعلقہ شخص یا ہوٹل کا عملہ بھی بغیر اجازت اندر نہ آسکے۔ ہمیں میڈم کی اس پوزیشن کو اخباری نمائندوں سے ہر قیمت پر محفوظ رکھنا ہوگا۔''
انسپکٹر نے بھی سراج کی بات سمجھ لی، سپاہیوں کو ضروری احکامات اور رازداری سے کام لینے کا حکم دینے کے بعد اس نے دوبارہ سراج سے کمرے میں آکر کہا۔
''سر کیا ہمیں اس کمرے سے فنگر پرنٹ اٹھانے اور ضروری تصویریں لینے کی کارروائی بھی نہیں کرنی ہوگی؟''
''ساری کارروائی نہایت تفصیل اور رازداری سے ہوگی۔ یہ بے حد ضروری ہے لیکن اس سے پیشتر ہمیں میڈم کو کسی طرح اس کے گھر پہنچانا ہوگا۔ اگر میڈم کا نام میں آگیا تو اس کی رسوائی بھی ہوگی اور جو بھی ہمارا مطلو ہے وہ بھی چوکنا ہوجائے گا۔'' سراج نے کچھ سوچ
''ہمیں پوری کہانی میں یہ تاثر دینا ہوگا کہ پولیس جر کسی خفیہ اطلاع پر روم نمبر چار سو آٹھ میں پہنچی اس یہاں کوئی بھی نہیں تھا...... جو بھی تھے وہ مارے پہنچ پہلے ہی فرار ہوگئے تھے۔''
''میں سمجھ رہا ہوں سر!'' انسپکٹر نے تائید کی۔'' میڈم کی پوزیشن بچانے کی خاطر خاص خیال رکھنا ہوگا اخباری نمائندے اس کا جینا حرام کردیں گے...... نمک لگا کر روزانہ نئی نئی من گھڑت سرخیاں لگائیں گے۔''
''ایک خاص بات اور بھی ہے، امید ہے آپ ت کریں گے۔'' سراج نے ہونٹ چباتے ہوئے بات رکھی۔ ''یہ کیس یا تفتیش صرف آپ کریں گے۔ میر درمیان میں نہ آئے تو بہتر ہوگا۔''
''کوئی خاص وجہ؟'' انسپکٹر نے مدھم لہجے میں پو
''پانچ لاشوں کے سلسلے میں بھی میرا نام آچکا ہے، اگر اس کیس میں بھی نام آگیا تو میڈیا کے لوگ میرا جینا د کردیں گے۔''
''ٹھیک ہے سر! ایز یو وش۔''
انسپکٹر کو تفصیل سے تفتیشی کاموں کی ہدایت دینے بعد سراج کو ہوٹل کے منیجر رابرٹ کلارک کو بھی میڈم رو اپنی گاڑی تک پہنچانے کے سلسلے میں اعتماد میں پڑا۔ اسے یقین تھا کہ منیجر بھی سراج کے حکم کے بعد اپنی زبا کھولنے کی غلطی نہیں کرے گا اس لیے کہ ہوٹل کے بہت پرائیویٹ معاملات میں خود وہ بھی ملوث رہ چکا تھا جس ثبوت سراج کے پاس موجود تھے۔
منیجر نے بڑی رازداری سے میڈم روبی کو برقعے م چھپا کر مخصوص راستے کے ذریعے اپنے خاص آدمیوں کی مد سے سراج کی گاڑی تک پہنچا دیا۔ اس کے لیے سراج کو اپ کار بھی ہوٹل کے عقبی حصے کی طرف لے جانا پڑی جو رات آٹھ بجے کے بعد ہی بالکل سنسان ہوجاتا تھا۔
میڈم کو اس کے گھر پہنچانے اور اس کی خاص سیکریٹری کو زبان بند رکھنے کی ہدایت دینے کے بعد ہی اس نے سیٹھ عثمان کے گھر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ راستے میں وہ کسی ممکنہ تعاقب کا جائزہ بھی لیتا رہا۔ لیاقت حسین کا مسئلہ سراج کے ذہن میں الجھ رہا تھا۔ وہ اس حد تک تو سمجھ گیا تھا کہ کوئی قوت ہے جو لیاقت حسین کی نیک کاموں میں مدد کررہی ہے لیکن وہ

...ات اسے کہاں سے حاصل ہوئی؟ اسے کیسے قبل از وقت ...ں بات کا علم ہوجاتا تھا۔ وہ کوئی کام کر گزرتا تھا لیکن اسے ...د میں اس طرح بھول جاتا تھا جیسے کچھ بھی یاد نہ ہو۔ اسی کی ...حانی قوت نے آج میڈم روبی کو ایک بار پھر رسوا ہونے ...ے بچالیا تھا ورنہ شاید وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ ...تی۔
سراج لیاقت حسین سے مل کر اسے ٹٹولنا چاہتا تھا کہ ...ں نے وہ اطلاع کیسے فراہم کی تھی؟ افضل خان کا نام بھی اسی ...نے لیا تھا جو شیخ حامد کا پالتو غنڈا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی ...راج کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میڈم روبی کو ایک ...ر پہلے بھی اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس روز بھی وہ ...فضل خان کے اپارٹمنٹ سے نکلی تھی اور آج...... آج بھی وہ ...فضل خان کے ساتھ اس ہوٹل میں موجود تھی۔ لیاقت حسین ...نے خاص طور پر اسی کا نام لیا تھا، سراج کا ذہن اسی ایک نکتے ...پر غور کررہا تھا کہ جب میڈم روبی افضل خان کے اپارٹمنٹ ...تک جا چکی تھی تو پھر اسے ہوٹل میں ملنے کی کیا ضرورت تھی؟ ...یہ بات سب ہی جانتے تھے کہ افضل خان عیاش بھی تھا لیکن ...میڈم روبی اس قماش کی خاتون نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو کم از کم ...میں پی آغا منظور اس سے شادی کرنے کا خواب کبھی نہ دیکھتا ...ور...... آغا منظور کے حوالے سے سراج کے ذہن میں ایک ...اور خیال نے سر ابھارا۔ آغا منظور کے کہے ہوئے کچھ مخصوص ...جملے اس کے ذہن میں ابھرے تو شیخ حامد کی شخصیت اس کے ...دماغ میں اسپارک کرنے لگی۔ ہوسکتا تھا کہ شیخ حامد ہی کے حکم ...پر افضل خان نے میڈم روبی کو کسی جال میں پھانسنے کی کوشش ...کی ہو مگر کیوں؟ شیخ حامد اور میڈم روبی کے درمیان ایسا کون ...سا مسئلہ تھا جس کو حل کرنے کی خاطر اسے دوبار نشانہ بنانے کی ...کوشش کی گئی اور...... دونوں ہی موقعوں پر لیاقت حسین اسے ...کسی نہ کسی طرح بچانے میں کامیاب رہا۔
اس وقت گیارہ بج رہے تھے جب سراج کی گاڑی ...لیے کر سیٹھ عثمان کا ڈیوٹی گارڈ بھاگتے ہوئے باہر آیا۔
''گیٹ کھولوں صاحب! لیکن اس وقت سب سو رہے ...ہیں۔''
''لیاقت حسین آج ڈیوٹی سے کس وقت گیا تھا؟'' ...راج نے سنجیدگی سے سوال کیا۔
''روز کے مقابلے میں آج وہ ساڑھے سات بجے چلا ...گیا تھا۔ میں نے جلدی جانے کی وجہ پوچھی تو اس نے یہی ...بتایا تھا کہ اسے کوئی ضروری کام کرنا ہے۔'' گارڈ نے کہا۔ ''...تو وہ نو بجے کے لگ بھگ جاتا ہے، کوئی خاص بات ہے صاحب؟''
''نہیں میں صرف یہ بتانے آیا تھا کہ تمہارے صاحب پرسوں رات کی فلائٹ سے واپس آرہے ہیں۔ گھر میں صبح اطلاع دے دینا۔''
''ٹھیک ہے صاحب!'' گارڈ نے کہا پھر سراج نے واپسی کے لیے گاڑی موڑی تو وہ سلام کرتے ہوئے دوبارہ اندر آکر اپنی ڈیوٹی پر کھڑا ہوگیا۔

☆☆☆

شبنم کسی سائے کی طرح میڈم روبی کی ذات سے قریب ترین رہنے کا فیصلہ کرچکی تھی۔ شیخ حامد سے مقابلے کے لیے وہ شبنم کے زیادہ کام آسکتی تھی۔ اس نے میڈم سے ملاقات کے وقت اس بات کا مشورہ دیا تھا کہ وہ افضل خان کے سلسلے میں محتاط رہے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ میڈم کے لیے افضل خان ہی وہ زہر قاتل تھا جسے وہ اپنے دشمن کے خلاف سب سے آسانی سے استعمال کرسکتی تھی، جہاں انتقام لینے کی جلدی ہو وہاں انسان اکثر غیر اختیاری طور پر بھی جذباتی ہوجاتا ہے۔ چنانچہ وہ دفتر سے فارغ ہونے کے بعد روز کسی نئے میک اپ میں میڈم کی ٹوہ میں لگی رہتی تھی۔
اتفاق سے اس روز اس نے میڈم کو گھر سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اس کا تعاقب کرتے ہوئے ہوٹل پہنچی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ڈرائیور کے ہونے کے باوجود وہ خود گاڑی کیوں ڈرائیو کررہی تھی جبکہ ڈاکٹر نے اسے مزید کچھ دنوں آرام کا مشورہ دیا تھا۔ میڈم کے ساتھ ہی ایک لفٹ میں سوار ہونا اس نے مناسب نہیں سمجھا۔ لہٰذا لفٹ کے سامنے گول دائروں کی شکل میں رکھے ہوئے ان صوفوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی جو مہمانوں کے لیے بطور انتظار گاہ مخصوص تھا۔ آس پاس کچھ اور افراد بھی موجود تھے۔ شبنم نے یونہی ایک فیشن میگزین اٹھا کر اس کے اوراق الٹنے پلٹنے شروع کردیے لیکن اس کی نظریں رہ رہ کر ادھر ادھر بھی دیکھ رہی تھیں، انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی متوقع مہمان کی منتظر ہو، اسی دوران میں وہ سوٹڈ بوٹڈ دراز قد آدمی بھی نظر آگیا جو مین گیٹ کے سامنے والے صوفے پر تنہا بیٹھا پائپ سے شغل کررہا تھا۔ ایک دو بار اس کی نظریں بھی اٹھ چکی تھیں، ممکن ہے وہ محض اتفاقی امر ہو لیکن نہ جانے کیوں شبنم کے ذہن میں یہ خیال بڑی سرعت سے ابھرا کہ کہیں وہ اسی کی نقل و حرکت تو نوٹ نہیں کررہا؟ اس خیال نے اسے اور محتاط کردیا۔ سو وہ آدمی اسے پہلی بار نظر آیا تھا لیکن کوئی بات ضرور تھی جس نے شبنم کو اس کی طرف سے چوکنا رہنے کا احساس دلایا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ دراز قد اور کسرتی جسم کا مالک تھا، پہناوے اور رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے اس کا تعلق اونچے لوگوں میں شمار کیا جاسکتا تھا۔ اس نے سنہری فریم کا لائٹ کلر چشمہ لگا رکھا تھا جو اس کی شخصیت کو اور بھی نمایاں کر رہا تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ اٹھائیس اور تیس کے درمیان لگایا جاسکتا تھا۔ شبنم نے بے پروائی سے میگزین کو اس طرح سامنے کرلیا کہ اس کی شکل چھپ گئی لیکن اب وہ ایک خاص زاویے سے اس پر نظر رکھ سکتی تھی۔ اس کی چھٹی حس رہ رہ کر اس دراز قد والے شخص کے خلاف نامعلوم سے شک میں مبتلا کر رہی تھی۔

بیس منٹ تک وہ اپنی جگہ بیٹھا پائپ کے ہلکے ہلکے کش لیتا رہا، بہ ظاہر وہ بے پروا نظر آرہا تھا لیکن پھر شبنم نے اسے جیب سے موبائل نکالتے دیکھا۔ دور ہونے کے سبب وہ اس کی گفتگو نہیں سن سکی تھی لیکن اس کے ہونٹوں پر ابھرنے والی مخصوص مسکراہٹ ابھرتے دیکھ کر شبنم نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ جو کال اسے موصول ہوئی وہ خاص نوعیت کی تھی۔ کال ختم کرنے کے بعد اٹھ کر اس بک اسٹال کی طرف گیا جہاں اس وقت کوئی اور نہیں تھا۔ غیر اختیاری طور پر شبنم بھی اپنے صوفے سے اٹھی، بک شاپ کے قریب ہی ایک بوتیک کی شوونڈو میں جدید تراش خراش کے زنانہ ملبوسات بڑی نفاست سے پلاسٹک کے بنے ماڈلز کے ذریعے ڈسپلے کیے گئے تھے، وہ ان کو قریب جا کر دیکھنے لگی۔ دراز قد کی اس کی طرف پشت تھی اس لیے اس نے شبنم کا کوئی نوٹس بھی نہیں لیا، پھر شبنم نے اسے موبائل پر کسی کو بڑے مدھم لہجے میں کوئی پیغام دیتے سنا تھا۔ وہ پوری بات ٹھیک سے نہیں سن سکی لیکن سراج اور بلیک ٹائیگر، دو ایسے نام تھے جو اس کی سماعت سے ٹکرانے کے بعد اس کے لیے تجسس کا سبب بن گئے۔ اس کے بعد اس نے اس دراز قد والے کو لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوٹل سے باہر جاتے دیکھا تھا۔

شبنم کا تجسس بے سبب بھی نہیں تھا۔ بلیک ٹائیگر یقیناً کوئی کوڈ تھا جو اصل نام کی جگہ استعمال کیا گیا تھا، وہ کون تھا؟ اس نے خفیہ کوڈ اختیار کر کے کس سے بات کی تھی؟ گفتگو کے بعد وہ جس بے پروائی مگر عجلت میں باہر چلا گیا تھا وہ بھی تعجب خیز تھا۔ ابھی وہ ان باتوں پر غور کر رہی تھی کہ اس نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کو ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ بھی خاصی تیزی سے ویٹنگ لاؤنج کا راستہ عبور کر کے لفٹ کی طرف گیا تھا۔ شبنم کے ذہن کے ایک گوشے میں خطرے کی سرخ بتی جلنے بجھنے لگی۔ بلیک ٹائیگر کے حوالے کے بعد ہی سراج کے نام کا معما حل ہوا تو اس نے محسوس کرلیا کہ کہیں کوئی خطرہ ضرور موجود ہے۔ اس نے جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ محتاط انداز میں ٹہلتے ہوئے باہر آئی۔ ٹیکسی کر کے اس صدر کے علاقے میں اسے رخصت کر دیا پھر اس نے ایک قدرے محفوظ جگہ پہنچ کر میڈم کے موبائل پر یکے بعد دیگر تین بار کال کی۔ دوسری جانب گھنٹی بجتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی جس کا مطلب یہی تھا کہ میڈم کسی خطرے سے دوچار ہوگئی ہے۔ سراج کی آمد اس کے شبہے کی تصدیق کر رہی تھی۔ ہوٹل سے باہر آتے وقت اس نے پولیس کی ایک جیپ بھی دیکھی تھی جس سے ایک انسپکٹر اور دو کانسٹیبل نیچے اتر کر ہوٹل کے صدر دروازے کی جانب لپکے تھے، باقی سپاہی جیپ میں ہی تھے۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر شبنم کو اپنی ذاتی حیثیت بھی خطرے میں محسوس ہوئی۔ ''ممکن ہے کچھ لوگ دور رہ کر اس کی نگرانی بھی کر رہے ہوں۔'' یہ سوچ کر اس نے پہلے قریبی وجوار کا جائزہ لیا، پھر ایک ٹیکسی پکڑ کر اسے نیوٹاؤن چلنے کہا۔ کہیں کوئی خطرہ ضرور تھا جو رہ رہ کر اسے بے چین کر رہا تھا۔ نیوٹاؤن پہنچ کر اس نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ یوں ہی قریبی کی بیکری سے روزمرہ کے استعمال کی چند چیزیں خریدیں پھر ایک قریبی بلڈنگ کے مرکزی دروازے سے داخل ہو کر اس کے عقبی راستے سے باہر نکل گئی۔ پچھلی جانب ایک دو افراد کے علاوہ اور کوئی نہیں نظر آیا۔ اس نے وہ پتلی سڑک عبور کی اور دوسری شاہراہ پر نئی ٹیکسی پکڑ کر اپنے اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہوگئی۔ اس دوران میں اس نے اندازہ لگالیا تھا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا گیا تھا۔

اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچ کر اس نے فوری طور پر چہرے سے ریڈی میڈ میک اپ اتارا پھر سکون سے بیٹھ کر حالات کے بارے میں غور کرنے لگی۔ میڈم کا ہوٹل میں تنہا جانا، بلیک ٹائیگر کا حوالہ..... سراج کی ہوٹل میں آمد..... پولیس جیپ کا بعد میں آنا..... یہ ساری باتیں اس بات کی نشاندہی کرتی نظر آرہی تھیں کہ کوئی خاص بات ضرور ہے.....؟ اور وہ بات کیا ہوسکتی ہے؟ کچھ لمحے وہ اس پر غور کرتی رہی پھر اس نے کچھ سوچ کر فون پر افضل خان کے نمبر ڈائل کیے لیکن دو بار کی کوشش کے باوجود کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔ کچھ دیر توقف کے بعد اس نے میڈم کے موبائل کو پھر آزمایا۔ دوسری جانب سے اس کی لیڈی سیکریٹری کی آواز ابھری۔

''مجھے میڈم روبی سے بات کرنی ہے'' شبنم نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔

''سوری اس وقت میڈم کسی سے بات نہیں کرسکتیں۔'' مہذب مگر سنجیدہ آواز میں جواب ملا۔ ''ڈاکٹر ابھی انہیں نیند کی دوا دے کر گیا ہے، میڈم کو اس حالت میں ڈسٹرب نہیں کیا جاسکتا۔ آپ اپنا نام بتا دیں، صبح میڈم کو اطلاع دے دی جائے گی۔''

''انجم بول رہی ہوں۔ صبح میں دوبارہ فون کرلوں گی۔'' شبنم نے انجم کے نام سے میڈم کو اپنا حوالہ دینا ہی مناسب سمجھا تھا۔

موبائل بند کر کے وہ بستر پر دراز ہوگئی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا اپارٹمنٹ بلڈنگ کے ٹاپ فلور پر تھا جہاں اس کے علاوہ کوئی اپارٹمنٹ نہیں تھا۔ اس لیے اس بات کا خطرہ بھی نہیں تھا کہ کسی نے اسے میک اپ میں آتے جاتے دیکھا ہوگا۔ بہرحال اس کے اندر ایک خدشہ بڑی تیزی سے اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔ دو اور دو چار کرنے کے بعد اس نے وقتی طور پر یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ میڈم کسی نہ کسی خطرے سے ضرور دوچار ہوئی ہوگی۔ بلیک ٹائیگر کے حوالے سے جو پیغام دیا گیا تھا وہ بھی اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا، سراج اور پولیس جیپ کی آمد اور اب میڈم کی سیکریٹری کا نیند کی دوا دینے کا جواب..... یہ تمام حوالے اس کے شبہے کو ہوا دے رہے تھے لیکن وہ خطرہ کیا تھا؟ میڈم کو کیا حادثہ پیش آسکتا ہے؟ اور افضل خان کا اپنے اپارٹمنٹ میں اس وقت موجود نہ ہونا؟ یہ ساری بکھری ہوئی کڑیاں شبنم کے ذہن میں کلبلا رہی تھیں۔

سب سے اہم کڑی بلیک ٹائیگر کا کوڈ تھا۔ کون تھا وہ؟ اس معمے کو حل کرتے ہوئے شبنم کے ذہن میں یک لخت شیخ حامد کا نام ابھرا تو وہ خوف سے جھرجھری لے کر رہ گئی..... کہیں وہ بگ باس کا ہی کوئی خفیہ ورکر تو نہیں تھا جو دوسروں پر نظر رکھنے کے لیے تعینات کیا گیا تھا۔

☆☆☆

افضل خان کے لیے بلیک ٹائیگر کا کوڈ خاصا پریشان کن تھا۔

اس کی نظریں نرم و گرم بستر پر میڈم روبی کے گداز رائے ہوئے جسم کے نشیب و فراز پر بھٹک رہی تھیں کہ اچانک بلیک ٹائیگر کسی تر نوالے کے درمیان کباب کی ہڈی بن کر آگیا تھا۔ وہ ریفرینس اس کے لیے نیا ضرور تھا لیکن جب بگ باس کی کہی ہوئی بات اس کے ذہن میں ابھری تو اس نے دوسری جانب سے ملنے والے حکم کو نظر انداز کر دینا مناسب بھی نہیں سمجھا۔ میڈم کے بکھرے ہوئے خوابیدہ اور حسین جسم کے عریاں حصوں پر ایک حسرت بھری نظر ڈالتے ہوئے ایمرجنسی کے راستے سے نکل کر پارکنگ لاٹ تک آگیا، پھر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ساحل سمندر کی طرف جانے والی سنسان سڑک پر نکل گیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اگر واقعی کوئی خطرہ لاحق تھا تو اس کا تعاقب بھی ضرور کیا جارہا ہوگا لیکن اسے دور دور تک تعاقب کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تو وہ جھلا گیا۔

''ڈبل کراس.....'' اس کے ذہن میں یہ اصطلاح بڑی سرعت سے ابھری تو وہ اپنی حماقت پر تلملانے لگا۔ اس کی نظروں کی وسعتوں میں ابھی تک میڈم کا خوبصورت وجود بکھرا ہوا تھا۔ نشے کی کیفیت سے زیادہ اس حسین بدن کا نشہ اس پر ابھی تک طاری تھا، اس کے عیاش ذہن میں فوری طور پر ایک خیال ابھرا۔ میڈم نے اس کی دسترس میں آنے سے پیشتر بھی یہی کہا تھا۔

''دشمن کے مقابلے میں تم میرے لیے زیادہ آسان ٹارگٹ ہوگے۔ تم نے میرے ساتھ دھوکا کر کے اچھا نہیں کیا۔''

ہوسکتا ہے کہ میڈم نے پہلے ہی سے حفظ ماتقدم کے طور پر کسی کو بلیک ٹائیگر کے فرضی نام سے اپنا نجات دہندہ بنا لیا ہو جس نے غالباً طے شدہ پروگرام کے تحت میڈم کی طرف سے کسی کال کا ایک مقررہ وقت تک انتظار کرنے کے بعد بلیک ٹائیگر کے کوڈ کا حوالہ اور بگ باس کے الفاظ استعمال کر کے میڈم کو بچانے کی خاطر افضل خان کو وہاں سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا ہو۔

''نان سنس'' افضل خان نے جھلا کر خود کو مخاطب کیا پھر دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔ ''اب بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی خوبصورت ناگن آج تیرا راز ہر ضرور کشید کیا جائے گا۔'' افضل خان نے اپنا جملہ مکمل کر کے اسٹیئرنگ گھمانے کی کوشش کی لیکن کسی نے پچھلی نشست سے ہاتھ بڑھا کر ایک بھیگا ہوا رومال اس کی ناک پر مضبوطی سے رکھتے ہوئے کہا۔ ''گاڑی روک دو ورنہ تمہاری موت کے خانے میں ایکسیڈنٹ کی وجہ ہی درج ہوگی۔''

افضل خان کا ذہن رومال کی تیز خوشبو کی وجہ سے بڑی سرعت سے خوابیدہ ہو رہا تھا، اس نے حکم کی تعمیل میں بریک پر پاؤں رکھ کر دباؤ بڑھایا پھر..... اسے کچھ یاد نہیں رہا، وہ بے ہوشی سے دوچار ہو کر اسٹیئرنگ پر منہ کے بل اوندھا گر گیا۔

وہ کتنی دیر اس کیفیت سے دوچار رہا اسے اس کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

احساس نہیں ہوسکا پھر یخ پانی کے بار بار ڈالے جانے والے چھینٹوں نے اسے ہڑبڑا کر آنکھ کھولنے پر مجبور کردیا۔ سامنے جو شخص کھڑا تھا اس کو ایک دو بار پلکیں جھپکا کر دیکھنے کے بعد وہ بوکھلا کر رہ گیا۔ موت کا تصور اس کے پورے جسم میں سنسنا گیا۔ وہ شخص اس کے لیے کوئی اجنبی نہیں بلکہ شیخ حامد تھا جو اس کے سامنے کچھ فاصلے پر نہایت اطمینان سے دوسرے صوفے پر بیٹھا تھا۔ کمرے میں ان دونوں کے علاوہ ایک گٹھے ہوئے مضبوط جسم کا پستہ قد شخص اور بھی تھا جس نے بگ باس کے اشارے پر مزید چھینٹے مارنے کا عمل روک دیا تھا۔

''ب..... باس!'' افضل خان سنبھل کر اپنی نشست پر سیدھا ہوگیا۔ اس کے ہاتھ پیر آزاد تھے لیکن ذہن کچھ سمجھنے سے قاصر ہو رہا تھا۔

شیخ حامد کی خونخوار نظریں اسے ٹکٹکی باندھے گھورتی رہیں پھر اس نے بڑے سرد لہجے میں افضل خان کو مخاطب کیا۔

''پریشان مت ہو ابھی تمہاری موت کا وقت نہیں آیا لیکن تمہیں کچھ عرصہ اسی جگہ چھپ کر رہنا پڑے گا۔''

''ب..... باس، وہ..... میں..... مم''

''منمناؤ مت.....'' شیخ حامد کا لہجہ اور سرد ہوگیا۔ ''ابھی تم بگ باس کی نظروں میں ایک کارآمد کارندے ہی ہو لیکن ہمیں معلوم کرنا ہوگا کہ وہ کون تھا جس نے تمہیں ایک خوبصورت موقعے سے فائدہ اٹھانے سے محروم کردیا؟''

''مم..... میں نے سارے انتظامات طے کر رکھے تھے۔ حسین ناگن بھی بے سدھ ہوکر میرے رحم وکرم پر بستر پر بکھری پڑی تھی لیکن، بلیک ٹائیگر.....''

''وہ میرا خاص آدمی ہے جو ایسے موقعوں پر آنکھیں کھلی رکھتا ہے، اس نے بروقت تمہیں موت کے منہ سے بچالیا۔''

''پھر.....'' افضل خان نے اطمینان کی سانس لے کر بگ باس کی طرف دیکھا۔

''پھر میرا کام اور تمہارا مشن ادھورا رہ گیا۔'' شیخ حامد کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھر کر گہری ہونے لگی۔ وہ کسی زخمی درندے کی طرح غرایا۔ ''کسی نے ہوٹل میں ہونے والے ڈرامے کی اطلاع ڈی ایس پی سراج کو دے دی تھی۔ وہ بڑی سرگرمی سے روم نمبر چار سو آٹھ سے شہادتیں اکٹھی کر رہا ہے اور..... وہ خارش زدہ زرخرید بلڈاگ..... ایس پی آغا منظور مجھے تھپکیاں دینے کی کوشش کر رہا ہے..... سن آف اے بچ۔''

''کہیں رابرٹ کلارک نے تو.....؟''

''نہیں.....'' شیخ حامد اس کا جملہ کاٹتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''وہ زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔''

''اور کون ہوسکتا ہے؟''

''تم ادھر ہی سکون سے رہو۔'' شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ''جب تک میری گڈ بکس میں ہو کوئی تمہارے اوپر ہاتھ نہیں ڈال سکتا اور جس دن نظروں سے گر گئے، وہ دن تمہاری اذیت ناک موت کا منحوس دن ہوگا۔''

پھر شیخ حامد تیزی سے پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ افضل خان نے سکون کا سانس لیا۔ وہ اس وقت بگ باس کی شخصیت اور بلیک ٹائیگر ہی کو اپنے لیے فرشتۂ رحمت سمجھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ تصور تیزی سے ابھر رہا تھا کہ اگر اس کو گاڑی میں بے ہوش نہ کیا جاتا، نشے کی کیفیت میں وہ دوبارہ میڈم کے جسم کو تسخیر کرنے کے ارادے سے واپس ہوٹل پہنچ جاتا تو شاید گلے گلے تک پولیس کے شکنجوں میں جکڑ کر رہ جاتا۔ دبی ہوئی فائلیں سرد خانوں سے پھر ایک ایک کرکے نکلنا شروع ہوجاتیں۔

بگ باس کے ساتھ وہ پستہ قد آدمی بھی چلا گیا تو افضل خان نے اٹھ کر کمرے کا جائزہ لیا جہاں زندگی سکون سے گزارنے کی تمام ضروری اشیا موجود تھیں۔ اسے یہ اندازہ بھی ہوگیا کہ وہ کسی نامعلوم عمارت کا تہ خانہ تھا جہاں بگ باس نے اسے سکون سے کچھ دن آرام کا مشورہ دیا تھا۔ افضل خان کے پاس شیخ حامد کے مشورے پر عمل کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ وہ تادیر اپنی پابندی پر غور کرتا رہا۔ سوچتا رہا کہ اگر تاج ہوٹل کے کمرے سے پولیس کو اس کے فنگر پرنٹس اور دو ایک گواہ اس کے اور میڈم کے روم نمبر چار سو آٹھ میں موجود ہونے کے سلسلے میں مل گئے تو اس کی قانونی پوزیشن کیا ہوگی؟ بگ باس اسے بچانے کی خاطر اپنا اثر ورسوخ استعمال کرے گا یا کچھ دنوں کے لیے اسے قربانی کا بکرا سمجھ کر پولیس کے حوالے کرنے میں کسی پس وپیش کا مظاہرہ بھی نہیں کرے گا؟

وہ تہ خانے کے کمرے کے ایک بستر پر نیم دراز تھا۔ حالات کی اونچ نیچ اور اپنے مستقبل کے بارے میں غور کر رہا تھا جب اسے اچانک شبنم کا خیال آیا جو کئی بار قریب آنے کی کوشش کرچکی تھی۔ خود افضل خان نے ایک ہی دفتر میں کام کرنے کی وجہ سے اسے زیادہ قریب ہونے کی اجازت نہیں دی تھی لیکن شبنم نے میڈم روبی کا بیان بدلوانے میں اس کے ساتھ ایک دوست کی طرح بھرپور تعاون کیا تھا۔ وہ اس

اڈے وقت میں بھی کم از کم باہر کے معاملات کی تھوڑی بہت خبر ضرور دے سکتی تھی۔

افضل خان نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا موبائل نکالنے کی کوشش کی مگر اسے مایوسی ہوئی۔ اس کا والٹ اور دوسری تمام چیزیں موجود تھیں لیکن موبائل موجود نہیں تھا جس کا صرف ایک ہی مطلب اخذ کیا جاسکتا تھا۔ شیخ حامد نے اس نامعلوم عمارت کے تہ خانے کے کمرے اور بیرونی دنیا کے تمام تعلقات شاید عارضی طور پر ختم کردیے تھے۔ افضل خان نے جھلا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے جسم کو اس وقت صرف آرام کی ضرورت تھی، کل کیا ہوگا؟ کیا ہونے والا ہے؟ اس کے بارے میں اس نے زیادہ الجھنا مناسب نہیں سمجھا..... دوراندیشی کا تقاضا بھی یہی تھا۔

آنکھ بند کرتے ہی میڈم کا نیم عریاں جسم پھر اس کے تصورات میں کسی کن کھجورے کے مانند چمٹنے لگا۔

☆☆☆

سراج کو یقین تھا کہ دفتر پہنچنے کے بعد اسے سر اٹھانے کا موقع نہیں ملے گا۔ میڈم روبی کے سلسلے میں تفتیشی رپورٹ ملنے کے بعد اسے پرانی فائلوں میں بھی سر کھپانا پڑے گا۔ اس لیے گھر سے نکل کر وہ سیٹھ عثمان کے بنگلے پر پہنچا۔ پہلے اس نے گھر والوں سے سیٹھ عثمان کے سلسلے میں ائرپورٹ جانے اور ساتھ لانے کے بارے میں گفتگو کی اس کے بعد وہ باہر آگیا جہاں لیاقت حسین موجود تھا۔

''کیسے ہو لیاقت حسین ہو؟'' اس نے لیاقت حسین سے کچھ سوالات کرنے سے پہلے اس کی خیریت دریافت کی۔

''اللہ کا کرم ہے صاحب۔'' لیاقت حسین نے بالکل نارمل انداز میں جواب دیا، اس کا چہرہ کسی بھی قسم کی اضطراری کیفیت سے یکسر عاری تھا۔

''سنا ہے کل رات تم جلدی چلے گئے تھے؟''

''جی صاحب میں نے اور عمر گل نے فرحین اور زرینہ کو اپنے شہر بھیج دیا ہے۔''

''سب خیریت تو ہے؟''

''آپ کی مہربانی ہے صاحب لیکن جو لوگ ایک بار ہماری عزت پر ہاتھ ڈال چکے ہیں۔ وہ خبیث دوبارہ بھی کچھ کر سکتے ہیں۔'' لیاقت حسین نے فیصلہ کن انداز میں تفصیل بتائی۔ ''میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ فرحین کے آنے سے پہلے کسی ایسی رہائش گاہ کا بندوبست کرلوں گا جہاں کوئی خطرہ نہ ہو۔''

''اچھا خیال ہے لیکن ابھی جلدی نہ کرنا۔'' سراج نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''اپنے صاحب کو آلینے دو پھر کوئی فیصلہ بھی کرلیں گے۔''

''جیسا حکم صاحب.....''

سراج لیاقت حسین سے گفتگو کرتے ہوئے باہر اپنی گاڑی تک آگیا پھر اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔ ''تم نے اپنے گھر والوں کو کب روانہ کیا تھا، میرا مطلب ہے کہ کس وقت بس میں بٹھایا تھا؟''

''فرحین اور زرینہ عمر گل خان کے ساتھ بس اڈے گئے تھے۔ میں ادھر پونے آٹھ بجے پہنچا تھا، بس کے روانہ ہونے کے بعد ہی لاری اڈے سے واپس آیا تھا۔''

''اور کوئی بات؟'' سراج نے اس کو مزید ٹٹولنے کی خاطر سوال کیا۔

''اور سب ٹھیک ہے صاحب، جب آپ ہیں تو پھر فکر کس بات کی؟''

''لیاقت حسین کیا تمہیں یاد ہے کہ کل رات تم ساڑھے آٹھ اور نو بجے کے درمیان کہاں تھے؟''

''بس ٹھیک آٹھ بجے چل دیا تھا، اس کے بعد گل خان کسی دوست کے پاس چلا گیا اور میں گھر واپس آگیا تھا۔'' لیاقت حسین نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

''راستے میں تم کہیں رکے بھی تھے.....؟''

''بازار کی طرف سے آیا تھا صاحب، ایک دکان سے گھر کے لیے ایک دو چیزیں بھی خریدی تھیں اور کہیں نہیں گیا تھا۔''

''کسی واقف کار کو راستے سے کوئی فون تو نہیں کیا تھا؟''

''کیا بات ہے صاحب؟'' لیاقت حسین نے حیرت سے دریافت کیا۔ ''آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟''

''صرف اتنا کہ تم نے کسی یار دوست کو فون تو نہیں کیا تھا؟'' سراج نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''ادھر سوائے گل خان کے اپنی کسی اور سے یاری دوستی نہیں صاحب، پھر فون کسے کرتا.....؟'' لیاقت حسین نے بدستور سراج کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا ''میں آپ کے سوال کا مطلب نہیں سمجھا۔''

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' سراج نے اس بات پر یقین کرلینے کے بعد کہ لیاقت حسین دروغ نہیں کر رہا، بے تکلفی سے کہا۔ ''لیاقت حسین، فرض کرلو کہ اگر تمہیں کسی موقعے پر میری ضرورت پیش آئے تو کیا تم میرے دفتر یا گھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے نمبر پر فون کر سکتے ہو، میرے نمبر یاد ہیں تمہیں؟''

''زبانی نہیں یاد صاحب لیکن، میں نے ڈائری میں لکھ لیا ہے جو ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہے۔'' لیاقت حسین نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''کوئی ضرورت ہوئی تو آپ کے علاوہ اور کس کو فون کروں گا؟ بہ ظاہر آپ کے علاوہ میری ڈائری میں صاحب کے دفتر اور موبائل کے سارے نمبر بھی نوٹ ہیں۔''

''اور کوئی بات؟'' سراج نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے یوں ہی پوچھ لیا۔

''آج رات اپنا صاحب اور بیگم صاحب آرہا ہے۔ ان کو لینے کے لیے ائرپورٹ بھی جاتا ہے۔''

''میں بھی ادھر آؤں گا۔'' سراج نے کہا پھر وہ دفتر کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس کو لیاقت حسین نے جو جواب دیے وہ اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھے، دو موقعوں پر پہلے بھی وہ دیکھ چکا تھا کہ لیاقت حسین جب کسی روحانی قوت کے تابع ہوتا ہے تو یکسر بدل جاتا ہے، بعد میں اسے گزرے ہوئے لمحات بھی یاد نہیں رہتے۔ سراج کو یقین تھا کہ گزشتہ رات بھی جب اس نے سراج کو فون کیا ہوگا، اس وقت بھی وہ یقیناً کسی پراسرار روحانی قوت کے زیر اثر رہا ہوگا، یہ باتیں سراج کے لیے کسی اچنبھے سے کم نہیں تھیں۔

دفتر جاتے ہوئے راستے میں ایس پی آغا منظور کی کال ریسیو کرنے کے بعد سراج کو سیدھا اسی کی طرف جانا پڑا۔ ایس پی کے آفس میں تاج محل کے علاقے کا انسپکٹر مع فائل کے پہلے ہی سے موجود تھا۔ سراج نے کمرے میں پہلا قدم رکھتے ہی بھانپ لیا کہ اس وقت آغا منظور کا مزاج ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خراب نظر آرہا تھا۔ سراج کے سلام کا جواب بھی اس نے سر کی معمولی جنبش سے دیا تھا۔ ایک لمحے سکوت طاری رہا پھر ایس پی نے کسمسا کر سب سے پہلے انسپکٹر کو مخاطب کیا۔ کمرے میں ان تینوں کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ باہر دروازے کی سرخ لائٹ بھی آن کر دی گئی جس کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔

''فائل میں جو رپورٹس موجود ہیں اس کو اور کسی نے تو نہیں دیکھا؟''

''جی نہیں۔'' انسپکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ڈی ایس پی صاحب نے کل جائے وقوعہ پر ہی مجھے اس کیس کی حساس نوعیت سے آگاہ کر دیا تھا، چنانچہ میں نے ذاتی طور پر اپنی نگرانی میں ساری رپورٹس حاصل کی ہیں۔ میرے علاوہ اور کوئی ان کے بارے میں تفصیل سے واقف نہیں ہے۔''

''میڈم کا نام تو درمیان میں کہیں نہیں آیا؟''

''جی نہیں سر'' انسپکٹر نے مستعدی سے جواب دیا۔

''آنا بھی نہیں چاہیے۔'' ایس پی نے بدستور ہو چباتے ہوئے کہا۔ ''میں اس معاملے میں کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کروں گا۔''

''رائٹ سر!''

''موقعۂ واردات سے وہ جس باسٹرڈ کے پرنٹس ہیں۔ کیا آپ نے اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش بھی؟''

''جی نہیں سر!'' انسپکٹر نے کہا۔ ''اس سلسلے میں آپ اور ڈی ایس پی صاحب کی ہدایت کی روشنی میں ہی کارروائی کروں گا۔''

''گڈ......'' ایس پی نے ایک بار پھر فائل کے پرنٹس اور مشتبہ افراد کے پرنٹس اور اس کے بارے ماہرین کے فیصلے کی رپورٹ پر نظر ڈالی، پھر سراج کی دیکھا۔

''آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''میرے خیال میں صرف دو ہی طریقے ہیں سراج نے سنبھل کر ٹھوس لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''یا تو ذاتی طور پر کوئی بولڈ اسٹیپ لیں یا پھر آپ اپنی فائنڈنگ ٹاپ کانفیڈنشل کے لیبل کے ساتھ ٹاپ لیول تک پہنچا دیں پھر دیکھیں گے اوپر سے کیا جواب آتا ہے۔''

''میرے ذہن میں بھی دو طریقے ہیں مگر آپ رائے جاننا چاہوں گا۔'' ایس پی نے اپنا دامن بچانے خاطر ایک بار پھر سراج کو کریدنے کی کوشش کی۔ وہ ذاتی طو پر خود کو ذمے دار نہیں کہلوانا چاہتا تھا۔ سراج نے اس کی بات سننے سے پیشتر اپنا دامن بچا لیا۔

''میں آپ کے کسی آرڈر کے خلاف نہیں جاؤں گا لیکن چوائس بہرحال آپ ہی کی ہوگی۔''

آغا منظور سراج کے اس سیاسی جواب کو سن کر اندر ہی اندر کھول اٹھا لیکن وہ ایک ہی تالاب میں رہ کر کسی دوسرے مگرمچھ سے بیر لینے کا خطرہ بھی نہیں مول لینا چاہتا تھا۔

''سر!'' انسپکٹر نے دبی زبان میں کہا۔ ''جس مخصوص شخص کے فنگر پرنٹس کو ماہرین نے بھی زیادہ اہمیت دی ہے وہ اس سے پیشتر بھی کئی واردات میں ملوث رہ چکا ہے مگر...... ٹاپ لیول سے ملنے والے احکام کے بعد ہمیں انہیں مجبوراً داخل دفتر کرنا پڑا تھا، شاید اس بار بھی۔''

''انسپکٹر!'' ایس پی نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

''آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس کا علم سب کو ہے انڈر سٹینڈ۔''

''سوری سر!'' انسپکٹر ہچکچا کر خاموش ہوگیا۔

''مسٹر سراج!'' ایس پی نے سراج کو مخاطب کیا۔ ''کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم اس سلسلے میں ڈی آئی جی کرائمز کو بھی شامل کرلیں۔ اس کے مشورے کے بعد قدم اٹھانا ہمارے لیے زیادہ بہتر ہوگا۔ پانچ لاشوں کی فائل بھی ان ہی کے پاس ہے اور موجودہ فائل...... یہ بھی میرے اندازے کے مطابق اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔''

''میں آپ کے اس خیال سے سو فیصد متفق ہوں۔'' سراج نے بے حد سنجیدگی سے تائید کی۔ ''اس طرح اوپر والوں کے کسی ممکنہ عتاب سے بھی محفوظ رہیں گے۔''

''ایک بات میں آپ کو کھل کر بتا دوں.... اس معاملے کو میں آسانی سے فائل نہیں ہونے دوں گا۔''

سراج نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ سمجھ رہا تھا کہ میڈم روبی کی وجہ سے خود ایس پی بھی تلملایا ہوا تھا۔

''انسپکٹر!'' ایس پی نے دوبارہ انسپکٹر کو مخاطب کیا۔ ''تاج ہوٹل کے منیجر رابرٹ کلارک کا کیا کہنا ہے؟''

''میں نے ابھی تک اس کا تحریری بیان نہیں لیا، آپ سے مشورہ کرنے کے بعد ہی ایسا کروں گا لیکن زبانی طور پر اس نے یہی کہا ہے کہ سب سے پہلے ہوٹل کا کمرا بک کرنے کے لیے میڈم ہی کا فون موصول ہوا تھا، اس کے تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ہوٹل کے ایک پارٹنر کا فون آیا تھا جس نے منیجر کو ہدایت کی تھی کہ وہ افضل خان کے ساتھ پورا پورا تعاون کرے۔ کوئی غفلت برداشت نہیں کی جائے گی۔''

انسپکٹر کا جواب سن کر ایس پی چونکا پھر اس سے پیشتر کہ وہ کسی ردعمل کا اظہار کرتا اس کے ان لسٹڈ فون کی گھنٹی بجی جس کا نمبر صرف اہم ترین شخصیات کو معلوم تھا۔ اس خیال سے کہ شاید موجودہ کیس کے بارے میں کہیں اوپر سے اسے کال کیا گیا ہو، اس نے ہچکچا کر ریسیور اٹھا لیا۔ ''ایس پی آغا منظور۔''

''آپ کے لیے ایک اہم اطلاع ہے محترم ایس پی صاحب۔'' دوسری جانب سے کسی نے خاصے ترش انداز میں مخاطب کیا تھا۔

''کون بول رہا ہے؟'' آغا منظور کا لہجہ اچانک تلخ ہوگیا۔ دوسری طرف سے ابھرنے والی آواز اس کے لیے قطعی غیر مانوس تھی۔

''اس سوال کا جواب ضروری نہیں ہے۔'' اس بار بھی ٹھوس لہجے میں کہا گیا۔ ''فی الحال تمہاری اطلاع کے لیے بتا رہا ہوں کہ اب اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا۔''

''وہاٹ نان سنس۔'' ایس پی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ ''کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''بکواس کو حقیقت کا روپ دیا جاچکا ہے مائی ڈیئر...... تمہیں یقین نہ آئے تو افضل خان کے اپارٹمنٹ جاکر خود تصدیق کرلو۔ اگر وہ اس وقت اپارٹمنٹ میں ہوتا تو اس کی بھی وہی حالت ہوتی، جس کنڈیشن میں تمہیں اس کا اپارٹمنٹ نظر آئے گا۔''

''کیا مطلب؟'' ایس پی چونکا۔

''اسے وقتی طور پر منظر عام سے ہٹا دیا گیا ہے لیکن ہم اسے چوہے کے بل سے بھی نکال لیں گے گڈ بائی۔'' دوسری جانب سے لائن کاٹ دی گئی۔

ایس پی نے جھلا کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ اس کا موڈ آف ہوچکا تھا۔

''کس کا فون تھا سر؟'' سراج نے دبی زبان میں پوچھا۔

''ہمارے مطلوبہ مجرم کو انڈر گراؤنڈ کر دیا گیا ہے، اس کے علاوہ فوری طور پر ایک اطلاع کی تصدیق بھی کرنی ہے۔'' ایس پی نے صرف اتنا کہا پھر دوسرے فون کا ریسیور اٹھا کر کسی کے نمبر گھمانے لگا۔ کال ملنے پر اس نے تحکمانہ انداز میں کہا تھا۔

''فوری طور پر کسی ذمے دار ماتحت کو افضل خان کے اپارٹمنٹ بھیج کر معلوم کرو کہ وہاں کی پوزیشن کیا ہے...... راستہ نکالنا تمہارا کام ہے، مجھے بیس منٹ کے اندر اندر تفصیلی رپورٹ درکار ہوگی، اٹ از ٹاپ ارجنٹ۔''

''افضل خان کے اپارٹمنٹ میں کیا ہوا......؟'' سراج نے دلچسپی سے سوال کیا۔

''کسی نے وہاں کی چیزوں کو توڑ پھوڑ کر سارے سامان کو کھنڈر کی شکل میں تبدیل کر دیا ہے۔'' ایس پی نے کسمسا کر جواب دیا۔ ''ابھی دوسرے فون پر یہی کہا گیا کہ...... اب اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا۔''

''کون ہوسکتا ہے جناب اور...... اسے آپ کا ان لسٹڈ نمبر کیسے معلوم ہوا؟'' سراج نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔

ایس پی جواب دینے کے بجائے کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ بھی اسی سوال کا جواب تلاش کر رہا ہے جو سراج نے کیا تھا۔ پھر بیس منٹ سے پہلے ہی فون پر اس اطلاع کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تصدیق کردی گئی جو ایس پی کو درکار تھی۔

''سر..... اپارٹمنٹ لاک نہیں تھا، ہمیں کوئی دشواری نہیں ہوئی لیکن پورے اپارٹمنٹ کے تمام قیمتی ساز و سامان کو توڑ پھوڑ کر غارت کر دیا گیا ہے، کوئی شے بھی سلامت نظر نہیں آئی، کچن کو توڑ پھوڑ کر مکمل طور پر برباد کر دیا گیا ہے۔''

''پاس پڑوس والوں کا کیا کہنا ہے؟'' ایس پی نے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔

''ابھی ہم نے صرف آپ کے حکم کی تصدیق کی ہے، آپ کہیں تو دو چار پڑوسیوں کے بیانات بھی.....''

''نہیں.....'' ایس پی نے اس بار کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ''اپارٹمنٹ جس طرح بند تھا اسی طرح بند کر کے خاموشی سے تھانے واپس لوٹ جاؤ، جب تک کوئی اطلاع نہ ملے۔ مزید کسی کارروائی کو از خود کرنے سے گریز ہی کرنا۔''

''ایز یو وش سر۔''

ایس پی ریسیور رکھ کر پھر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ سراج کے علاوہ انسپکٹر نے بھی محسوس کیا تھا کہ اب اس کے چہرے پر وہ جھلاہٹ اور غصے کی کیفیت نظر نہیں آ رہی تھی، جو پہلے دونوں نے محسوس کی تھی۔ وجہ کا سبب دونوں کے علم میں نہیں آ سکا۔

''کیا رپورٹ ملی سر؟'' سراج نے کچھ توقف سے دریافت کیا۔

''اسی صورت حال کی تصدیق کی گئی ہے جس کی اطلاع ابھی کچھ دیر پہلے ملی تھی۔'' ایس پی نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

''کیا ابھی تک کسی نے رپورٹ درج نہیں کرائی؟''

''نہیں۔'' اس بار ایس پی نے خلا میں گھورتے ہوئے عجیب لہجے میں خود کلامی کا انداز اختیار کیا۔ ''ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ محض پولیس کو مس گائڈ کرنے کی خاطر ایک پری پلانٹ ڈراما ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی نے تنگ آ کر جوابی کارروائی کی ٹھان لی ہو اور بھی کئی باتیں ممکن ہیں، اپارٹمنٹ کی تباہی کے ساتھ افضل خان کے اغوا کی ایف آئی آر بھی کسی کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے جناب؟'' انسپکٹر نے دبی زبان میں سوال کیا۔

''آپ یہ فائل میرے پاس چھوڑ جائیں اور پہلی فرصت میں ہوٹل کے منیجر کا تحریری بیان حاصل کریں۔ اسے یہ بھی باور کرا دینا ضروری ہے کہ زبان بند رکھنا اس کے حق میں زیادہ بہتر ہوگا۔''

''او کے سر!'' انسپکٹر نے اٹھ کر سیلیوٹ کیا پھر پلٹ کمرے سے باہر نکل گیا۔

''کبھی کبھی پاؤں کے نیچے دبی ہوئی چیونٹی بھی کو لینے کی ٹھان لیتی ہے۔'' انسپکٹر کے جانے کے بعد آغا منظور نے سراج سے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''میرا اندازہ اگر درست ہوا تو اب اس نئے کھیل میں پولیس کے لیے کوئی درمیانہ راستہ اختیار کرنے میں زیادہ سہولتیں میسر ہوں گی۔ بہرحال ہمیں سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔''

''سر.....!'' سراج نے ذرا کھل کر کہا۔ ''اگر افضل خان کے اپارٹمنٹ کو تباہ کر دیا گیا ہے تو پھر اس میں ڈرانے والی ہی صورت زیادہ واضح نظر آتی ہے۔''

''آپ کے ذہن میں کس کا نام ابھر رہا ہے؟'' منظور نے سراج کو غور سے دیکھا۔

''سوری سر!'' سراج نے مسکرا کر مدھم لہجے میں جواب دیا۔ ''جہاں تک کھل کر بات کرنے کا سوال ہے تو دونوں ایک ہی پوزیشن میں ہیں۔''

ایس پی، سراج کے جواب پر چونکا ضرور لیکن پھر اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ شاید مناسب بھی یہی تھا۔

''ایک وضاحت اور چاہوں گا سر!'' سراج نے کہا ''ابھی آپ نے کسی چیونٹی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ وہ کون ہے؟''

''میں آپ ہی کا جواب آپ کو واپس کرتا ہوں۔'' ایس پی نے دوستانہ انداز میں مسکرا کر کہا۔ ''ہم دونوں ایک ہی پوزیشن میں ہیں۔''

سراج نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔ وہ آغا منظور کے ساتھ بے تکلف بھی نہیں ہونا چاہتا تھا۔ محتاط روی کا مشورہ اسے ڈی آئی جی کرائمز نے بھی دیا تھا۔

☆☆☆

ہوش میں آتے ہی میڈم روبی اس طرح چونکی جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھتے دیکھتے اچانک اس کی آنکھ کھل گئی ہو۔ نیم غنودگی کے باوجود اس کا ذہن گزری ہوئی باتوں کو یاد کر رہا تھا لیکن ایک خاص موڑ تک پہنچ کر اس کے آگے اندھیرا پھیلنے لگتا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے افضل خان کی بے جا ضد کے بعد جشن صحت منانے پر اپنی آمادگی کا اظہار کیا تھا لیکن شرط یہ رکھی تھی کہ تقریب ہوٹل تاج محل میں ہوگی جہاں اس کے اور افضل خان کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوگا۔ اس بات کو بغیر کسی عذر کے تسلیم بھی کر لیا گیا۔ ایک بار افضل خان کے اپارٹمنٹ جانے کے بعد وہ اغوا ہونے سے بال بال بچی تھی،

...ی فرشتے نے اسے دشمن کے شکنجے سے اپنی جان پر کھیل کر ...چایا تھا۔ اسے کن لوگوں نے اغوا کرنے کی کوشش کی، ان کا ...مقصد کیا تھا، وہ کسی حد تک شیخ حامد کی ذات پر شبہ کر رہی تھی ...لیکن بہرحال اس نے محتاط رہنے کا عہد بھی کر لیا تھا۔ ہوٹل ...تاج محل کے منیجر رابرٹ کلارک کی وجہ سے اس نے وہی جگہ ...مناسب سمجھی تھی۔ شیمپین کی سیل بند بوتل بھی اس نے کسی ...خطرے سے محفوظ رہنے کی خاطر منگائی تھی لیکن شاید افضل ...خان نے کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت بھرپور انداز میں پلاننگ کر رکھی تھی۔

میڈم کو امید نہیں تھی کہ افضل خان اس آخری حد تک بھی جانے کی حماقت کرے گا لیکن اسے یاد آ رہا تھا کہ غنودگی کی حالت میں اسے بانہوں میں سمیٹنے کے بعد افضل خان نے کیا کہا تھا، سارے گھناؤنے جملے اس کے ذہن میں صدائے بازگشت بن کر ابھر رہے تھے لیکن جس وقت اسے ڈبل بیڈ پر زبردستی لٹایا گیا تھا اس کے بعد اس کا ذہن معطل ہو چکا تھا۔ بعد میں کیا کچھ ہوا؟ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

اس وقت وہ کمرے میں صرف ایک نرس کے ساتھ تھی۔ شاید اس کی سیکریٹری تھریسیا نے اس کی گزشتہ رات کی حالت کے پیش نظر ڈاکٹر اور نرس کو کال کر لیا تھا۔ چند لمحوں تک وہ ذہنی خلفشار میں مبتلا رہی پھر نرس سے بولی۔

''آپ میری سیکریٹری کو بلا دیں اور کچھ دیر باہر ہی ٹھہریں، اس کے ساتھ مجھے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

نرس خاموشی سے باہر چلی گئی، ایک منٹ بعد تھریسیا اندر داخل ہوئی۔ اس نے کسی وجہ سے اندر آنے کے بعد دروازے کو بھی لاک کر دیا تھا، میڈم روبی نے اس کی حرکت کو خاص طور پر محسوس کیا۔ یہ بات بھی اس کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی کہ تھریسیا گزشتہ آٹھ سال سے اس کے ساتھ بے تکلف دوستوں کی طرح کام کرنے کے باوجود اس وقت اس سے نظریں ملانے سے گریز کر رہی تھی۔ پھر میڈم نے کسی استفسار کی ضرورت نہیں محسوس کی، وہ تھریسیا کی نظر نہ ملانے کی وجہ کچھ کچھ سمجھ رہی تھی۔

''میں کل رات کس وقت واپس آئی تھی؟'' اس نے کچھ توقف کے بعد تھریسیا کو مخاطب کیا۔

''آپ خود نہیں آئی تھیں۔'' تھریسیا نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔ ''ڈی ایس پی مسٹر سراج آپ کو چھوڑ کر گئے تھے۔ آپ کی گاڑی اس وقت گیراج میں موجود ہے۔''

میڈم..... سراج کا نام سن کر چونکی، پہلی بار بھی اس کی معلومات کے مطابق سراج ہی نے اس کی مدد کی تھی مگر کسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وجہ سے اس کا نام درمیان میں نہیں آیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ سراج کے ساتھ کوئی اور بھی تھا جس نے فائرنگ کے باوجود اسے اغوا کرنے والوں کے ہاتھوں سے چھین لیا تھا۔ وہ کچھ دیر تھریسیا کو دیکھتی رہی جس پر اسے مکمل اعتماد تھا۔ تھریسیا جرمن نژاد تھی لیکن آٹھ سال کے تجربے کے بعد وہ میڈم کے لیے ہر معاملے میں بہترین دوست اور رازدار ثابت ہوئی تھی۔

''مسٹر سراج نے تم سے کچھ کہا بھی ہوگا؟'' اس نے کچھ توقف کے بعد سوال کیا۔

''جی ہاں، ان کا مشورہ تھا کہ آپ کی طرف سے کسی فوری کارروائی سے گریز کیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' میڈم نے اسے گہری نظروں سے ٹٹولا۔

''میں مسٹر سراج کے مشورے سے پوری طرح متفق ہوں۔'' تھریسیا نے ایک اچٹتی نظر میڈم کے چہرے پر ڈالی پھر دوبارہ نظریں جھکا کر بولی۔ ''اگر بات پریس تک پہنچ گئی تو بلاوجہ کی بدنامی ہوگی۔''

''جس وقت میں واپس آئی اس وقت شاید میں پوری طرح ہوش میں نہیں تھی؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے، میں نے بڑی رازداری سے آپ کو بیڈروم تک پہنچایا تھا۔ ایک اہم فرض مسٹر سراج نے ہمارے لیے آسان کر دیا تھا۔''

''وہ کیا؟''

''رات کا ڈیوٹی گارڈ، مسٹر سراج نے خالص پولیس والے انداز میں اسے تنبیہ کر دی تھی کہ اس کی زبان کسی بھی موقعے پر نہیں کھلنی چاہیے ورنہ اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔''

میڈم روبی کے مضطرب ذہن میں پھر سے سوالات کی یلغار شروع ہوگئی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے ساری جھجک بالائے طاق رکھ کر تھریسیا کو بے تکلفی سے مخاطب کیا۔

''جس وقت میں واپس آئی اس وقت تم نے کچھ نہ کچھ تو اندازہ ضرور لگایا ہوگا؟ میرا مطلب ہے کہ تم میری طرح ایک عورت کی حیثیت سے وہ بات سمجھ سکتی ہو جو میرے وجود میں نشتر بن کر چبھ رہی ہے۔ پلیز، میری بات کاٹ کر جواب دینا ورنہ میرا ضمیر ہمیشہ مجھے کچوکے لگاتا رہے گا۔''

''مم..... میں پورے یقین سے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتی البتہ آپ کے میک اپ اور چہرے کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر ضرور پہنچی ہوں کہ اگر مسٹر سراج نے بروقت آپ کی مدد نہ کی ہوتی تو شاید.....'' تھریسیا نے جا بوجھ کر اپنا جملہ مکمل نہیں کیا۔

''آج کے اخبارات.....''

''میں نے آپ کے کہے بغیر تمام اخبارات چھپا ڈالے ہیں۔'' تھریسیا نے میڈم کے اطمینان کی خاطر اس بات کاٹ کر جواب دیا۔ ''آپ سے متعلق کوئی خبر نہیں ہے۔''

''سراج نے دوبارہ فون تو نہیں کیا؟''

''نہیں.....''

میڈم نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی۔ اس وقت دوپہر کے سوا گیارہ کا عمل تھا۔ اس کا ذہن الجھنے لگا۔ اس خیال تھا بیشتر افسران شیخ حامد کی مٹھی میں ہوں گے لیکن سراج نے اسے گھر تک لانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی جبکہ اسے غالباً اس بات کا علم بھی ہوٹل منیجمنٹ کے ذریعے ہو چکا ہوگا کہ روم نمبر چار سو آٹھ میں اس کے ساتھ خان افضل بھی موجود تھا۔ اس کے ساتھ کئی اور خیال بھی میڈم کے ذہن میں کسی بگولے کی طرح چکرانے لگے۔ اسے ہوٹل سے واپس لاتے وقت وہاں کے کچھ ملازموں نے بھی ضرور دیکھ ہوگا..... بات ان کے ذریعے آج نہیں تو کل تک منظر عام پر بھی آسکتی تھی۔ فوری طور پر اس نے ہوٹل کے منیجر کو فون کرنے کا سوچا لیکن پھر اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

''آپ کس الجھن میں گرفتار ہیں.....؟'' تھریسیا نے میڈم کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے سوال کیا۔

''تھریسیا!'' میڈم نے اسے ایک بے تکلف سہیلی کی طرح مخاطب کیا۔ ''اس وقت مجھے پرسنل سیکریٹری کے بجائے ایک سہیلی کے کچھ مفید مشورے درکار ہیں۔''

''آپ مجھ پر اعتماد کر سکتی ہیں۔'' تھریسیا نے اس بار میڈم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے خلوص سے کہا۔ ''میں اگر آپ کے کسی کام آسکی تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔''

''موجودہ پوزیشن میں میری جگہ تم ہوتیں تو..... پہلا قدم کیا اٹھاتیں؟''

''میں سب سے پہلے مسٹر سراج کا شکریہ ادا کرتی جس نے ابھی تک آپ کے سلسلے میں تمام تر احتیاط اور رازداری سے کام لیا ہے۔ اس کے بعد..... میرا ذاتی خیال ہے کہ اب پانی سر سے گزرنے لگا ہے، فیصلہ آپ کو کرنا ہے لیکن میں نے آپ کا نمک کھایا ہے اس لیے اتنا ضرور کہوں گی کہ اب دوسری پارٹی کو بھی اس بات کا احساس دلانا ضروری ہوگیا ہے کہ..... آپ تر نوالا نہیں ہیں۔''

''تھینکس فار یور گڈ ایڈوائس۔'' میڈم نے اطمینان کا اظہار کیا۔ ''میرے ذہن میں بھی یہی دو باتیں گونج رہی تھیں۔ اب تک میں کسی جنجال سے دور رہ کر بلاوجہ اپنی بزدلی کا ثبوت دیتی رہی مگر اب..... ایسا نہیں ہوگا۔''

''ایسی سچویشن میں بھی میری ایڈوائس یہی ہوگی کہ کوئی قدم اٹھانے سے پیشتر مسٹر سراج کو اعتماد میں لینے کی کوشش کریں، کسی نہ کسی پر تو بہرحال بھروسا کرنا ہوگا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میڈم نے سنجیدگی سے کہا پھر اس نے فون بستر پر منگوا کر سراج کے دفتر کے نمبر ڈائل کرنے شروع کیے۔

سراج اس وقت دفتر میں ہی ملا۔ دوسری جانب سے یہی جواب ملا کہ وہ کسی کام کے سلسلے میں ایس پی کے دفتر گیا ہوا ہے۔ اس کا نام بھی دریافت کیا گیا مگر میڈم نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ دوپہر دو بجے تک اس نے تھریسیا کے ذریعے پھر دوسرے فون سے سراج سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

شام کو ناشتے کے بعد وہ تھریسیا کے ساتھ لان میں بیٹھی باتوں میں مشغول تھی جب اس کے موبائل پر کسی نے کال کی۔ نمبر جانا پہچانا نہیں تھا اس لیے میڈم نے موبائل تھریسیا کی طرف بڑھا دیا۔

''ہیلو۔'' تھریسیا نے فون آن کر کے سپاٹ لہجہ اختیار کیا۔

''میرا خیال ہے کہ کل رات آپ سے میری ملاقات ہو چکی ہے۔'' دوسری جانب سے پراعتماد لہجے میں جواب ملا۔ ''اس وقت مجھے میڈم سے بات کرنی ہے۔ دن میں شاید وہ مجھے کنٹیکٹ کرنے کی کوشش کر چکی ہیں۔''

''بات کریں۔'' تھریسیا نے موبائل میڈم کی طرف بڑھاتے ہوئے اشارے سے یہ بھی بتا دیا کہ سراج کی کال ہے۔

''ہیلو، روبی بول رہی ہوں۔''

''آپ نے غالباً مجھے کال کیا تھا۔'' سراج کی آواز ابھری۔ ''میں اسے اپنی بدقسمتی ہی کہوں گا کہ اس وقت میں ایس پی آفس میں ایک اہم میٹنگ کے سلسلے میں مصروف تھا۔''

''مم..... میں نے آپ کا شکریہ ادا کرنے کی خاطر کال کی تھی۔''

''کس بات کا شکریہ؟''

''کل آپ نے میری جس طرح مدد کی..... مجھے کسی پولیس آفیسر سے اس کی توقع نہیں تھی۔'' اس بار میڈم نے سراج کو آزمانے کی خاطر جان بوجھ کر صاف گوئی سے کام لیا۔

''آپ جن حالات سے گزری ہیں اس کے تحت آپ کا اندازہ کچھ غلط بھی نہیں ہے۔'' سراج نے برا مانے بغیر سلجھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ''لیکن پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اور..... ہر پولیس آفیسر ضمیر فروش بھی نہیں ہوتا۔ رہا آپ کا شکریہ ادا کرنے کا سوال تو اس سلسلے میں یہی کہوں گا کہ میں نے جو کچھ بھی کیا وہ اپنا فرض سمجھ کر کیا تھا۔ یقین کرنا نہ کرنا آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔''

''ایک شرط پر یقین بھی کر لوں گی۔''

''قبل از وقت کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''پہلی بار کسی شخص نے جان کی بازی لگا کر مجھے اغوا ہونے سے بچا لیا تھا۔ وہ کون تھا؟''

''میں اس سے واقف ہوں لیکن کسی مصلحت کی بنا پر اس وقت اس کا نام نہیں لے سکتا..... البتہ جواب قرض رہا۔''

بولتے لفظ

☆ اللہ کے ساتھ وابستہ ہونا زندگی ہے اور اس سے غافل ہونا موت ہے۔

☆ اللہ نے جو نعمتیں دی ہیں ان کا یہی شکر ہے کہ تکلیف برداشت کرو۔

☆ آپ کوئی ایک چیز، دین کے نسخے کے مطابق ایک عمل اپنی زندگی میں شامل کر لو، کوئی سا عمل، زندگی... ساری کی ساری دین میں ڈھل جائے گی۔

☆ اگر ظرف نہ ہو تو عطا انسان کو مغرور بنا دیتی ہے، زیادہ ظرف والا آدمی مرتبہ ملنے پر انکساری سے کام لینے لگتا ہے اس لیے اپنے ظرف سے باہر کی تمنا کبھی نہیں کرنی چاہئیں۔

☆ آج بھی تہجد گزار موجود ہیں، آج بھی ہر شے آباد ہے۔ ہر مقام آباد ہے، آج بھی لوگوں کے دل محبت سے بھرے ہوئے ہیں، آج بھی قربانی دینے والے لوگ ہیں۔ آج بھی قتل کرنے والے ہیں۔ آج بھی لوگ خاموش ہیں۔ یہ وقت نہیں آیا کہ نیکی پر راستہ بند ہو گیا ہو، اگر آپ نیک وقت گزارنا چاہو تو گزر سکتا ہے۔

مرسلہ: واصف علی واصف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مسٹر سراج!'' اس بار میڈم نے قدرے بے تکلفی سے کام لیا۔ ''کیا ہم کسی وقت براہ راست مل سکتے ہیں؟''

''آپ ایسی غلطی بھول کر بھی نہ کریں۔'' سنجیدگی سے جواب ملا۔ ''یہ مشورہ میں ایک مخلص دوست کی حیثیت سے دے رہا ہوں۔ ایک بات اور...... اس وقت میں جس نمبر سے بات کر رہا ہوں اسے احتیاط سے نوٹ کرلیں...... ان پر جب بھی چاہیں رابطہ کرسکتی ہیں۔ فوری جواب نہ ملے تو اسے میری مجبوری سمجھ لیں۔''

''میرا دل کہتا ہے کہ آپ پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔''

''کسی پر اعتماد کرنے سے پیشتر اچھی طرح اسے پرکھ کر دیکھ لینا ہی دانشمندی ہوتی ہے۔ ورنہ کبھی کبھی یہی اعتماد انسان کو کوئی ایسا نقصان بھی پہنچا سکتا ہے جس کا تدارک ممکن نہیں ہوتا۔''

''میں...... شاید آپ کا اشارہ سمجھ رہی ہوں۔''

''ایک سوال میں بھی آپ سے پوچھنا چاہوں گا۔'' بے حد سنجیدگی مگر مدھم آواز میں پوچھا گیا۔ ''ہوٹل کے ناخوشگوار واقعے کے بعد کیا آپ کی طرف سے کوئی جوابی کارروائی بھی کی گئی ہے؟''

''جی نہیں......'' میڈم چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ ''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

جواب میں سراج نے کچھ سوچ کر افضل خان کے اپارٹمنٹ میں ہونے والی توڑ پھوڑ کی پوری تفصیل دہراتے ہوئے کہا۔ ''یہ اطلاع اپنی ذات تک ہی محدود رکھیں تو بہتر ہے...... بائی۔''

دوسری جانب سے رابطہ ختم ہوا تو میڈم کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ افضل خان کے سلسلے میں جو بات اس کے علم میں آئی، وہ اس کے لیے حیرت انگیز ہی تھی۔ ذاتی طور پر اس نے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔ اس میں بھی یقیناً اس کے دشمن کا ہاتھ ہوگا۔ شاید اس طرح افضل خان کو تحفظ دینے کی خاطر کوئی شاطرانہ چال چلی گئی ہوگی۔

''کوئی نئی خبر......؟'' تھریسیا نے میڈم کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر دبی زبان میں پوچھا۔

''ہاں۔'' میڈم نے تھریسیا کو ملنے والی اطلاع کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ''اگر اس میں میرے دشمن کا ہاتھ شامل ہے تو پھر افضل خان کو کہیں انڈر گراؤنڈ کر کے پولیس والوں کو اس کے اغوا کا تاثر دیا جائے گا۔''

''آئی۔سی۔'' تھریسیا نے کسمسا کر سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ ہم بھی دشمنوں کی کمینگی کا منہ توڑ جواب دیں۔ فوری طور پر میں آپ کو اور گھر کی سیکیورٹی کی خاطر گارڈز کی تعداد میں اضافے کی تجویز پیش کروں گی۔''

میڈم نے جواب دینے کے بجائے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ اس کے ذہن میں اس وقت سراج کی کھری کھری باتوں کے علاوہ اس کی شخصیت کے کئی نئے پہلو اجاگر ہو رہے تھے۔ اس کا دل یہی کہہ رہا تھا کہ سراج پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

دوسری شام کو شائع ہونے والے اخباروں نے پولیس افسروں کے ذہن میں ابھرنے والے شبہات کو دور کر دیا۔ افضل خان کے بارے میں اور اس کے اپارٹمنٹ میں ہونے والی توڑ پھوڑ کے سلسلے میں جو ایف آئی آر درج کرائی گئی، اس کی روشنی میں اخباری نمائندوں نے کلی پھندنے لگا کر خاصی گرما گرم سرخیاں لگائی تھیں۔ ایک مقبول اخبار کے نمائندے نے جو سرخی لگائی تھی وہ عوام الناس کے لیے توجہ کا مرکز بن گئی۔

''شیر کی کچھار میں لومڑیوں کی دال گل گئی۔''

''عوام الناس میں یہ خبر یقیناً دلچسپی اور حیرت کا سبب ہوگی کہ شہر کے معروف تاجر شیخ حامد جو مرکزی حکومت کے منتخب نمائندوں میں بھی خاصا اثر رکھتے ہیں۔ ان کے بزنس منیجر افضل خان کو اس قدر پراسرار طور پر اغوا کیا گیا کہ پڑوسیوں کو کانوں کان بھنک تک نہ مل سکی۔ جن مجرموں نے شیر کی کچھار میں گھس کر دن دہاڑے افضل خان جیسے خاص آدمی کو اغوا کیا انہوں نے نہایت آرام و سکون سے ان کے اپارٹمنٹ میں بھی دل کھول کر حسب منشا توڑ پھوڑ کی جس کا اندازہ اس بات سے بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ڈرائنگ روم، بیڈ روم کی تمام قیمتی اشیا اور دیوار پر لگی قیمتی پینٹنگز کے ساتھ ساتھ انہوں نے کچن کے کسی ساز و سامان کو بھی اس کی اصل شکل میں نہیں رہنے دیا۔ پورے اپارٹمنٹ کو کھنڈر بنا کر افضل خان جیسے نامی گرامی شخص کو بھی اغوا کر کے لے گئے جو پولیس کی لسٹ پر کئی بار نمایاں حیثیت سے اجاگر ہوا لیکن اتفاق سے کسی معاملے میں بھی اسے کوئی قابل ذکر سزا نہیں ملی۔ حامد گروپ آف کمپنیز کو جوائن کرنے کے بعد چھوٹے موٹے پولیس افسران بھی اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کتراتے تھے۔

ہمارے اخبار نے جب شیخ حامد سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کی تو ہر فون کال پر نو کمنٹس کہہ کر

ان کاٹ دی گئی۔ کاروباری حلقوں میں بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جا رہا ہے کہ افضل خان جیسی نامور شخصیت کے اغوا میں کسی بھی تاجر یا صنعت کار کا ہاتھ بھی شامل ہوسکتا ہے۔ پولیس بھی کھل کر کچھ کہنے سے گریز کر رہی ہے کہ جب تک مکمل تفتیش نہ ہو جائے اور فنگر پرنٹس کی رپورٹ سامنے نہ آجائے وہ کھل کر کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔ چوبیس گھنٹوں میں سنسنی خیز انکشافات کی توقع کی جارہی ہے۔ ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ملحقہ تھانے کے علاوہ دوسرے افسروں نے بھی اپنے فون مصروف کر رکھے ہیں تاکہ ان کی ذاتی مصروفیات میں خلل نہ پڑے۔''

سراج اس وقت اپنی بیوی الماس کے ہمراہ سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھا تھا، جب اس خبر کی تفصیل کو پڑھ کر وہ بھی حیران رہ گیا۔ ایس پی نے گزشتہ روز ہی کسی نامعلوم کال کے بعد افضل خان کے اپارٹمنٹ کے بارے میں خفیہ معلومات حاصل کرلی تھیں اور ملحقہ تھانے کے کارندوں کو بھی ہدایت کردی تھی کہ جب تک کوئی ایف آئی آر نہ درج کرائی جائے وہ کوئی کارروائی نہ کریں۔ اس نے سراج سے یہ شبہ بھی ظاہر کیا تھا کہ یا تو کسی چیونٹی نے ہی بالآخر پلٹ کر کاٹ لینے کا راستہ اختیار کیا ہے یا پھر ساری کارروائی محض ڈراما تھا جو پولیس کو فریب دینے کے لیے رچایا گیا ہے۔ سیٹھ عثمان نے بھی اس خبر پر تعجب اور حیرت کا اظہار کیا تھا۔

''یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہم کل رات ہی کی فلائٹ سے آئے اور آج یہ حادثہ پیش آگیا۔'' راحیلہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔

''اسی کو کہتے ہیں کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔'' الماس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''تعجب اس بات پر ہے کہ میرے یار نے غالباً جہاز میں ہی ساری پلاننگ کی اور گھر آتے ہی دھماکا کرایا۔'' سراج نے بیوی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے سیٹھ عثمان کو چھیڑنے کی خاطر کہا تو راحیلہ نے سراج کو بڑی اپنایت سے گھورا۔

''آپ کو اس وقت مذاق سوجھ رہا ہے اور ادھر ممکن ہے کہ شیخ حامد نے ہمارے آتے ہی پھر اپنی شرارت کا مظاہرہ کر دیا ہو۔''

''اس سے کچھ بعید بھی نہیں ہے۔'' سیٹھ عثمان نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''افضل خان کو اغوا کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہے، ضرور اس میں کسی بہت قریبی کسی آدمی کا ہاتھ شامل رہا ہوگا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' الماس نے شوہر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''اس معاملے میں لومڑی کا کردار کس نے ادا کیا ہوگا؟''

''ہمیں یہ اطلاع کل شام ہی مل گئی تھی۔'' سراج نے سنجیدگی سے میڈم روبی کی ہوٹل والی کہانی کو درمیان سے حذف کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے ایس پی صاحب سے کل ہی کسی نامعلوم شخص نے فون پر کہا تھا کہ اب اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا۔ یہ جملہ بھی زور دے کر کہا گیا تھا کہ اگر اپارٹمنٹ کو کھنڈر کی شکل میں تبدیل کرتے وقت افضل خان وہاں ہوتا تو اس کی لاش کی حالت بھی ٹوٹے پھوٹے سامان سے مختلف نہ ہوتی۔''

''کیا فون کرنے والے نے اس واردات کی وجہ نہیں بتائی تھی؟'' راحیلہ بیگم نے کسمسا کر سوال کیا۔

''نہیں...... لیکن دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔'' سراج نے بدستور کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''یا تو سارا ڈراما خود بڑی مچھلی نے رچایا ہے یا پھر کسی کے صبر کا پیمانہ بھی چھلک سکتا ہے۔''

''بڑی مچھلی والی بات تو میں سمجھ گیا مگر صبر کا پیمانہ......'' سیٹھ عثمان نے سراج کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ''صبر کا پیمانہ کس کا چھلک سکتا ہے؟''

''تمہارا کیا خیال ہے کیا صرف تم ہی اس بلیو وہیل کی مخالف پارٹی کی لسٹ پر ہو؟''

''آپ کی حتمی رائے کیا ہے؟'' الماس نے شوہر سے دریافت کیا۔ ''افضل خان جیسے مگرمچھ کو کس نے جال میں پھانسا ہوگا؟''

''یقین سے نہیں کہہ سکتا مگر اسّی فیصد یقین اسی بات کا ہے یہ محض ڈراما ہے۔'' سراج نے محتاط انداز میں کہا۔ ''کسی ذاتی وجہ سے خود اس کے آدمیوں نے افضل خان کو انڈر گراؤنڈ کیا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کسی غلطی کی وجہ سے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا گیا ہو۔ اگر میرا آخری اندازہ درست ہوا تو اس کی لاش بھی بہت جلد منظر عام پر آجائے گی۔''

''گویا اس بار شیخ حامد نے ایک شخص کو اغوا کرا کے کئی اور مقاصد بھی پورے کرنے کی ٹھانی ہوگی۔''

''بہ ظاہر یہی نظر آتا ہے۔''

پھر اس سے پہلے کہ سیٹھ عثمان کچھ کہتے سراج کا موبائل فون جاگ اٹھا۔ اسکرین پر ایس پی کے نمبر روشن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے۔

''ہیلو سراج اسپیکنگ۔'' سراج نے سب کو خاموش رہنے کو اشارے سے کہا۔

''آپ نے شام کے اخبار دیکھے؟'' دوسری جانب سے سوال کیا گیا۔

''دیکھ چکا ہوں سر..... اور اس بات کا یقین ہے کہ اوپر سے افضل خان کو فوری تلاش کرنے، اصل مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے اور ان سے آہنی ہاتھ سے نمٹنے کے گھسے پٹے جملے بھی ادا کیے جارہے ہوں گے۔''

''پھر آپ نے کیا نتیجہ نکالا؟''

''وہی جو میں کل عرض کر چکا ہوں۔'' سراج نے بھی رازداری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''میں زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں آپ کے آفس میں پہنچ رہا ہوں۔''

سراج عجلت میں چلا گیا تو الماس کندھے اچکا کر بولی۔ ''آپ لوگوں کو مجھ سے شکایت رہتی ہے کہ میں سراج کو وقت نہیں دیتی لیکن میرے میاں کو بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ میرے لیے کتنا وقت نکال سکیں گے۔''

''یہ غلط بات ہے الماس۔'' راحیلہ بیگم شوخی سے بولیں۔ ''میں سراج بھائی کے خلاف کچھ نہیں سن سکتی۔''

''میرا خیال ہے کہ الماس کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی۔'' سیٹھ عثمان نے الماس کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔ ''سراج کالج کے زمانے ہی سے لاابالی آدمی واقع ہوا ہے۔''

جواب میں الماس مسکرا دی، راحیلہ نے کھنکارتے ہوئے شوہر کو محبت بھری نظروں سے گھورا۔ ''سوچ سمجھ کر بات کریں۔ الماس ابھی کچھ دیر میں چلی جائے گی، آپ کو میرے ساتھ ہی رہنا ہے۔''

''اس جملے کے خلاف بھی ایف آئی آر درج کرائی جاسکتی ہے۔'' الماس نے کہا۔ ''کسی کو دھمکی دینا بھی تعزیرات پاکستان میں قابل گرفت جرم ہے اور راحیلہ بھابی آپ کو یہ بھی بھولنا نہیں چاہیے کہ میں بری یا بھلی، جیسی بھی سہی، لیکن ایک ذمے دار پولیس آفیسر کی باقاعدہ نکاح شدہ بیوی ہوں۔''

کچھ دیر اسی قسم کی معصوم نوک جھوک جاری رہی پھر الماس بھی دوبارہ جلد آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوگئی تو راحیلہ بیگم نے سنجیدگی سے شوہر سے کہا۔

''ہمارے واپس آتے ہی افضل خان کے حوالے سے شائع ہونے والی خبر..... اچھا شگون نہیں ہے۔''

''پریشان مت ہوں، میں سراج کے مشورے پر وقتی طور پر باہر ضرور چلا گیا تھا لیکن اب اتنا گیا گزرا بھی نہیں ذرا ذرا سی باتوں پر خوفزدہ ہونے لگوں۔'' سیٹھ عثمان نے بے پروائی سے کہا۔ ''آپ بھی اب اس قسم کے وہم اور فکر پالنا چھوڑ دیں۔''

''آپ بھی وعدہ کریں کہ کبھی مجھ سے مشورہ بغیر شیخ حامد سے الجھنے کی کوشش نہیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' سیٹھ عثمان نے بیوی کا خیال مسکرا کر بات ٹالنے کی کوشش کی۔ ''جب بھی کوئی ایسا وقت میں آپ کی تحریری اجازت قبل از وقت لیے بغیر کہیں قدم نہیں اٹھاؤں گا۔''

''نوازش ہوگی آپ کی۔'' راحیلہ بیگم نے بھی اٹھ کچن کی طرف چلی گئیں۔ سیٹھ عثمان نے دوبارہ نام کو شائع ہونے والے اخبارات الٹنے پلٹنے شروع کر دیے۔

''افضل خان کو کون اغوا کرا سکتا ہے؟'' یہی ایک سوال سیٹھ عثمان کے ذہن میں بھی سوالیہ نشان بن کر گردش کر رہا تھا۔

☆☆☆

خشک ندی کے کنارے بنگالی پاڑے کی وہ گنجان آبادی، کچے پکے مکانات، اس کی تنگ و پر پیچ گلیوں کا جال اس قدر تنگ تھا کہ کوئی نیا آدمی اگر وہاں پہلی بار جائے اور گلیوں کے پیچیدہ ہیر پھیر میں الجھ جائے تو اس کی بھول بھلیوں سے نکلنا اس کے اختیار کی بات نہیں رہتی تھی۔ کوئی واقف کار ہی اسے واپسی کا راستہ تلاش کرنے میں مدد دے سکتا تھا۔ اس کے داخلی راستے آبادی کی طرف تھے اور ایک نہیں کئی تھے، اسی طرح اس کے خارجی راستے بھی بے شمار تھے اور خشک ندی کی طرف نکلتے تھے۔

اس گنجان آبادی میں مقامی پولیس بھی جانے سے کتراتی تھی جہاں دنیا کا سارا اچھا برا کاروبار بڑے دھڑلے سے چلتا تھا۔ جرائم پیشہ افراد کا گروہ اس آبادی کو اپنے لیے ایسی نعمت سمجھتا تھا جہاں قانون کی رسائی مشکل ہی سے ہو پاتی تھی۔ اس آبادی میں زیادہ تر مزدور پیشہ بنگالی اور ان کی عورتیں آباد تھیں جو قریبی گھروں میں کام کرتی تھیں۔ تعلیم کے فقدان کی وجہ سے بچے گلیوں میں کھیل کر جوان ہوتے تھے، انہیں جو ماحول ملتا تھا وہ بھی انہیں یا تو مزدور اور راج مستری بنا دیتا یا پھر وہ جواری بن جاتے۔ ایک بار جرم کی طرف راغب ہونے کے بعد جیسے جیسے ان کی طلب بڑھتی، وہ رسد کی خاطر حشیش، چرس اور ہیروئن کا کاروبار شروع کر دیتے۔ حوصلے بڑھتے تو چوری اور پھر ڈاکا ڈالنے لگتے۔

بہر حال بنگالی پاڑے کی گنجان آباد اور تنگ و پر پیچ گلیوں کی وجہ سے علاقے کی پولیس اور جرائم پیشہ افراد کے درمیان آنکھ مچولی کا سلسلہ جاری رہتا۔

اسی بدنام پاڑے کے خارجی راستے کے کنارے واقع ایک اسی گز کے رقبے پر بنے ہوئے پکے مکان کے اندر چار افراد فرش پر بچھے قالین پر جوا کھیلنے میں مگن تھے۔ مکان کی حالت باہر سے زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن اندر کا معاملہ باہر سے بدرجہ بہتر تھا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

جوا کھیلنے والے چاروں افراد صورت شکل کے اعتبار سے بھی بدمعاش ہی لگتے تھے۔ ہر ایک کے سامنے شراب کے ساتھ اس کے لوازمات بھی نظر آرہے تھے۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ان چاروں کے ساتھ ہی ان کے ریوالور اور کارتوس کی پیٹیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ سامنے قالین پر بڑے چھوٹے نوٹوں کی تعداد بھی اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ ان کے پاس مال کی کمی نہیں تھی۔ جیتی ہوئی رقمیں ہر شخص کے سامنے بکھری پڑی تھیں۔

چاروں کے درمیان وہ بازی پھنس کر رہ گئی تھی۔ دو افراد نے پتے پھینک کر شراب اور سگریٹ سے شغل شروع کر دیا۔ باقی دو بدستور ایک دوسرے کی قسمت ریڈنگ کرنے اور ایک دوسرے کو پتا پھینکنے کے مختلف ہتھکنڈے آزمارہے تھے، بورڈ پر پڑی رقم بھی چار ساڑھے چار ہزار سے کسی طرح کم نہیں تھی۔

''کیا بات ہے رنگیلے؟'' ایک ملوث جواری نے اپنے تینوں پتوں کو آہستہ آہستہ کھس کر دیکھتے ہوئے دوسرے سے کہا۔ ''کوئی تریل پھنس گئی ہے کیا؟''

''نہیں۔'' دوسرے نے اپنے مخاطب کو ڈاج دینے کی کوشش کی۔ ''ایک کے بجائے دو مادھوری پھنس گئی ہیں، انہی کے نام پر قسمت آزما رہا ہوں۔ ویسے میں سمجھ رہا ہوں دھرمیندر مہاراج کہ تو کون سا سکہ اچھال کر مجھے کچا کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟'' دوسرا مسکرا دیا۔

''اسی بات پر گبر سنگھ کے نام پر ایک چال اور۔'' سامنے والے نے سو سو کے چار نوٹ مزید گڈی میں شامل کر دیے۔

''کلر راؤنڈ پھنس گئی ہے شاید۔'' دوسرے نے کہا پھر کچھ توقف کے بعد اس نے بھی چار سو کی رقم ردی کاغذوں کی طرح ڈھیری میں ڈال دی۔

''ایسا کر.....'' پہلے نے تجویز پیش کی۔ ''گھر کی بات ہے، چل ساری رقم ففٹی ففٹی کر لیتے ہیں۔''

''گھسنے کی کوشش کر رہا ہے؟'' دوسرے نے گلاس اٹھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر ایک لمبا گھونٹ لے کر کہا۔ ’’شو کیوں نہیں مانگ لیتا‘‘

’’چل رنگیلے تیرا کہا مان رہا ہوں۔‘‘ پہلے نے مزید چار سو ڈال کر سرسراتے لہجے میں کہا۔ ’’شو کر دے۔‘‘

دوسرے نے کارڈ شو کر دیے۔ پہلے نے ایک لمحے کو منہ بنایا پھر اپنے تین پتے کھولتے ہوئے بولا۔ ’’دیکھ لے میری جان، اپنا دھرمندر تیری مادھوری پر چڑھ بیٹھا۔ اس کے پاس بادشاہ، بیگم اور غلام تھا۔‘‘ پتا نیچے ڈالنے کے بعد اس نے نوٹوں کی گڈی بھی اپنی طرف گھسیٹ لی۔

’’آج تیری گڈی چڑھی ہوئی ہے۔‘‘ تیسرے نے جیتنے والے کو مبارک دی۔

جیتنے والے نے مسکرا کر تاش کے پتے سمیٹ کر انہیں دوبارہ پھینٹنا شروع کیا۔ اسی وقت ایک پانچواں شخص اندر داخل ہوا، وہ بہ ظاہر کسی سوکھے ہوئے جھینگے کی طرح دبلا پتلا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں بلا کی ذہانت تھی۔ اس کے سارے ساتھی اسے استاد انفارمر کے نام سے یاد کرتے تھے اس لیے کہ وہ ظاہری شخصیت کے برخلاف انتہائی چالاک اور پھرتیلا آدمی تھا، کسی قتل و غارت گری میں اس نے کبھی کوئی حصہ نہیں لیا تھا لیکن مخالفین کے ساتھ گھل مل کر ایسی دور کی خبریں لاتا تھا کہ سب ہی اس خوبی کا اعتراف کرتے تھے، وہ نسلاً بنگالی نظر آتا تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں ایک مڑا تڑا اخبار دبا ہوا تھا۔

’’کیا خبر ہے شرلاک ہومز؟‘‘ کمرے میں پہلے سے موجود ایک شخص نے جس کے گلے پر بہت گہرے زخم کا واضح نشان موجود تھا استاد انفارمر کو نئے نام سے مخاطب کیا۔

’’بڑی گرما گرم خبر ہے۔‘‘ استاد انفارمر نے جس کو محلے کے بیشتر پاس پڑوس والے چارلی کے نام سے جانتے تھے، اخبار کھول کر قالین پر بچھاتے ہوئے کہا۔ ’’تمہارے کارناموں کی تعریف سارے اخبار والوں نے کی ہے۔ شیر اور لومڑی کی سرخی لگائی ہے۔ مجھے کئی جگہ سے یہی خبر ملی ہے کہ ادھر پولیس کے بڑے بڑے سورما بھی بغلیں جھانکتے پھر رہے ہیں۔ اپنا بگ باس زندہ با...... آ...... آ د......‘‘

چارلی اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ گردن پر زخم کے نشان والے نے اچانک ہی الٹا ہاتھ اتنی قوت سے گھمایا تھا کہ چارلی لوٹ پوٹ ہو کر رہ گیا۔ باقی تینوں افراد بھی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ زخم کے نشان والا ان کا لیڈر تھا لیکن اس وقت یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ چارلی کو کس جرم کی سزا دی گئی ہے۔

’’کیا بات ہے جیرے استاد؟‘‘ ایک ساتھی نے پوچھا۔

’’دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، حرام کے تخم۔ جیرے استاد نے خونخوار نظروں سے بدستور چارلی کو گھورتے ہوئے خطرناک لہجے میں مخاطب کیا۔ ’’کتنی بار سمجھا چکا ہوں کہ زبان بند رکھا کر، ایک چنگاری بھی پورے جنگل کو جلا کر بھسم کر سکتی ہے۔ تیری زبان پر پولیس اور باس کا نام کیوں آیا؟ کیا زندگی سے عاجز آ گیا ہے؟‘‘

’’بھول ہو گیا استاد۔‘‘ چارلی جواب میں اس طرح گڑگڑانے لگا جیسے اس سے انجانے میں کوئی ناقابل معافی جرم سرزد ہو گیا ہو، کپکپاتے ہوئے بولا۔ ’’آئندہ کے لیے کان پکڑ کر توبہ کرتا ہوں۔‘‘

باقی تینوں کو اخبار کی سرخی دیکھ کر اصل بات کا اندازہ ہوا تو وہ بھی چارلی کو تھپڑ، لاتوں اور گھونسوں سے نوازنے لگے۔ ان کے لیے چارلی کے مقابلے میں اپنی زندگی کی اہمیت زیادہ تھی۔ سب کے منہ سے مغلظات گالیاں ابلنے لگیں۔ نشے کی حالت میں وہ کچھ زیادہ ہی بہک گئے تھے یہ بھی فراموش کر بیٹھے کہ جس چارلی کو اس وقت وہ پرانی روئی کی طرح دھن رہے تھے وہی کئی موقعوں پر ان چاروں کو بروقت پولیس کی ریڈ کی اطلاع دے کر قانون کے شکنجوں میں پھنسنے سے بچا بھی چکا تھا۔

چارلی کی پوزیشن اس وقت اس فٹ بال جیسی تھی جس پر ٹیم کے چار کھلاڑی ایک ساتھ جھپٹ پڑے ہوں اور اس کے حصول کی خاطر زوردار کک لگا رہے ہوں۔ دائیں بائیں قلابازیاں کھانے اور ہاتھ جوڑ کر اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے سوا وہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

’’بس کرو۔‘‘ جیرے استاد کے حکم کے ساتھ ہی باقی تینوں کے ہاتھ پاؤں بھی رک گئے۔ چارلی نے اطمینان کی سانس لی لیکن اس کی دبی دبی سسکیاں بدستور ابھرتی رہیں۔

’’دوبارہ کوئی غلطی کی تو تیری ٹانگیں چیر کر ایک سے دو چارلی بنا دوں گا۔‘‘ ایک دراز قد والے نے غرا کر کہا۔

’’خنزیر کی کھوپڑی میں ہر وقت حسینہ کلبلاتی رہتی ہے۔‘‘ دوسرے نے چارلی کی محبوبہ کو کھنگالنے کی کوشش کی۔ ’’اسی کے لہنگے میں اس کی عقل بھی الجھی رہتی ہے۔‘‘

’’ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔‘‘ تیسرے نے چٹخارا لیتے ہوئے گلاس خالی کیا پھر چارلی کو گھور کر بولا۔ ’’ہفتے میں کتنی بار اس پھلجھڑی کے ساتھ داؤ پیچ لڑاتا ہے؟ ویسے تیری حسینہ ہے بھی ایک دم کسی بچھیا کی طرح جاندار، کبھی ہمیں دیکھتی ہے تو اس طرح بدکتی ہے جیسے قسائی کو دیکھ کر قربانی کا جانور۔‘‘

’’حسینہ کی یاد اچھی دلائی تم نے۔‘‘ چھریرے بدن والا تیز لہجے میں بولا۔ ’’کیا خیال ہے؟ آج چارلی کی طرف سے ہم بھی موج میلا نہ کر لیں۔‘‘

’’بات تو تم نے سولہ آنے میرے دل کی کہی ہے لیکن......‘‘ بونے قد والے ساتھی نے لہرا کر کہا۔ ’’وہ اکیلی بچھیا ہم چار سانڈوں کو برداشت کرنے میں کہیں اوپر کا ٹکٹ نہ کٹا لے۔‘‘

’’کیوں مچھی بھات؟‘‘ دوسرے نے براہ راست چارلی کو دیکھا۔ ’’تو کیا بولتا ہے؟ کیا تیری رانی میں اتنا دم خم ہے کہ ہم کو جھیل لے گی۔‘‘

’’میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں استاد۔‘‘ چارلی جیرے کو دیکھ کر گڑگڑانے لگا۔ ’’غلطی میری تھی، مجھے جو چاہے سزا دے دو لیکن حسینہ کے ساتھ میں شادی بنانے والا ہوں، اس لیے اس کو معاف کر دو۔‘‘

’’کسی اور کو پکڑ لو۔‘‘ دراز قد والے نے نشے میں جھومتے ہوئے کہا۔ ’’تو نے اپنا کھیل خراب کیا ہے، اب تو ہی کسی اور کا بندوبست بھی کرے گا۔ چل اٹھ کر کھڑا ہو جا جلدی سے، کوئی ہچر مچر کیا تو تیری خیر نہیں۔‘‘

’’وہ...... وہ...... شادا کی بڑی بہن چلے گی؟‘‘ چارلی نے مردہ آواز میں کہا۔ ’’وہ دھندا بھی کرتی ہے، ایک بار اس سے دوستی پکی کر لو تو پھر وہ اپنی دوسری جاننے والیوں کی بھی لائن لگا دے گی لیکن......‘‘

’’لیکن کیا؟‘‘ دراز قد والے نے چارلی کو غصے سے گھورا۔ ’’بولتے بولتے تیری نانی کیوں فوت ہو گئی؟‘‘

’’بات نانی دادی کی نہیں، میں تمہیں صرف یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اوپر سے کسی عورت کے ساتھ چکر چلانے کو سختی سے منع کیا گیا ہے۔‘‘ چارلی نے ڈرتے ڈرتے جملہ مکمل کیا۔

’’ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔‘‘ استاد نے اسے ایک اور ٹھوکر لگاتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ’’کسی کو ہمارے ٹھکانوں کی ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے اور ایسی صورت میں جبکہ ہم سب ساتھ ہوں تو پھر کوئی ہلڑ بازی مناسب بھی نہیں رہے گی۔ ویسے بھی ہم جیسوں کی مٹی ہمیشہ کسی نہ کسی عورت ہی کے ہاتھوں پلید ہوتی ہے۔‘‘

’’پھر تو نشہ اتارنے کا ایک ہی علاج ہو سکتا ہے۔‘‘ ایک گٹھے ہوئے اور درمیانہ قد والے نے جیرے استاد کو آنکھ مار کر چارلی کی طرف اشارہ کیا۔ ’’آج کیوں نہ ہم پوری کے پورے اسی پٹھے پر گزارا کر لیں۔‘‘

چاروں اس جملے پر قہقہہ لگا کر لوٹ پوٹ ہو گئے اور چارلی اندر ہی اندر کسی بپھرے ہوئے طوفان کی طرح مچل رہا تھا۔ جن کی زبان پر آج اس کی محبوبہ کا نام آ گیا تھا وہ کل اسے آدم خور بھیڑیوں کی طرح بھنبھوڑنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ چارلی کسی قیمت پر بھی اپنی حسینہ کی عزت کی دھجیاں اپنی نگاہوں کے سامنے اڑتے نہیں دیکھ سکتا تھا...... یہی اس کا آخری فیصلہ تھا۔

☆☆☆

وہ تین دن افضل خان کی آزاد زندگی کے سب سے اذیت ناک دن تھے۔ اس کی آزادی اس طرح ایک نامعلوم عمارت کے زمیں دوز کمرے تک، سلب کر کے محدود کر دی جائے گی، یہ بات اس نے خواب میں بھی نہیں سوچی تھی۔ وہاں زندگی گزارنے کے لیے ضرورت کی تمام اشیا موجود تھیں لیکن وقت گزارنے کے لیے کسی قسم کا کوئی الیکٹرانک سامان موجود نہیں تھا، اس کا موبائل بھی لے لیا گیا تھا۔ ایک پستہ قد اور گٹھے ہوئے مضبوط جسم کا آدمی ضرور تھا جو صبح و شام اس کے کھانے اور ناشتے کا باقاعدہ اہتمام کرتا تھا لیکن اس نے بھی اپنے ہونٹ سی رکھے تھے۔ [illegible] بارے میں کوئی معلومات فراہم کرنا [illegible] افضل خان کے کسی سوال کے جواب میں وہ اسے صرف خشک اور تنبیہہ آمیز نظروں سے دیکھتا تھا جیسے کہنا چاہتا ہو۔ ’’تمہارے حق میں یہی بہت ہے کہ بگ باس نے تمہیں زندہ چھوڑ دیا ورنہ وہ گلاب کے مہکتے پھولوں کو بھی کسی کانٹے سمیت برداشت کرنے کا عادی نہیں ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ صرف اسی کمرے تک خود کو محدود کر لو...... باہر کیا ہو رہا ہے اس کا زیادہ تجسس کرو گے تو ہو سکتا ہے تمہاری گنی چنی سانسیں بھی تم سے چھین لی جائیں......‘‘

افضل خان کو مجبوراً اس کی سرد مہری برداشت کرنا پڑتی۔ وہ اس وقت ایسی پوزیشن میں نہیں تھا کہ اپنی آزادی کے بارے میں کچھ سوچنے کی بھی کوشش کرتا...... شیخ حامد ہی نے اب تک اسے پھانسی کے پھندوں سے بچا رکھا تھا۔ اسی کی بدولت وہ کھلے عام سینہ تان کر آزادی سے گھومتا پھرتا تھا۔ اس کا ایک اشارہ ہی افضل خان کو موت کے گھپ اندھیروں میں ہمیشہ کے لیے غرق کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میڈم روبی کا معاملہ دو تین روز میں دب جانے کے بعد وہ پھر کھلی فضا میں سانس لے سکے گا لیکن...... جانے کیوں اب ہر گزرتا لمحہ اس کی الجھن میں اضافہ کر رہا تھا۔

اس وقت بھی وہ کسی زخمی درندے کے مانند اپنے اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھیں، فرحین کے علاوہ اسے ماں باپ کی یاد بھی تنہائی میں ستاتی تو وہ مضطرب ہوجاتا۔ وہ ماں کا احسان مند تھا جس نے فرحین کے حق میں اپنی مرضی کا اظہار کرکے اس کا دل رکھ لیا تھا۔ اسی کی دعائیں تھیں جو وہ پھل پھول رہا تھا لیکن اسے باپ سے بھی کوئی شکوہ نہیں تھا۔ لیاقت حسین روز اول سے اس بات سے واقف تھا کہ سرفراز خان جس کے ساتھ سردار بھی لکھا جاتا تھا، سخت اور ٹھوس اصولوں کا مالک تھا۔ وہ اپنی بات منوانے کا عادی تھا، دوسروں کی مرضی پر اپنی مرضی کو پس پشت ڈالنا اس کی عادت کے خلاف تھا۔ لیاقت حسین کے ساتھ بھی شادی کے معاملے میں اس نے کوئی واویلا نہیں کیا، صرف اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ اگر وہ باپ کے مقابلے میں اپنی پسند کو ترجیح دینا چاہتا ہے تو اس کی طرف سے کھلی اجازت ہے لیکن نافرمانی کے جرم میں اس نے لیاقت حسین کے اوپر اپنی عالیشان حویلی کے دروازے بند کردیے تھے۔ بہرحال وہ اس کا باپ تھا۔ اس کی ماں کا سہاگ تھا جسے وہ کسی قیمت پر دل کے نہاں خانوں سے دور نہیں کرسکتا تھا۔ وہ ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ گل خان چائے لے کر آ گیا۔ دونوں کے درمیان پھر گفتگو کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ زرینہ کے جانے کے بعد گل خان بھی اپنا بیشتر وقت لیاقت حسین کے ساتھ گزارتا تھا، کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر گل خان نے پوچھا۔

''فرحین کے جانے کے بعد تو وہ پلید کا تخم پھر تمہیں نظر نہیں آیا؟''

''نہیں۔'' لیاقت حسین نے ایک گھونٹ لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''مسجد کے امام صاحب نے آخری ملاقات میں یہی کہا تھا کہ انہوں نے گھر کے چاروں طرف اللہ کے نام کا حصار باندھ دیا ہے۔ کوئی گندی قوت اس حصار کو نہیں توڑ سکتی۔''

''خدا کا شکر ہے کہ اس خبیث کے بچے سے نجات مل گیا۔''

''گل خان!'' لیاقت حسین نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔ ''میرا دل بولتا ہے کہ اب فرحین کے آنے سے پہلے پہلے میں کسی دوسری جگہ گھر لے لوں۔ ادھر فرحین کو اس گندے عمل والے کافر کی وجہ سے سکون نہیں ملتا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' گل خان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔ ''ہماری دوستی ہمیشہ قائم رہے گی، میں زرینہ کو ساتھ لے کر تم سے ملنے آیا کروں گا لیکن ایک بات میری بھی مان لو، جو مکان بھی لو اس کو پہلے اپنے امام صاحب سے بول کر خدا کے نام کا حصار بھی پکا کرا لینا۔''

''تم نے دل خوش کردیا میرے یار۔ میں تو سمجھ رہا کہ تمہاری دوستی میرے آڑے آجائے گی۔''

''ایسا کبھی نہیں ہوگا لیاقت حسین۔'' گل خان نے ایک کپ ختم کرنے کے بعد اپنے اور لیاقت حسین کا خالی کپ دوبارہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''دل میں میل نہ ہو تو انسان سات سمندر دور رہ کر بھی دل کے قریب ہی رہتا ہے۔ فاصلے میرا تیری محبت میں کبھی حائل نہیں ہوں گے۔''

ایک بجے رات تک وہ جاگتے رہے، ہوٹل والا لڑکا آکر کیتلی اور گلاس لے جا چکا تھا، پھر گل خان بھی اپنے گھر چلا گیا تو لیاقت چارپائی پر ٹانگیں پسار کر لیٹ گیا۔ والدین اور فرحین کی یادیں اس کو پھر ستانے لگیں، وہ ان سے دور ہونے کے باوجود دل ہی دل میں دنیا جہان کی میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا پھر نیند کی آغوش میں گم ہوکر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔

دوبارہ اس کی نیند اس وقت خلل انداز ہوئی جب اس نے سراج کی آواز بہت واضح طور پر سنی تھی۔ ''لیاقت حسین باہر آؤ۔'' سراج کسی خاص وجہ سے اسے باہر بلا رہا تھا۔ لیاقت حسین مشینی انداز میں اٹھا۔ دروازہ کھول کر باہر نکلا، اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ سراج اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ شاید وہ لیاقت حسین کو اٹھا دیکھ کر سڑک پر موجود اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا تھا۔ لیاقت حسین نے دروازے کو باہر سے کنڈی لگائی پھر وہ بستی سے نکلنے والے راستے کی سمت دو قدم ہی اٹھا سکا تھا کہ سراج کی آواز اسے قبرستان کی طرف سے آتی سنائی دی۔

اندھیرے کے سبب لیاقت حسین کو سراج نظر نہیں آیا لیکن وہ آواز کی سمت کا تعین کرکے قبرستان کے اندر کی جانب چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر جانے لگا۔ شاید سراج کو اتنی رات گئے کوئی اہم ضرورت ہی اس کے دروازے تک کھینچ لائی تھی۔ وہ اندھیرے میں آگے بڑھتا رہا۔ دس پندرہ قدم چلنے کے بعد اس نے مدھم آواز میں سراج کو مخاطب کیا۔

''صاحب آپ کدھر ہیں.....؟''

''ناک کی سیدھ میں چلے آؤ۔'' لیاقت حسین پھر چل پڑا لیکن جب وہ اس قبر کے قریب پہنچا جہاں سے اس نے گندے عمل والا نیبو نکالا تھا تو اچانک ایک کتے کی آڑ سے جو آدمی اٹھ کر سامنے آیا اسے دیکھ کر ایک لمحے کو لیاقت حسین بھی ششدر رہ گیا۔

وہ ایک دراز قد کالا بھجنگ شخص تھا جس کے جسم پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صرف ایک لنگوٹی نظر آرہی تھی۔ ماتھے پر چندن کی آڑی ترچھی لکیریں بھی نظر آرہی تھیں۔ سر انڈے کے چھلکے کی طرح گھٹا ہوا تھا، سب سے نمایاں اس کی سرخ سرخ آنکھوں کی پتلیاں تھیں جو آنکھوں کے حلقوں کے درمیان دہکتے انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے گلے میں رنگ دانوں والی مالائیں پہن رکھی تھیں۔

کسی خطرے کا احساس ذہن میں ابھرتے ہی لیاقت حسین نے اپنے پستول کو پھرتی سے نیفے سے باہر نکال لیا۔ دبنگ آواز میں سامنے والے کو للکارا۔ ''کون ہے تم..... پلیت انسان۔''

''دھیان سے دیکھ مورکھ۔ میں وہی پرتاب بھوش ہوں جس کے ایک عمل کو تو نے درمیان میں آکر کھوٹا کر دیا تھا۔'' جواب میں گھٹتی ہوئی حقارت بھری آواز ابھری۔ ''تو نے اپنے گھر کے چاروں اور ریکھائیں کھنچوا دی ہیں لیکن دیکھ لے مورکھ میری مہان شکتی تجھے مکھن کے بال کے انوسار کھینچ کر بستر سے باہر نکال لائی۔ اب دھرتی کی کوئی شکتی تجھے کالی کے پجاری کے کشٹ سے مکتی نہیں دلا سکتی..... جے بھوانی، الکھ نرنجن۔'' اس نے جملہ ختم کر کے نعرے لگائے۔

''اچھا ہوا تجھے تیری موت میرے سامنے گھسیٹ لائی۔'' لیاقت حسین نے پستول اس کی سمت کر کے ٹریگر دبا دیا۔ ''ٹچ.....'' فائر کی مدھم آواز سنائی دی، اس کے ساتھ ہی لیاقت حسین پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، زندگی میں اسے پہلی بار کسی خوف کا احساس ہوا، اس کے پستول سے نکلی ہوئی گولی گند اعمل کرنے والے منحوس کے پیٹ میں سوراخ کر کے آر پار ہو گئی تھی لیکن وہ اسی طرح کھڑا رہا، البتہ اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی کوندنے لگیں۔ اس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے نہ جانے کیا منتر پڑھ کر ہاتھوں کو لیاقت کی سمت کر کے غصے سے جھٹکا تو لیاقت حسین کو ایک لمحے کو ایسا لگا جیسے اس کا پورا وجود شل ہو کر رہ گیا ہو۔ اس نے دوسرا فائر کرنے کی خاطر ٹریگر کو دبانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ کسی ماورائی قوت نے اس کے پورے جسم کو جیسے پتھر کا بنا دیا ہو، پستول اس کے ہاتھوں سے پھسل کر زمین پر گر پڑا۔ لیاقت حسین اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گیا، وہ دیکھ سکتا تھا، سن سکتا تھا لیکن اس کی زبان کچھ بولنے سے قاصر تھی۔ خوف کی ایک سرد لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔

''اب سانپ کیوں سونگھ گیا تجھے؟'' چمار ذات پرتاپ بھوش کی منحوس و کرو آواز لیاقت حسین کے کانوں میں گونجی۔ ''تو کالی کے مہان سیوک کو نشٹ کرنے چلا دیکھ رہا تھا مورکھ..... پرنتو اب میں تجھے ایسا شراپ دوں جسے تو سارا جیون بھوگتا رہے گا۔ تیری آتما بھی کبھی شانتی ہو سکے گی، تو بھکاریوں کے انوسار دھرتی پر رلتا پھرے لیکن کوئی تجھے شرف نہیں دے گا۔''

پرتاپ بھوش اپنی جگہ کھڑا اسے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اسے موت سے بدتر زندگی کا پیغام سنا رہا لیکن لیاقت حسین اپنی جگہ سے جنبش کرنے کے قابل نہ تھا۔ پرتاپ بھوش نے اپنی بات ختم کرتے ہی گلے سے رنگ برنگی مالا اتار لی۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ بدبدانے لگے، وہ کسی منتر کا جاپ پڑھ رہا تھا۔ اس کی شعلہ بار نظریں جس کی پلکوں نے جھپکنا بند کر دیا تھا، لیاقت حسین کو قہر آلود انداز میں گھور رہی تھیں۔ ان میں شعلوں کا بھڑکتا رقص جاری تھا۔ لیاقت حسین اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ طاقتوں نے اسے کسی جوابی کارروائی سے یکسر محروم کر دیا تھا۔ پرتاپ بھوش نے اپنا منتر پڑھ کر مالا پر پھونکا پھر اسے لیاقت حسین کی طرف اچھال دیا۔ ایک ثانیے کے لیے موت بھیانک تصور لیاقت حسین کے ذہن میں ابھرا لیکن دوسرے ہی پل اس نے مالا کو فضا میں کسی نادیدہ شے سے ٹکرا کر گرتے دیکھا۔ پرتاپ بھوش حیرت سے اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے حیرت سے سر اٹھا کر بادل کے اس سفید ٹکڑے کو دیکھا جو لیاقت حسین کے سر پر معلق نظر آرہا تھا۔ پرتاپ بھوش ہونٹ چبانے لگا پھر اس نے قہر آلود نظروں سے لیاقت حسین کو گھورتے ہوئے تلملا کر کہا۔

''میں نے جیون میں کبھی ہار نہیں مانی لیکن..... ابھی کوئی مہا پرش تیرے اوپر مہربان ہے۔ پرنتو میری نظریں دیکھ رہی ہیں کہ تیرے بھوش میں کیا لکھا ہے۔ جو شکتی آج تیرے اوپر مہربان ہے وہ کل نہیں ہوگی۔ سمے کی بات ہے، آج بازی تیرے ہاتھ ہے کل جیون کے کسی موڑ پر تیرے پگ اوش سنسار کی سندرتا میں کہیں نہ کہیں رپٹ جائیں گے پھر بازی میرے ہاتھ ہوگی.....'' پرتاپ بھوش نے بل کھاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''چاہے تیرے کارن مجھے دس جنم لینے پڑیں، میں تیرا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ میری بات یاد رکھنا، وہ گھڑی کب آئے گی ابھی میں نہیں بتا سکتا لیکن کالی کبھی اپنے مہان سیوک کو نراش نہیں کرتی۔ دیر سویر کی اور بات ہے، پرودے میری ہی ہوگی، میرے کہے کو گانٹھ مار لے۔ میں جو چنتاونی آج دے رہا ہوں اسے کل پورا بھی میں ہی کروں گا۔''

پرتاپ بھوش اپنی ناکامی کے احساس سے کسی زخمی سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا۔ وہ خاموش ہوا تو لیاقت حسین کو یک لخت ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بندشیں جنہوں نے اسے جکڑ رکھا تھا ٹوٹ چکی ہیں..... اس کے اندر جو طوفان تھم گیا تھا وہ دوبارہ جاگ اٹھا۔ اس نے لپک کر اس مکروہ شخص کو پوری قوت سے دبوچ لیا مگر پھر جو کچھ ہوا وہ بھی اس کے لیے کچھ کم حیرت انگیز نہیں تھا۔ پرتاپ بھوش اس کے شکنجوں میں بس ایک پل کو کسمسایا تھا پھر اس کا بدبودار وجود جیسے ہوا میں تحلیل ہو کر لیاقت حسین کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ اسی لمحے لیاقت حسین اس طرح چونکا جیسے وہ کوئی خواب دیکھتے دیکھتے بیدار ہو گیا ہو۔ اس نے خود کو مکان کے اندر چارپائی کے بجائے قبرستان میں کھڑے دیکھا تو بڑی سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ وہ اندر سے باہر کس طرح آگیا؟ بس دو تین لمحے وہ اسی الجھن میں گرفتار رہا پھر دوبارہ خواب بیداری کی کیفیت سے دوچار ہو کر گھر کی جانب آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔ دروازے کی کنڈی بھی اس نے مشینی انداز میں ہاتھ بڑھا کر کھولی۔ گھر کے اندر داخل ہو کر دروازے کو دوبارہ بند کیا اور اندر اپنے کمرے میں جا کر خاموشی سے چارپائی پر لیٹ کر اس طرح آنکھیں موند لیں جیسے کوئی غیبی یا پراسرار قوت اسے گائڈ کر رہی تھی۔

☆☆☆

چیف منسٹر آفس کے کانفرنس روم میں اس وقت پولیس کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے ایس پی سے لے کر اوپر تک سارے افسران موجود تھے۔ صرف دو ڈی ایس پیز کو مدعو کیا گیا تھا۔ ایک سراج اور دوسرا لودھی، جو شیخ حامد کے علاقے کا ڈی ایس پی ہونے کے علاوہ اس کا خاص آدمی بھی تھا۔ شیخ حامد ہی کی وجہ سے وہ کئی سینئر افسروں کا حق مار کر اس عہدے تک پہنچا تھا۔ اوپر سے لے کر نیچے تک سب ہی کو علم تھا کہ یہ طلبی کیوں ہوئی تھی۔ سوائے ڈی آئی جی کرائمز علیم احمد کے سب ہی متفکر نظر آرہے تھے۔

چیف منسٹر اپنے چیمبر سے نکل کر کانفرنس روم میں داخل ہوا تو سب ہی اٹھ کھڑے ہوئے، جو کانا پھوسی ہو رہی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ چند لمحے کانفرنس روم میں پن ڈراپ خاموشی طاری رہی پھر چیف منسٹر نے لا اینڈ آرڈر اور شہر میں جرائم کے موضوع پر مختصر اً روشنی ڈالی، ان اعداد و شمار کے مطابق جو اسے انفارمیشن سیکریٹری نے فراہم کیے تھے اس پر سرسری تبادلہ خیال کیا پھر ایک گھونٹ پانی حلق سے نیچے اتارنے کے بعد اس نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

''پچھلے دنوں دہشت گردوں نے جو افراتفری پھیلائی ہوئی ہے اس نے عام شہریوں کے سکون پر بھی سوالیہ نشان بنا دیا ہے۔ پانچ اشتہاری مجرموں، جن کے سر کی مختلف قیمتیں مقرر تھیں، ان کی لاشوں کا صبح اندھیرے ہی شہر کی معروف ترین شاہراہ پر پایا جانا ہم سب کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے۔ متعلقہ تھانے کے افراد ابھی تک مجرموں کی نشاندہی کرنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں جو یقیناً نااہلی کا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ شہر کے معروف بزنس مین شیخ حامد کے بزنس منیجر کا اغوا بھی ایک معما بن کر رہ گیا ہے۔ اغوا کرنے والوں نے مغوی کے اپارٹمنٹ کا حلیہ جس انداز میں بگاڑا آپ کو اس کی تفصیل بھی بخوبی معلوم ہے لیکن چھتیس گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی ہماری کارکردگی صفر ہی رہی۔ اس کے علاوہ بھی اخبارات جن باتوں کی خصوصاً جرائم سے متعلق جو نشاندہی کرتے رہے ہیں، ہمارے پاس ان کا بھی کوئی معقول جواب نہیں ہے یہ صورت حال ہم سب کے لیے شرمناک ہے۔''

چیف منسٹر نے باری باری سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی، ایک گھونٹ پانی کا اور حلق سے اتارنے کے بعد قدرے ٹھوس لہجے میں کہنا شروع کیا..... ''مرکزی حکومت سے جو جواب طلبی ہو رہی ہے، اسمبلی میں جو سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔ ہمارے پاس ان کا کیا جواب ہے؟ کب تک ہم اور آپ بغلیں جھانکتے اور الٹی سیدھی تاویلیں پیش کرتے رہیں گے؟ حیرت اور افسوس کے علاوہ شرم کا مقام ہے کہ ابھی تک پولیس کی جانب سے کوئی نمایاں پیش رفت نہیں ہوئی۔ پانچ لاشوں کی سرخیاں ختم نہ ہو سکیں کہ اخبارات کے ہاتھ شیخ حامد کے بزنس منیجر افضل خان کے اغوا کا موضوع..... آگیا۔ اس کا جواب کون دے گا..... کیا اب مجھے اپنی کرسی چھوڑ کر آپ حضرات کی کرسیوں پر بیٹھ کر کام کرنا ہوگا؟''

کانفرنس میں سب ہی دم سادھے بیٹھے تلخ حقائق اور چیف منسٹر کے تیز و تند جملوں کو سن رہے تھے، متعلقہ افسروں نے اپنی اپنی نشستوں پر کسمسانا شروع کر دیا تھا لیکن ڈی آئی جی کرائمز علیم احمد کسی ٹھہرے ہوئے طوفان کی طرح خاموش بیٹھا تھا، اس کا چہرہ کسی بھی قسم کے تاثرات کی ترجمانی سے یکسر عاری تھا۔

کانفرنس روم میں ایک منٹ تک سکوت طاری رہا پھر چیف منسٹر نے قدرے خشک انداز میں کہا۔

''پانچوں اشتہاری مجرموں کی فائل کس کے پاس ہے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

’’لاشیں دستیاب ہونے کے دوروز بعد اسے میرے پاس روانہ کر دیا گیا تھا۔‘‘ علیم احمد نے متعلقہ فائل کا ایک فلیگ شدہ ورق کھولتے ہوئے کہا۔ ’’مرنے والوں کے فنگر پرنٹس کے بارے میں جو رپورٹ آئی ہے وہ......‘‘

’’وہ اوپر والوں کے لیے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی مسٹر علیم احمد صاحب۔‘‘ چیف منسٹر نے الجھ کر کہا۔ ’’یہ بتائیں کہ وہ لوگ کون ہیں جو ابھی تک کھلے عام دندناتے پھر رہے ہیں؟ اور پولیس کی نظروں سے یا تو دور ہیں یا انہیں جان بوجھ کر نظرانداز کیا جا رہا ہے؟‘‘

’’میں آپ کی دوسری بات سے اتفاق کروں گا۔‘‘ علیم احمد نے بے پروائی سے جواب دیا۔

’’کیا مطلب ہے آپ کا......؟‘‘

’’فنگر پرنٹس کی رپورٹس اس بات کا ٹھوس ثبوت پیش کرتی نظر آرہی ہیں کہ مرنے والوں کا کیس جب بھی زیرِ تفتیش آیا پولیس کی طرف سے اس کی مکمل چھان بین کرنے سے پیشتر ہی اوپر سے احکامات آگئے اور انوسٹی گیشن آفیسرز کو مجبوراً وہ فائل سردخانے کے حوالے کرنی پڑیں۔‘‘

’’اور اب وہ اصل مجرم آسمان سے گر کر زمین پر آگئے؟‘‘ چیف منسٹر نے برہم ہوتے ہوئے کہا۔

’’جی نہیں......‘‘ علیم احمد نے دبی آواز مگر بے خوف لہجے میں جواب دیا۔ ’’لاشوں کا اچانک منظرعام پر آنا کسی اور بات کی نشان دہی کرتا ہے۔‘‘

’’وہ بھی بتا دیں؟‘‘ چیف منسٹر کا لب ولہجہ بدستور جارحانہ تھا جو اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اسے ڈی آئی جی کرائمز کا اندازِ گفتگو پسند نہیں آیا تھا۔

’’محترم میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کچھ بڑے لوگ ایسے ہیں جو غنڈہ عناصر اور دہشت گردوں کی نہ صرف پشت پناہی کرتے ہیں بلکہ ان کی پرورش بھی کرتے ہیں۔ جب تک وہ ان کے کام آتے رہتے ہیں، قانون سے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ جس دن ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے اس دن ان کی لاشوں کو منظرعام پر لا کر پولیس کی کارکردگی کو چیلنج کیا جاتا ہے۔‘‘

افسروں کے درمیان چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ چیف منسٹر علیم احمد کو سخت ناپسندیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

’’آپ کی اس قسم کی رپورٹس میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں......‘‘ چیف منسٹر نے پہلو بدل کر کہا۔ ’’کسی ذمے داری کو اپنے سر سے ٹالنے کی خاطر اس قسم کی باتیں کرنا بڑا آسان ہے جناب لیکن اس سے کچھ اور بھی ظاہر ہوتا ہے۔‘‘

علیم احمد چیف منسٹر کے آخری جملے پر تلملا اٹھا۔ سنجیدگی سے اس نے بلاجھجک دریافت کیا۔

’’سر...... میں آپ کے آخری جملے کا واضح مطلب نہیں سمجھ سکا......؟‘‘

’’آپ کے ریٹائرمنٹ میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں؟‘‘ چیف منسٹر نے خشک انداز میں سوال کیا۔

’’باقی ایک دن بھی نہیں رہا ہے جناب...... ایک سال سے زیادہ ہو چکے ہیں۔‘‘

’’میں آپ کی فائل دیکھ چکا ہوں۔‘‘ چیف منسٹر علیم کے جواب پر تلملا اٹھا۔ ’’آپ کو دو سال کا ایکسٹینشن ملا ہے۔‘‘

’’یہ بھی اوپر والوں کا حکم تھا سر...... میں نے اس کے لیے کوئی درخواست نہیں دی تھی۔‘‘ علیم احمد نے برجستہ کہا۔ ’’میں آج بھی عزت کے ساتھ گھر جانے کو تیار ہوں۔‘‘

’’آپ نے ابھی کہا تھا کہ اوپر والے یا صاحبِ اختیار لوگ اپنے ذاتی مقاصد کے لیے شرپسند عناصر کی پرورش کرتے ہیں۔‘‘ چیف منسٹر کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔ اس کے جملے کی ساخت نے اکثر افسران کے ہونٹوں پر لطیف تبسم بکھیر دیا لیکن کچھ افسران زیادہ سنجیدہ نظر آنے لگے تھے۔ چیف منسٹر جن نظروں سے علیم احمد کو دیکھ رہا تھا اس میں تحقیر کے پہلو نمایاں تھے۔

’’مجھے خوشی ہے جناب کہ میں نے اشتہاری مجرموں کی لاشوں کے سلسلے میں جو وضاحت کی تھی وہ آپ نے سمجھ لی۔‘‘ علیم احمد نے چیف منسٹر کی سخت ریمارکس کو بڑی خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ’’مذکورہ فائل میرے پاس چار روز پہلے آئی ہے اور میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں اس کی تفصیلی رپورٹ اور اپنی ایمان دارانہ فائنڈنگز آپ کو پیش کر دوں گا۔‘‘

چیف منسٹر کو علیم احمد کا یہ جواب پسند نہیں آیا۔ اس نے بیزاری سے اپنے شانوں کو ہلا کر باقی افسران کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ اسے مجبوراً اوپر کے احکامات کی وجہ سے علیم کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ پھر اس نے باقی افسران پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ’’وہ لاشیں کس کے علاقے میں پائی گئی تھیں؟‘‘

’’سر......‘‘ ایس پی آغا منظور نے اپنا مائیک آن کرتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی۔ ’’جس روز لاشیں ملی تھیں، میں نے اسی دن سے پوری جدوجہد شروع کر دی تھی لیکن پھر اوپر سے آرڈر آگئے کہ فی الحال تفتیش روک دی

جائے۔ بعدازاں وہ فائل ڈی آئی جی کرائمز علیم احمد صاحب کو اوپر کے حکم کے مطابق بھیج دی گئی تھی۔‘‘

’’کچھ نہ کچھ چھان بین تو آپ نے بھی کی ہوگی۔‘‘ چیف منسٹر نے سوال کیا۔

’’جی ہاں...... میں نے ایک دو باتوں کو خاص طور پر نوٹ کیا تھا لیکن اس کی رپورٹ میں آپ کو میٹنگ ختم ہونے کے بعد آپ کے چیمبر میں دے دوں گا۔‘‘

علیم احمد نے معنی خیز نظروں سے متعلقہ ایس پی کو دیکھا لیکن صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے اس انداز کو سامنے بیٹھے افسران نے خاص طور پر محسوس کیا تھا۔ وہ سب ہی علیم احمد کی ایمان داری اور صاف گوئی کے معترف تھے۔

’’افضل خان کے اغوا کی تفتیش کا کیا بنا؟‘‘ چیف منسٹر نے آغا منظور کی طرف سے نظریں ہٹا کر سوال کیا۔

’’وہ...... میں ڈیل کر رہا ہوں جناب۔‘‘ سراج نے مائیک آن کر کے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ’’شیخ حامد ہمارے شہر ہی کے نہیں بلکہ پورے ملک کے سرفہرست بزنس مین اور صنعت کار شمار کیے جاتے ہیں۔ میں ابھی تک تو ان سے ذاتی طور پر نہیں ملا لیکن اب مسٹر افضل خان کے پراسرار اغوا کے سلسلے میں ان سے ایک ملاقات ضروری ہے۔ اس کے بعد اپنی رپورٹ مکمل کرنے میں مجھے زیادہ آسانی ہوگی۔‘‘

’’کوئی خاص کلیو ملا ہے آپ کو؟‘‘

’’جی ہاں...... لیکن، تفتیش اور رپورٹ مکمل کرنے سے پیشتر میں اس ضمن میں کچھ کہنا قبل از وقت سمجھتا ہوں لیکن سب اشارے بہت واضح ہیں سر...... میرے پوائنٹ آف ویو سے مسٹر افضل خان کو اغوا کرنے میں کسی ایسی شخصیت کا ہاتھ ضرور شامل ہے جو کسی وجہ سے محترم شیخ حامد کو یا تو کوئی مخصوص نقصان پہنچانا چاہتا ہے یا پھر مغوی پر جبر و تشدد کر کے کوئی ایسا بزنس سیکرٹ اگلوانے کی کوشش کرے گا جو اس کے لیے مفید اور شیخ حامد صاحب کے لیے نقصان کا باعث بنے۔‘‘

ڈی آئی جی کرائمز کے علاوہ ایس پی آغا منظور نے بھی چونک کر سراج کی طرف دیکھا۔

’’مجھے اپنے ذرائع سے ایک اہم اطلاع اور بھی ملی ہے۔‘‘ چیف منسٹر نے کسمسا کر کہا۔ ’’میں نے سنا ہے کہ آپ ہمارے ملک کے ایک اور بڑے صنعت کار اور بزنس مین نیلم خان کے کلاس فیلو بھی رہ چکے ہیں؟‘‘

’’میں سمجھا نہیں سر...... آپ کو جو اطلاع ملی ہے اس کی تصدیق کرتا ہوں لیکن ایک کھرے پولیس آفیسر کے لیے اس کی وردی اور اس کے فرائض، ذاتی دوستوں یا کلاس فیلو اور بلڈر ریلیشن سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔‘‘

’’گڈ......‘‘ چیف منسٹر نے کہا پھر کسمسا کر بولا۔ ’’اگر میں کیس فائل، آپ کے بجائے کسی اور کے حوالے کر دوں...... تو؟‘‘

’’یہ فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے سر۔ میں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔‘‘

’’میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر کیس فائل کسی اور......‘‘ علیم احمد نے بولنا چاہا۔

’’سوری مسٹر علیم......‘‘ چیف منسٹر نے ڈی آئی جی کرائمز کا جملہ مکمل ہونے سے پیشتر کہا۔ ’’میں نے آپ سے رائے نہیں مانگی۔‘‘

علیم احمد اپنی کرسی پر پہلو بدل کر رہ گئے۔ اسی لمحے چیف منسٹر چیمبر سے ان کی پرسنل سیکریٹری نے باہر آکر سرخ رنگ کی ایک فائل چیف منسٹر کے سامنے رکھی پھر الٹے قدموں واپس چلی گئی۔ چیف منسٹر نے فائل کھول کر ایک نظر ڈالی پھر اسے ایک طرف رکھتے ہوئے دوبارہ سراج سے مخاطب ہوا۔

’’مسٹر سراج...... میں فی الحال ایک چانس کا موقع آپ کو دے رہا ہوں۔ آپ نے کہا تھا کہ کسی دشمن نے شیخ حامد کو پریشان کرنے کی خاطر اس کے بزنس منیجر کو اغوا کیا ہے؟‘‘

’’یس سر...... میں نے صرف ایک خیال ظاہر کیا تھا......‘‘ سراج نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ ’’دوسرا امکان اغوا برائے تاوان کا بھی ہو سکتا ہے...... مگر چھتیس گھنٹے گزر جانے کے بعد یہ امکان زیادہ اہم نظر نہیں آتا۔‘‘

’’کوئی وجہ......؟‘‘

’’ظاہر ہے سر......‘‘ سراج نے جواب دیا۔ ’’اگر بات اغوا برائے تاوان کی ہوتی تو مسٹر شیخ حامد سے اب تک اس کا مطالبہ کیا جا چکا ہوتا۔‘‘

’’ہو سکتا ہے کہ کیا جا چکا ہو اور آپ کو اس کو علم نہ ہو سکا ہو...... یا آپ کو انفارم کرنا کسی وجہ سے ضروری نہ سمجھا گیا ہوں۔‘‘ ایس پی اینٹی کرپشن نے پہلی بار زبان کھولی۔

’’میں نے صرف اپنے خیال کا اظہار کیا تھا سر۔‘‘ سراج نے برجستہ جواب دیا۔ ’’اندرونی حقائق اگر متعلقہ تفتیشی افسران کے علم میں نہ لائے جائیں تو پھر...... وہ کیا کر سکتا ہے۔‘‘

خاصی دیر افضل خان کے اغوا، اس کے اپارٹمنٹ میں ہونے والی سنگین نوعیت کی توڑ پھوڑ اور پانچ اشتہاری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجرموں کی لاشوں کے بارے میں مختلف افسران اپنا اپنا خیال ظاہر کرتے رہے پھر چیف منسٹر نے دوبارہ علیم احمد کو مخاطب کیا۔

''آپ ان لاشوں کے بارے میں اپنی فائنڈنگس جلدازجلد مکمل کرکے مجھے براہ راست بھجوادیں......''

''ایز یو وِش سر......'' علیم احمد نے خشک انداز میں جواب دیا پھر ہاتھ بڑھا کر اپنا مائیک آف کردیا۔ چیف منسٹر کے علاوہ دوسرے، سامنے بیٹھے افسران نے بھی علیم احمد کے بگڑے ہوئے تیور کو محسوس کیا تھا لیکن کسی نے اس ضمن میں کچھ نہیں کہا۔

کانفرنس ختم ہونے کے بعد دوسرے کمرے میں لائٹ ریفریشمنٹ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ علیم احمد نے اس میں بھی شرکت نہ کرکے کھلے لفظوں میں اس بات کا خاموش اظہار کردیا تھا وہ کسی کے دباؤ میں آکر کام کرنے کا عادی نہیں تھا۔

☆☆☆

شیخ حامد کو جیسے ہی وزیراعلیٰ کی پولیس کانفرنس کی تفصیلی رپورٹ اپنے مخصوص موبائل پر موصول ہوئی وہ اٹھ کر اپنے وسیع وعریض پرسنل آفس میں ٹہلنے لگا، وہ خاص طور پر ڈی ایس پی سراج کے بارے میں غور کررہا تھا۔ کانفرنس کے دوران میں سراج نے جس طرح ایک دبنگ آفیسر کی طرح کھل کر دوٹوک باتیں کی تھیں اس کے لیے کئی مختلف پہلو اس وقت شیخ عابد کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ اس نے گزشتہ دنوں سراج کی فون کال ریسیو کرنے کے بعد گفتگو کے دوران میں اس بات کا یقین دلایا تھا کہ اگر اشتہاری مجرموں کی لاشوں کے سلسلے میں پولیس والوں میں کوئی اکھاڑ پچھاڑ ہوئی بھی تو سراج کے تبادلے کی نوبت نہیں آئے گی۔ شاید اس پہلو کے پیش نظر سراج نے وزیراعلیٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کی تھی۔ دوسرا پہلو یہ بھی اس کے حق میں جاتا تھا کہ اس نے میڈم روبی کو بھی بہ حفاظت رازداری سے اس کے گھر پہنچانے کے علاوہ افضل خان کے نام کو بھی منظرعام پر نہیں آنے دیا تھا حالانکہ وہ اس معاملے کی آڑ میں ڈھکے چھپے لفظوں میں بھی شیخ حامد کے خلاف تھوڑا بہت زہر تو اگل سکتا تھا۔ ہوٹل کے منیجر نے علاقے کے انسپکٹر کو جو بیان رجسٹر میں اندراج، روم بکنگ کی روشنی میں دیا تھا اسے بھی ہوا دی جاسکتی تھی اور افضل خان کے منظرعام سے غائب ہوجانے کے اہم مسئلے کو بھی اس نے پولیس کے تمام سینئر آفیسر کی موجودگی میں شیخ حامد سے کسی کی دشمنی کا شاخسانہ قرار دیا تھا۔

انہی زاویوں کی روشنی میں اس نے بروقت وزیرا[علیٰ] کی پرسنل سیکریٹری کو فون کرکے یہ تجویز ایک فائل میں رکھ[وا کر] کانفرنس روم تک پہنچوادی تھی کہ سراج کی جگہ فی الحال کس[ی] کو انکوائری آفیسر نہ مقرر کیا جائے۔ یہ مثبت پہلو تھے جو سرا[ج] کے حق میں جاتے تھے لیکن شیخ حامد منفی پہلوؤں کو بھ[ی] نظرانداز نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک نکتہ یہ بھی ر[ہ] رہ کر خطرے کی سرخ بتی کی طرح اسپارک کررہا تھا کہ ممکن ہے محض شیخ حامد پر اپنی وفاداری ظاہر کرنے کی خاطر سراج نے مصلحتاً زبان نہ کھولی ہو لیکن درپردہ وہ سیٹھ عثمان کو اپنی ان چالبازیوں سے کوئی فائدہ پہنچانا چاہتا ہو......؟

وہ خاصی دیر تک نہایت باریک بینی سے ایک ایک نکتے پر غور کرتا رہا پھر اس نے ایک دوسرا موبائل نکالا، اس میں ان رجسٹرڈ سم پڑی تھی جس کو ٹریس نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر اس نے جوتوں سمیت دونوں ٹانگیں میز کے ایک کونے پر لٹکائیں پھر کسی کے نمبر پنچ کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت کسی لومڑی جیسی چالاکی چھلک رہی تھی۔ ایک منٹ بعد ہی موبائل پر ایک بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

''کون ہے؟''

''بی۔بی۔ایس۔اے'' شیخ حامد نے اپنی مخصوص شناخت کرائی۔

''بی۔ٹی۔فور، آن دی لائن سر......'' دوسری جانب سے بھی کوڈ ورڈ میں جواب ملا۔

''تمہیں ایک اہم ذمے داری سونپ رہا ہوں لیکن کسی قسم کی غفلت کا مظاہرہ نہ کرنا......''

''بلیک ٹائیگر جانتا ہے بگ باس کہ غفلت کرنے والوں کی پہلی ہی سزا آخری ثابت ہوتی ہے۔''

''گڈ...... مجھے تمہارا جملہ پسند آیا۔''

''میں حکم کا منتظر ہوں بگ باس۔'' اس بار بھی سعادت مندی کا اظہار کیا گیا۔

''سراج کی ایک ایک نقل وحرکت پر نظر رکھو۔'' شیخ حامد نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''ڈے اینڈ نائٹ ڈاگ واچ۔ مجھے دو روز بعد تمہاری رپورٹ درکار ہوگی۔ وہ کہاں جاتا ہے؟ کس سے ملتا ہے؟ گھر کے اندر یا باہر کتنا وقت گزارتا ہے؟ اس کے چہرے کے تاثرات کیا ہوتے ہیں؟ مجھے ایک ایک بات کی تفصیلی رپورٹ درکار ہوگی۔''

''رائٹ باس......'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''جسے

[...]گراؤنڈ کیا گیا ہے اس کی نگرانی کسے سونپی جائے؟''

''تم میری طرف سے نمبر تھری کو فون کرکے ضروری [ہد]ایت کردو...... ویسے میرا خیال ہے کہ اب وہ زیادہ بے چینی کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔''

''اور کوئی حکم......؟''

''نمبر تھری کو ڈیوٹی سونپنے سے پیشتر اگر مناسب سمجھو تو اندر والے کو یہ خوش خبری دے دو کہ اب اس کی قید کے دن گنے چنے رہ گئے ہیں...... ہوسکتا ہے کہ دو روز بعد ہی اسے کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع میسر آجائے۔''

''او۔کے باس۔''

شیخ حامد نے موبائل بند کرنے کے بعد ایک لمحے کو کچھ غور کیا پھر اپنے آفس کے ریگولر فون کا ریسیور اٹھا کر سیٹھ عثمان کے نمبر گھمانے لگا۔ رابطہ قائم ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

''ہیلو مائی ڈیئر عثمان......'' شیخ حامد نے چہکتے ہوئے دوستانہ انداز میں گفتگو شروع کی۔ ''ٹور کیسا رہا؟''

''ونڈرفل......'' دوسری جانب سے سیٹھ عثمان کی آواز ابھری۔ ''آپ کیسے ہیں، کاروبار کیسا چل رہا ہے؟''

''سب کچھ ونڈرفل ہے۔'' شیخ حامد نے کہا۔ ''آج شام کا کیا پروگرام ہے؟''

''ایز یوژول...... چھ بجے دفتر سے اٹھ کر سیدھا گھر ہی جاؤں گا۔''

''بھابی نے خوب انجوائے کیا یا نہیں؟'' شیخ حامد نے اپنایت سے دریافت کیا۔

''اس کا بس چلے تو سال میں کم ازکم مجھے دو مرتبہ اسے لے کر باہر جانا پڑے۔'' سیٹھ عثمان نے کہا۔ ''بیرونی ملک جاکر وہ ہمیشہ بہت انجوائے کرتی ہے۔''

''ہونا بھی چاہیے...... ادھر بیٹھ کر بھابی کو دن بھر تمہارے انتظار کے سوا اور کیا کام رہ جاتا ہے۔''

''کیسے فون کیا......؟''

''آج ڈنر پر میں نے تمہیں اور بھابی کو بلانے کا ارادہ کیا ہے۔'' شیخ حامد نے کہا۔ ''پلیز...... تم کوئی بہانہ نہیں کروگے ورنہ مجھے براہ راست بھابی کو فون کرنا پڑے گا۔''

''اس کی نوبت نہیں آئے گی۔'' سیٹھ عثمان نے اس کی دعوت قبول کرتے ہوئے پوچھا۔ ''بڑے لوگوں کے ڈنر کا وقت بھی بتادو؟''

''ٹھیک نو بجے......'' شیخ حامد نے جواب دیا۔ ''میں اب کوئی ایکسکیوز نہیں سنوں گا اور...... ایک بات اور سن لو، جلدی بھاگنے کی کوشش مت کرنا، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

''او۔کے۔''

''بائی......'' شیخ حامد نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ابھرنے والی چمک اس بات کی ترجمانی کررہی تھی کہ وہ اپنے ذہن میں کسی خاص منصوبے کو ترتیب دے رہا تھا۔

☆☆☆

ایمرٹس ائرلائن کا طیارہ اس وقت بادلوں سے بہت اوپر پرواز کررہا تھا۔

فرسٹ کلاس کے کیبن میں اس وقت کل تین مسافر سفر کررہے تھے لیکن اتفاق سے ان کی نشستیں بھی ایک دوسرے سے دور دور تھیں۔ رنگ اور نسل کے اعتبار سے بھی وہ مختلف ممالک کے باشندے نظر آرہے تھے لیکن اتفاق سے وہ تینوں فرینکفرٹ ائرپورٹ سے جہاز میں سوار ہوئے تھے۔ جہاز کی اب آخری منزل کراچی کا انٹرنیشنل ائرپورٹ تھی۔ فرینکفرٹ ائیرپورٹ سے روانگی کے بعد رات کا کھانا بھی انہوں نے اپنی اپنی نشستوں پر لیا تھا پھر ان تینوں نے فضائی میزبان سے اپنی اپنی پسند کی شراب طلب کی تھی۔

ان تینوں میں سب سے نمایاں وہ سیاہ فام تھا جو درمیانہ قد اور چھریرے جسم کا مالک تھا، اس کے سر کے بال گھنگریالے تھے مگر ان کی لمبائی شاید ایک یا ڈیڑھ انچ سے کسی طرح بھی زیادہ نہیں تھی، اس کی آنکھیں گول تھیں، پتلی کی رنگت زردی مائل تھی۔ کان اور پیشانی دونوں اس کے قد کے اعتبار سے میل کھاتے نظر نہیں آرہے تھے۔ بظاہر وہ پچیس سال کے پیٹے میں نظر آتا لیکن عمر کے اعتبار سے اس کے گفتگو کا انداز بوڑھوں جیسا تھا۔ کھانے کے دوران میں بھی اس نے کئی بار ائرہوسٹس کو اپنے پاس کسی نہ کسی ضرورت سے طلب کیا تھا۔ شاید اسے یہ بات بری لگی تھی کہ محض سیاہ رنگت کی وجہ سے وہ اس کے مقابلے میں ایک پستہ قد اور چپٹی صورت شکل والے چائنیز میں زیادہ دلچسپی لے رہی تھی جو رفتہ رفتہ اس فضائی میزبان سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہوتا جارہا تھا۔

تیسرا مسافر جو دراز قد اور سفید فام تھا وہ ایک فیشن میگزین میں منسلک بیوٹیز کی نیم عریاں تصویروں سے لطف اندوز ہورہا تھا، صورت شکل کے مقابلے میں باقی دو مسافروں کے مقابلے میں وہ زیادہ جاذب نظر تھا لیکن اس نے ائرہوسٹس کے کئی بار اپنے آس پاس چکر لگانے کے باوجود کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس سے مایوس ہونے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے بعد ہی ائر ہوسٹس کی ساری توجہ چائینز کی طرف ہوگئی تھی جو بے حد سخت جان اور ٹھوس کسرتی جسم کا مالک تھا۔

اچانک سیاہ فام اپنی نشست سے اٹھا اور گلاس ہاتھ میں لیے چائینز کے برابر والی خالی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ ''میرے لیے سالٹش کا جولاؤ.....'' اس نے ائر ہوسٹس سے مسکرا کر کہا۔

''ابھی لائی.....'' ائر ہوسٹس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی پھر وہ تیزی سے لہراتی بل کھاتی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

''مائی ڈیئر .....'' سیاہ فام نے چائینز سے کہا۔ لہجہ مدھم اور رازدارانہ ہی تھا۔ ''اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو تمہارا نام لوچن ہے۔''

''بہت خوب.....'' چائینز نے اسے خشمگیں نظروں سے گھورا۔ ''آپ شاید دوسروں کو قسمت کا حال بتانے میں بھی مہارت رکھتے ہوں گے؟''

''کسی حد تک تمہارا اندازہ غلط بھی نہیں ہے۔'' اس نے بدستور سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''اب چونکہ لوچن کا نام سن کر تمہارے اندر کا تجسس جاگ اٹھا ہے تو میں اپنا تعارف بھی کرادوں۔ میرا نام ہاشم ہے۔ ہاشم فرام ساؤتھ افریقا۔''

لوچن، سیاہ فام کا نام سن کر ایک ثانیے کو چونکا پھر مسکرا کر بولا۔ ''میرے دوست، تم نے شاید اس علم پر پوری دسترس نہیں حاصل کی جس کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ ویسے اس طرح کسی سے بے تکلف ہونے کا طریقہ کار کم از کم مجھے سخت ناپسند ہے۔''

''اور وہ..... جو بہ ظاہر فیشن میگزین میں شائع ہونے والی خوبصورت لڑکیوں کی برہنہ تصویروں سے دل بہلا رہا ہے..... مجھے اپنے اور تمہارے مقابلے میں زیادہ گہرا اور بردبار نظر آتا ہے..... اس کا نام یقیناً ڈوما ہوگا۔''

''تم اس قسم کی فضول باتوں سے کیا ظاہر کرنا چاہتے ہو؟'' چائینز کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت طاری ہونے لگی۔

''نہیں میرے دوست.....'' سیاہ فام نے مدھم آواز میں کہا۔ ''یہ درست ہے کہ ہمیں منہ مانگا معاوضہ دیا جارہا ہے لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو..... کیا ہم الگ الگ رہنے کے بجائے اگر جہاز سے اترنے سے پیشتر ہی ایک دوسرے سے متعارف ہوجائیں تو یہ ہمارے حق میں بہتر ثابت نہ ہوگا..... ایک ساتھ مل بیٹھنے کے بعد ہم کسی آڑے وقت میں ایک دوسرے کے کام بھی آسکتے ہیں۔''

''اب تک تم کتنی پی چکے ہو؟'' چائینز کے لہجے میں ترشی اتر آئی۔

''تم شاید اس وقت گلاس کی تعداد معلوم کرنا چا... ہو.....'' ہاشم کے نام سے خود کو متعارف کرانے والے چبھتے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ''شراب ہمارے ... پانی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی..... میرا تعلق جنوبی افریقا ... جس حصے سے ہے وہاں بارہ سال کی عمر کے بچے بھی ا... چھوٹی چھوٹی منکیوں میں پینے کے عادی ہوتے ہیں جن میں ... از کم چار پیگ تو ضرور ہوتے ہیں۔''

''آئی۔سی.....'' چائینز سے جھلا کر کہا۔ ''میرا خیا... ہے کہ اب مجھے بھی سکون سے بیٹھنے کی خاطر کسی دوسر... نشست کا انتخاب کرنا ہوگا۔''

''تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔'' ہاشم نے بے پروا... سے کندھے اچکائے۔ ''لیکن جانے سے پہلے یہ اچھی طر... سوچ لو..... کہ ہمیں صرف ایک کلیو دیا گیا ہے..... سیو... اسٹارز..... اس حوالے سے ملنے والے احکامات پر ہمیں آ... بند کر کے ہی موت کے منہ میں بھی چھلانگ لگانے پر آمادہ ہو... پڑے گا، کیا ایسی صورت میں قبل از وقت ہمارا گٹھ جو... مناسب نہ ہوگا؟''

چائینز جو اپنی نشست سے آدھا اٹھ چکا تھا، سیو... اسٹارز کے حوالے پر دوبارہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ایک لمحے تک و... کسی ذہنی خلفشار میں مبتلا رہا پھر جب ائر ہوسٹس سالٹش کا ج... کی بھری ہوئی پلیٹ ٹرے میں رکھ کر واپس چلی گئی تو چائینز نے جسے لوچن کے نام سے منسوب کیا گیا تھا۔ کسمسا کر بولا۔

''تم..... شاید ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' اس نے سیاہ فام کی تائید کی۔

''ٹھیک نہیں..... بہت زیادہ ٹھیک۔'' ہاشم معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''پچیس ہزار امریکن ڈالرز کا ایڈوانس جو ہمیں صرف ذاتی جیب خرچ کے لیے دیا گیا ہے یقیناً بے حد پرکشش ہے۔ دیگر تمام اخراجات کی ذمے داری ''سیون اسٹارز'' یا اس کے نمائندوں کی ہوگی لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ ہماری پوزیشن کوئی ذاتی کوڈورڈ طے کر لینے کے بعد زیادہ محفوظ رہے گی یا ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہ کر؟''

لوچن نے تیسرے مسافر کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھا پھر ہونٹ چباتے ہوئے بڑی رازداری سے بولا۔

''کیا تم اس کا نام بھی جانتے ہو؟''

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آیندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

''جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم'' پر عمل پیرا ایک دلبر کا قصہ

یہ عشق بھی کیا چیز ہے... ہو جائے تو ایک ہی ذات میں پوری کائنات کے رنگ اور نہ ملے تو ہر رنگ پر خزاں کا عکس... وہ ایسا سچا عاشق تھا کہ وصال یار کی خاطر اپنے سب رنگ ڈھنگ کچھ اس طرح بدلے کہ گلی گلی ایک ہی صدا تھی... ''تیری خاطر چھوڑا جھنگ... تیری خاطر بنے ملنگ... تیری خاطر بدلی ذات... کیا سورج کو بھی رات''

کندھم جنس

منظر امام

وہ ایک بھکاری تھا۔

اور بھکاری بھی ایسا کہ جس کی شان ہی نرالی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے کبھی بھیک کے لیے اپنا ہاتھ نہیں پھیلایا ہوگا کیونکہ وہ بہت مزے سے بیٹھا رہتا تھا۔ ایک بے نیازی کی کیفیت اس کے چہرے پر ہوا کرتی۔

میں نے ایک دن بھیک دیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''تم کوئی آواز کیوں نہیں لگاتے؟''

''تم کیا سمجھتے ہو کہ آواز لگانے سے بھیک زیادہ ملتی ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ملتا وہی ہے جو مقدر میں ہوتا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اس بے نیاز قسم کے بھکاری کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس نے کیسی زبردست بات کہہ دی تھی۔ میرے خیال کے مطابق اس کی عمر پچاس اور پچپن کے درمیان ہوگی۔

اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کبھی اس نے اچھے دن بھی دیکھے ہوں گے۔ یا شاید پڑھا لکھا بھی ہو۔ بہرحال مختصر یہ کہ وہ ایک مختلف قسم کا بھکاری تھا۔

وہ مجھ سے کچھ دنوں میں ہی مانوس ہوگیا تھا کیونکہ میں اکثر اسے پیسے دے دیا کرتا۔ اس کے سامنے ایک چھوٹا سا کپڑا بچھا رہتا تھا۔ آتے جاتے لوگ اس کپڑے پر بھیک ڈال دیتے تھے۔

ایک صبح جب میں اس راستے سے گزرا تو میں نے اس کے قریب ایک لڑکی کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ بہت خوبصورت اور اسمارٹ لڑکی تھی۔

مجھے حیرت ہوئی تھی کہ ایسی لڑکی ایک بھکاری کے پاس بیٹھی ہوئی ہے اور وہ بھی اس انداز سے جیسے دونوں ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔

میں ان کے برابر سے گزرتا چلا گیا۔

دوسری صبح جب میں وہاں پہنچا تو وہ اکیلا تھا۔ یعنی وہ لڑکی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ میں جب اسے خیرات دینے کے لیے اس کے پاس پہنچا تو اس نے مجھ سے کہا۔ ”نوجوان۔ تم کچھ دیر کے لیے میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

”ضرور۔“ میں اس کے قریب بغیر کسی جھجک کے بیٹھ گیا۔

”تم نے کل میرے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھا ہوگا؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”وہ میری بیٹی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کیا؟“ مجھے یہ سن کر واقعی حیرت ہوئی تھی۔

”ہاں۔ اور وہ یہ سمجھتی ہے کہ میں اس کے کہنے سے یہ کام چھوڑ دوں گا۔“

”آپ یہ کام کیوں کرتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ میں اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کرسکتا۔“ اس نے جواب دیا۔

”آپ کی باتیں سن کر حیرت ہو رہی ہے۔“

”ارے بھئی! سیدھی سی بات ہے۔“ اس نے کہا۔ ”بھیک کی عادت مجھے اس وقت پڑی تھی جب میں تفریح کے لیے دوسرے شہر گیا تھا۔ وہاں میری جیب کٹ گئی۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں، کس کے پاس جاؤں؟ جان پہچان بھی کسی سے نہیں تھی۔ جمعہ کا دن تھا۔ نماز کے بعد میں ایک مسجد کے گیٹ پر جا کر کھڑا ہوگیا۔ اس دوران میں ایک معقول صورت آدمی برابر سے گزرا۔ میں نے اس سے اپنی پریشانی بیان کی۔ اس نے پانچ روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ بہت شرم آئی تھی لیکن اس کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی پیسے دے دیے۔ ذرا سی دیر میں میرے پاس واپسی کے کرائے سے دگنی رقم جمع ہوچکی تھی۔ میں پھر آرام سے اپنے شہر واپس آگیا۔“

”کمال کردیا آپ نے۔“

”بس میاں، وہ میری ابتدا تھی۔ میں اس زمانے میں نوکری کی تلاش میں تھا لیکن کہیں نوکری نہیں مل رہی تھی۔ پھر مجھے یہی راستہ بہتر معلوم ہوا اور میں نے اپنے محلے سے دور جا کر مانگنا شروع کردیا۔ میں یہاں یہ بھی بتادوں کہ میں نے کبھی آواز نہیں لگائی۔ بس چپ چاپ سر جھکائے بیٹھ جاتا۔ جس طرح آج بیٹھتا ہوں اور لوگ مجھے پیسے دینے لگتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ میں عادی بھکاری بنتا چلا گیا۔“

”اور آپ کے بچے وغیرہ؟“

”بیوی ہے۔ دو بچے اور دو بچیاں ہیں اور وہ سب تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ تم نے تو میری ایک بیٹی کو دیکھ ہی لیا ہے۔ اپنا گھر ہے۔ بینک بیلنس ہے۔ سب کچھ ہے۔ اب یہ سب میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ میں اپنا یہ کام چھوڑ دوں۔“

”تو پھر چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“

”نہیں میاں، جس کام نے اتنے پیسے دیے ہیں۔ برے وقتوں میں ساتھ دیا ہے۔ وہ کیسے چھوڑ دوں؟“ عجیب منطق تھی اس کی۔

بہرحال میں کیا کہہ سکتا تھا۔ اس نے اپنے بارے میں جو بتایا تھا۔ اس دنیا میں اور نہ جانے کتنے بھکاری اسی انداز کے ہوں گے۔ انہوں نے اسی طرح اپنا کیریئر شروع کیا ہوگا اور اب ان کی عادتیں پختہ ہوچکی ہوں گی۔

بہرحال کئی دنوں کے بعد جب پھر ادھر سے گزر ہوا تو وہی لڑکی اس بھکاری کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بھکاری نے آواز لگائی۔ ”میاں ادھر آؤ۔“

میں ان دونوں کے پاس چلا گیا۔

”دیکھو۔ یہ آج پھر مجھے سمجھانے چلی آئی ہے۔“

میں نے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ وہ ایک خاصی پرکشش لڑکی

تھی۔

”دیکھیں۔“ اس لڑکی نے مجھ سے کہا۔ ”اگر آپ کو ابو کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے تو پلیز آپ ہی انہیں سمجھانے کی کوشش کریں۔ ہم تو سمجھا سمجھا کر تھک چکے ہیں۔“

اتنا کہہ کر وہ آگے چلی گئی۔ شاید اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

”جناب۔ آپ اپنے گھر والوں کی بات کیوں نہیں مان لیتے؟“

”نہیں میاں۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ گھر والوں کی محبت اپنی جگہ اور یہ کام اپنی جگہ۔“

ایسے سرپھرے انسان سے میں کیا بات کرسکتا تھا۔

کئی دنوں کے بعد پھر وہاں سے گزرا تو وہ بھکاری اکیلا تھا۔ میں نے معمول کے مطابق اسے پیسے دیے اور آگے بڑھ گیا۔ ابھی چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ اچانک کسی نے آواز دی۔ ”ذرا بات سنیں۔“

یہ وہی لڑکی تھی۔ بھکاری کی بیٹی جو ایک درخت کی آڑ سے اچانک سامنے آگئی تھی۔

گرچہ وہ بھکاری کی بیٹی تھی لیکن ایسی نہ تھی کہ اسے کم تر سمجھ کر بات نہیں کی جاسکتی ہو۔ انتہائی سلیقے کا لباس، مہذب انداز، خوبصورت اسمارٹ۔ اس لیے میں نے بڑی نرمی سے پوچھا۔ ”کہو کیا بات ہے؟“

”کیا آپ ابو کو اس ذلیل کام سے روک نہیں سکتے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں کئی دفعہ ان سے بات کرچکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن آپ کے ابو کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہوتے۔“

”یہی تو پرابلم ہے۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”پلیز۔ آپ انہیں سمجھانے کی کوشش کریں کہ وہ اس طرح ہم سب کا فیوچر تباہ کررہے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔“

ہم چلتے ہوئے باتیں کرتے جارہے تھے۔ اس کی باتیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ وہ یقیناً پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اس لیے چلتے ہوئے میں نے اس سے پوچھ لیا۔ ”آپ پڑھی لکھی بھی معلوم ہوتی ہیں؟“

”جی ہاں۔ میں گریجویٹ ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”اور اب آئی آر میں ماسٹرز کرنے کی تیاری کررہی ہوں۔“

اس دوران میں ایک ہوٹل نظر آیا اور میں نے فوراً چائے کی آفر کردی۔ دراصل میں اس سے باتیں کرنے کے بہانے تلاش کررہا تھا۔ وہ کچھ سوچنے لگی۔ پھر میرے ساتھ ہوٹل میں آگئی۔

”خود بتائیں۔ کیا مجھے دیکھ کر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں کسی بھکاری کی بیٹی ہوں؟“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ میں نے کہا ”اور ویسے بھی یہ تمہارے باپ دادا کا کام تو نہیں ہے۔ بس تمہارے ابو کو یہ عادت پڑ گئی ہے۔“

”میرے بھائی بہن بھی میری طرح ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ لوگ تو مارے شرم کے کبھی اس طرف نہیں آتے۔ البتہ میں ابو کو ہر طرح سمجھانے کی کوشش کرتی رہتی ہوں۔ گھر پر بھی اور یہاں آکر بھی۔“

”اور تمہارے دوسرے گھر والے؟“

”ان کا بھی یہی حال ہے۔ وہ بے چارے بھی تنگ آچکے ہیں اور جانتے ہیں، سب سے بڑی رکاوٹ اور پریشانی کیا ہے؟ ابو کی اس عادت کی وجہ سے میرا کوئی رشتہ نہیں آرہا۔ ایک دو رشتے آئے تھے اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میرا باپ بھیک مانگتا ہے تو سر پر پیر رکھ کر بھاگ گئے۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے اس کی تائید کی۔ ”ان حالات میں تو کوئی تم سے شادی نہیں کرے گا۔ ہر ایک کو اپنی عزت پیاری ہوا کرتی ہے۔“

”بس۔ آپ کسی طرح یہ بات ان کے ذہن میں ڈال دیں کہ وہ اپنی بیٹی کو برباد کررہے ہیں۔“

ہم اور کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر ہوٹل سے باہر آگئے۔ پھر وہ اپنے راستے چلی گئی اور میں گھر واپس آگیا۔ میں بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔

کتنی معقول لڑکی تھی۔ شکل وصورت کی بھی کتنی اچھی تھی۔ لیکن کیسی پرابلم تھی اس کے ساتھ۔ اس طرح تو واقعی اس کی کبھی شادی نہیں ہوسکتی تھی۔

نہ جانے کیوں وہ لڑکی مجھے رات بھر یاد آتی رہی۔

کئی دنوں کے بعد میں اس طرف گیا تو وہ بھکاری اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ اپنے اسی انداز سے۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے باتیں شروع کردیں۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جب میں نے اس سے کہا کہ اس کی اس عادت کی وجہ سے اس کے بچوں کی شادیاں نہیں ہوسکتیں تو وہ تڑپ اٹھا۔ ”کس نے کہہ دیا شادیاں نہیں ہوسکتیں۔ آخر کیا کمی ہے میری لڑکیوں میں۔“

”لڑکیوں میں تو کمی نہیں ہے لیکن ایسا کوئی داماد ہوگا جو اس لڑکی کو قبول کرلے گا جس کا باپ بھیک مانگتا ہو۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہ کوئی بات نہیں ہوئی۔'' وہ مسکرادیا۔ ''داماد بھی وہی ہوگا جسے اس کام سے دلچسپی ہوگی' جو خود بھی یہی کرتا ہوگا۔''

''کیا مطلب۔ کیا داماد بھی بھکاری ہوگا؟''

''ظاہر ہے۔ تب ہی تو وہ ایڈجسٹ کر پائے گا اور جہاں تک اس کام کا تعلق ہے۔ وہ تو میں نہیں چھوڑ سکتا۔''

اب ایسے شخص سے کیا بحث کی جاسکتی تھی۔

کئی دنوں کے بعد اس کی لڑکی کا فون آ گیا۔ میں نے اسے اپنا موبائل نمبر دے دیا تھا۔ وہ مجھ سے پروگریس پوچھ رہی تھی۔ میں نے اسے بتادیا کہ میں نے اس کے باپ سے بات کرلی ہے اور وہ داماد بھی بھکاری لانے کے موڈ میں ہے۔ یہ سن کر اس نے اپنے باپ کو برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ ''پاگل ہوگئے ہیں وہ۔ دماغ خراب ہوگیا ہے۔ زندگی برباد کردینا چاہتے ہیں۔''

''سویرا۔ کیا تم مجھ سے مل سکتی ہو؟'' میں نے کہا۔

''جی۔ آپ سے۔''

''ہاں۔ تم سے ایک بات کرنی ہے۔''

''آجاؤں گی۔''

میں نے اسے بتادیا کہ کہاں ملنا ہے۔ وہ بے چاری مقررہ وقت پر پہنچ گئی۔ بہت پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ ہم پھر ایک ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے بالآخر وہ بات کہہ دی جو میں کہنا چاہتا تھا' جس کے لیے میں مسلسل سوچتا رہا تھا۔ میں نے اسے شادی کی آفر کردی تھی۔

میری آفر نے اسے حیران کردیا۔ ''آخر کیوں۔ کیا مجھ پر ترس کھا کر؟''

''نہیں۔ تم پر کیوں ترس کھانے لگا۔ تم میں کیا کمی ہے؟''

''تو پھر۔''

''تمہاری محبت سے مجبور ہوکر۔'' میں نے بتایا۔

''محبت سے مجبور۔''

''ہاں سویرا۔ تم جھوٹ سمجھو یا سچ سمجھو۔ تم سے ملاقات کے بعد میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ تمہارے ابو بھیک مانگتے ہیں۔ وہ مانگتے رہیں۔ مجھے تو تم سے مطلب ہے۔ بتاؤ۔ اب تم کیا کہتی ہو؟''

''آپ ابو سے بات کرلیں۔'' اس نے شرما کر گردن جھکالی تھی۔

میں نے جب اس بھکاری سے بات کی تو وہ بہت خوش ہوا۔ ''تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ سویرا بہت اچھی لڑکی ہے۔ بہت محبت کرنے والی۔ بہت سعادت مند۔''

''تو پھر میں اپنے گھر والوں کو بھیج دوں؟''

''نہیں۔''

''وہ کیوں۔''

''دیکھو بیٹا۔ میری یہ شرط ہے کہ میرے داماد کو بھی بھکاری ہونا چاہیے۔'' اس نے کہا۔ ''تاکہ کبھی وہ طعنہ نہ دے سکے کہ اس کا سسر بھکاری تھا۔ چاہے ایک ہفتے کے لیے سہی۔ لیکن بھیک ضرور مانگے۔''

عجیب الٹی کھوپڑی کا آدمی تھا۔

میں نے جب سویرا سے بات کی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''بس رہنے دیں۔ بھول جائیں مجھے۔''

''نہیں سویرا۔ میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔'' میں نے کہا۔ ''چاہے مجھے بھیک ہی کیوں نہ مانگنی پڑے۔''

اور تیسرے دن میں خود اپنا حلیہ خراب کرکے بالوں میں تیل ڈال کر سامنے والے فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ اس بھکاری کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا تھا۔

ایک ہفتے بعد میرے گھر والوں نے اس کے گھر جاکر سویرا کا رشتہ مانگ لیا اور دوسرے مہینے سویرا سے میری شادی ہوگئی۔

شادی کے تیسرے دن اس بھکاری نے مجھ سے کہا۔ ''بیٹے۔ اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں بھیک نہیں مانگوں گا۔''

''جناب۔ یہ فیصلہ آپ کا ہوسکتا ہے' میرا نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے کہ میں نے ایک ہفتے میں اتنی کمائی کرلی تھی کہ شادی کا اچھا خاصا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ اب ایسے کام کو کیسے چھوڑ دوں؟''

''یہ بات ہوئی نا۔'' وہ مسکرادیا۔ ''تو چلو۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔''

اب ہم دونوں داماد اور سسر آمنے سامنے کی فٹ پاتھوں پر بیٹھے بھیک مانگا کرتے ہیں اور اس لڑکی یعنی سویرا کی قسمت بھی یہی ہے کہ وہ کبھی میرے پاس بیٹھ کر مجھے سمجھاتی رہتی ہے اور کبھی اپنے باپ کو اور ہم دونوں میں سے کوئی بھی یہ نفع بخش کام ترک کرنے کو تیار نہیں ہے۔

تلاش

کاشف زبیر

ایک دائرے میں قید اس کائنات کا تسلسل کچھ یوں ہے کہ ہر کوئی کسی نہ کسی کے تعاقب میں دکھائی دیتا ہے۔ کسی کو محبت چاہیے اور کسی کو دولت... کہیں یہ محبت اور دولت خود ہی کسی کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں اور جب کوئی مل کر بھی نہ ملنے پائے... اور جب قدموں میں دولت کا ڈھیر لگ جائے مگر وہ مفلس کہلائے... تو اسے مقدر کا کھیل نہیں تو کیا کہیں گے۔

ساحل پر کھڑے چند پیاس کے ماروں کا قصۂ الم

یہ دو مہینے پرانی بات ہے جب مسٹر کائل بیورگ نے مجھے طلب کیا تھا۔ مسٹر بیورگ ملک کے نامی گرامی سرمایہ دار اور صنعت کار ہیں۔ ان کی فراخ دلی اور غریبوں سے ہمدردی کے قصے مشہور ہیں اور یہ صرف قصے ہی نہیں ہیں بلکہ سب جانتے ہیں کہ مسٹر کائل صحیح معنوں میں غریبوں کے کام آتے ہیں۔ وہ ارب پتی ہیں اور ایک سال پہلے ان کے اثاثے کم و بیش دو ارب ڈالرز تھے اور ممکن ہے اب تک اس میں مزید اضافہ ہوگیا ہو۔ امریکا کی سات ریاستوں میں ان کے کارخانے پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی روز کی آمدنی ایک ملین ڈالرز سے زیادہ ہے۔ حالانکہ دس سال پہلے کوئی ان کے نام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تک سے واقف نہیں تھا۔ انہوں نے ساری ترقی انہی دس سالوں میں کی تھی۔

لیکن ذاتی طور پر مسٹر کائل کا یہ حال ہے کہ وہ ایک چھوٹے سے پینٹ ہاؤس میں رہتے ہیں جو ان کے والدان کے لیے چھوڑ کر گئے تھے۔ ان کے پاس ایک دس سال پرانی بیوک کار تھی اور وہ کبھی دو سو ڈالرز سے زیادہ مہنگا سوٹ نہیں پہنتے تھے۔ آج سے بیس سال پہلے انہوں نے ایک عام سی صورت والی عورت سے شادی کی تھی حالانکہ وہ کسی سپر ماڈل یا ہالی وڈ ایکٹریس سے بھی شادی کر سکتے تھے لیکن انہوں نے صورت کے بجائے سیرت کو ترجیح دی تھی جن کی وجہ سے ان کی ازدواجی زندگی کامیاب زندگی گزر رہی ہے۔ ان کے گھر میں کوئی نوکر یا بہت زیادہ آسائشیں نہیں ہیں لیکن خوشیاں بہت ہیں۔ مسٹر کائل کے چار بچے ہیں۔ تین لڑکے اور ایک لڑکی۔ یہ سب اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی زندگی خود بنانے کا عزم رکھتے ہیں۔ مسٹر کائل نے انہیں کھلی پیشکش کی تھی کہ وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان کی دولت سے جس طرح چاہیں فائدہ اٹھا سکتے ہیں مگر ان کی اولاد بھی ان کی طرح سادہ مزاج اور خوددار ہے۔ وہ اپنی زندگی خود بنانا چاہتی ہے۔

امریکی دولت مندوں میں مسٹر کائل کی مثال دی جاتی تھی۔ ہر فرد ان سے خوش تھا اور کسی کو ان سے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ملازمین کے حقوق کا خیال رکھنے پر مسلسل دس سال تک بہترین بزنس مین کا ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد مسٹر کائل نے خود اس ایوارڈ سے دست برداری اختیار کر لی تھی۔

میں ایک چھوٹی سی جاسوس ایجنسی چلاتا ہوں اور میرا کام زیادہ تر گم ہو جانے والے افراد کی تلاش ہے۔ اس کام میں مجھے خصوصی مہارت حاصل ہے اس لیے میں دوسرے کیسز لینے سے گریز کرتا ہوں۔ میں اکیلا ہی کام کرتا ہوں اور اس سے مجھے آسانی رہتی ہے۔ صرف دفتر کے لیے ایک سیکریٹری رکھی ہوئی ہے جو کسٹمرز سے رابطے میں رہتی ہے۔ اس صبح میں دفتر ذرا دیر سے پہنچا تھا۔ ماریتا یعنی میری سیکریٹری نے اندر آتے ہی مجھ سے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''جونی، مسٹر کائل بیورگ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

میں نے بے یقینی سے کہا۔ ''مسٹر کائل بیورگ... وہی جو کھرب پتی ہیں؟''

''بالکل وہی، ابھی کچھ دیر پہلے ہی ان کا فون آیا تھا اور انہوں نے تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔''

''ان سے ملنا تو میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آج مجھے کچھ کام ہیں لیکن میں پہلے ان سے مل لوں۔''

''انہوں نے اپنا نمبر دیا ہے اور کہا ہے کہ جیسے ہی تمہیں فرصت ملے کال کر لو۔'' ماریتا نے فون اٹھاتے ہوئے بتایا۔ ''نمبر ملاؤں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے نمبر ملا کر فون مجھے تھما دیا۔ رابطہ ہونے پر میں نے اپنا تعارف کرایا اور کہا۔ ''مسٹر کائل بیورگ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''تم مجھ سے فوری ملاقات کر سکتے ہو، مجھے تم سے کام ہے؟''

''کیوں نہیں مسٹر بیورگ! آپ کے لیے میں اپنی ساری مصروفیات ترک کر کے آ سکتا ہوں۔''

''تب مجھ سے فوراً مل لو۔''

اس کے نصف گھنٹے بعد میں ان کے چھوٹے لیکن خوب صورت پینٹ ہاؤس میں ان کے سامنے تھا۔ یہاں سے سمندر کا نظارہ بہت واضح نظر آ رہا تھا۔ مسٹر کائل بیورگ ایک سادہ سی نشست گاہ میں میرے منتظر تھے۔ مسز بیورگ نے ہمارے سامنے کافی اور گھر میں تیار کوکیز رکھے اور خاموشی سے شوہر کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ مسٹر کائل نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر جون نوواک، تم گم شدہ افراد کو تلاش کرنے کے ماہر ہو؟''

''جی مسٹر بیورگ، لیکن میں اتنا ماہر بھی نہیں ہوں۔'' میں نے محتاط انداز میں کہا۔

''میں نے تمہارے بارے میں معلوم کیا ہے تم نے جو کیسز لیے ان میں سے ستر فی صد کامیاب رہے ہے۔ اس لیے میں نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔''

''آپ کسی کو تلاش کروانا چاہتے ہیں؟''

مسٹر بیورگ نے سر ہلایا۔ ''میں ایک شخص کو تلاش کروانا چاہتا ہوں، گزشتہ دس سال سے میں نے اسے نہیں دیکھا۔''

''کیا وہ کوئی رشتے دار ہے؟''

''نہیں۔''

''عزیز... دوست؟''

''نہیں۔''

''بزنس کے حوالے سے؟''

''کسی طرح بھی نہیں۔ دس سال پہلے میں اس سے صرف ایک بار ملا تھا اور وہ بھی صرف دس منٹ کے لیے۔''

''ٹھیک ہے، آپ اس کے بارے میں جو جانتے ہیں مجھے بتا دیں۔'' میں نے نوٹ بک اور پین سنبھال لیا۔

''میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا کیونکہ

اس ایک ملاقات کے بعد وہ غائب ہو گیا تھا۔ لیکن میں تمہیں یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ مجھے کیسے ملا اور اب میں اسے کیوں تلاش کروانا چاہ رہا ہوں۔'' مسٹر بیورگ اپنی نشست پر ذرا پھیل کر بیٹھ گئے۔ ''یہ دس سال پہلے کی بات ہے، میں نیویارک میں تھا اور ان دنوں اپنا کیریئر بنانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ میرے باپ نے میرے لیے یہ پینٹ ہاؤس اور کچھ شیئرز چھوڑے تھے۔ میں صنعت کار بننا چاہتا تھا۔ میں نے ایک بیمار فیکٹری کا سودا کر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اسے پھر سے اپنے پیروں پر کھڑا کر دوں گا۔ اس کے لیے میں نے اپنے باپ کے چھوڑے ہوئے شیئرز فروخت کیے اور بینک سے قرض لیا۔ یہ ساری رقم ایک بریف کیس میں لے کر میں فیکٹری کا سودا کرنے جا رہا تھا اور میٹرو میں سفر کے دوران فیکٹری کو پھر سے پیروں پر کھڑا کرنے کے بارے میں منصوبہ سازی کر رہا تھا۔ ٹرین میں بہت رش تھا۔ اچانک ہی میرے مطلوبہ اسٹیشن کے آنے کا اعلان ہوا تو میں عجلت میں لوگوں کو دھکیلتا ہوا دروازے کی طرف لپکا اور اس دوران میں ٹرین رکنے لگی۔ اس کا دروازہ کھلا اور لوگوں کا ریلا باہر نکلا تو میں بھی اس ریلے کے ساتھ ہی باہر نکل گیا اور جب میں باہر نکلا تو مجھے احساس ہوا کہ میں اپنا بریف کیس اندر بھول آیا ہوں۔

''کتنی ناقابلِ یقین بات ہے۔ اس بریف کیس میں میری ساری جمع پونجی تھی۔ کوئی چھ لاکھ ڈالرز ...... اور میرے مستقبل کا انحصار انہی پر تھا، میں کسی صورت اسے نہیں بھول سکتا تھا لیکن اُس روز نہ جانے کیا ہوا کہ میں اسے بھول گیا۔ جیسے ہی مجھے احساس ہوا کہ میں بریف کیس بھول گیا ہوں میں واپس ڈبے میں جانے کے لیے پلٹا مگر باہر آنے والوں کا ریلا تند و تیز نالے کی طرح مجھے بہائے لیے جا رہا تھا۔ میں کوشش کے باوجود دوبارہ نہ پلٹ سکا اور اس دوران میں ٹرین چلنے کا اشارہ ہو گیا۔ اس کے دروازے بند ہوئے اور پھر وہ میرے سامنے سے گزرتی چلی گئی۔ جب ڈبے کا وہ حصہ میرے سامنے آیا جہاں میں بیٹھا تھا تو میں نے نشست پر رکھا اپنا بریف کیس دیکھا اور مجھے لگا جیسے مجھے غش آ گیا ہو۔ اگر کچھ لوگ مجھے پیچھے نہ کھینچ لیتے تو میں چلتی ٹرین سے ٹکرا جاتا۔ جب تک میرے حواس بحال ہوئے ٹرین جا چکی تھی۔'' مسٹر کائل بیورگ چند لمحے کے لیے خاموش ہوئے۔

میں ایک سنسنی خیز داستان سن رہا تھا۔ مجھ سے ان کی خاموشی برداشت نہیں ہوئی اور میں بول اٹھا۔ ''پھر کیا ہوا مسٹر بیورگ؟''

وہ مسکرائے۔ ''پھر یہ ہوا کہ مجھے لٹ جانے کا احساس ہوا۔ ننانوے فی صد امکان تھا کہ اب مجھے بریف کیس واپس نہیں ملے گا اور نہ ہی اس میں رکھی چھ لاکھ ڈالرز کی رقم کبھی ملے گی۔ میں فیکٹری نہیں لے سکوں گا اور میرا کیریئر شروع ہونے سے پہلے ختم ہو جائے گا۔ میٹرو کے گم ہو جانے والی اشیا کے دفتر اور پولیس کو بریف کیس کی گم شدگی کی رپورٹ کر کے میں صدمے کے عالم میں اس فرم کے دفتر تک پہنچا جس سے میں فیکٹری خرید رہا تھا اور میں نے انہیں حادثے کی اطلاع دیتے ہوئے معاہدہ چند دن کے لیے ملتوی کرنے کی درخواست کی۔ فیکٹری کے مالک نے ہمدردی سے میری بات سنی اور مجھے دو دن کی مہلت دے دی۔

میں سارا دن پولیس اسٹیشن اور میٹرو اسٹیشن کے چکر لگاتا رہا کہ شاید کوئی میرا بریف کیس دے گیا ہو لیکن ایسا نہیں تھا۔ دس بجے دونوں جگہ دفاتر بند ہو گئے اور میں دل شکستگی کے عالم میں اس ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا جہاں میں مقیم تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو ڈیسک کلرک کے ساتھ ایک شخص کو موجود پایا۔ وہ شاید تیس بتیس سال کا آدمی تھا اور اس نے ایک خستہ سا اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کا ستا ہوا کمزور چہرہ اور کھچڑی سے بال بتا رہے تھے کہ وہ زندگی کے برے دور سے گزر رہا ہے لیکن خاص بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں میرا بریف کیس تھا۔ میں جھپٹ کر اس کے پاس پہنچا۔

''یہ میرا ہے۔'' میں نے زور سے کہا تو وہ گھبرا گیا۔

''جی جی... میں اسے دینے ہی آیا ہوں۔ ان سے پوچھ لیں۔'' اس نے ڈیسک کلرک کی طرف اشارہ کیا۔

''جی سر۔'' ڈیسک کلرک نے شائستگی سے کہا۔ ''یہ بےچارہ تین گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہا ہے۔''

تب مجھے یقین آیا کہ وہ واقعی میرا بریف کیس واپس کرنے آیا تھا اور میں شرمندہ ہو گیا۔ ''معاف کرنا میرے دوست، کیا تم میرے ساتھ میرے کمرے تک چلو گے؟''

''جی جناب لیکن کیا کائل بیورگ آپ ہی ہیں؟'' اس نے سادگی سے پوچھا۔

''ہاں، میں ہی کائل بیورگ ہوں۔''

''میرا نام جارج کلیمنٹ ہے۔''

میں اسے کمرے میں لے آیا۔ اس نے اندر آتے ہی بریف کیس میری طرف بڑھایا اور بولا۔ ''اسے دیکھ لیں جناب آپ کی کوئی چیز کم تو نہیں ہے۔''

نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو گیا کہ اس میں واقعی کوئی چیز کم نہیں ہوگی۔ چھ لاکھ ڈالرز میں سے ایک ڈالر بھی کم نہیں ہوگا۔ میں نے بریف کیس لے کر ایک طرف رکھ دیا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جارج کو بیٹھنے کو کہا۔ وہ نروس سے انداز میں کرسی پر ٹک گیا۔ ''تم نے اسے کہاں پایا؟''

''میٹرو میں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ اس نشست پر تھا جہاں میں آکر بیٹھا تھا۔ پہلے مجھے لگا کہ یہ اس مسافر کا ہے جو ساتھ بیٹھا ہے لیکن جب اس کا اسٹیشن آیا تو وہ اتر کر چلا گیا اور بریف کیس وہیں رہ گیا۔''

''پھر تم نے کیا، کیا؟''

''پھر بھی مجھے شک رہا تھا۔ آخر جب میرا اسٹیشن قریب آنے لگا تو میں نے اسے اٹھالیا۔ میرا خیال تھا کہ اس کا مالک آس پاس ہوگا تو اعتراض کرے گا لیکن کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ حتیٰ کہ میں اسے لے کر اپنے اسٹیشن پر اتر گیا تب بھی کسی نے نہیں روکا۔''

''پھر تم اسے لے کر اپنے گھر چلے گئے؟''

''نہیں، میں ایک بار میں ویٹر کا کام کرتا ہوں۔ میری ڈیوٹی صبح دس سے شام چھ بجے تک ہوتی ہے۔ میں نے بریف کیس لے جا کر بارٹینڈر کے پاس رکھوا دیا اور اپنا کام کرنے لگا۔''

''تمہیں تجسس نہیں ہوا کہ اس میں کیا ہے؟''

''ہوا تھا لیکن اتنا نہیں کہ میں اسے اسی وقت کھول لیتا۔'' جارج نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہا۔ ''ڈیوٹی کے بعد میں نے اسے کھولا کہ اس میں مالک کا کوئی پتا مل جائے تو اس میں ایک خط نکل آیا جس میں اس ہوٹل کا پتا تھا۔''

''اس میں چھ لاکھ ڈالرز بھی تھے۔''

''جی بالکل تھے لیکن وہ آپ کے تھے۔ اب آپ گن لیں اور مجھے جانے کی اجازت دیں۔''

میں نے بریف کیس کھول کر دیکھا، اس میں تمام رقم موجود تھی، ایک ایک چیز تھی۔ خط مجھے فرم کی جانب سے فیکٹری کے سودے کے سلسلے میں لکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بریف کیس میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو میرے بارے میں نشاندہی کرتی۔ اگر یہ خط نہ ہوتا تو جارج کوشش کے باوجود مجھے بریف کیس نہیں پہنچا سکتا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ جانا چاہتا تھا لیکن میں نے پہلے کافی اور پھر شیمپئن سے اس کی خاطر تواضع کی۔ اس دوران میں، میں نے اس بار کے بارے میں پوچھ لیا جہاں وہ کام کرتا تھا۔ اب مجھے اطمینان تھا کہ میں اسے تلاش کرنا چاہوں گا تو آسانی سے تلاش کرلوں گا۔ وہ چلا گیا۔

اگلے روز میں نے فیکٹری کا سودا کر کے اسے خرید لیا اور پھر دو مہینے میں اسے پھر سے نفع بخش بنانے میں ایسا مگن ہوا کہ مجھے اپنا ہوش تک نہیں رہا تھا۔ میں کئی کئی دن اپنے گھر نہیں جاتا تھا کیونکہ وقت ہی نہیں ملتا تھا اور میری کوششوں کا نتیجہ مثبت نکلا۔ فیکٹری نے پھر سے کام شروع کر دیا۔ پرانے آرڈرز پورے کیے تو نئے آرڈرز ملنے لگے..... دو مہینے بعد جا کر میں نے ذرا سکون کا سانس لیا تو مجھے جارج کا خیال آیا کہ اب اس سے ملا جائے۔ جب اس نے مجھے بریف کیس لا کر دیا تھا تب ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے اپنے کاروبار میں دس فی صد کا پارٹنر بنالوں گا لیکن یہ بات میں نے اس وقت اس سے نہیں کہی تھی کیونکہ اس وقت مجھے یقین نہیں تھا کہ میں فیکٹری چلانے میں کامیاب ہوں گا یا نہیں۔ اب میں ایک کامیاب بزنس مین تھا اور اسے اپنے کاروبار میں شریک کرسکتا تھا۔

میں اس کے بتائے ہوئے بار پہنچا لیکن مجھے جارج وہاں نظر نہیں آیا۔ میں نے بارٹینڈر سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے شانے اُچکا کر کہا۔ ''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ وہ ایک مہینا پہلے ملازمت چھوڑ کر چلا گیا۔''

''کہاں گیا، تمہیں اس کے گھر کا پتا معلوم ہے؟''

بارٹینڈر نے ایک چٹ پر اس کے گھر کا پتا لکھ دیا۔ یہ نیویارک کی ایک خستہ حال آبادی کا پتا تھا جہاں زیادہ تر نچلے درجے کے اور جرائم پیشہ لوگ بستے تھے۔ مجھے جارج کی عظمت کا احساس ہوا، وہ بہت غریب تھا اور اس نے میرے بریف کیس میں چھ لاکھ ڈالرز دیکھ لیے تھے، اس کے باوجود اس نے پوری ایمان داری سے بریف کیس لا کر میرے حوالے کر دیا۔ اس میں سے ایک ڈالر بھی نہیں لیا اور نہ ہی اس نے مجھ سے بریف کیس واپس کرنے کے عوض انعام طلب کیا بلکہ اس نے تو کافی اور شیمپئن بھی بہ مشکل پی تھی اور اس کے فوراً بعد چلا گیا تھا۔ میں مطلوبہ پتے پر پہنچا تو وہاں موجود ایک سیاہ فام لڑکے نے مجھے بتایا۔

''جارج ایک مہینا پہلے یہ فلیٹ چھوڑ گیا ہے۔''

''وہ کہاں گیا ہے؟''

یہ لڑکے کو بھی نہیں معلوم تھا۔ میں نے گھوم پھر کر اس کے آس پڑوس میں معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلوم ہو لیکن سب ہی اس سے بے خبر تھے۔ کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں گیا تھا اس کا کوئی دوست نہیں تھا اور نہ ہی کوئی پس منظر تھا۔ وہ ایک دم غائب ہو گیا تھا۔ میں مایوس لوٹ آیا۔ اس کے بعد میں نے ایک جاسوس ایجنسی کی خدمات حاصل کیں اور اس کی مدد سے جارج کو تلاش کرانے کی کوشش کی۔ میرے کوئی دس ہزار ڈالرز خرچ

گئے لیکن نتیجہ صفر رہا۔ جارج بدستور غائب تھا۔''

''اس کے بعد بھی آپ نے اسے تلاش کرنے کی کوشش جاری رکھی؟'' میں نے پوچھا۔

''تقریباً... دو سال بعد میں نارتھ کیرولینا منتقل ہو گیا کیونکہ یہ میرا آبائی شہر ہے لیکن میرا کاروبار نیویارک میں رہا۔ میرا وہاں آنا جانا لگا رہتا تھا اس لیے میں جب جاتا جارج کو تلاش کرنے کی کوشش ضرور کرتا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ میں نے جارج کو دس فی صد کا شریک بنانے کا سوچا تھا لیکن وہ ملتا تو میں اسے اپنا شریک بناتا۔ اس لیے میں نے یہ کیا کہ سال میں مجھے جتنا بھی نفع ہوتا تھا اس کا دس فی صد نکال کر میں ایک الگ بینک اکاؤنٹ میں ڈال دیتا تھا۔ یہ اکاؤنٹ ایک وصیت نامے کے ساتھ میرے وکیل کی نگرانی میں ہے اور میں نے اسے یہ ذمے داری بھی سونپ رکھی ہے کہ اگر میں مر جاؤں تب بھی وہ جارج کی تلاش جاری رکھے اور اکاؤنٹ میں موجود رقم اس کے حوالے کر دے۔ یہ پیازٹ اکاؤنٹ ہے اور اس میں سالانہ نفع کی رقم بھی شامل ہوتی رہی ہے۔ میں گزشتہ دس سال سے اپنے سالانہ نفع کا دس فی صد اس اکاؤنٹ میں ڈال رہا ہوں اور یہ میرے پاس جارج کی امانت ہے، وہ جب آئے گا میں اسے جارج کے حوالے کر دوں گا۔''

میں نے کائل بیورگ کے بارے میں سنا تھا کہ وہ انسان کے روپ میں فرشتہ ہے لیکن اس کی یہ کہانی سن کر وہ مجھے ایک فرشتہ ہی لگا تھا۔ آج کے دور میں کوئی انسان اتنے بڑے دل والا نہیں ہوسکتا۔ میں نے کہا۔ ''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہے؟''

''اگرچہ اس معاملے سے تمہارا تعلق نہیں ہے اور تمہیں صرف جارج کو تلاش کرنا ہے لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ اس اکاؤنٹ میں پانچ سو اسّی ملین ڈالرز کی رقم جمع ہو چکی ہے اور شاید اگلے مہینے یہ رقم چھ سو ملین ڈالرز سے تجاوز کر جائے گی۔''

میں دنگ رہ گیا تھا۔ چھ سو ملین ڈالرز... امریکا میں کتنے لوگ ہوں گے جن کے پاس چھ سو ملین ڈالرز کی رقم ہو گی؟ شاید ایک لاکھ بھی نہیں ہوں۔ جارج نامی یہ شخص جو پتا نہیں زندہ بھی تھا یا نہیں، اتنی بڑی رقم کا مالک تھا اور اسے خبر ہی نہیں تھی۔ میں نے کائل بیورگ سے پوچھا۔ ''کیا آپ نے اسے اشتہار دے کر تلاش کرنے کی کوشش کی؟''

اس نے اپنے پاس رکھا نیویارک ٹائمز کا تازہ شمارہ اٹھایا اور اس کے مقامی خبروں کے فرنٹ پیج پر دو بائی دو کے سائز میں ایک اشتہار موجود تھا جس میں کائل بیورگ نے اپنے اور جارج کے نام کے ساتھ بریف کیس کی گمشدگی کی مکمل کہانی بیان کی تھی اور جارج سے اپیل کی تھی کہ وہ پڑھنے کی صورت میں اس سے رابطہ کرے۔ ''اخبار کا یہ حصہ مستقل طور پر اس اشتہار کے لیے مخصوص ہے۔ ہر سنڈے کو باقاعدگی سے یہ اشتہار چھپتا ہے اور گزشتہ دس سال میں پانچ سو بار سے زیادہ چھپ چکا ہے۔''

''اسے پڑھ کر کسی نے آپ سے رابطہ کیا؟''

''کئی افراد نے۔'' انہوں نے سر ہلایا۔ ''وہ جارج بن کر مجھ سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے لیکن میں ایک ہی نظر میں انہیں پہچان جاتا تھا۔''

''یعنی اصل جارج سے ایک بار بھی آپ کا رابطہ نہیں ہوا؟''

''نہیں ورنہ تمہیں کیوں بلاتا۔ میں اب تک جارج کی تلاش پر کوئی ایک ملین ڈالرز خرچ کر چکا ہوں۔ میں خبردار کر دوں اس سے پہلے بے شمار لوگ اسے تلاش کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔''

''میں کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہارے معاوضے سے دُگنا دوں گا۔ اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے اور اگر تم نے اسے تلاش کر لیا تو تمہیں ایک لاکھ ڈالرز کا انعام الگ سے ملے گا۔'' کائل بیورگ نے کہا۔

''مجھے اس سلسلے میں آپ کی اور دوسرے لوگوں کی سابقہ کاوشوں کی رپورٹ بھی درکار ہے۔''

''وہ بھی تمہیں مل جائے گی۔''

''مجھے اپنے یہاں کے پہلے سے جاری کچھ کام نمٹانے میں دو دن لگ سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہی میں نیویارک روانہ ہوں گا۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' انہوں نے سر ہلایا اور ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ ''اس میں کچھ ایڈوانس ہے۔''

''اس کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن آپ دے رہے ہیں تو...'' میں نے لفافہ لے لیا اور روانگی کے لیے کھڑا ہو گیا۔ ''اتنی اچھی کافی اور کوکیز کا شکریہ۔''

اگلے روز مجھے دفتر میں ایک بھاری بھر کم لفافہ ملا۔ اس میں جارج کلیمنٹ کی تلاش کے بارے میں مکمل رپورٹس تھیں۔ میں شام تک ان کا مطالعہ کرتا رہا اور اس سے مجھے معلوم ہوا کہ جارج کو تلاش کرنے کے لیے جاسوسوں نے ہر مروجہ طریقہ استعمال کر لیا تھا۔ اصل میں جارج بہت بے نام اور ایسے طبقے سے تعلق رکھتا تھا جس کے لوگ اپنا کوئی نام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ونشان نہیں رکھتے اور نہ کہیں ان کا کوئی ریکارڈ ہوتا ہے جب تک کہ وہ کسی چکر میں نہ آجائیں۔ مسٹر بیورگ نے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ان سے ملاقات کے وقت تقریباً بتیس برس کا تھا تو اس لحاظ سے وہ اب بیالیس برس کا ہوگا۔ یہ کچھ زیادہ عمر نہیں ہوتی اور انسان خود کو سنبھال کر رکھے تو اس عمر میں جوان ہی ہوتا ہے۔ مگر جارج کے سلسلے میں مجھے اس کا امکان کم ہی نظر آرہا تھا کہ اس نے خود کو سنبھال کر رکھا ہو گا۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا وہ عام طور سے خود کو بے دردی سے استعمال کرتا ہے۔

تمام ضروری معلومات ذہن میں رکھ کر میں رات کو اپنے کمپیوٹر پر بیٹھا اور میں نے اس کی مدد سے جارج کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ ایک زمانے میں کچھ ہیکرز سے میری دوستی رہی تھی اور انہوں نے مجھے کمپیوٹرز میں محفوظ خفیہ معلومات تک رسائی کے کچھ ایسے گُر سکھائے تھے جو آج تک میرے کام آرہے تھے بلکہ اب تو میں خود بھی ایسے کاموں کا ماہر ہو گیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے نیویارک پولیس کے مرکزی ریکارڈ میں جارج کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی۔ میں نے گزشتہ بیس برس کا ریکارڈ چیک کیا تھا اور اس کے نتیجے میں کوئی دو ہزار جارج کلیمنٹ سامنے آئے پھر میں نے عمر کے حساب سے دوبارہ تلاش کیا تو ان کی تعداد دوسو رہ گئی۔ میں نے باری باری ان کا ڈیٹا چیک کیا اور ان میں سے کوئی بھی وہ جارج کلیمنٹ ثابت نہیں ہو سکا جو مسٹر بیورگ کو درکار تھا۔

جارج کلیمنٹ یقیناً بیک وقت خوش قسمت اور بدقسمت انسان تھا کیونکہ اس کے نام پر اتنی بڑی دولت ایک بینک اکاؤنٹ میں پڑی تھی اور اسے اس کی خبر ہی نہیں تھی۔ یہ ممکن تھا کہ وہ ایک اچھی زندگی گزار رہا ہو لیکن میرا ذہن کہہ رہا تھا کہ وہ بہت ہی مشکل زندگی گزار رہا ہوگا کیونکہ وہ جس طرح سے مفقود الخبر تھا اور مسٹر بیورگ نے جس طرح اسے تلاش کرنے کی کوشش کی تھی اس سے لگتا تھا کہ وہ عام زندگی سے بہت دور تھا جہاں اسے اطلاعات نہیں ملتی تھیں اور وہاں وہ بہت محدود تھا۔

مسٹر بیورگ نے اسے پولیس کے علاوہ جیلوں اور نفسیاتی امراض کے اسپتالوں میں بھی تلاش کروایا تھا۔ انہوں نے امریکن امیگریشن حکام کی مدد بھی لی تھی کہ جارج کہیں بیرونِ ملک جا کر آباد تو نہیں ہو گیا تھا مگر امیگریشن کے ریکارڈ میں بھی جارج کلیمنٹ شامل نہیں تھا۔ گزشتہ دس سالوں میں جو جارج کلیمنٹ وفات پا چکے تھے ان کی چھان بین بھی کر لی گئی اور بے نام ونشان ملنے والی لاشوں کے بارے میں بھی پولیس رپورٹ کی چھان بین کر لی گئی تھی۔ ظاہر ہے تلاش کرنے والوں نے کوئی خانہ خالی نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے جارج کو ان سب سے ہٹ کر تلاش کرنا تھا۔

میں نے پولیس ریکارڈ سے مایوس ہونے کے بعد امریکا میں فلاحی کام کرنے والی آرگنائزیشنز کا ریکارڈ کھنگالنا شروع کیا۔ اس میں آغاز بے گھر اور بے روزگار افراد سے کیا کیونکہ میرے حساب سے جارج اس کیٹگری میں آتا تھا۔ میں رات تین بجے تک کمپیوٹر پر مصروف رہا تھا لیکن جارج کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا۔ تھک ہار کر میں سونے کے لیے اٹھ گیا، ویسے مجھے امید بھی نہیں تھی۔ جو شخص گزشتہ دس سال سے اس طرح غائب تھا کہ اسے تلاش کرنے کی ہر کوشش ناکامی کے بند دروازے پر جا کر ختم ہوئی تھی تو میں ایک رات اور چند گھنٹوں میں اسے کس طرح تلاش کر سکتا تھا۔ بہر حال مجھے کوشش کرنی تھی۔ ایک تو مجھے مسٹر بیورگ سے ان کے کردار کی وجہ سے عقیدت سی تھی اور دوسرے مجھے اس کیس پر کام کرنے کا معاوضہ دگنا مل رہا تھا۔ میں عام طور سے ایک دن کا معاوضہ ڈھائی سو ڈالرز لیتا ہوں لیکن اس کیس سے مجھے پانچ سو ڈالرز روز کے حساب سے ملتے۔

اگلے دن میں نے کچھ کام جو باقی رہ گئے تھے نمٹائے اور نیویارک جانے والی فلائٹ کا ٹکٹ لیا۔ اسی رات میں نیویارک کے لیے روانہ ہو گیا۔ مسٹر بیورگ نے ابتدائی طور پر مجھے ایک ہزار ڈالرز دیے تھے۔ میں نے نیویارک کے ایک متوسط ہوٹل میں قیام کیا۔ اگرچہ اس کے اخراجات بھی مسٹر بیورگ ادا کرتے لیکن میں اپنے گاہکوں پر بلاوجہ کا بوجھ لادنے کا قائل نہیں تھا۔ اس لیے کام کے دوران ہمیشہ متوسط ہوٹلوں میں ٹھہرتا۔ اگلے روز سے میں نے جارج کی تلاش شروع کی۔ میں سب سے پہلے اس کے آخری محلے میں گیا جہاں وہ کبھی رہتا تھا لیکن وہاں کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ اب اس بلڈنگ میں رہنے والا کوئی فرد جارج کو نہیں جانتا تھا کیونکہ وہ سب جارج کے جانے کے بعد آئے تھے۔ بڑی مشکل سے ایک آدمی ملا جو یہاں بارہ سال سے رہ رہا تھا۔ میں نے اسے جارج کے بارے میں تفصیل سے بتایا لیکن اسے کوئی جارج کلیمنٹ یاد نہیں تھا۔

''نہیں، مجھے ایسا کوئی جارج کلیمنٹ یاد نہیں ہے۔ آخر تم اسے کیوں تلاش کر رہے ہو؟''

''اس کی لاٹری کھل گئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''تب کاش میں جارج ہوتا۔'' اس نے سرد آہ بھری۔

میری اگلی منزل وہ بار تھا جہاں جارج ملازم ہوا کرتا تھا۔ میرا تجربہ تھا کہ لاپتا افراد کی تلاش میں بعض اوقات اس جگہ جانا مفید ہوتا ہے جہاں پہلے بھی کئی بار تفتیش کی جا چکی ہو۔ بار کی انتظامیہ اور تمام ہی ملازم بھی بدل چکے تھے سوائے بارٹینڈر کے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ اس نے کہا۔ ''تم سے پہلے بھی کئی افراد جارج کے بارے میں پوچھنے آچکے ہیں۔ آخر اس میں ایسی کیا خاص بات ہے؟''

''اس کی لاٹری کھل گئی ہے۔'' میں نے اسے بھی وہی جواب دیا۔

''یہ بکواس ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''جارج کے جاب چھوڑنے کے ایک مہینے بعد ہی اسے تلاش کرنے والے آنے لگے تھے اور اس بات کو دس سال گزر چکے ہیں۔ کوئی لاٹری اس کے جیتنے والے کے لیے اتنی دیر نہیں روکی جاتی ہے۔''

''یہ درست ہے لیکن لاٹری دوسرے معنوں میں کھلی ہے یوں سمجھ لو کہ ایک بہت بڑی دولت اس کا انتظار کر رہی ہے۔''

اس نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''کہیں تم غلط بیانی تو نہیں کر رہے ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ وہ تمہاری یا کسی شخص کی بڑی رقم لے کر فرار ہو گیا ہو اور وہ اسے تلاش کروا رہا ہو۔''

''ایسا نہیں ہے۔ اسے سچ مچ اسی وجہ سے تلاش کیا جا رہا ہے جو میں نے بیان کی ہے۔'' میں نے کہا اور نیویارک ٹائمز کا تازہ شمارہ اس کے سامنے کر دیا۔ ''یہ دیکھو یہ اشتہار اس کے بارے میں چھپ رہا ہے اور مسلسل دس سال سے چھپ رہا ہے۔ اگر وہ کسی کی رقم لے کر بھاگا ہوتا تو وہ اسے اس طرح تلاش نہیں کرتا۔''

میں نے محسوس کیا کہ میری بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا تھا اور مجھے ایک موہوم سی امید بندھی کہ شاید وہ اس کے بارے میں کچھ جانتا ہو، میں نے کچھ پوچھنے کے بجائے اسے جارج کلیمنٹ کی تلاش کے بارے میں مزید کچھ معلومات فراہم کیں کہ اسے پورے امریکا اور اس سے باہر بھی تلاش کرنے کی کیا کیا کوششیں کی گئی تھیں لیکن بدقسمتی سے اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ آخر کار بارٹینڈر کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔

''آخر یہ شخص اسے کیوں تلاش کروا رہا ہے؟''

''کیونکہ جارج نے اس شخص کے ساتھ بہت بڑی نیکی کی تھی اور اگر جارج ایسا نہ کرتا تو وہ شخص جس مقام پر ہے شاید آج یہاں نہ ہوتا۔ اس لیے اس شخص نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی دولت کا ایک حصہ جارج کو دے گا اور اسی لیے اسے تلاش کروا رہا ہے۔''

بارٹینڈر نے کچھ سوچا اور بولا۔ ''جارج ایک چوہا نما شخص تھا، دوسروں سے خوف زدہ رہنے والا اور کونے کھدروں میں چھپنے والا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کسی کے ساتھ کیا نیکی کر سکتا ہے؟''

''سچی بات ہے کہ میں نے اسے دیکھا نہیں ہے لیکن اس کے بارے میں جو سنا ہے تو میری سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ اس نے یہ نیکی کیسے کی حالانکہ اسے بہت بڑا چانس ملا تھا اور اس نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ میرا خیال ہے یہ اس شخص کی نیکی ہی تھی جس کے لیے میں جارج کلیمنٹ کو تلاش کر رہا ہوں۔ اس کی نیک نفسی کی پورا امریکا قسم کھا سکتا ہے۔''

''دیکھو، میں نے اس کے بارے میں پوچھنے والوں کو ہر بات بتا دی تھی۔''

''لیکن کوئی بات شاید رہ گئی ہو؟'' میں نے امید سے کہا۔

''ہاں ایک بات ہے۔'' وہ ہچکچایا۔ ''لیکن ایک تو وہ بہت پرانی ہے اور دوسرے میں نے اس وجہ سے نہیں بتائی تھی کہ دوسرا فریق کوئی اچھا آدمی نہیں تھا بلکہ اب بھی برا آدمی ہی ہے۔''

''کوئی جرائم پیشہ؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''یہاں کا ایک بدنام شخص ہے اور اس کے بارے میں شبہ ہے کہ مافیا کا آدمی ہے۔''

''مافیا!'' میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی تھی۔ میں خود مافیا سے دور رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ کیونکہ کسی معاملے میں مافیا کے ملوث ہونے کا مطلب اس میں قتل و غارت گری کا پورا امکان تھا لیکن یہ معاملہ مختلف تھا۔ ''جارج کلیمنٹ کا اس شخص سے کیا تعلق تھا؟''

''پتا نہیں، میں نے بس اسے اس سے ملتے دیکھا تھا اور یہ اس کی یہاں سے ملازمت چھوڑ کر جانے سے ایک دن پہلے کی بات تھی۔ جارج اس کی میز پر سرو کرنے گیا اور پھر وہیں بیٹھ گیا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ ایک گاہک کے ساتھ کیوں بیٹھا ہے؟ تب اس نے عجیب سے لہجے میں کہا کہ وہ گاہک نہیں اس کا دوست تھا اور وہ کل سے ملازمت چھوڑ رہا ہے۔ پھر وہ سچ مچ اگلے دن نہیں آیا اور اس کے بعد میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔''

''اس کے بارے میں سنا بھی نہیں؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نہیں، سنا بھی نہیں... ہاں اس کے کچھ دن بعد ہی سے تلاش کرنے والے آنا شروع ہو گئے تھے۔''

''وہ شخص کون ہے؟''

بارٹینڈر ہچکچایا لیکن اس نے نام بتا دیا۔ ''مائیک فری مین... کسی سے بھی اس کے بارے میں معلوم کیا جا سکتا ہے۔''

''اس کا پتا؟''

''وہ تم خود معلوم کر لو۔ ویسے بھی وہ کسی ایک جگہ نہیں رہتا۔'' اس نے انکار کر دیا۔

''خیر اتنا بھی کافی ہے۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''تم نے اتنا تو بتا دیا، تمہارا شکریہ۔''

''میرا شکریہ یوں ادا کرنا کہ مجھے بھول جانا۔ ویسے اگر میرا نام کہیں آیا بھی تو میں صاف انکار کر دوں گا۔'' اس نے پھر صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''فکر مت کرو میرے پیشے میں سب سے زیادہ اہمیت رازداری کی ہوتی ہے۔'' میں نے اسے اپنا جاسوسی کا کارڈ دکھایا تو کسی قدر مطمئن نظر آنے لگا۔ میں باہر آیا۔ مائیک فری مین کے بارے میں کہیں سے معلوم کرنا خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں نے آسان طریقہ استعمال کیا اور انٹرنیٹ پر جا کر اسے تلاش کر لیا۔ اس کا پتا اور کرتوت سامنے آ گئے تھے۔ وہ قتل کے دو مقدمات سے صاف بَری ہو گیا تھا جس میں اس نے کھلے عام دو افراد کو شوٹ کیا تھا۔

مختلف پولیس رپورٹس میں اسے مقامی مافیا کا ایک چھوٹا چیف قرار دیا گیا۔ چھوٹے چیف سے مراد وہ لوگ ہیں جو سامنے ہوتے ہیں اور جن کے بارے میں سب کو پتا ہوتا ہے کہ وہ مافیا کے لوگ ہیں۔ جبکہ بڑے چیف کبھی سامنے نہیں آتے اگر وہ سامنے آ جائیں تو پھر زندہ نہیں رہتے۔ میں سوچ میں پڑ گیا تھا کہ اس سے کیسے رابطہ کروں۔ پھر میں نے راست طریقہ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اس کے گھر کا نمبر حاصل کیا اور اپنے موبائل سے اسے کال کی۔ اس طرح میرا نمبر اس کے پاس آ جاتا لیکن وہ مجھے تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری طرف سے ایک مرد نے فون اٹھایا اور غرّا کر بولا۔

''کیا بات ہے؟''

''مجھے فری مین سے بات کرنی ہے۔''

''نام اور کام بتاؤ؟'' مرد نے اسی طرح غرّاتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے اپنا اصل نام بتا دیا لیکن کام کے بارے میں کہا۔ ''یہ میں صرف فری مین کو ہی بتاؤں گا۔''

''انتظار کرو۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ فری مین کا موڈ ہوا تو وہ مجھے کال کر لے گا۔ میرے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد میرے فون کی بیل بجی۔ ایک اجنبی نمبر سے کال آ رہی تھی۔ میرا نمبر یقیناً فون کی سی ایل آئی میں آ گیا تھا اس لیے غرّانے والے نے نمبر مانگنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ میں نے کال ریسیو کی۔

''فری مین۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''تم مجھ سے بات کرنا چاہ رہے تھے؟''

خلافِ توقع فری مین نرم لہجے میں بات کر رہا تھا۔ اس سے مجھے حوصلہ ہوا۔ ''ہاں... مجھے تم سے ایک کام ہے۔''

''کس قسم کا کام؟''

''مجھے ایک شخص کی تلاش ہے اور اس کا تم سے رابطہ رہا ہے۔''

''کون..... اور تمہیں اس کی تلاش کیوں ہے؟''

''اس کا نام جارج کلیمنٹ ہے اور میں اسے کسی کے لیے تلاش کر رہا ہوں۔ میرے علم میں آیا ہے کہ تمہارا اس سے رابطہ ہے۔''

''یہ غلط ہے، میرا کبھی اس سے رابطہ تھا اور اس نے کچھ دن میرے لیے کام کیا تھا۔''

''پھر مسٹر فری مین؟'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''وہ میرے معیار کا آدمی نہیں تھا، اس لیے میں نے اسے نکال دیا۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ میرا دل ایک لمحے کو رک گیا۔ مافیا میں کسی کو نکالنے کا مطلب دنیا سے رخصت کرنا بھی ہوتا ہے۔

''وہ... زندہ تو ہے؟'' میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

''ہاں، جب میں نے اسے آخری بار دیکھا تو وہ زندہ ہی تھا اور اس کے مرنے کی کوئی خبر بھی نہیں آئی ہے۔''

''تب تم بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں مل سکتا ہے؟''

''پہلے تم بتاؤ کہ تمہیں اس کی تلاش کیوں ہے؟''

''یہ تو وہی شخص جانتا ہے جو اسے تلاش کروا رہا ہے۔'' میں نے مصلحتاً جھوٹ بولا۔ فری مین جیسے جرائم پیشہ کو یہ بتانا ٹھیک نہیں ہوتا کہ جارج اپنی بے خبری میں ارب پتی ہو گیا ہے۔

''کوئی دشمنی کا چکر ہے؟'' اس نے شک سے کہا۔

میں ہنس دیا۔ ''ارے نہیں، میں جس کے لیے کام کر رہا ہوں وہ دشمنی کرنے والوں میں سے نہیں ہے۔''

''بہر حال یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔'' اس نے رکھائی

سے کہا۔

''مسٹر فری مین، پلیز .... مجھے اس شخص کو لازمی تلاش کرنا ہے۔''

ایک لمحے کو وہ خاموش ہوا تو مجھے شبہ ہوا کہ اس نے فون کاٹ دیا ہے لیکن پھر اس کی آواز آئی۔ ''مجھے صحیح نہیں معلوم لیکن وہ میری کے شیلٹر ہاؤس میں رہتا تھا۔ یہ بھی چار پانچ سال پرانی بات ہے۔''

''میری کا شیلٹر ہاؤس کہاں ہے؟''

''ایک سوستائیس ایونیو پر کسی سے بھی پوچھ لینا۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ ایک مشکل مرحلہ آسانی سے نمٹ گیا تھا ورنہ مجھے توقع نہیں تھی کہ مافیا کا ایک مقامی چیف مجھ سے اتنے سیدھے انداز میں گفتگو کرے گا۔ میں نے انٹرنیٹ پر ایک سوستائیس ایونیو کا نقشہ نکالا اور مجھے اس میں میری کا شیلٹر ہاؤس مل گیا تھا۔ میں ہوٹل سے نکلا اور ٹیکسی لے کر وہاں کے لیے روانہ ہو گیا۔

امریکا میں سب سے زیادہ بے گھر افراد نیویارک میں ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کی تعداد پانچ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ یہ لوگ فٹ پاتھوں، گلیوں، پارکوں اور انڈر گراؤنڈ ریل اسٹیشنوں میں رات گزارتے ہیں اور اس کے علاوہ بھی انہوں نے زیرِ زمین متروک سرنگوں اور ریلوے لائنوں میں ٹھکانے بنا رکھے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے نیویارک کی طویل سردیاں عذاب بن جاتی ہیں۔ ان کے لیے سرکاری اور نجی سطح پر سردیوں سے بچاؤ کے لیے ایسے شیلٹر ہوم بنائے گئے ہیں جہاں وہ رات گزار سکتے ہیں کیونکہ منفی پانچ درجے سینٹی گریڈ ان کی جان لے سکتا ہے۔ میری کا شیلٹر ہوم ان ہی میں سے ایک تھا۔

یہ سیاہ فام کمیونٹی کا علاقہ تھا اس لیے وہاں زیادہ تر سیاہ فام ہی نظر آ رہے تھے، خود میری بھی ایک سیاہ فام عورت ثابت ہوئی تھی لیکن وہ خوش مزاج اور زندہ دل تھی۔ میں نے اس سے تعارف کرایا تو وہ فوراً میرے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''مجھے یاد تو آ رہا ہے لیکن اس کی تصدیق کرنا ہو گی۔''

وہ مجھے اپنے چھوٹے سے دفتر میں لے آئی اور اپنا ریکارڈ کھنگالنا شروع کر دیا۔ ''اگر کوئی ایک دو دن کے لیے آ کر رکتا ہے تو ہم اس کا ریکارڈ نہیں رکھتے لیکن اگر کوئی مستقل پناہ کے لیے یہاں آتا رہے تو ہم اس کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔''

میں کرسی پر بیٹھا اسے فائلیں الٹتے پلٹتے دیکھتا رہا۔ آخر اس نے ایک فائل نکالی اور میرے سامنے آ بیٹھی۔ ''شاید

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس میں ہے، کیا نام بتایا تم نے؟''

''جارج کلیمنٹ۔''

''جارج ہاں یہ جارج کی سیریز ہے...'' وہ صفحے پلٹتے ہوئے بولی۔ ''کلیمنٹ... ہاں یہ رہا۔''

اس نے کہا تو میرا دل زور سے دھڑکا، مجھے امید نہیں تھی کہ یہ جارج کلیمنٹ اتنی آسانی سے مل جائے گا جو گزشتہ دس سال میں تمام تر کوششوں اور تقریباً ایک ملین ڈالرز خرچ کرنے کے باوجود نہیں ملا تھا۔ میں بے تابی سے آگے جھکا۔ میری نے فائل پر جو صفحہ کھولا ہوا تھا اس میں ایک ادھیڑ عمر شخص کی تصویر تھی۔ کثرت شراب نوشی سے اس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے اور چہرے پر زخموں کے نشانات تھے۔ اس کے بال سامنے سے اڑ گئے تھے اور رنگت جیسے جل گئی تھی۔ میں نے میری سے پوچھا۔

''یہی جارج کلیمنٹ ہے؟''

''ہاں، میرے شیلٹر ہاؤس میں پناہ لینے والا یہ واحد کلیمنٹ ہے ورنہ جارج تو درجنوں ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''تمہیں اس کی تلاش کیوں ہے؟''

''مجھے نہیں اس کی تلاش امریکا کے ایک بہت دولت مند شخص کو ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ جارج کہاں ملے گا؟''

''کیا کہہ سکتے ہیں؟'' میری نے شانے اچکائے۔ ''ریکارڈ کے مطابق یہ آخری بار مارچ میں یہاں آیا تھا۔ ان دنوں شدید برف باری ہوئی تھی اور یہ چار دن یہاں رکا تھا۔ موسم بہتر ہونے پر یہ چلا گیا اور اس کے بعد کم سے کم رہائش کے لیے نہیں آیا۔''

''رہائش کے علاوہ بھی لوگ یہاں آتے ہیں؟''

''ہاں میں بھوکوں کو کھانا بھی کھلاتی ہوں اور میرے پاس سالویشن آرمی کا لائسنس ہے، میں کپڑے بھی مہیا کرتی ہوں۔''

''ممکن ہے وہ بعد میں یہاں کھانا کھانے آتا ہو؟'' میں نے امید سے کہا۔ جارج کم سے کم تین مہینے پہلے تک زندہ تھا اور اس بات کا پورا امکان تھا کہ وہ اب بھی زندہ ہوگا لیکن وہ کہاں تھا یہ جاننا باقی تھا۔ میری نے اپنے شیلٹر ہاؤس میں کچن کے انچارج اسکوبی کو بلایا، وہ ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام تھا جو دیکھنے میں کوئی خطرناک مجرم لگتا تھا لیکن حقیقت میں بہت شریف اور ہنس مکھ انسان ثابت ہوا۔ میری نے اس سے جارج کے بارے میں پوچھا۔

''تم جارج بیسٹ کی بات کر رہی ہو؟''

''نہیں، میں جارج کلیمنٹ کی بات کر رہی ہوں۔''

''جارج کلیمنٹ'' اسکوبی سوچ میں پڑ گیا۔ ''اچھا وہ... جو کبھی کبھی کھانا لینے آتا ہے۔ سامنے سے گنجا ہوگیا ہے؟''

''بالکل وہی۔''

''وہ ایک ہفتہ پہلے آیا تھا۔'' اسکوبی نے بتایا۔

''تم بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ملے گا؟'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''کیا کہہ سکتے ہیں؟'' اس نے بھی شانے اچکا دیے۔

''اس کا کوئی ساتھی... دوست جس کے بارے میں تم جانتے ہو؟''

''دوست۔'' اس نے سوچا۔ ''دوست تو نہیں ہاں ایک واقف کار ہے شاید... وہ ادھر پچپن نمبر میں رہتا ہے۔ اصل نام تو پتا نہیں کیا ہے لیکن شارکی کے نام سے مشہور ہے۔''

''پچپن نمبر کیا ہے؟''

''پچپن نمبر یہاں ایک بلڈنگ ہے۔'' میری نے مداخلت کی۔ ''شیلٹر ہاؤس سے آگے جاؤ گے تو تیسری بلڈنگ ہے۔''

''اس کے علاوہ کوئی فرد جو جارج کلیمنٹ کے بارے میں جانتا ہو؟''

لیکن اسکوبی یا میری کے علم میں ایسا کوئی فرد نہیں تھا۔ میں نے میری کے ریکارڈ کی فائل سے اس کی اجازت سے جارج کلیمنٹ کی تصویر اپنے موبائل کے کیمرے سے اتاری اور فوری طور پر کائل بیورگ کو بھیج دی کہ وہ اس کی تصدیق کر دے کہ یہی جارج کلیمنٹ ہوسکتا ہے یا نہیں۔ پھر میں ان دونوں کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گیا۔ شام کا وقت ہو گیا تھا اور میں صبح سے بھوکا پیاسا گھوم رہا تھا میں نے ایک نزدیکی دکان سے برگر لے کر تسلی کی۔ اس دوران میں کائل بیورگ کی کال آ گئی۔ میں نے ریسیو کی تو اس کی پُرجوش آواز آئی۔

''مسٹر جونی یہی جارج ہے۔''

''آپ کو یقین ہے؟''

''نوے فی صد کیونکہ یہ بدل گیا ہے لیکن تم اس سے ملو گے اور میرا حوالہ دو گے تو اسے یاد آ جانا چاہیے۔''

''فی الحال میں اس تک نہیں پہنچ سکا ہوں۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''لیکن اگر یہی جارج ہے تو ایک ہفتے پہلے تک یہ ٹھیک ٹھاک تھا۔''

''ٹھیک ہے اس کے بارے میں جلد از جلد معلوم کرنے کی کوشش کرو، میں تمہاری رپورٹ کا انتظار کر رہا ہوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں برگر کھا کر بلڈنگ چپن کی طرف بڑھ گیا۔ یہ ایک چھوٹی سی عمارت تھی لیکن بدقسمتی سے شارکی کا فلیٹ آخری منزل پر تھا اور وہ ساتواں فلور تھا۔ یہاں لفٹ نہیں تھی اور سیڑھیوں پر تاریکی کا راج تھا۔ ایک بار میں کسی مائع چیز سے پھسل کر گرتے گرتے بچا اور ایک بار سیڑھیوں پر محبت میں معروف جوڑے سے ٹکرا گیا۔ لڑکا میرے پیچھے پڑ گیا تھا، بڑی مشکل سے اس سے پیچھا چھڑا کر اوپر شارکی کے فلیٹ تک پہنچا اور کال بیل بجاتے ہوئے دل ہی دل میں دعا کی کہ شارکی گھر پر ہو کیونکہ یہاں رہنے والے لوگ دن میں سونے اور رات کو جاگنے والوں میں سے تھے۔ میں نے اس وقت تک کال بیل پر ہاتھ رکھا جب تک اندر سے کسی کی جھنجلائی ہوئی آواز نہیں آئی۔

''کون ہے؟''

''مجھے شارکی سے ملنا ہے۔'' میں نے بلند آواز سے کہا۔

چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور میرے سامنے ایک نشے میں دُھت شخص کھڑا تھا۔ اس کے پاس سے بدبو کے بھبکے آ رہے تھے اور شاید اس نے کئی ہفتے سے غسل نہیں کیا تھا۔ بدبو کے ساتھ میں نے دھواں بھی محسوس کیا تھا۔ شاید وہ اب بھی کوئی نشہ کر رہا تھا۔ اس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''کیا... بات ہے؟ میں شارکی ہوں۔''

''مجھے جارج کی تلاش ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں کسی جارج کو نہیں جانتا۔'' اس نے رکھائی سے کہا اور دروازہ بند کرنے لگا تھا کہ میں نے پاؤں اڑا دیا۔

''مجھے معلوم ہے تم جارج کلیمنٹ سے واقف ہو اس لیے انکار کا فائدہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور اپنا پرس اس طرح نکالا کہ اس میں موجود نوٹوں کی جھلک اسے نظر آنے لگے۔ اس کے ہاتھ کا دباؤ ختم ہو گیا۔ اس نے حریص نظروں سے پرس کی طرف دیکھا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''مجھے جارج کلیمنٹ کا پتا چاہیے۔'' میں نے کہا اور سو ڈالرز کا ایک نوٹ پرس سے باہر نکال لیا۔

''تم مجھے دو سو ڈالرز دو تو میں اس کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔''

''تم مجھے اس کے پاس لے چلو تو میں تمہیں تین سو ڈالرز دوں گا۔'' میں نے کہا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔

''میں چلنے کو تیار ہوں لیکن میرے پاس گاڑی نہیں ہے اور اسے تلاش کرنا پڑے گا۔''

''اس کی فکر مت کرو بس تم انسانیت کے جامے میں آ جاؤ۔''

وہ دو منٹ میں تیار ہو کر آ گیا۔ اس نے شاید مدافعتی دوا استعمال کیا تھا کیونکہ اس کے نشے کی کیفیت کم ہو گئی تھی البتہ اس کے پاس سے بدبو کے بھبکے ویسے آ رہے تھے۔ ہم نیچے آئے اور میں نے ایک ٹیکسی روک لی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔ ''ممکن ہے ہمیں کئی جگہ رکنا پڑے اگر ہم کہیں رکے تب بھی تمہارا میٹر چلتا رہے گا۔''

''تب کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن اس کے پاس کوئی منشیات تو نہیں ہے۔'' اس نے شارکی کی طرف دیکھا۔

''نہیں اور اگر تمہیں شک ہے تو تم اس کی تلاشی لے سکتے ہو۔''

''اس نے اگر میرے جسم کو ہاتھ لگایا تو میں اس کی ٹیکسی پر اسکریچ ڈال دوں گا۔'' شارکی غرایا تو ڈرائیور فوراً اپنے مطالبے سے دست بردار ہو گیا۔ ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ پہلے شارکی نے ایک بار کے سامنے ٹیکسی رکوائی اور اندر چلا گیا۔ اس نے مجھے روک دیا تھا۔

''کوئی اجنبی میرے ساتھ ہوا تو سب میری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔''

اس کی بات معقول تھی اس لیے میں ٹیکسی میں ہی رہا۔ ڈرائیور کو فوراً فکر لاحق ہو گئی تھی۔ ''دوست، کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟''

''نہیں ہمیں ایک آدمی کی تلاش ہے اور بس۔'' میں نے اسے اطمینان دلایا۔

''کیوں؟''

''اس سے تمہارا تعلق نہیں ہے تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔'' میں نے ذرا خشک لہجے میں کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔ شارکی دس منٹ بعد آیا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔

''کیا ہوا، جارج ملا؟''

اس نے مجھے دیکھا اور ہچکچا کر بولا۔ ''کوئی چکر ہے تمہارا، جارج اسپتال میں داخل ہے۔''

میں چونکا۔ ''اسپتال... کیوں کیا اس کی طبیعت خراب ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیوں وہاں ہے۔ وہ کوکین استعمال کرتا ہے ممکن ہے اوور ڈوز کی وجہ سے اس کی طبیعت خراب ہو گئی ہو۔'' شارکی فکرمند تھا اسے فکر جارج کی نہیں تھی بلکہ اپنے تین سو ڈالرز کی تھی جو میں نے اسے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔

''تم فکر مت کرو اگر یہی جارج کلیمنٹ نکلا تو تمہارا انعام ضرور ملے گا۔''

''میں اسی جارج کلیمنٹ کو جانتا ہوں اور میں نہیں جانتا کہ تم کسے تلاش کر رہے ہو۔'' اس کی تشویش کم نہیں ہوئی تھی۔

''میں اسی جارج کلیمنٹ کو تلاش کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ کس اسپتال میں ہے؟''

''ایڈورڈ میڈیکل سینٹر... اسی ایونیو پر ہے۔'' اس نے کہا۔

''تم نے سن لیا ہے؟'' میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ ''اب چلو۔''

اس نے ٹیکسی آگے بڑھا دی اور ہم دس منٹ میں اسپتال کے سامنے تھے۔ یہاں میں نے ٹیکسی والے کو فارغ کر دیا۔ استقبالیہ سے میں نے جارج کلیمنٹ کے بارے میں پوچھا تو وہاں موجود عورت نے بتایا۔

''وہ آئی سی یو میں ہے۔''

میں پریشان ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کی حالت نازک تھی۔ آئی سی یو کا پوچھ کر ہم وہاں پہنچے۔ وہاں ایک نرس نے جارج کلیمنٹ کا نام سن کر افسوس سے سر ہلایا۔ ''وہ کچھ دیر پہلے ہی انتقال کر گیا ہے۔''

میرا دل ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ جس شخص کو قسمت دس سال سے تلاش کر رہی تھی اور وہ ملا تو کس حال میں کہ چند منٹ پہلے اس دنیا سے جا چکا تھا۔ مجھے شدت سے افسوس ہوا۔ میری صورت دیکھ کر نرس نے کسی قدر تعجب سے کہا۔ ''کیا وہ تمہارا رشتے دار تھا؟''

''نہیں، لیکن میں اسے بہت دور سے تلاش کرتا یہاں تک آیا ہوں۔''

''افسوس کہ وہ اب بہت دور چلا گیا ہے۔'' نرس نے کہا۔

''کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟''

''ہاں ابھی اس کی ڈیڈ باڈی کمرے میں ہے۔'' نرس نے کہا۔ ''تم یہاں سے دائیں طرف چلے جاؤ، بارہ نمبر کمرا ہے۔''

جب ہم کمرا نمبر بارہ کے سامنے پہنچے تو جارج کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ تیار کرنے والے ڈاکٹر کے ساتھ دو عدد پولیس والے بھی وہاں موجود تھے۔ انہیں دیکھتے ہی شارکی راہداری میں ہی رک گیا اور میں شیشے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ ایک پولیس افسر نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے اسے اپنا کارڈ دکھایا۔ اس پر اس نے مجھے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔

''کیا بات ہے؟''

''میں اس شخص کو تلاش کرتا ہوا یہاں آیا ہوں۔''

پولیس افسر نے جارج کلیمنٹ کی لاش کی طرف دیکھا۔ ''اب یہ تمہارے کسی کام کا نہیں رہا۔ ویسے تم اسے کیوں تلاش کر رہے تھے؟''

''ظاہر ہے اپنے ایک کلائنٹ کے لیے۔'' میں نے جارج کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ بلاشبہ جارج کلیمنٹ ہی تھا۔ ''اسے کیا ہوا تھا؟''

''دل سے ذرا نیچے دو گولیاں لگی ہیں۔'' پولیس افسر نے جواب دیا۔ ''یہ سڑک پر رہزنی کی واردات کر کے بھاگ رہا تھا۔ اس نے ایک آدمی سے پرس چھین لیا تھا جس میں صرف بیس ڈالرز تھے۔ پولیس نے اسے رکنے کے لیے وارننگ دی اور جب یہ نہیں رکا تو اسے گولی مار دی۔''

''صرف بیس ڈالرز کے لیے۔'' میں نے حیرت اور افسوس سے کہا۔ ''اس نے اپنی جان دے دی۔''

''بعد میں جب پرس سے صرف بیس ڈالرز نکلے تو پولیس افسر کو بھی افسوس ہوا تھا جس نے اسے شوٹ کیا تھا۔''

اس دوران میں ڈاکٹر نے اپنی کارروائی مکمل کر لی تھی اور میں باہر نکل آیا۔ شارکی میرا منتظر تھا۔ میں نے اسے اس کے تین سو ڈالرز ادا کیے اور وہ فوراً وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کائل بیورگ کا نمبر ملایا۔ وہ جیسے میری ہی کال کا منتظر تھا۔ اس نے فوراً ریسیو کیا۔

''ہاں جونی کیا ہوا؟''

''مجھے افسوس ہے مسٹر بیورگ، میں جارج کو آپ کے سامنے پیش نہیں کر سکوں گا۔''

مسٹر بیورگ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئے پھر انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ''وہ زندہ نہیں ہے؟''

''ہاں، اس نے کچھ دیر پہلے ہی دم توڑا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ چھ لاکھ ڈالرز آپ تک پہنچانے والا جارج کلیمنٹ صرف بیس ڈالرز کی ڈکیتی کرتے ہوئے پولیس کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔''

یہ سن کر دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی اور میں نے فون بند کر دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نرم چارا

مرزا امجد بیگ

”کرے کوئی بھرے کوئی“ یہ تو زمانوں سے دنیا کی رِیت چلی آرہی ہے مگر... ضروری نہیں کہ اس ریت میں اتنی ہی صداقت بھی ہو... کیونکہ قانونِ قدرت کے مطابق بھرنا تو اُسی کو پڑتا ہے جو کرنے کا سبب بنتا ہے۔ وہاں کوئی سازش کوئی سفارش کام نہیں آتی... دیر یا سویر... مسئلہ بس اتنا ہی ہوتا ہے... اور اسی دیر سویر کے درمیان اپنے مزاج کے مطابق انسان صبر یا عجلت، شکر اور ناشکری کا رستہ اختیار کرکے اپنا وہ دورانیہ پورا کرلیتا ہے جو مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ صحیح یا غلط... عدالت کا ایک تصور ہماری دنیا کا حصہ ہے جہاں کبھی انصاف دولت کے ترازو میں رکھ دیا جاتا ہے اور کبھی بیگ صاحب جیسے وکیل انصاف کا یہ ترازو سنبھالے مظلوموں کی دادرسی کے لیے مصروفِ عمل دکھائی دیتے ہیں۔

حتی الامکان صحیح کا ساتھ دینے والے مرزا امجد بیگ کا ایک اور کارنامہ

اس روز میرا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔ ریسٹورنٹ میں لنچ کرتے ہوئے ایک بے ہودہ شخص سے اچھی خاصی گرما گرمی ہوگئی تھی۔ میں عدالتی بکھیڑوں کو نمٹانے کے بعد سٹی کورٹ کے نزدیک ہی واقع ایک ریسٹورنٹ میں لنچ کیا کرتا تھا۔ برسوں سے میرا یہ معمول تھا کہ لنچ کے بعد میں اپنے دفتر میں بیٹھ جاتا تھا جو کہ ریسٹورنٹ کے قریب ہی ایک کثیر المنزلہ عمارت میں تھا لیکن اس روز بہت کچھ معمول سے ہٹ کر پیش آیا تھا۔

میں ریسٹورنٹ میں بیٹھا لنچ کر رہا تھا کہ مجھے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا مخصوص دباؤ محسوس ہوا۔ پہلے میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ وہ میرا کوئی شناسا یا بے تکلف دوست ہوگا لیکن اگلے ہی لمحے مجھے اپنے خیال کی تردید کرنا پڑی۔

میں نے ایک جھٹکے سے گردن موڑ کر اپنے عقب میں دیکھا اور مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ایک ایسا شخص میری نگاہ کے سامنے تھا جسے دیکھ کر جی متلانے لگا۔ میرے اچانک پلٹ کر دیکھنے پر وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ گندا شخص، صاف ستھرے ریسٹورنٹ میں کیسے گھس آیا تھا۔

اس قسم کے لوگ آپ نے بھی دیکھ رکھے ہوں گے۔ بے ڈھنگے، میلے کچیلے اور بدبو سے فضا کو آلودہ کرتے ہوئے۔ میرے متوجہ ہونے پر اس نامعقول شخص نے اپنا غلیظ ہاتھ آگے بڑھایا اور بڑے دھڑلے سے بولا۔

”پچاس روپے کا سوال ہے بابو......!“

اس کا انداز بھیک مانگنے والا نہیں بلکہ غنڈا ٹیکس وصول کرنے کا سا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہوئے آواز لگائی۔ ”ویٹر......!“

”ویٹر کو کیوں بلایا ہے بابو......؟“ وہ اپنی سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”پچاس روپے ویٹر تو نہیں دے گا...... میں نے تجھ سے مانگے ہیں۔“

اس غلیظ بھکاری کا یہ بدتمیزی بھرا انداز میرے لیے ذہنی کوفت کا سامان پیدا کر رہا تھا۔ تاہم میری پکار پر دو ویٹرز دوڑتے ہوئے آئے اور ڈانٹ ڈپٹ کر اس شخص کو ریسٹورنٹ سے نکل جانے کے لیے کہنے لگے۔ ویٹرز کی یہ کوشش زبانی کلامی اظہارِ خفگی تک محدود تھی، کوئی بھی اسے اسے بازو سے تھام کر باہر کی راہ دکھانے کی ہمت نہیں کر رہا تھا اور وہ تو جیسے ریسٹورنٹ کے فلور کے ساتھ چپک کر رہ گیا تھا۔

اس کا تقاضا بردار ہاتھ ابھی تک میرے سامنے دراز تھا۔ گویا، وہ اس عزم کے ساتھ میرے پاس آیا تھا کہ کچھ بھی ہوجائے، خالی ہاتھ واپس نہیں جائے گا۔ اس کی کھلم کھلا ڈھٹائی کو دیکھ کر مجھے غصہ آنے لگا اور میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

”تم جاتے ہو یہاں سے کہ میں پولیس کو بلاؤں......!“

”جس کی جیب سے پچاس روپے نہیں نکل رہے، اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے کہنے پر پولیس کیا آئے گی۔'' وہ میری دھمکی کے جواب میں عجیب استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''بڑا وکیل بنتا ہے..... بس..... دوسروں کی جیب سے ہی نکلوانا سیکھا ہے۔ اپنا مال نکالتے ہوئے دیکھو..... کیسے موت آرہی ہے۔''

ریسٹورنٹ میں موجود تمام افراد ہماری طرف متوجہ ہو چکے تھے جن میں نصف کے قریب تعداد وکلا برادری کی تھی۔ اس واقعے پر ان کا رجحان ملا جلا تھا۔ جو میرے خیر خواہ تھے اور میرے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھتے تھے، وہ حیران اور پریشان تھے کہ بیگ صاحب کے منہ سے یہ کیسی بلا لگی ہے لیکن وہیں پر چند بدخواہ بھی موجود تھے جو بڑے محظوظ کن انداز میں یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ اس بدمزہ اور کریہہ واقعے سے ان کے دلوں میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ انسان کے جہاں دس دوست ہوتے ہیں وہاں ایک آدھ دشمن کی موجودگی بھی لازمی بات ہے اور یہی دشمن ہم پیشہ اس وقت کھی کھی کی آوازیں نکال کر میرا تمسخر اڑا رہے تھے تاہم مجھے ان کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔

بالآخر ویٹرز نے ہمت دکھانے کا فیصلہ کر ہی لیا اور اس غنڈا صفت بھکاری کو بہ زور بازو دھکیل اور کھینچ کر ریسٹورنٹ سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اشارے سے ویٹر کو اپنے پاس بلا کر خفگی آمیز لہجے میں کہا۔

''جلدی سے بل لے آؤ.....''

ایک طرف سے آواز آئی۔ ''ان مسٹنڈوں کی دیدہ دلیری دیکھو۔ کیسے منہ اٹھا کر اندر گھس آتے ہیں.....!''

''ریسٹورنٹس کے باہر تو ایسے میلے کچیلے بدبودار لوگوں کو قطار بنائے کھانے کے انتظار میں بیٹھے دیکھا ہے لیکن اس بدمعاش نے جس جرأت مندی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ حیران کن ہے۔''

''اللہ پتا نہیں، کس کس رنگ اور بھیس میں انسان کے سامنے آجاتا ہے۔'' یہ آواز میرے عقب میں ابھری تھی۔

''کسی مجذوب کو یوں دھتکارنا بہت بڑا گناہ ہے.....''

''دھتکارنا تو بہت دور کی بات ہے۔'' کسی نے بڑے سنجیدہ انداز میں تبصرہ کیا۔ ''یہاں تو اس بے چارے فقیر کو اٹھا کر باہر پھنکوا دیا گیا ہے۔''

میں نے پلٹ کر دیکھا، ان فکر انگیز تبصرہ نگاروں میں ایک میری برادری کا بندہ تھا اور ان دنوں اس سے میری کشیدگی چل رہی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ بڑے بے ہودہ انداز میں مسکرایا پھر اپنے ہم خیال ساتھی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''اللہ رحم کرے..... اس بے چارے مجذوب کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے بھائی.....''

میرے جی میں تو آئی کہ اپنے اس بدخواہ ہم پیشہ سے کہوں کہ میں نے تو مجذوب کے ساتھ سنگین زیادتی کر ڈالی ہے۔ اب آپ اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر گھر لے جاؤ اور ایک بیڈ روم میں مقیم کر لو۔ اللہ والوں کی صحبت میں تمہاری دنیا اور آخرت خوب سنور جائے گی لیکن میں غصے کو پی گیا۔ ایسے سخت جواب کا مطلب یہ ہوتا کہ میں اعصابی طور پر بہت کمزور ہوں۔ میں نے اس ہم پیشہ بدخواہ سے کسی اور انداز میں نمٹنے کا فیصلہ کیا اور جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

چند لمحے پہلے میں نے ویٹر کو بل لانے کے لیے کہا تھا۔ ادھر سے ریسٹورنٹ کا مالک میرے پاس آگیا۔ وہ اس واقعے پر افسوس کرتے ہوئے بولا۔

''یہ جو کچھ بھی ہوا ہے، مجھے اس کا بہت دکھ ہے۔ آپ بیٹھیں سر! میں آپ کے لیے دوبارہ کھانا چنواتا ہوں۔''

''رہنے دیں جناب!'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اس زحمت کی کوئی ضرورت نہیں۔ کھانے کا بالکل موڈ نہیں ہو رہا۔ آپ اپنا بل لے لیں اور مجھے جانے دیں۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے ہپ پاکٹ میں سے اپنا والٹ نکال لیا لیکن اس سے پہلے کہ میں بٹوے کو کھول کر کھانے کی ادائیگی کرتا، ریسٹورنٹ کا مالک کم منیجر بڑی قطعیت سے بولا۔ اس کا ایک ہاتھ منع کرنے والے انداز میں میری جانب اٹھا ہوا تھا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب.....!''

''کس چیز کا سوال پیدا نہیں ہوتا؟'' میں نے حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''بل کا!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''اگر آپ یہاں بیٹھ کر دوبارہ کھانا کھائیں گے تو میں آپ سے بل وصول کروں گا ورنہ آپ کو ادائیگی کے بغیر ہی جانا ہوگا۔ میں ایک بار پھر آپ سے معذرت خواہ ہوں۔''

دوبارہ بیٹھ کر کھانے کا بالکل موڈ نہیں ہو رہا تھا لہٰذا میں ہوٹل کے منیجر سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

''ٹھیک ہے جناب! ابھی تو میں جا رہا ہوں۔ اس موضوع پر ہم کل بات کریں گے.....''

ریسٹورنٹ سے نکل کر اپنے آفس کی طرف آتے ہوئے میں اسی بدمزہ واقعے کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسی ہیجان بچار کے دوران میں میرے ذہن میں ایک چمک سی

پیدا ہوئی، کہیں کسی نے اس بدبودار اور بدہیئت بھکاری کو فرستہ تو میرے پاس نہیں بھیجا تھا تاکہ بھرے ہوئے ریسٹورنٹ میں مجھے تماشا بنایا جا سکے؟

اس خطرناک سوال کے ساتھ ہی متعلقہ چند امور یکے بعد دیگرے میرے ذہن میں ابھرنے لگے۔ اس غلیظ شخص نے مجھ سے بھیک نہیں مانگی تھی بلکہ اس کا انداز غنڈا ٹیکس وصول کرنے والوں ایسا تھا اور وہ خاص طور پر میرے پاس ہی آیا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا، اس کی یہ حرکت کسی خاص منصوبے کے تحت تھی۔ نمبر دو، وہ پولیس کو بلانے کی، میری دھمکی سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا تھا اور نہ ہی وہ ویٹرز کو خاطر میں لایا تھا۔ یہ اعتماد اس امر کا غماز تھا کہ وہ کسی خاص مشن پر ہے۔ اپنا کام کرے گا اور واپس چلا جائے گا۔ نمبر تین، وہ کم بخت یہ بات جانتا تھا کہ میں ایک وکیل ہوں۔ اس نے بڑی حقارت سے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ میری جیب سے پچاس روپے نہیں نکل رہے۔ میں صرف دوسروں کی جیبوں سے پیسے نکلوانا جانتا ہوں۔ گویا وہ ہوش وحواس میں تھا۔ مجذوب انسان کو ایسی حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا اور..... سب سے بڑھ کر میرے ہم پیشہ بدخواہ اور اس کے ساتھیوں کی تمسخر آمیز ''کھی کھی.....''

مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہو گیا کہ یہ سارا واہیات ہنگامہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت برپا کیا گیا تھا اور اس گھٹیا حرکت کے پیچھے میرے ہم پیشہ بدخواہ ہی کی گندی ذہنیت کارفرما تھی جس کا نام تھا..... کلیم باجوہ!

کلیم باجوہ ایک فتنہ پرور اور منفی ذہن کا حامل وکیل تھا ہماری چپقلش کی عمر کچھ زیادہ نہیں تھی۔

میں آفس پہنچا اور ویٹرز لابی کو خالی پایا تو میری کوفت میں اضافہ ہو گیا۔ پچھلے چند روز سے کاروبار وکالت ذرا مندا چل رہا تھا۔ پتا نہیں، کس بدخواہ کی نظر لگ گئی تھی۔ میری سیکریٹری صدف کا خیال تھا کہ کلیم باجوہ نے میرے خلاف کوئی بندش کروا دی ہے۔ صدف میرے اور کلیم باجوہ کے تنازع سے نہ صرف اچھی طرح آگاہ تھی بلکہ اس جھگڑے کا مرکزی کردار بھی وہی تھی۔ بہرحال، میں اپنے چیمبر میں آکر بیٹھا تو صدف کا انٹر کام آگیا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور کہا۔

''ہیلو.....!''

''سر! آپ کے دوست کا تین چار مرتبہ فون آچکا ہے۔''

صدف اسی انداز میں بات شروع کرتی تھی کہ سر پیر کا کچھ اندازہ نہیں ہو پاتا تھا۔ میں چونکہ اس کی اس عادت کا عادی ہو چکا تھا لہٰذا اس اسٹائل سے کوفت نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی میں کوئی الجھن محسوس کرتا تھا۔ میں نے معتدل انداز میں پوچھا۔

''کون سا دوست؟''

''ڈاکٹر واحد کا سر.....!''

ڈاکٹر واحد سے میرے بڑے گہرے دوستانہ مراسم تھے، میں نے صدف سے پوچھا۔ ''ڈاکٹر صاحب کیا کہہ رہے تھے؟''

''کہا تو کچھ نہیں لیکن وہ آواز سے خاصے پریشان لگ رہے تھے۔'' صدف نے بتایا۔ ''بلکہ آخری فون پر تو انہوں نے کہا تھا کہ وہ پندرہ بیس منٹ میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، ڈاکٹر واحد جیسے ہی آئیں، انہیں میرے چیمبر میں بھیج دینا۔'' میں نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔

''او کے سر.....'' صدف نے کہا پھر چونکے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''لیں سر..... ڈاکٹر صاحب آگئے.....''

چند لمحات کے بعد ڈاکٹر واحد میرے سامنے بیٹھا تھا۔ واحد کوئی ''اسپیشلسٹ'' ڈاکٹر نہیں تھا بلکہ وہ اپنے کلینک میں ایک مخصوص انداز میں مریضوں کا علاج کیا کرتا تھا۔ یہ طریقہ آکوپریشر (ACU-PRESSURE) کہلاتا تھا۔

ڈاکٹر واحد واقعی بے حد پریشان نظر آرہا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھ لیا۔ ''ڈاکٹر صاحب! خیریت تو ہے نا؟''

''عاقل کی وجہ سے ایک مسئلہ ہو گیا ہے بیگ صاحب.....!'' اس نے اضطراری لہجے میں بتایا۔

عاقل، ڈاکٹر واحد کے چھوٹے بھائی کا نام تھا جو کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کرتا تھا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

''کیسا مسئلہ ڈاکٹر صاحب؟''

''پولیس نے عاقل کو گرفتار کر لیا ہے۔''

''کس جرم میں؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''قتل کے الزام میں۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

''عاقل نے کس کو قتل کر دیا ہے..... میرا مطلب ہے، پولیس نے اسے کس شخص کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے؟''

''مقتول کا نام ہے..... مورس!'' وہ انکشاف انگیز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لہجے میں بولا۔

''مورس!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''اس کا مطلب ہے، مقتول کا تعلق مسیحی برادری سے ہے؟''

''جی ہاں..... بالکل!''

''عاقل کی مورس کے ساتھ کیا دشمنی تھی؟''

''کوئی بھی نہیں۔''

''اور مورس کی عاقل کے ساتھ.....؟''

جواباً ڈاکٹر واحد نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''پھر مورس کے قتل کے الزام میں پولیس نے آپ کے بھائی عاقل ہی کو کیوں گرفتار کیا ہے؟'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''آخر کوئی نہ کوئی تو ایسی وجہ ہوگی جس کی بنا پر پولیس کا ذہن، قاتل کے حوالے سے آپ کے بھائی کی طرف گیا.....؟''

''ہاں..... اس کا ایک خاص سبب ہے۔''

''میں وہی سبب جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''چند روز پہلے عاقل اور مورس میں اچھا خاصا جھگڑا ہوگیا تھا۔'' ڈاکٹر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جس میں مورس نے عاقل کو دو چار ہاتھ بھی مار دیے تھے۔ اس دست و گریبانی میں عاقل کی شرٹ پھٹ گئی تھی اور وہ پٹا بھی تھا لہٰذا اس نے مورس کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دی تھیں جن میں سے ایک دھمکی کچھ اس نوعیت کی تھی..... مورس! دیکھ لینا، تم میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکو گے..... میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں.....'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اس موقعے پر بہت سے لوگ جمع تھے اور انہی کے بیچ بچاؤ سے یہ جھگڑا ختم بھی ہوا تھا۔ ان لوگوں میں مورس کے حمایتی بھی شامل تھے چنانچہ چند روز بعد جب کل رات مورس کو قتل کر دیا گیا تو پولیس کی تفتیش کا رخ فوراً عاقل کی جانب مڑ گیا۔ آج صبح عاقل کو گھر سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ میں اسی سلسلے میں آپ کے پاس آیا ہوں بیگ صاحب۔ بتائیں کہ اس پریشانی میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''آپ کو جو کچھ بھی کرنا چاہیے اس میں سرِفہرست تو یہ ہے کہ پریشان بالکل نہ ہوں۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''نمبر دو، اس فکر کو بھی ذہن سے جھٹک دیں کہ یہ معاملہ حل کیسے ہوگا۔ آپ میرے پاس آگئے ہیں، یہی کافی ہے۔ باقی کے مسائل میں خود دیکھ لوں گا۔ نمبر تین.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

''نمبر تین یہ کہ آپ مجھے ملزم اور مقتول کے درمیان ہونے والے جھگڑے کے بارے میں تفصیلاً بتائیں۔ خاص طور پر اس جھگڑے کا پس منظر..... تاکہ میں اس بات کا تعین کر سکوں کہ آگے بڑھنے کے لیے کیا لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''جی، بیگ صاحب.....!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''اس جھگڑے کی جڑیں اس اخبار کے نیچے ہیں جو میں نے نیا نیا نکالا ہے۔''

یہ بات میرے علم میں تھی کہ ڈاکٹر واحد نے لگ بھگ ایک ماہ پہلے اپنے علاقے میں ایک اخبار کا اجرا کیا تھا۔ ویسے تو یہ اخبار پہلے سے مارکیٹ میں موجود تھا لیکن ڈاکٹر واحد نے اپنے علاقے کی خبروں پر مبنی ایک سپلیمنٹ الگ سے اضافی اس کے ساتھ شامل کرایا تھا۔ وہ خود دو صفحات پر مشتمل اس خصوصی حصے کا انچارج تھا۔ آپ اسے اس اخبار کے ذیل میں اپنے علاقے کا بیورو چیف سمجھ لیں۔ اخبار کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں۔ میں زیرِ نظر کہانی میں اسے محض ''اخبار'' کے نام سے یاد کروں گا۔

مذکورہ اخبار کا اصل مالک سلمان فاروقی تھا۔ سلمان فاروقی اخبار کی دنیا کا آدمی نہیں تھا، ان کا فیملی بزنس کوئی اور تھا۔ ایک خاص سبب سلمان کو صحافت کا شوق چرایا اور اس نے چند ہمدردوں کے مشورے پر ایک ہفت روزہ نکال لیا۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد جب سلمان کو احساس ہوا کہ ہفت روزہ تو چل نہیں رہا، صرف کھا رہا ہے۔ جو شخص ''کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا'' ہو، اسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا چنانچہ سلمان کے کندھوں اور جیب پر بھی یہ ہفت روزہ بوجھ بن کر رہ گیا۔ اس کی عقل میں یہی بات آئی کہ مزید نقصان اٹھانے کے بجائے اس پرچے کو بند کر دینا چاہیے۔ اس کے ہمدردوں کے کان کھڑے ہوگئے۔ پرچے کو بند کر دینے کا فیصلہ ان کے لیے سراسر نقصان دہ تھا۔ سلمان فاروقی کی صحافت اور پبلی کیشنز سے ناواقفیت ان لوگوں کے لیے بڑی سودمند ثابت ہو رہی تھی چنانچہ..... انہوں نے اپنے زبانی اور کلامی ٹیلنٹ کو استعمال کر کے سلمان فاروقی کو اب ایک نیا خواب دکھایا کہ کیوں نہ اسے روزنامہ کر دیا جائے۔

سلمان فاروقی نے پوچھا۔ ''اس سے کچھ فائدہ بھی ہوگا؟''

''یقیناً ہوگا سر.....!'' اسے یقین دلایا گیا۔

''مثلاً کس قسم کا فائدہ ہوگا؟'' سلمان نے استفسار کیا۔

''روزنامہ ہو جانے سے ہمارا پرچہ دھڑا دھڑ بکنے لگے گا۔'' اسے بتایا گیا۔ ''اس سے ایک تو پچھلا نقصان پورا ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں آیندہ کے لیے آمدنی کی ایک محفوظ راہ بن جائے گی۔ شہرت الگ ہے۔''

یہ شہرت والی بات سلمان فاروقی کو زیادہ پسند آئی۔ اس کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ فیملی بزنس خوب زور شور سے چل رہا تھا۔ اس کے والد صاحب اور دیگر برادران اسی کام میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی فیکٹری بچوں کے کھانے کی چیزیں تیار کرتی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا لیکن یہ کوئی ایسا کاروبار نہیں تھا کہ وہ اونچی سوسائٹی میں بیٹھ کر فخریہ انداز میں اپنے بزنس کا ذکر کر سکتا اور..... یہی اس کا مسئلہ تھا۔

وہ چونکہ تعلیم یافتہ تھا اور اونچی سوسائٹی میں اس کا اٹھنا بیٹھنا بھی تھا اسی لیے وہ چاہتا تھا کہ اس کی الگ سے کوئی شناخت ہو اور ایسی شناخت ہو جس پر وہ سینہ پھلا سکے اور اترا سکے۔ اس نے دیکھا تھا کہ اخبار اور میگزین وغیرہ کے مالکان کے بڑے مزے ہوتے ہیں یہی سب دیکھ کر وہ اس فیلڈ میں کودا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی کہ ہمدردوں کے چناؤ میں اس نے عقلِ سلیم سے کام نہیں لیا تھا۔

کہتے ہیں کہ جو درخت جتنا پھل دار ہوتا ہے، اس کی شاخیں اتنی ہی جھکی ہوئی اور لچک دار ہوتی ہیں۔ اسی طرح جس انسان پر اللہ کی خاص عنایت ہو وہ بہت ہی سادہ، نرم خو اور لچکیلا ہو جاتا ہے۔ اسے الو بنانا یا دھوکا دینا نہایت ہی آسان ثابت ہوتا ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کا نقصان عارضی اور وقتی ہوتا ہے۔ قدرت اس کے نقصان کو فوراً پورا کر دیتی ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہی نواز دیتی ہے۔ سلمان فاروقی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض موقع پرست اور عیار لوگ اس کے سامنے مختلف قسم کے آئیڈیاز پیش کر کے اسے چونا لگانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ یہ اخبار والا منصوبہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

بہرحال، ہفت روزہ..... روزنامہ میں بدل گیا۔

کچھ عرصے کے بعد وہ ''اے بی سی'' بھی ہوگیا۔

اخبار روز چھپتا اور پورے شہر میں پھیل جاتا لیکن ناظر خواہ فروخت نہیں ہوتا تھا۔ اشتہارات بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ چند ماہ مسلسل نقصان اٹھانے کے بعد اس نے اپنے ہمدردوں کو جمع کیا اور اس عظیم ناکامی کی وجوہات دریافت کیں۔ اس کی سماعت تک اس قسم کے جملے پہنچے۔

''سر! ہم تو ابھی اس میدان میں بالکل بچے ہیں۔ آپ خود دیکھ لیں، کتنے بڑے بڑے مگرمچھ پہلے سے یہاں موجود ہیں۔''

مگرمچھ سے اس شخص کی مراد وہ اخبارات تھے جو سال ہا سال سے میدانِ صحافت میں اپنے قدم جمائے کھڑے تھے۔ ایک جانب سے کچھ اس انداز میں تسلی دی گئی۔

''سر! ہم سخت محنت کر رہے ہیں۔ ہماری محنت ایک دن ضرور رنگ لائے گی۔''

''سر! روزنامہ..... کو اس مقام تک پہنچنے میں تیس پینتیس سال لگے ہیں۔'' ایک جگادری قسم کے ہمدرد نے ایک سرکردہ معروف اخبار کا نام لیتے ہوئے دعویٰ کیا۔ ''ہمیں تو ابھی چند ماہ ہی ہوئے ہیں لیکن آپ دیکھیں گے سر..... ہم دو سے تین سال میں اس اخبار کو بہت پیچھے چھوڑ دیں گے۔ ہمارا اخبار شہر کا نمبر ون اخبار ہوگا۔''

یہ دعوے، تسلیاں، دلاسے اور خوش امیدیاں بہ ظاہر دل خوش کن تھے لیکن ان سے سلمان فاروقی کے دل کو اطمینان حاصل نہیں ہو رہا تھا کیونکہ اسے روزانہ ہزاروں کا نقصان برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔

اسی دوران میں اس کا اٹھنا بیٹھنا معقول اور قابل صحافیوں میں ہوا جن کے ساتھ وہ پریس کلب بھی جانے لگا۔ اس کی آنکھیں کھلنے لگیں اور اسے واضح طور پر یہ محسوس ہونے لگا کہ اس کے نقصان کے ذمے دار سراسر وہی لوگ تھے جو اپنے بلند بانگ دعوؤں سے اسے جھوٹی تسلیاں دیتے رہتے تھے۔ اخبار کی ناکامی انہی ہمدردوں کی نالائقیوں کے سبب تھی۔ اخبار میں ایسا کچھ پیش ہی نہیں کیا جاتا تھا کہ لوگ نیوز اسٹینڈ سے اخبار اٹھانے پر مجبور ہو جائیں۔ اس صورتِ حال میں اخبار کیا چلتا، جبکہ اس کے مقابلے میں پہلے سے جمے جمائے اخبارات موجود تھے۔

سلمان فاروقی کو اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا احساس ہوا تو ایک دوست کے مشورے سے اس نے ڈاکٹر واحد کے ساتھ مشروط پارٹنر شپ کر لی۔ ڈاکٹر واحد مارکیٹنگ کی دنیا کا چیتا تھا۔ وہ اپنے علاقے میں، دوستوں کے ساتھ مل کر پہلے بھی اخبار نکالنے کا ایک کامیاب تجربہ کر چکا تھا۔ اشتہار لانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ڈاکٹر واحد کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو صحرا میں کشتی اور سائبیریا میں بہ آسانی فریج فروخت کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر تو وہ بعد میں بنا تھا، اس سے پہلے وہ ایک اچھا سیلز مین اور سماجی کارکن تھا۔ اپنے علاقے میں ہونے والے فلاح و بہبود کے کاموں میں وہ پیش پیش رہتا تھا۔ لوگ اس کی عزت کرتے تھے، اس پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اعتماد کرتے تھے اور اس کی بات مانتے تھے اور یہی اس کی کامیابی کا راز تھا اور..... اس راز کے پیچھے اس کی ذات کے دو وصف کارفرما نظر آتے تھے۔ نمبر ایک، وہ انتھک محنت سے نہیں گھبراتا تھا۔ ڈاکٹر کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو نیند کے دوران میں بھی کسی نہ کسی مشن میں مصروف رہتے ہیں۔ نمبر دو، وہ اپنا کام نہایت ہی ایمان داری سے کرتا تھا۔

اسی ایمان داری اور انتھک محنت کے نتیجے میں وہ اپنے علاقے کے اخبار کو کامیاب بنا چکا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ ہی عرصے کے بعد دوستوں کی باہمی پھوٹ سے وہ اخبار بند ہوگیا۔ واحد ڈاکٹر بن گیا اور اپنا کلینک کرنے لگا۔ کئی سال گزر جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر وہ صحافت کے میدان میں کود پڑا تھا۔ سلمان فاروقی کے ساتھ اس کا دل مل گیا تھا۔

ڈاکٹر واحد، سلمان فاروقی اور اس کے اخبار کے ساتھ ماہِ رمضان سے چند روز پہلے ہی وابستہ ہوا تھا۔ ان کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ رمضان کا مہینا سلمان فاروقی، ڈاکٹر واحد والے دو صفحات مفت میں تیار کر کے اسے دے گا۔ اس دوران میں ڈاکٹر واحد اپنے علاقے میں اس اخبار کی مارکیٹنگ کرے گا اور اسی مقصد کے لیے اخبار مفت میں تقسیم ہوگا۔ عید کے بعد پارٹنر شپ بزنس کے اصول بالکل مختلف ہوں گے۔ یعنی پھر ڈاکٹر واحد کو ان دو صفحات کے نصف اخراجات اٹھانا ہوں گے، باقی نصف سلمان فاروقی برداشت کرے گا۔ منافع میں وہ برابر کے شریک ہوں گے۔ علاوہ ازیں اخبار میں شائع ہونے والے اشتہارات سے ہونے والی آمدنی میں بھی سلمان فاروقی کا آدھا حصہ ہوگا حالانکہ یہ سراسر ڈاکٹر کی محنت کا ثمر ہوتا۔ بہرحال، جب وہ دونوں ان شرائط اور قواعد پر مطمئن اور متفق تھے تو بھلا کسی اور کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

اس پارٹنر شپ بزنس کو شروع ہوئے ابھی دس بارہ دن ہی ہوئے تھے کہ یہ واقعہ پیش آگیا جس کے نتیجے میں ڈاکٹر واحد اس وقت میرے سامنے بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر واحد نے اپنے بھائی کی گرفتاری کو اخبار سے منسوب کر دیا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب!'' میں نے الجھن زدہ نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''مورس کے قتل اور عاقل کی گرفتاری کا اس اخبار سے کیا تعلق ہے، یہ میری سمجھ میں نہیں آیا؟''

''آپ نے ہمارا علاقہ تو دیکھا ہوا ہے بیگ صاحب!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اخبار کے دفتر کے قریب ہی ایک شراب خانہ کھلا ہوا ہے جس کا ماڈرن نام وائن شاپ ہے۔ چند روز پہلے ہم نے اس شراب خانے کی مذمت کرتے ہوئے ایک خبر لگائی تھی۔ اگلے روز شراب خانے والوں نے ہمارے رپورٹر کو ایک ہینڈسم آفر کر دی.....''

''مطلب..... رشوت کی آفر؟'' میں نے لقمہ دیا۔

''جی ہاں!'' ڈاکٹر واحد نے سر کو اثباتی جنبش دی اور بتانے لگا۔ ''انہوں نے کہا کہ ہم آپ کا مہینا باندھ دیتے ہیں۔ بس آپ اس قسم کی خبریں نہ لگایا کریں۔ رپورٹر نے آکر مجھے اس آفر کے بارے میں بتایا تو میرا دماغ گھوم گیا۔ میں رشوت لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں تو اس مشن کے ساتھ میدان میں اترا ہوں کہ جس کے خلاف خبر لگاؤں گا اس کا اشتہار نہیں چھاپوں گا۔ میں نے شراب خانے والے معاملے کے سلسلے میں اپنے ایک بزرگ دوست جمیل صاحب سے مشورہ کیا۔ جمیل صاحب پیشے کے اعتبار سے ایک انجینیئر ہیں، آدھی سے زیادہ دنیا دیکھ رکھی ہے انہوں نے۔ نہایت ہی تجربہ کار اور جہاں دیدہ انسان ہیں۔ میری تربیت میں جمیل صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔ میں انہیں اپنا بزرگ، استاد اور مرشد مانتا ہوں۔''

وہ سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔ ''پھر جمیل صاحب نے آپ کو کیا مشورہ دیا؟''

''انہوں نے مجھے سمجھایا کہ اس نوعیت کی وائن شاپس گورنمنٹ سے باقاعدہ لائسنس لے کر کھولی جاتی ہیں۔'' ڈاکٹر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''مسیحی برادری کے یہاں چونکہ پینے پلانے کی ممانعت نہیں لہٰذا ایسے پرمٹ اور لائسنس انہیں جاری کر دیے جاتے ہیں۔ اب اگر وہاں سے مسلمان بھی کسی طرح شراب خرید رہے ہیں تو اس میں وائن شاپ والوں کا زیادہ قصور نہیں ہے۔ آپ کوئی بھی اخباری مہم چلا کر نہ تو وائن شاپ بند کروا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں شراب فروخت کرنے سے منع کر سکتے ہیں۔ اس بات کا خیال تو خود مسلمانوں کو ہونا چاہیے کہ جب ان کا مذہب شراب نوشی کی اجازت نہیں دیتا تو وہ وائن شاپ کا رخ نہ کریں۔''

''بالکل بجا اور مناسب مشورہ دیا تھا جمیل صاحب نے!'' میں نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

''ان کا مشورہ تو میری سمجھ میں آگیا تھا.....'' ڈاکٹر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میرا دل مطمئن نہیں ہوا تھا۔''

''اس عدم اطمینان کا سبب؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں وائن شاپ کے حوالے سے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر میں اس شراب

خانے کو بند نہیں کروا سکتا تھا تو کم از کم انہیں اس بات کے لیے تو پابند کر سکتا تھا کہ وہ نوجوان نسل کو شراب نہ بیچیں..... جو تباہ ہو چکے، سو ہو چکے، ہماری ینگ جنریشن تو اس بیماری سے محفوظ رہے۔''

ڈاکٹر واحد کی ڈاکٹرانہ قابلیت اپنی جگہ مسلّم تھی۔ اس کی مارکیٹنگ کی صلاحیت میں بھی کوئی کلام نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ اپنی فطرت میں بہت ہی سادہ اور معصوم تھا۔ یہ وصف اس کی سچائی اور دیانت داری پر دلالت کرتا تھا۔ شراب اور شراب خانے کے حوالے سے اس نے اپنے عزم اور خواہش کا جس انداز میں اظہار کیا تھا وہ اس کے باطن کو سمجھنے کے لیے کافی تھا۔

میں نے ڈاکٹر سے یہ نہیں کہا کہ شراب، کباب اور شباب کے تمام تر معاملات کی کشش اور ضرورت زیادہ تر نوجوان اور جوان طبقے کو محسوس ہوتی ہے۔ اگر وائن شاپ والے ان لوگوں پر اپنی دکان کے دروازے بند کر دیں گے تو پھر وہاں بیٹھ کر کیا کریں گے۔ انہوں نے یہ دھندا فارغ بیٹھ کر مکھیاں مارنے کے لیے تو شروع نہیں کر رکھا۔ میں نے اپنے دلی جذبات پر قابو رکھتے ہوئے زیرِلب مسکرا کر اس سے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ کی اس خواہش پر جمیل صاحب نے کیا کہا تھا؟''

''وہ بھی بالکل آپ ہی کے انداز میں مسکرائے تھے.....'' اس نے شاکی نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور فرمایا تھا کہ اگرچہ اس سے کوئی فرق تو نہیں پڑنے والا، بہرحال میں کوشش کر کے دیکھ لوں۔''

''ہوں!'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''تو پھر اس سلسلے میں آپ نے کوشش کی تھی؟''

''جی ہاں..... کی تھی۔'' وہ بڑی قطعیت سے بولا۔ ''میں نے اپنے رپورٹر ہی کے ذریعے وائن شاپ کے مالک کو کہلوا دیا تھا کہ ہمیں رشوت وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ لوگ ینگ جنریشن کو کھلے عام یوں شراب فروخت کرنے سے باز رہیں یا کم از کم کسی مسلمان کو تو ایک بوند بھی نہ بیچیں تو میرا اخبار ان کے معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گا۔''

''آپ کے گراں قدر خیالات بڑے متاثر کن ہیں ڈاکٹر صاحب!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر پوچھا۔ ''وائن شاپ والوں کی طرف سے کیا جواب آیا تھا؟''

''انہوں نے یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ میری بات پر عمل کریں گے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''کیا آپ نے خود وائن شاپ کے مالک سے بات کی تھی؟''

''نہیں'' ڈاکٹر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ سارا معاملہ رپورٹر کے توسط ہی سے طے ہوا تھا۔''

''آپ کے اس رپورٹر کا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''عارف انصاری!''

''اور وائن شاپ کے مالک کا نام؟''

اس سوال و جواب کے دوران ہی میں، میں اہم پوائنٹس بھی نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر کی بیان کردہ کہانی دلچسپ ہونے کے ساتھ ہی سنسنی خیز بھی تھی۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''پیٹر.....؟''

''اور مورس.....؟''

''مورس کو وائن شاپ کا انچارج سمجھ لیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مقتول کاؤنٹر پر بیٹھتا تھا۔ کیش کے تمام تر معاملات اسی کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ دکان بند ہونے سے پہلے پیٹر وہاں کا ایک چکر لگاتا تھا۔ وہ لوگ حساب کتاب کرتے تھے۔ پیٹر کیش کو اپنے قبضے میں کر کے پہلے روانہ ہو جاتا۔ اس کے بعد مورس اور دیگر دونوں ملازم دکان بند کر کے اپنے اپنے گھروں کی جانب چلے جاتے تھے۔''

''ٹھیک ہے!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا وائن شاپ والوں نے عہد کی پابندی کی تھی؟''

''اگر وہ انسانوں کی طرح اپنے الفاظ کی پاسداری کرتے تو یہ فتنہ کبھی کھڑا نہ ہوتا۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

''مطلب یہ کہ انہوں نے ینگ جنریشن کو شراب کی فروخت جاری رکھی؟''

''جی ہاں..... اور وہ بھی بڑے دھڑلے سے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''مجھے تو اس معاملے کی خبر اس وقت ہوئی جب مورس اور عاقل کے بیچ شدید نوعیت کا جھگڑا ہوا۔ مجھے اخبار کے معاملات کے ساتھ ہی کلینک کو بھی دیکھنا ہوتا ہے لہٰذا توجہ دو جانب بٹ کر رہ گئی ہے البتہ، یہ معاملہ عاقل کے علم میں فوراً ہی آگیا تھا۔ رمضان کی وجہ سے وہ ایڈورٹائزنگ کمپنی سے جلدی آجاتا ہے اور آکر اخبار کا دفتر سنبھال لیتا ہے.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''عاقل کو جیسے ہی پتا چلا کہ وائن شاپ والے معاہدے کی خلاف ورزی کررہے ہیں تو اس نے مجھے بتائے بغیر چار کالم کی ایک سنسنی خیز خبر بنا کر چھاپ دی جو سراسر وائن شاپ کے خلاف تھی۔ اخبار کا چھپ کر مارکیٹ میں آنا تھا کہ مورس آگ بگولا ہوکر اخبار کے آفس پر چڑھ دوڑا۔ آفس میں عاقل کے سوا اس وقت اور کوئی بھی نہیں تھا لہٰذا مورس نے عاقل کو رُدوکوب کیا۔ اسی تنازع میں عاقل کی شرٹ بھی پھٹ گئی اور اس نے مورس کو خطرناک نتائج وغیرہ کی دھمکیاں بھی دیں۔ اسی شعلہ بیانی کی وجہ سے وہ اس وقت پولیس کی گرفت میں ہے۔ پھڈا تو چند روز پہلے سہ پہر میں ہوا تھا، کل رات میں مورس کا قتل ہوجاتا ہے اور آج سحری کے وقت پولیس نے عاقل کو مورس کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق کل وہ عاقل کو عدالت میں پیش کریں گے۔''

''یہ سب تو اپنی جگہ.....'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''لیکن یہ بات ذہن میں نہیں بیٹھ رہی کہ مورس نے کس بات پر پھڈا کیا تھا۔ معاہدے کی خلاف ورزی تو وائن شاپ والوں کی طرف سے ہوئی تھی نا؟''

''عاقل بھی یہی سمجھ رہا تھا اور میں بھی.....!'' وہ پرخیال انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''تو کیا حقیقت کچھ اور تھی؟''

''حقیقت ابھی کھل کر پوری طرح سامنے نہیں آئی۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''مورس اور عارف انصاری کے بیانات میں بہت بڑا تضاد ہے۔''

''کیسا تضاد؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میں نے عارف انصاری کو جو کچھ کہہ کر بھیجا تھا، بہ قول اس کے، اس نے میرا پیغام من وعن شراب خانے والوں تک پہنچا دیا تھا اور انہوں نے میری خواہش کو پورا کرنے کے لیے یقین دہانی کرائی تھی۔'' ڈاکٹر واحد نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا ''لیکن مورس نے جب عاقل کے ساتھ مار پیٹ کی تو اس کا موقف کچھ اور تھا.....''

''کیا مطلب.....'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''مورس نے اس موقعے پر کیا موقف اختیار کیا تھا؟''

وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بتانے لگا۔ ''بیگ صاحب! میں تو موقعے پر موجود نہیں تھا لیکن مجھے جو کچھ بتایا گیا ہے اس کے مطابق مورس دوبارہ ان کے خلاف خبر چھاپنے پر بے حد برہم تھا۔ جب عاقل نے اسے یاد دلایا کہ معاہدے کی خلاف ورزی ان کی طرف سے ہوئی ہے تو کی برہمی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا اور وہ چیخ چیخ کر بتانے لگا ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا بلکہ ہمارے رپورٹر نے ان ساتھ مک مکا کرلیا تھا۔ شراب خانے والوں نے رپور ماہانہ باندھ دیا تھا جس کی پہلی قسط ایڈوانس میں ادا کردی تھی۔ اسی لیے وہ دوبارہ خبر چھپنے پر غصے میں آگیا تھا اور نے اخبار کے دفتر آکر ہنگامہ آرائی کی۔ عاقل سے مار پی کے علاوہ مورس بہ آواز بلند یہ بھی کہہ رہا تھا کہ ہم بلیک میل ہیں۔ بھتا بھی وصول کرتے ہیں اور لوگوں کے خلاف خبریں بھی لگاتے ہیں۔''

''آپ نے اپنے رپورٹر سے اس سلسلے میں باز پُرس نہیں کی؟'' ڈاکٹر واحد کے خاموش ہوجانے پر میں نے پوچھا۔ ''آپ نے اسے تو کوئی اور ہدایت کی تھی.....''

''میں نے عارف انصاری کو تنہائی میں بلا کر پوچھ گچھ کی ہے۔'' اس نے بتایا ''لیکن وہ کسی بھی قسم کی کوئی رقم لینے سے انکاری ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے وائن شاپ والوں سے اسی انداز میں معاملہ طے کیا تھا جیسی میں نے اسے تاکید کی تھی۔''

''آپ اپنے رپورٹر اور اس کے بیان پر کس حد تک یقین کرسکتے ہیں؟'' میں نے گمبھیر انداز میں استفسار کیا ''یہ بھی تو ممکن ہے، اس نے آپ کے علم میں لائے بغیر وہاں معاملات طے کرلیے ہوں۔ کیا آپ اپنے رپورٹر پر اندھا اعتماد کرتے ہیں؟''

''ایسی بات نہیں ہے بیگ صاحب'' وہ سرسری انداز میں بولا۔ ''ابھی یہ کام شروع کیے مجھے ایک ماہ بھی نہیں ہوا۔ رپورٹرز، فوٹوگرافرز، ڈیسک انچارج وغیرہ سب نئے لوگ ہیں۔ یہ میرے آزمائے ہوئے نہیں ہیں۔ میں اپنے سیٹ اپ میں صرف عاقل پر بھروسا کرسکتا ہوں۔ ویسے عارف انصاری نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ اس نے وائن شاپ والوں سے ایک پیسا بھی وصول نہیں کیا۔ حقیقت کیا ہے، یہ تو اللہ ہی جانتا ہے.....!''

''حقیقت یہ ہے ڈاکٹر ڈاحب..... کہ آپ بہت ہی شریف النفس ہیں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے بیان کی روشنی میں، مقتول مورس نے جس انداز میں آپ کے آفس میں آکر ہنگامہ آرائی کی تھی اس سے تو ذہن میں یہی آتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ میں آپ کے رپورٹر عارف انصاری کی ذات کو بڑی الشک نہیں سمجھتا۔''

''بیگ صاحب! دال میں کچھ کالا ہے یا پوری کی پوری ال ہی کالی ہے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ ٹھہرے ئے لہجے میں بولا۔ ''جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ میرا بھائی بے گناہ ہے۔ مورس کے قتل سے عاقل کا کوئی تعلق نہیں۔ آپ اس کی بریت کے بارے میں ہیں۔''

''بالکل درست فرمایا آپ نے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''سب سے اہم پوائنٹ یہی ہے کہ اس جھنجٹ سے عاقل کو کیسے نکالا جائے۔''

''ملا کی دوڑ مسجد تک ہوتی ہے اور میری دوڑ آپ تک ہے۔'' وہ بڑی سادگی سے بولا۔ ''میں اپنا مسئلہ لے کر آپ کے پاس آگیا ہوں اور تمام تر حالات سے آپ کو آگاہ بھی کر دیا ہے۔ آگے کیا کرنا ہے، یہ اب آپ کو سوچنا اور کرنا ہے۔''

''بالکل!'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''سوچنا اور کرنا تو مجھے ہی ہے لیکن بعض معاملات میں حقائق تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اور سچائی کے چہرے سے پردہ ہٹانے میں آپ کو مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔''

''میں ہر قسم کی مدد اور تعاون کے لیے تیار ہوں بیگ صاحب!''

''بس تو پھر ٹھیک ہے!'' میں نے پراعتماد لہجے میں کہا اور پوچھا۔ ''عاقل اس وقت کون سے تھانے میں بند ہے؟''

اس نے متعلقہ پولیس اسٹیشن کا نام بتا دیا۔

میں نے کہا۔ ''میں آج کسی وقت فرصت نکال کر تھانے میں عاقل سے ملاقات کرلوں گا۔ آپ کل کورٹ آجائیں۔ ہماری ملاقات وہیں پر ہوگی۔''

وہ میرا شکریہ ادا کرکے رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

آیندہ روز پولیس نے ملزم عاقل کو عدالت میں پیش کرکے اس کا سات دن کا ریمانڈ حاصل کرلیا۔ یہ ایک معمول کی کارروائی تھی۔ اب پولیس نے ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد چالان کے ساتھ ملزم کو عدالت میں پیش کرنا تھا۔

ریمانڈ کے دوران میں پولیس ملزم سے بھی کڑی پوچھ گچھ کرتی ہے اور اس کیس کو تندرست وتوانا بنانے کے لیے مزید شواہد اور ثبوت بھی جمع کرنے میں لگی رہتی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایسا مواد اکٹھا کرلینا چاہتی ہے جسے استعمال کرکے ملزم کو مجرم ثابت کیا جاسکے۔ اس مقصد کے لیے جائے وقوعہ کی کیفیت، موقعے پر موجود گواہوں کے بیانات، واقعاتی شہادتیں، پوسٹ مارٹم رپورٹ اور اس سے بڑھ کر ملزم اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مقتول کے باہمی تعلقات کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ پولیس کی حتی الامکان سعی تو یہی ہوتی ہے کہ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں ملزم اقبالِ جرم کرلے تاکہ ان کا کام آسان ہوجائے۔ بعض شاطر ملزم پولیس کی مہمان داری سے محفوظ رہنے کے لیے جرم کا اقرار کر بھی لیتے ہیں تاہم پولیس کی کسٹڈی میں کیے گئے اقبالِ جرم کی عدالت کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ سچ اور جھوٹ کو جانچنے کا عدالت کا اپنا ایک معیار اور طریقۂ کار ہے۔ وہ اسی کی پیروی کرتی ہے۔ ملزم کے حلفیہ بیان سے لے کر استغاثہ کے گواہان کے بیانات اور دونوں وکلا کی جرح کے نتیجے میں جو حقائق نکل کر سامنے آتے ہیں، عدالت انہی کی روشنی میں کوئی فیصلہ صادر کرتی ہے۔

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کردیا۔ اس موقعے پر میں نے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم کی درخواست ضمانت بھی دائر کردی تھی۔ میری جانب سے ضمانت کے حق میں اور وکیل استغاثہ کی طرف سے اس کے خلاف بحث ومباحثہ ہوا۔ فوج داری مقدمات میں ملزم کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی اور قتل کے کیس میں تو یہ ناممکن ہی سمجھیں، سو عدالت نے میرے موکل کو جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو ڈاکٹر واحد نے مجھ سے کہا۔ ''کیا خیال ہے بیگ صاحب..... اگر عاقل کی ضمانت کے کاغذات منظور ہوجاتے تو ہماری اس کیس پر گرفت زیادہ مضبوط نہ ہوجاتی۔''

ڈاکٹر کے ان الفاظ کے پیچھے چھپے معانی کو میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ ہر ملزم کے ورثا کی یہی کوشش اور خواہش ہوتی ہے کہ پہلی ہی پیشی پر ان کے بندے کی ضمانت ہوجائے۔ ڈاکٹر واحد کی بھی یقیناً یہی تمنا تھی اور وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھے باور کرانا چاہتا تھا کہ اس پیشی پر مجھے اپنے موکل کی ضمانت کروالینا چاہیے تھی۔

میں نے ڈاکٹر کو قتل کے ملزم کی ضمانت اور اس کی راہ میں حائل مشکلات سے مختصراً آگاہ کیا اور اس کے استفسار کے جواب میں بتایا۔

''کیس پر میں نے جو گرفت قائم کی ہے وہ عاقل کی ضمانت سے مشروط نہیں۔ میرا موکل جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں کچھ عرصہ گزارے یا ضمانت پر رہا ہوکر گھریلو آرام اور کھانوں کا لطف اٹھائے اس سے کیس کی صحت اور طبیعت پر کوئی اثر نہیں پڑتا البتہ.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''البتہ..... ضمانت پر رہا ہوجانے سے ملزم اور اس کے گھر والوں کو جو نفسیاتی اور روحانی سکون ملتا ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔ بہرحال، میں نے اس ضمانت کے حوالے سے درپیش مشکلات سے آپ کو تفصیلاً آگاہ کردیا ہے۔''

''مجھے آپ کی بات پر بھروسا ہے بیگ صاحب!'' وہ جلدی سے بولا پھر پرسوچ انداز میں پوچھنے لگا۔ ''آپ نے عاقل کی جیل کسٹڈی کے حوالے سے کچھ عرصہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ آپ کو یقین ہے نا کہ عاقل کا جیل میں قیام بہت کم عرصے کے لیے ہے.....؟''

''کیوں نہیں ڈاکٹر صاحب! مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''اس کیس کی باقاعدہ سماعت شروع ہونے دیں، پھر دیکھیے گا، کیا تماشا ہوتا ہے لیکن.....!''

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا تو اس نے جلدی سے پوچھا۔ ''لیکن کیا؟''

''لیکن..... یہ کہ میں نے آپ کے ذمے جو کام لگائے ہیں وہ آپ کو جلد از جلد نمٹانا ہوں گے۔'' میں نے یاد دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ ''آپ اپنے علاقے کی ایک معروف سماجی شخصیت ہیں۔ میری مطلوبہ معلومات حاصل کرنے میں آپ کو زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔''

''آپ بالکل بے فکر ہوجائیں بیگ صاحب!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں چند روز میں آپ کا بتایا ہوا کام کردوں گا۔''

میں نے ڈاکٹر واحد کے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ وہ مجھے مقتول مورس کے پس منظر سے تفصیلاً آگاہ کرے۔ یہ بات تو طے تھی کہ عاقل کا اس قتل میں کوئی کردار نہیں تھا۔ اگر مجھے عاقل کے ملوث ہونے کی ذرا سی بھی بھنک مل جاتی تو میں یہ کیس کبھی اپنے ہاتھ میں نہ لیتا۔ ڈاکٹر واحد لاکھ میرا دوست سہی مگر میں نے اپنے پیشے کے حوالے سے چند ٹھوس اصول وضع کررکھے ہیں جن کی میں ہر حال میں پابندی کرتا ہوں۔ انہی اصولوں میں ایک یہ بھی ہے کہ کسی مجرم کا کیس نہیں پکڑنا حالانکہ اس نوعیت کے کیسوں میں بے حساب آمدنی ہے اور جھنجٹ بھی نہ ہونے کے برابر۔ میرے ایک ہم پیشہ دوست تھے، وہ اسی نوعیت کے کیس لیتے تھے اور وہ بھی سال میں صرف ایک۔ اس ایک کیس ہی سے اتنی آمدنی ہوجاتی تھی کہ پورے سال کے اخراجات بہ آسانی نکل آتے تھے۔ وہ دوست صاحب سال میں دو تین بیرونِ ملک کے تفریحی

دورے بھی کرتے تھے۔ میں یہاں پر ان کا نام ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا کیونکہ چند سال پہلے موصوف کا انتقال ہوچکا ہے۔ ان کی موت بڑی اذیت اور کسمپرسی میں واقع ہوئی تھی۔ برین کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہوکر وہ دو سال تک زیرِ علاج رہے۔ اس دوران میں پہلے جمع پونجی ختم ہوئی، پھر شاندار بنگلا فروخت ہوا اور ان کی فیملی ایک چھوٹے سے فلیٹ میں منتقل ہوگئی۔ اس کے بعد زیورات اور دیگر قیمتی سامان کی باری آئی۔ جب کچھ بھی پلے نہ رہا تو قرض، ادھار کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو جلد ہی ختم ہوگیا کیونکہ کینسر موت ہی کا دوسرا نام ہے۔

میں نے ابھی اپنے جس ہم پیشہ دوست کا ذکر کیا ہے وہ اکثر مجھ سے مذاق میں کہا کرتے تھے۔ ''بیگ صاحب! آپ نے تو پرچون کی دکان کھول رکھی ہے۔ سال میں چالیس پچاس کیس پکڑتے ہیں تو پھر کہیں جاکر گزارہ ہوتا ہے۔ یہ بھی بھلا کوئی زندگی ہے۔ مجھے دیکھیں، میں ایک سال میں صرف ایک کیس لیتا ہوں اور بڑے سکون اور عیش سے زندگی بسر کررہا ہوں۔ سلیکٹڈ کام کریں بیگ صاحب..... سلیکٹڈ!''

''اگر ہر شخص تھوک کا دھندا شروع کردے گا تو پھر پرچون کے خریداروں کا کیا ہوگا؟'' میں جواب میں کہتا۔ ''قانون کی صرف امرا ہی کو نہیں بلکہ غربا کو بھی ضرورت ہوتی ہے اور میرے خیال میں اس طبقے کو قانون اور انصاف کی کچھ زیادہ ہی ضرورت ہوتی ہے۔''

''آپ کی مرضی ہے بیگ صاحب!'' وہ کندھے اچکا کر بے پروائی سے کہتے ''غریبوں کا ساتھ دینے والا ہمیشہ غریب ہی رہتا ہے اور اسے بے تحاشا کام بھی کرنا پڑتا ہے جبکہ اونچی سوسائٹی کی صحبت سے انسان کا اسٹیٹس بلند ہوجاتا ہے اسی لیے میں سیاست دانوں، بیوروکریٹس اور اسی سطح کے لوگوں کے کیسوں میں ہاتھ ڈالتا ہوں جو مجھے مالا مال کر دیتے ہیں۔''

''آپ انسان کی امیری اور غریبی کو دولت کے اسکیل سے ناپتے ہیں۔'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس بات پر فخر ہے کہ آپ کی نظر میں، میں اور میرے کلائنٹس معاشرے کے نچلے یا درمیانے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔''

''کیا مطلب.....!'' انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''اس میں باعثِ فخر کون سا پہلو ہے؟''

''ایک بہت ہی مضبوط پہلو ہے جناب.....!''

''مثلاً!.....؟''

''مثلاً یہ کہ..... میں جس نبی ﷺ کا ماننے والا ہوں آپ کے اسکیل پر وہ خود بھی غریب تھے اور غریب پرور بھی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ وصف میرے لیے باعثِ افتخار نہیں ہے کہ میں اپنے آقا کی کسی سنت پر ایک حد تک عمل پیرا تو ہوں.....''

''آپ تو بات کو بہت دور لے گئے ہیں بیگ صاحب!'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''جناب! بات نکلی ہے تو دور تک جائے گی ہی..... وہ آپ نے سنا نہیں..... منہ سے نکلی، پرائی بات۔''

ایسے ہی کسی موڑ پر ہماری گفتگو کا دھارا کسی اور جانب مڑ جاتا تھا۔

اس ہم پیشہ کا ذکر کرنا خالی از مقصد نہیں ہے۔ ان کی زندگی درسِ عبرت ہے۔ ان کا انجام انسان کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ انہوں نے زندگی بھر مال حرام سے خود بھی عیاشی کی اور اپنے بیوی بچوں کو بھی مزے کرائے پھر ایک روز کینسر کے مرض نے ان کے اندر سب عیش وآرام اور شان وشوکت کو تہس نہس کرڈالا۔

کسی دانشور کا قول ہے..... اچھے وقت میں اپنے برے وقت کو ضرور یاد رکھنا چاہیے۔ ان لوگوں نے اچھے وقت میں نہ صرف برے وقت کو بھلا دیا تھا بلکہ اپنے غریب رشتے داروں سے بھی قطع تعلق کرلیا تھا لہٰذا وہ ہوا جو ہونا تھا..... رہے نام اللہ کا!

میں نے ڈاکٹر واحد کو مطمئن کرنے کے بعد رخصت کر دیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا ذکر ہوجائے۔ اس رپورٹ کے مطابق مقتول مورس کی موت دس اکتوبر کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب وہ دو گولیاں تھیں جو ایک بے آواز گن سے اس کی کھوپڑی پر برسائی گئی تھیں یعنی گن کی آواز کو سلب کرنے کے لیے اس کے دہانے پر سائیلنسر فٹ کیا گیا تھا اور یہ دونوں گولیاں اعشاریہ تین آٹھ کیلی بر کی گن سے فائر کی گئی تھیں۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مذکورہ دونوں گولیاں مقتول کے عقب سے چلائی گئی تھیں جن میں سے ایک اس کی کھوپڑی کے پچھلے حصے سے داخل ہوکر اسے پھاڑتے ہوئے نکل گئی تھی جبکہ دوسری گولی اس کی گدی میں پیوست ہوگئی تھی۔ اس فائرنگ کے سبب مقتول کی فوری موت واقع ہوگئی تھی۔

حاصل شدہ ابتدائی معلومات کے مطابق مقتول کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈیوٹی پورے بارہ گھنٹے کی تھی۔ وہ دن گیارہ بجے وائن شاپ پر پہنچتا تھا اور رات گیارہ بجے تک وہ وہاں موجود رہتا تھا۔ اس دوران میں سہ پہر تین اور چار بجے کے درمیان وہ ریسٹ کرتا تھا۔ اس کے آرام کے درمیانی وقفے میں نیلسن اور رکی شاپ کو سنبھالا کرتے تھے۔ یہ دونوں لڑکے وائن شاپ کے ملازم تھے اور مورس کے انڈر کام کرتے تھے۔

مقتول کی رہائش وائن شاپ سے لگ بھگ پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی اور وہ آمدورفت کے لیے موٹر سائیکل استعمال کرتا تھا۔ جب اسے فائرنگ کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تو اس وقت وہ بائیک پر سوار اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے گھر اور وائن شاپ کے درمیان آدھے کلومیٹر کا ایسا علاقہ تھا جہاں آس پاس آبادی کے آثار نہیں تھے اور زیادہ تر وہاں رات میں اندھیرا ہی رہتا تھا۔ اس سڑک سے بسیں اور منی بسیں (ویگن وغیرہ) بھی گزرا کرتی تھیں تاہم اتنے سے ٹکڑے میں اسٹریٹ لائٹس کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ مقتول مورس کو اسی تاریک ٹکڑے میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ جائے وقوعہ کے قریب ہی اس کی بائیک بھی الٹی پڑی تھی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے فائرنگ کی جو تفصیل بیان کی تھی اس سے ایک بات تو بالکل واضح ہو جاتی تھی کہ قاتل اس کا تعاقب کرتے ہوئے جائے واردات تک پہنچا تھا اور اس شقی القلب شخص نے عقب سے اس کی کھوپڑی کا نشانہ لے کر دو گولیاں فائر کی تھیں۔ اغلب امکان اس امر کا تھا کہ قاتل بھی موٹر سائیکل پر سوار ہوگا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کار یا کسی اور ایسی ہی چھوٹی گاڑی میں ہو اور مقتول کی کھوپڑی کو عقب سے نشانہ بنانے کے بعد وہ آگے بڑھ گیا ہو۔

آئندہ چند روز میں ڈاکٹر واحد نے مجھے وہ تمام معلومات فراہم کر دیں جو میں نے اس کے ذمے لگائی تھیں۔ ان میں بعض بڑے سنسنی خیز اور انکشاف انگیز نکات تھے۔

☆☆☆

عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔

جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم نے صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ یہ کم و بیش وہی بیان تھا جو وہ اس سے پہلے اپنی گرفتاری پر پولیس کو دے چکا تھا۔ بس، چند نکات اضافی شامل تھے جو اس نے میری ہدایت کی روشنی میں شامل کیے تھے۔

استغاثہ کی جانب سے لگ بھگ آٹھ گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر صرف انہی کا ذکر کروں گا جن کے بیانات میں کوئی خاص اور چونکا دینے والی بات ہوگی۔ اس سے پہلے کہ استغاثہ کی طرف سے گواہوں کی پیشی کا سلسلہ شروع ہوتا، میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں جج سے درخواست کی۔

''جنابِ عالی!'' اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

جج نے فوراً میری فرمائش پوری کر دی۔ انکوائری آفیسر یعنی تفتیشی افسر ہر پیشی پر عدالت کے کمرے میں موجود ہوتا ہے اور اس کی حیثیت بھی استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہی ہوتی ہے۔ جج کے اشارے پر آئی۔ او وٹنس باکس (گواہوں والے کٹہرے) میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے دوسرے پہلو میں میرا مؤکل ملزموں والے کٹہرے (اکیوزڈ باکس) میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ میں آئی۔او کے قریب پہنچا اور اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''آئی۔او صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کس نے اور کب دی تھی؟''

''اطلاع فراہم کرنے والے شخص کا نام ہے، محمد اسحاق۔'' اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''اسحاق پیشے کے اعتبار سے ایک ڈرائیور ہے۔ وہ ایک مزدا (منی بس) چلاتا ہے جو اس سڑک سے بھی گزرتی ہے جہاں وقوعہ پیش آیا تھا۔''

''آپ نے میرے سوال کے پہلے حصے کا جواب تو دے دیا۔'' میں نے تفتیشی افسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میرے سوال کا آخری حصہ ابھی تک تشنہ ہے.....؟''

''جی.....!'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں گردن کو اثباتی جنبش دی اور جلدی سے بولا۔ ''اس واقعے کی اطلاع ہمارے روزنامچے کے مطابق کوئی ساڑھے گیارہ بجے رات کو دی گئی تھی۔''

''یعنی دس اکتوبر کی رات ساڑھے گیارہ بجے؟''

''جی ہاں..... بالکل۔''

''اسحاق ڈرائیور نے کیا اطلاع دی تھی؟''

''اس نے فون پر ہمیں بتایا تھا کہ اس سڑک پر ایک موٹر سائیکل سوار کی لاش پڑی ہوئی ہے اور موٹر سائیکل بھی لاش سے تھوڑے فاصلے پر الٹی پڑی ہے۔'' آئی۔او نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ''مزدا ڈرائیور نے خاصے فاصلے سے سڑک پر گڑبڑ ہوتے دیکھ لی تھی لیکن وہ اتنی

دور سے سمجھ نہیں پایا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ شاید ایک موٹر سائیکل نے دوسری موٹر سائیکل کو ٹکر مار دی ہے اور متاثرہ موٹر سائیکل کو وہیں چھوڑ کر ٹکر مارنے والی موٹر سائیکل موقعے سے فرار ہو گئی ہے لیکن جب اس کی مزدا جائے وقوعہ پر پہنچی تو صورتِ حال اس پر واضح ہوئی۔ اس کی دیکھا دیکھی مزدا کے اکثر مسافر بھی نیچے اتر آئے تھے۔ جلد ہی انہیں پتا چل گیا کہ وہ قتل کی ایک سنگین واردات تھی لہٰذا اسحاق نے ایک پبلک کال آفس سے فون کر کے تھانے میں اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔ ''آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''جائے واردات ہمارے تھانے سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔'' اس نے بتایا ''میں دو کانسٹیبلو کے ہمراہ رات بارہ بجے سے پہلے وہاں پہنچ گیا تھا۔''

''کیا آپ کی آمد تک مزدا ڈرائیور وقوعہ پر موجود تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں..... ہم نے اسے فون پر ہی پابند کر دیا تھا کہ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے وہ کہیں نہ جائے۔'' آئی۔او نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''لہٰذا جب ہم وقوعہ پر پہنچے تو وہ اللہ کا بندہ اپنی مزدا سمیت وہاں موجود تھا..... اور ویگن کے پسنجرز بھی۔''

''آپ نے ویگن ڈرائیور محمد اسحاق کا بیان بھی لیا ہوگا؟''

''جی ہاں۔ اس کا بیان استغاثہ کے ریکارڈ میں موجود ہے۔'' انکوائری آفیسر نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''اور منی بس کا ڈرائیور اسحاق استغاثہ کا گواہ بھی ہے۔''

''ویری گڈ.....!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''پھر تو وہ جب اپنی باری پر گواہی دینے آئے گا تو اس سے بات ہو جائے گی۔ آپ یہ بتائیں کہ.....'' میں نے اثباتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''کہ..... مقتول کے ورثا تک کیسے پہنچے تھے۔ جس جگہ قتل کی یہ واردات پیش آئی تھی وہاں آبادی وغیرہ نہیں ہے اور سڑک کا وہ حصہ تاریکی میں بھی ڈوبا رہتا ہے؟''

''مقتول کی جامہ تلاشی نے اس سلسلے میں ہماری بہت زیادہ مدد کی تھی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کی جیب سے آئی ڈی کارڈ نکل آیا تھا۔ یہ دراصل سروس کارڈ تھا اس سے پتا چلا کہ وہ کسی وائن شاپ کا انچارج تھا۔ ہم مذکورہ

عیدِ قرباں

اس موقعے پر قربانی کے بکروں کا ذکر بے محل نہ ہوگا، ہمیں ایک بکرے کی ادا بہت پسند آئی۔ یوں تو عیدالاضحیٰ کی رعایت سے بکروں اور بکرے خریدنے والوں کے بہت سے لطیفے مشہور ہیں۔ ان میں سے کئی ایک آپ کو بھی معلوم ہوں گے۔ چند ایک ایسے ہوں گے جو شاید آپ نے نہ سنے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو آپ کسی دوست سے سن لیجیے کیونکہ اس وقت ہم لطیفہ نہیں سنا رہے بلکہ واقعہ بیان کر رہے ہیں۔ یہ عید کے چار روز پہلے کی بات ہے۔ ہم ایک دو، دوستوں کے ساتھ بکرا خریدنے گئے۔ آپ جانتے ہوں گے کہ بکرا خریدنے والے سب سے پہلے بکرے کا منہ کھول کر یہ دیکھتے ہیں کہ دو دانت کا ہے یا نہیں۔ چنانچہ اسی غرض سے ہم ایک بکرے کی طرف بڑھے تو اس نے جلدی سے خود ہی اپنا منہ کھول دیا کہ دیکھ لو۔ ''دو دانت کا ہوں۔'' یقین جانیے اس بکرے کی یہ ادا ہمیں بہت پسند آئی۔ بے چارے کا نہ جانے کس کس نے اور کتنوں نے منہ کھول کر دیکھا تھا اور اب وہ اس عمل سے اس قدر تنگ آ چکا تھا کہ خریدار کو دیکھتے ہی جلدی سے منہ کھول دیتا تھا کہ ''دیکھ لو۔ خریدنا ہے تو خریدو، ورنہ بھاڑ میں جاؤ۔''

لوڈشیڈنگ

''اگر آپ بار بار بجلی جانے سے پریشان ہیں تو میں ایک مشورہ دیتا ہوں۔''

''وہ کیا؟ جلدی بتایئے؟''

ہم نے بے صبری سے دریافت کیا۔ اس پر انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''اول تو یہ کوشش کریں کہ کے ای ایس سی کے چیئرمین آپ کے علاقے میں رہائش پذیر ہو جائیں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس کے محکمے کے کسی انجینئر کو اپنے علاقے میں بسا لیں اور یہ بھی مشکل ہے تو پھر کے ای ایس سی میں تعلقاتِ عامہ کے انچارج کو کسی طرح گلشن اقبال میں رہنے پر مجبور کریں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی آپ کے علاقے میں آ گیا تو جان لیجیے لوڈشیڈنگ ادھر کا کبھی رخ نہیں کرے گی۔''

واقعی ان کی بات سو فیصد درست ہے مگر یہ جوئے شیر لائے کون؟ اگر آپ کے علاقے میں بھی لوڈشیڈنگ اور بار بار بجلی جانے کا مرض پھیلا ہوا ہے تو آپ یہ نسخہ آزما لیں۔ انشاء اللہ کامل شفا ہوگی۔

شفیع عقیل کی کتاب: سرخ سیاہ سفید سے اقتباس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وائن شاپ پر پہنچے تو وہ بند ہو چکی تھی۔ عید کی آمد آمد تھی لہٰذا دکانیں اور بازار کھلے ہوئے تھے۔ وائن شاپ کے گرد و نواح سے ہم نے پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کہ شراب خانے کا ایک ملازم ادھر قریب ہی رہتا ہے۔ ہم رکی نامی اس شخص کے گھر پہنچ گئے پھر کڑی سے کڑی ملتی گئی اور ہم مقتول کے لواحقین تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔''

''آپ نے یہ کیسے جان لیا کہ مقتول کی موت کا ذمے دار میرا مؤکل تھا۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا آپ نے جائے وقوعہ سے ایسی شہادتیں جمع کر لی تھیں جو ملزم کی وہاں موجودگی اور قتل کی اس واردات میں ملوث ہونے کو ثابت کرتی تھیں.....؟''

''جائے وقوعہ پر تو ایسا کچھ نہیں مل سکا تھا.....'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''لیکن وائن شاپ کے دونوں ملازمین رکی اور نیلسن کے بیانات ملزم کے مجرم ہونے کی جانب بڑے واضح اشارے کرتے ہیں۔ پھر مقتول اور ملزم کے بیچ چند روز پہلے ہونے والا جھگڑا بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''وقوعہ کی رات، وائن شاپ بند ہونے سے تھوڑی دیر پہلے ملزم کو وائن شاپ کے سامنے مشکوک انداز میں منڈلاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک شخص اور بھی تھا۔ وہ دونوں بائیک پر تھے اور وائن شاپ کے سامنے منڈلاتے ہوئے انہوں نے بڑے خطرناک انداز میں اندر بھی جھانکا تھا جیسے وہ یہ اندازہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہوں کہ مقتول کب شاپ بند کر کے گھر کی طرف روانہ ہوتا ہے اور کب وہ اس کے تعاقب میں روانہ ہوتے ہیں۔ مزدا ڈرائیور محمد اسحاق کا بیان ہے کہ اس نے دور سے دو موٹر سائیکلوں کو آگے پیچھے جاتے دیکھا تھا اور اگلی موٹر سائیکل پر ایک اور پیچھے والی موٹر سائیکل پر دو افراد سوار تھے.....''

''سبحان اللہ! ماشاءاللہ.....!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''آپ بڑے تجربہ کار تفتیشی افسر ہیں۔ آپ نے بڑی محنت اور جان ماری کے بعد میرے مؤکل کو ملزم کے فریم میں فٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال.....'' میں نے تھوڑا وقفہ دیا اور جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیمیکل ایگزامنر اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹس کے نتیجے میں یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ مقتول مورس کی موت اعشاریہ تین آٹھ کیلی برکی گولیوں سے واقع ہوئی تھی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں جناب..... آپ درست فرما رہے ہیں۔'' اس نے تائیدی انداز میں کہا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ نے آلۂ قتل تو یقیناً برآمد کر لیا ہوگا؟''

''نہیں جناب'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آلۂ قتل برآمد نہیں ہو سکا۔''

''کیوں؟'' میں نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ نے ریمانڈ کے نام پر ملزم کو اپنی کسٹڈی میں رکھا ہے۔ کیا اس دوران میں اس نے آپ کو آلۂ قتل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

اس نے بڑی شرافت سے نفی میں گردن ہلا دی۔

''عجیب بات ہے آئی۔ او صاحب!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ لوگ تفتیش کے نام پر ملزمان کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں اس کی تاثیر سے تو پتھر بھی بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر میرے مؤکل کی زبان کیوں نہ کھل سکی..... آپ آلۂ قتل تک رسائی حاصل کیوں نہیں کر سکے.....؟''

''سب سے پہلے تو میں تفتیش کے حوالے سے آپ کی غلط فہمی دور کر دوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ سب آپ لوگوں کا پروپیگنڈا ہے کہ ہم ریمانڈ کے نام پر ملزمان سے مار پیٹ اور زیادتی کرتے ہیں۔ انہیں مختلف انداز میں ذہنی اور جسمانی اذیت دے کر سچ اگلوانے کی کوشش کرتے ہیں اور.....''

''تو کیا ایسا نہیں ہے؟'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی تیز لہجے میں پوچھا۔

''ہرگز نہیں!'' اس نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔ ''اس پروپیگنڈا میں صرف اتنی سی بات درست ہے کہ ہم ملزم کی زبان سے سچ کا اعتراف کرانے کی کوشش کرتے ہیں.....''

''اور اس کوشش میں آپ ملزم سے نہایت ہی شائستہ اور مہذب انداز میں درخواست کرتے ہیں کہ بھائی صاحب ..... پلیز! آپ ہمیں بتا دیں کہ یہ جرم آپ نے کیا ہے نہیں؟ آپ اگر اس سوال کا سچا اور کھرا جواب دے دیں گے تو یہ پولیس ڈیپارٹمنٹ پر آپ کا عظیم احسان ہوگا۔'' میں نے بڑے تیکھے انداز میں کہا پھر پوچھا ''کیوں..... ہے یہی بات؟''

''وکیل صاحب! آپ نے انتہائی سنجیدہ معاملے کو مذاق کا جامہ پہنا دیا ہے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''جبکہ ہماری تفتیش کی حقیقت صرف اتنی سی ہے کہ ہم ریمانڈ

کی مدت کے دوران میں بھاگ دوڑ کر کے ملزم اور اس کے جرم کے خلاف زیادہ سے زیادہ واقعاتی شواہد اور ٹھوس ثبوت اکٹھے کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور یہ سب کوشش ملزم سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں کی جاتی ہے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اب ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم ملزم سے ''آپ جناب'' اور ''منت سماجت'' سے بات کرتے ہیں۔ ہم اس پر سختی کرتے ہیں، اس کی زبان کھلوانے کے لیے مختلف قسم کی دھمکیاں بھی دیتے ہیں۔ بعض نفسیاتی چالیں بھی چلتے ہیں لیکن ہماری کسی بھی کوشش کو تشدد کا نام نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی آپ اسے انسانیت سوز سلوک کہہ سکتے ہیں۔''

''او کے..... میں معزز عدالت کے وقت کو قیمتی اور مقدم جانتے ہوئے مصلحتاً آپ کے فلسفے سے اتفاق کر لیتا ہوں۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''اب جلدی سے یہ بتا دیں کہ آپ کی شریفانہ تفتیش کے نتیجے میں ملزم نے آلۂ قتل کے بارے میں کیا بتایا تھا؟''

''کک..... کچھ بھی نہیں.....'' وہ بے بسی سے بولا۔

''پھر آپ نے سائیلنسر لگی اعشاریہ تین آٹھ کیلی برکی گن کے بارے میں کیا تصور قائم کیا؟'' میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے سوال کیا۔ ''مقتول مورس کا قتل تو ایک ٹھوس حقیقت ہے نا اور اعشاریہ تین آٹھ کیلی برکی سائیلنسر لگی وہ گن بھی ایک سنگین سچائی!''

''اغلب امکان یہی ہے کہ واردات کے بعد ملزم نے وہ گن ندی میں پھینک دی ہوگی۔'' وہ قیاس آرائی کرتے ہوئے بولا۔

''ندی..... کون سی ندی؟'' میں نے دانستہ حیرت کی اداکاری کی۔

''جناب! شاید آپ کو معلوم نہیں کہ جہاں قتل کی یہ واردات پیش آئی تھی، وہ ایک پل ہے اور پل ..... ہمیشہ ندی، نالوں اور نہروں، دریاؤں پر ہی تعمیر کیے جاتے ہیں۔'' وہ بڑے حکیمانہ انداز میں بولا۔

''اس قیمتی معلومات کی فراہمی پر میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں آئی۔ او صاحب!'' میں نے چہرے پر مصنوعی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ نے مذکورہ ندی میں آلۂ قتل کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی؟''

''آدھی رات کو تو یہ کام ممکن نہیں تھا۔'' وہ متاملانہ انداز میں بولا۔ ''البتہ، اگلی صبح یہ کوشش کی گئی تھی.....''

''پھر اس کوشش کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟''

''کچھ بھی نہیں.....''

''کیا مطلب؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''مطلب یہ کہ آلۂ قتل بازیاب نہیں ہو سکا۔'' وہ ندامت آمیز لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''دراصل، اس سال جولائی اور اگست میں معمول سے زیادہ اور خطرناک نوعیت کی بارش ہوئی تھی جس کے سبب ندی بھی ان دنوں جولانی پر تھی جب وقوعہ پیش آیا لہٰذا قوی امکان اس بات کا ہے کہ آلۂ قتل ندی کے پانی کے اندر سفر کرتے ہوئے کہیں کا کہیں نکل گیا ہوگا۔''

''یہ آپ کا قیاس ہے یا آپ اس بیان کے سلسلے میں کوئی ٹھوس ثبوت بھی مہیا کر سکتے ہیں؟'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''ظاہر ہے کہ یہ ہمارا اندازہ ہی ہے۔ آپ اسے قیاس بھی کہہ سکتے ہیں۔'' وہ جھنجلاہٹ بھرے انداز میں بولا۔ ''میں نے انڈر واٹر گن کے آبی سفر کی وڈیو نہیں بنائی جو عدالت میں کوئی ٹھوس ثبوت پیش کر سکوں۔''

''آپ کا یہ فیصلہ بروقت اور دانش مندانہ تھا۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''کون سا فیصلہ؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

''یہی کہ.....'' میں نے لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے انڈر واٹر، گن کے زیرِآب سفر کو شوٹ کرنے کی کوشش نہیں کی ورنہ.....''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تڑپ کر بولا۔

''ورنہ کیا؟''

''ورنہ آپ اس وقت زندہ سلامت عدالت میں کھڑے نہ ہوتے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر الجھن کی لکیریں پھیل گئیں، متذبذب لہجے میں بولا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں، آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''میری معلومات کے مطابق.....'' میں نے ٹھوس انداز میں کہنا شروع کیا۔ ''آدھے کراچی شہر کی غلاظت مختلف سیوریج نالوں میں سے گزر کر اس ندی میں پہنچتی ہے۔ اگرچہ اس کے کنارے پر مختلف کچی بستیوں کی عورتیں بیٹھی کپڑے دھوتی نظر آتی ہیں اور ان کے ننگ دھڑنگ بچے غسل فرماتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں لیکن ساری ایکٹی ویٹیز پانی کی بالائی سطح پر ہوتی ہیں۔ انڈر واٹر وڈیو بنانے کے لیے اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ بھی کسی دھاتی شے کے بہتے ہوئے مناظر کی..... ایک طویل غوطہ خوری کی ضرورت پیش آتی ہے جس کا دورانیہ بیس منٹ سے لے کر دو گھنٹے تک کا ہوسکتا ہے اور اس سے کچھ زیادہ بھی..... لہٰذا آپ اپنی عقل کو استعمال کر کے سوچیں ذرا.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''جس پانی کے اندر کاربن، نائٹروجن، امونیا اور کلورین جیسی خطرناک گیسوں کے علاوہ نصف شہر کی گندگی بھی شامل ہو اس کے نیچے ایسا مہلک جاں مہماتی سفر آپ کی صحت بلکہ زندگی کا کیا حشر نشر کرسکتا تھا.....؟''

میری اس گہری اور کاری چوٹ پر وہ تلملا کر رہ گیا لیکن میں نے چونکہ کوئی انہونی نہیں کہی تھی لہٰذا وہ مجھے منہ توڑ تو کیا منہ جوڑ جواب بھی نہ دے سکا، بس معاندانہ نظر سے مجھے تکتا چلا گیا۔

میں نے جرح کے سلسلے میں کرنٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔ ''آئی۔او صاحب! آپ کے قیاس کے مطابق تو آلۂ قتل ندی کی منہ زور موجوں میں بہہ کر پتا نہیں، کدھر کا کدھر نکل گیا لیکن آپ نے دوسرے بندے کے بارے میں نہیں بتایا کہ وہ اب تک کہاں غائب ہے۔ کیا وہ بھی ندی کے بدبودار پانی میں گن کے ساتھ ہی.....!''

''دوسرا بندہ.....!'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''یہ آپ کس کا ذکر کر رہے ہیں؟''

''کمال ہے آئی۔او صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ دوسرے بندے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے.....؟''

''نن..... نہیں.....'' وہ ہکا بکا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔

''یُور آنر!'' جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ دوسرے بندے کی وضاحت کر دیں۔ یہ کیا ایشو ہے؟''

میرے لیے یہ بات باعثِ اطمینان تھی کہ جج پوری توجہ سے میری جرح کو سماعت کر رہا تھا۔ میں نے آئی۔او کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا روئے سخن جج کی جانب پھیرا اور نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! استغاثہ کی جانب سے جو چالان پیش کیا گیا ہے اس میں دیگر امور کے ساتھ ہی یہ بیان بھی شامل ہے کہ وقوعہ کی رات، وقوعہ سے لگ بھگ ایک گھنٹا پہلے ملزم کو مقتول والی وائن شاپ کے سامنے مشکوک انداز میں منڈلاتے اور شاپ کے اندر جھانکتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا اور یہ دونوں موٹر بائیک سوار تھے.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔

''آئی۔او کے مطابق استغاثہ کا وہ گواہ جس نے اس واقعے کی پولیس کو اطلاع دی تھی یعنی منی بس کے ڈرائیور محمد اسحاق نے بھی دو موٹر سائیکلوں کو دور سے دیکھا تھا جن میں سے آگے والی موٹر سائیکل پر ایک شخص اور عقبی موٹر سائیکل پر دو بندے سوار تھے۔ اس وقت محمد اسحاق یہی سمجھا تھا کہ پیچھے والی موٹر سائیکل، اگلی موٹر سائیکل کو ٹکر مارتے ہوئے آگے نکل گئی ہے لیکن جائے وقوعہ پر پہنچنے کے بعد اسحاق کو پتا چلا کہ یہ روڈ ایکسیڈنٹ نہیں بلکہ قتل کی ایک سنگین واردات تھی، جبھی اس نے ایک قریبی کال آفس پہنچ کر پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔ دوسرے بندے سے میری مراد وہ شخص ہے.....''

میں نے ڈرامائی انداز میں رک کر حاضرینِ عدالت کا طائرانہ جائزہ لیا پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی..... وہ بندہ جو استغاثہ کے مطابق ملزم کا ساتھی تھا اور بائیک پر اس کے ساتھ سوار تھا، اس پُراسرار شخص کا نام نہ تو استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل ہے اور نہ ہی چالان میں اس کا ذکر موجود ہے۔ کچھ پتا نہیں چل رہا کہ اس بندے کو آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی.....؟''

''وکیل صاحب! آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے؟'' جج نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔

''ہم نے اس بندے کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کی تھی.....'' وکیل استغاثہ نے غیر مستحکم لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن اتفاق سے وہ ٹریس نہیں ہوسکا۔''

''وہ بندہ اتفاق سے ٹریس نہیں ہوا اور آلۂ قتل اتفاق سے ندی میں بہہ گیا۔'' میں نے وکیل استغاثہ اور انکوائری آفیسر کی جانب باری باری دیکھتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''ہم تو بچپن سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ اتفاق میں بڑی برکت ہوتی ہے لیکن استغاثہ کا اتفاق تو اس کیس میں سے برکت اٹھا رہا ہے۔ آلۂ قتل غائب..... ملزم کا ایک اہم ساتھی غائب۔ اللہ خیر کرے! کہیں میرا مؤکل ہی غائب ہوجائے۔'' میں نے ایک مصنوعی جھرجھری لینے کے بعد کی جانب دیکھا اور بہ آواز بلند کہا۔

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی.....!''

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں سات آٹھ منٹ باقی تھے۔ اتنی قلیل مدت میں کسی اور گواہ کو شہادت کے لیے پیش نہیں کیا جاسکتا تھا لہٰذا جج نے تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

آئندہ پیشی پندرہ روز بعد کی تھی۔

☆☆☆

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ استغاثہ کی طرف سے اس ڈرائیور کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا جس نے اس واردات کی اطلاع پولیس کو فون پر دی تھی جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے، اس مزدا ڈرائیور کا نام محمد اسحاق تھا۔

اسحاق کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ گھونگریالے بالوں والا ایک عام سا انسان تھا۔ ناک نقشہ واجبی سا اور پستہ قامت، جسم مائل بہ فربہی۔ اسحاق کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہوچکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ وہ پندرہ بیس منٹ تک اپنے گواہ سے گھما پھرا کر مختلف سوالات کرتا رہا۔ اس جرح کا لبِ لباب یہ تھا کہ مقتول اپنی موٹر سائیکل پر آگے جارہا تھا اور اس کے تعاقب میں دوسری موٹر سائیکل پر دو شخص سوار تھے۔ پھر وہ خوفناک واقعہ پیش آیا اور دو افراد والی موٹر سائیکل جائے وقوعہ سے فرار ہوگئی، وغیرہ وغیرہ.....!

وکیل استغاثہ نے جرح ختم کی تو میں جج کی اجازت حاصل کر کے استغاثہ کے گواہ منی بس کے ڈرائیور محمد اسحاق کے قریب چلا گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ذرا مختلف انداز میں جرح کا آغاز کیا۔

''اسحاق صاحب! آپ نے وکیل استغاثہ کے سوالات کے جواب میں اور اس سے پہلے اپنے حلفیہ بیان میں بھی بتایا ہے کہ وقوعہ کی رات آپ نے ڈرائیونگ کے دوران میں، بہت آگے سڑک پر دو موٹر سائیکلوں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا.....؟''

''نہیں جناب، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔''

''پھر آپ نے دیکھا کہ آگے والی موٹر سائیکل اپنے سوار سمیت سڑک پر گر گئی تھی۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اور پیچھے والی موٹر سائیکل جس پر دو افراد سوار تھے، وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی جیسے کوئی جائے وقوعہ سے فرار ہوتا ہے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

''جی ہاں..... بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

''آپ اس وقت یہی سمجھے تھے کہ یہ ایک ایکسیڈنٹ ہے۔ اس حادثے میں قصور چونکہ پچھلی موٹر سائیکل والوں کا نظر آرہا تھا اس لیے وہ فی الفور جائے واردات سے فرار ہوگئے لیکن جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے اور آپ نے منی بس میں سے باہر آکر صورتِ حال کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ یہ تو قتل کی ایک واردات تھی۔ اس کے بعد ہی آپ نے ایک قریبی پبلک کال آفس پہنچ کر پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی تھی.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اسحاق صاحب! آپ نے کس بات سے یہ اندازہ قائم کیا تھا کہ مقتول مورس کسی حادثے کا شکار نہیں ہوا، بلکہ اسے باقاعدہ قتل کیا گیا تھا؟''

''اس کی لاش کو دیکھ کر.....'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

''لاش کو دیکھ کر!'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں دہرایا۔ ''کیا یہ بات لاش نے آپ کو بتائی تھی کہ اسے قتل کیا گیا ہے؟''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ ''میرے فاضل دوست استغاثہ کے گواہ کو اپنی لچھے دار باتوں سے الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ غیر متعلق اور اوٹ پٹانگ سوالات سے استغاثہ کے گواہوں کو کنفیوز کرتے ہیں۔ معزز عدالت سے میری یہ استدعا ہے کہ انہیں اس نوعیت کے ہتھکنڈے آزمانے سے روکا جائے۔''

''یہ سراسر مجھ پر الزام ہے یُور آنر!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے اس سے پہلے اور نہ ہی اب ایسی کوئی حرکت کی ہے جیسے ہتھکنڈوں کا میرے فاضل دوست ذکر کر رہے ہیں۔ میں نے استغاثہ کے گواہ سے جرح کے دوران میں جو سوال کیا ہے اس میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں لاش، قتل، دیکھنا، بتانا، بات..... وغیرہ۔ ان میں سے کوئی بھی لفظ غیر متعلق نہیں ہے اور نہ ہی میرے سوال کو اوٹ پٹانگ کہا جاسکتا ہے۔ دیٹس آل یور آنر!''

میری اس وضاحت پر وکیل استغاثہ زہر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ جج نے تیز لہجے میں اس سے استفسار کیا۔

''وکیل صاحب! آپ کو وکیل صفائی کے الفاظ پر کیا اعتراض ہے؟''

''اعتراض الفاظ پر نہیں جناب عالی!'' وہ مجھے ناپسندیدہ نظروں سے گھورتے ہوئے جج سے مخاطب ہوا۔ ''بلکہ ان الفاظ کے معنی اور مفہوم پر ہے اور..... اور سب سے بڑھ کر وکیل صفائی کے تمسخرانہ اسٹائل پر مجھے اعتراض ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ ان من جملہ اعتراضات کی وضاحت کریں؟'' جج نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

وکیل استغاثہ نے بتانا شروع کیا۔ ''جناب عالی! میرے فاضل دوست نے استغاثہ کے معزز گواہ سے سوال کیا ہے کہ..... کیا یہ بات لاش نے گواہ کو بتائی تھی کہ اسے قتل کیا گیا ہے..... لاش کا تو سیدھا سیدھا مطلب ہے ڈیڈ باڈی..... کیا کوئی مردہ بھی اپنے قتل کے بارے میں کسی کو کچھ بتا سکتا ہے..... یہ تو گواہ کو الجھانے والی بات ہوئی نا!''

جج کی ہزار ہا سنجیدگی کے باوجود بھی اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ یہ مسکراہٹ وکیل استغاثہ کے اس اعتراض کا نتیجہ تھا جسے صرف اور صرف حماقت کے زمرے ہی میں فٹ کیا جا سکتا تھا۔

جج نے مجھ سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ اس اعتراض کے جواب میں کیا کہیں گے؟''

''صرف سوری.....!'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''سوری..... کیا مطلب؟'' جج نے الجھن زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''جناب عالی!'' میں نے شرارت آمیز انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں استغاثہ کے معزز گواہ اور اس کے معزز ترین وکیل سے سوری کہوں گا کہ میں نے لاش کے حوالے سے اس قسم کا سوال کیا۔ یہ تو میرے ذہن ہی میں نہیں رہا تھا کہ لاش باتیں نہیں کر سکتی بہرحال.....'' میں نے ڈرامائی توقف کر کے جج کی طرف دیکھا اور کہا۔

''اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں استغاثہ کے گواہ سے یہی سوال ذرا مختلف انداز میں کرنا چاہوں گا اور اس سوال میں..... میں یقین دلاتا ہوں کہ لاش کا لفظ بالکل نہیں آئے گا۔''

''اجازت ہے۔'' جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں دوبارہ گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا اور اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ ''اسحاق صاحب! آپ کو یہ کیسے اندازہ ہوا تھا کہ مقتول کو قتل کیا گیا ہے۔ اس کی موت کا سبب روڈ ایکسیڈنٹ بھی تو ہو سکتا تھا؟''

''وکیل صاحب! پہلے بھی آپ نے اسی نوعیت کا سوال کیا تھا لیکن اب میں پھر بھی جواب میں لاش کا ذکر نہیں کروں گا۔'' گواہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''بلکہ میں یہ کہوں گا کہ مقتول کی کھوپڑی کی حالت کو دیکھ کر مجھے اور وہاں موجود تمام افراد کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ مقتول کو فائرنگ کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا..... پوسٹ مارٹم رپورٹ سے بھی یہی ثابت ہوا ہے۔''

''فائرنگ..... ویری گڈ.....'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا پھر گواہ سے پوچھا۔ ''کیا آپ نے ڈرائیونگ کے دوران میں فائرنگ کی آواز سنی تھی..... یا کسی اور پسنجر نے سنی ہو؟''

''آواز سننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب!'' گمبھیر انداز میں بولا۔

''کیوں نہیں پیدا ہوتا؟'' میں نے پوچھا۔

''مقتول مورس کو سائیلنسر لگی گن سے فائرنگ کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''پوسٹ مارٹم رپورٹ نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے۔ اگرچہ اس فائرنگ کی مخصوص آواز تو ابھری ہو گی لیکن منی بس اس وقت جتنے فاصلے پر تھی، وہاں سے آواز کو سننا ناممکن تھا۔''

''آپ نے فائرنگ کی آواز نہیں سنی تھی۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''ظاہر ہے، اگر آپ گولیاں چلنے کی آواز سن لیتے تو پھر اسے حادثہ نہ سمجھتے بلکہ جائے وقوعہ پر پہنچنے سے پہلے ہی آپ کو پتا چل جاتا کہ ندی کے پل پر قتل کی کوئی واردات ہو گئی ہے۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں نا؟''

''سولہ آنے صحیح.....!'' اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

''اسحاق صاحب! اب میں آپ سے جو سوال کرنے والا ہوں، اس کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دیجیے گا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ڈرائیونگ کے دوران میں جب آپ نے یہ واقعہ ہوتے دیکھا اور جائے وقوعہ سے دو سوار افراد والی موٹر سائیکل کو فرار ہوتے دیکھا تو کیا آپ نے اسے دیکھا، دیکھا کے ساتھ یہ بھی دیکھا کہ ان دو فرار ہونے والے افراد میں سے کسی نے کوئی شے ندی میں پھینکی ہو.....؟''

''نہیں جناب! میں نے ایسا کچھ نہیں دیکھا تھا۔'' وہ پروثوق انداز میں بولا۔ ''یہ واقعہ رونما ہوا اور پیچھے والی موٹر سائیکل پلک جھپکتے میں جائے واردات سے فرار ہو گئی، بس.....''

لیکن آلۂ قتل کی عدم دستیابی کے حوالے سے اس کیس کے انکوائری آفیسر کا یہ دعویٰ ہے کہ.....'' میں نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''ملزم نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد سائیلنسر لگی گن کو ندی میں پھینک دیا تھا؟''

''میں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں دیکھا۔'' گواہ نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ''انکوائری آفیسر اپنے دعوے کا خود

ل جواب دیں گے۔''

اسی لمحے آئی۔ او نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولنا چاہے لیکن اس کی اس کوشش سے پہلے ہی میں نے کہہ دیا۔

''آئی۔ او صاحب کو میں بار بار کٹہرے میں بلانے کی ضرورت نہیں کر سکتا۔ پہلے انہوں نے انڈر واٹر آلۂ قتل کی وڈیو بنانے کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اب وہ اسی تلاش و جستجو میں کہیں مریخ کی طرف نہ نکل جائیں۔ آپ نے جو، جواب دیا ہے، میرے لیے وہی کافی ہے اور اب ..... چند آخری سوالات.....''

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر تفتیشی افسر کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے کچا چبا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں دوبارہ گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا اور پوچھا۔

''اسحاق صاحب! میرے مؤکل کو مورس کے قتل کے الزام میں ایک ملزم کی حیثیت سے عدالت میں پیش کیا گیا ہے۔ استغاثہ کے مطابق، وقوعہ کی رات آپ نے دو سواروں والی جس موٹر سائیکل کو ندی کے پل سے فرار ہوتے دیکھا تھا اس موٹر سائیکل پر ملزم اپنے کسی دوست کے ساتھ سوار تھا۔ اس نے مقتول کی کھوپڑی اور گدی پر دو بے آواز فائر کیے اور اپنے دوست کے ساتھ جائے واردات سے فرار ہو گیا۔ اگر استغاثہ کے دعوے کو بہ فرض محال ایک لمحے کے لیے درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس سے واضح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ملزم کا دوست ڈرائیونگ کر رہا تھا اور ملزم اس کے پیچھے سائیلنسر لگی گن تھامے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا کام کیا پھر یہ دونوں موقعے سے فرار ہو گئے۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟''

''ظاہر ہے جناب، موٹر سائیکل چلانے والا شخص تو اتنا صحیح نشانہ نہیں لگا سکتا۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''ملزم پیچھے ہی بیٹھا ہوا ہو گا.....''

''اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ڈرائیونگ ملزم نے سنبھال رکھی ہو۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور اس کا دوست گن تھامے پیچھے بیٹھا ہو اور..... مقتول پر اسی دوست نے فائرنگ کی ہو.....؟''

ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار پیدا ہوئے پھر وہ کاٹھ کے الو کے مانند اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی ہاں..... یہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''یعنی آپ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے؟''

''یقین کے ساتھ تو اس وقت کوئی بات کی جا سکتی ہے اگر میں نے پچھلی موٹر سائیکل والوں کو بہت قریب سے یہ واردات کرتے دیکھا ہو۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔

''جائے وقوعہ اور منی بس کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ میں کسی کے چہرے کو بھی واضح طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر دن کا وقت ہوتا یا سڑک کے اس حصے پر اسٹریٹ لائٹس نصب ہوتیں تو شاید میں قدرے بہتر اندازہ قائم کر لیتا۔ رات کی تاریکی اور منی بس کی ہیڈ لائٹس کی محدود روشنی میں وقوعہ کی رات میں نے ندی کے پل پر جو منظر دیکھا وہ آپ کو بتا دیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہیں تو معذرت ہی کر سکتا ہوں۔''

''معذرت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اسحاق صاحب!'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اس کے بجائے آپ ایک اور کام کریں.....''

باتوں سے خوشبو آئے

☆ جب کوئی کام کریں تو اس کے لیے موزوں دن یا وقت کا انتظار نہ کریں کیونکہ کام کرنے کے لیے ہر دن، ہر وقت موزوں ہوتا ہے۔ (ترک ماہر تعلیم پروفیسر علی فواد)

☆ تمہیں جس سے نفرت ہے اس سے ضرور ڈرتے رہو۔ (عرب ادیب عبداللہ سال)

☆ سرمائے کی منتقلی کا ایک طریقہ ایسا بھی ہے جو الیکٹرانک بینکاری سے بھی زیادہ تیز رفتار ہے۔ اسے شادی کہتے ہیں۔ (امریکی نفسیات داں جیمز ہولٹ)

❖ ❖ ❖

زاویہ نگاہ

☆ محبت کی عمارت میں شک کی دراڑ پڑ جائے تو وہ معذرت کے گارے سے بھر تو سکتی ہے مگر نشان باقی رہتا ہے۔

☆ افراد اور اقوام، واقعات سے ہمیشہ اپنے مزاج کے مطابق سبق حاصل کرتے ہیں۔

☆ جو مخلوق سے فاصلے پر رہے وہ خالق سے کیونکر قریب رہ سکتا ہے۔

☆ غم کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو مگر نیند سے پہلے تک ہے۔

☆ اندھیرا آئے تو اندھیرے کو نہ سوچو، بلکہ چراغ جلا دو، اس کے بعد اندھیرا خود بخود ختم ہو جائے گا۔

مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا (اوکاڑہ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کون سا کام؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''آپ ملزم کو غور سے دیکھیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

اس نے بہ غور میرے مؤکل کو سر تا پا گھور کر دیکھا پھر اپنی آنکھوں کا زاویہ میری طرف موڑتے ہوئے بولا۔

''جی.....؟''

''کیا آپ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وقوعہ کی رات مقتول مورس پر فائرنگ اسی نوجوان نے کی تھی؟'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں!'' اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

''مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!'' میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ''نمبر ایک، استغاثہ کا گواہ میرے مؤکل کے اس کیس میں ملوث ہونے کے بارے میں پُریقین نہیں ہے۔ نمبر دو، آلۂ قتل دستیاب نہیں ہوسکا اور گواہ نے کسی کو آلۂ قتل ندی میں پھینکتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ نمبر تین، پچھلی موٹر سائیکل پر جو دو افراد سوار تھے، ان میں سے ایک میرا مؤکل تھا، اس بات کا استغاثہ کے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ نمبر چار، یہ امر بھی واضح نہیں ہے کہ موٹر سائیکل سواروں میں سے کس نے فائرنگ کی اور کون ڈرائیونگ کر رہا تھا کیونکہ ان دونوں کا کوئی سراغ کہیں نہیں ملتا لہٰذا.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''لہٰذا..... میں نہایت ہی ذمے داری اور دعوے کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے مؤکل کا قتل کی اس واردات سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسے ایک گہری سازش کے تحت اس مقدمے میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وقوعہ سے چند روز قبل، مقتول سے ہونے والے جھگڑے میں میرے مؤکل نے جو دھمکی آمیز الفاظ استعمال کیے تھے پولیس نے انہی کی بنیاد پر اس کیس کی عمارت کھڑی کی ہے جبکہ وہ محض جذباتی ڈائیلاگ تھے۔ جب کوئی انسان کسی سے پٹتا ہے تو وہ جواباً اپنا غصہ نکالنے کے لیے اسی قسم کی دھمکیاں دیتا ہے۔''

''استغاثہ کی عمارت کی بنیاد میں ان دھمکی آمیز جملوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔'' وکیل استغاثہ نے مخالفانہ انداز میں کہا۔ ''وقوعہ کی رات لگ بھگ گیارہ بجے ملزم کو مقتول والی وائن شاپ کے سامنے مشکوک انداز میں ٹہلتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے۔ اس نے ایک دو مرتبہ دکان کے اندر بھی جھانک کر دیکھا تھا۔ اس کے تیور بڑے خطرناک نظر آتے تھے۔ مورس تو اس دنیا سے جا چکا ہے لیکن ملزم کی ان مشکوک حرکات کی گواہی نیلسن اور رکی دے سکتے ہیں۔ وہ دونوں بھی اس وقت وائن شاپ میں موجود تھے۔'' وہ سانس درست کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''تھوڑی دیر تک مشکوک انداز میں وائن شاپ کے سامنے منڈلانے کے بعد ملزم اپنے دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ایک طرف نکل گیا تھا۔''

''ٹھیک ہے، جب نیلسن اور رکی گواہی دینے عدالت میں آئیں گے تو میں ان سے اس اجنبی شخص کے بارے میں ضرور دریافت کروں گا جو وقوعہ کی رات میرے مؤکل کے ہمراہ، وائن شاپ کے سامنے مشکوک انداز میں منڈلاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''اجنبی شخص..... کے الفاظ میں نے اس لیے استعمال کیے ہیں کہ اگر استغاثہ اس شخص سے واقف ہوتا تو ملزم کے علاوہ مرد مذکور کو بھی عدالت میں گھسیٹ لیا جاتا۔''

''یہ حقیقت تو اپنی جگہ مسلّم ہے ہی۔'' وکیل استغاثہ اپنے موقف میں زور بھرتے ہوئے بولا۔ ''اس کے علاوہ بھی، ایک نہایت ہی اہم نکتہ ملزم کے جرم کی گواہی دیتا ہے.....''

''مثلاً..... کون سا نکتہ؟'' جج نے آنکھیں سکیڑ کر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔

''ملزم وقوعہ کی رات دس بجے اپنے گھر سے نکلا تھا۔'' وکیل استغاثہ نے جیسے کسی عظیم راز کی نقاب کشائی کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اس کی واپسی لگ بھگ رات ایک بجے ہوئی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب وہ مقتول کی وائن شاپ کے سامنے موجود پایا گیا تھا۔ اس کے بعد کے دو گھنٹوں کا حساب کہیں نہیں ملتا۔''

وکیل استغاثہ نے بڑے چبھنے والے انداز میں بات مکمل کی تو میں نے اسے آڑے ہاتھوں لے لیا۔ میں نے قدرے جارحانہ لہجے میں کہا۔

''میرے فاضل دوست! اگر استغاثہ کو ملزم کی دو گھنٹے کی مصروفیات کا حساب نہیں مل سکا تو اس کا یہ مطلب کس طرح نکال لیا گیا کہ وہ اس دوران میں قتل کی کسی واردات میں ملوث تھا؟''

''تو پھر وہ کہاں تھا؟'' وکیل استغاثہ نے اکھڑے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''یہ رمضان کریم کا مبارک مہینا ہے۔'' میں نے سرکار کے زخموں پر نمک چھڑکتے ہوئے کہا۔ ''یہ بھی تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے کہ یہ کسی مسجد میں عبادت کی غرض سے دو گھنٹے گزارآیا ہو۔“

”آپ تو اتنے وثوق سے یہ بات کہہ رہے ہیں جیسے اس رات آپ بھی ملزم کے ساتھ مسجد میں عبادت کرنے گئے تھے؟“ وکیل استغاثہ نے مجھ پر گہری چوٹ کی۔

”آپ کا وثوق تو مجھ سے ایک ہزار گنا زیادہ ہے میرے فاضل دوست!“ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں اس کے وار کو الفاظ کی ڈھال پر روکا پھر جوابی حملہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بلکہ آپ نے تو اپنے وثوق کو باقاعدہ تحریری شکل بھی دے ڈالی ہے جس کا نام استغاثہ رکھا گیا ہے جو اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ وقوعہ کی رات گیارہ اور ایک بجے کے درمیانی دو گھنٹے آپ نے ملزم کی معیت اور صحبت میں گزارے تھے جبھی آپ کو یقین ہے کہ انہی دو گھنٹوں کے دوران میں ملزم نے مقتول مورس کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ کہیں آپ...... کہیں آپ قاتل والی موٹر سائیکل تو ڈرائیور نہیں کر رہے تھے......؟“

یہ میری جانب سے ایسا بھرپور حملہ تھا کہ وکیل استغاثہ کی سوچ کی ایسی کم تیسی ہوگئی۔ حالانکہ میں نے تو بڑے سیدھے سادے انداز میں اس کی بات کا جواب دیا تھا لیکن الفاظ ایسے زہریلے اور طنزیلے تھے کہ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔ اس سے پہلے کہ ہمارا یہ کلیش کوئی خطرناک رخ اختیار کر لیتا، جج نے فوراً مداخلت کی اور گمبھیر انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”بیگ صاحب! استغاثہ کی جانب سے ابھی تک ایسا کوئی واضح ثبوت فراہم نہیں کیا گیا جو ملزم کی جائے وقوعہ پر موجودگی کو ثابت کرتا ہو۔ کیا آپ کوئی ایسا ٹھوس ثبوت پیش کر سکتے ہیں جو وقوعہ کی رات ملزم کو گیارہ سے بارہ بجے کے درمیان جائے واردات سے کہیں دور موجود ثابت کر سکے؟“

”ملزم کو اپنے دوست کے ساتھ، موٹر سائیکل پر بیٹھ کر جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہوتے ہوئے دیکھا گیا تھا......“ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وکیل استغاثہ بول اٹھا۔ ”استغاثہ کا گواہ نیلسن اپنی گواہی میں اس حقیقت کا انکشاف کرے گا۔“

”ویری گڈ!“ جج نے اثبات میں گردن ہلائی پھر استغاثہ کے گواہوں کی فہرست پر نگاہ ڈالنے کے بعد وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ ”آپ نیلسن نامی اس گواہ کو عدالت میں کب پیش کریں گے؟“

”آئندہ پیشی پر جناب عالی!“ وکیل استغاثہ نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

”او کے......!“ جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”ناؤ یور ٹرن مسٹر بیگ......!“

میں نے جواب میں ایک شعر پڑھ ڈالا۔ ”ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے، پڑھے لکھے کو فارسی کیا ہے......!“

”اپنی بات کی وضاحت کر دیں بیگ صاحب!“ جج نے مجھ سے کہا۔ ”اگرچہ عدالت تو آپ کے شعر کا مفہوم بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ گئی ہے لیکن سامعین میں سے ہوسکتا ہے، چند کے پلے کچھ نہ پڑا ہو لہٰذا وضاحت ضروری ہے۔“

اس موقعے پر وکیل استغاثہ ایک لمحے کے لیے نہیں چوکا اور اس نے فوراً مجھ پر وار کر دیا۔ ”میرے فاضل دوست کو اپنی علمیت جھاڑنے کا بہت شوق ہے۔ ابھی تو شکر کا مقام ہے کہ انہوں نے اردو کے شعر میں صرف لفظ فارسی استعمال کیا ہے ورنہ یہ تو فارسی کے پورے پورے شعر اور اگر بس چلے تو مکمل گلستاں، بوستاں بھی کوٹ کرنے سے باز نہیں آتے......“

جج نے وکیل استغاثہ کے اس عامیانہ اور بے محل تبصرے پر توجہ نہیں دی اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”جی، بیگ صاحب؟“

میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ ”جناب عالی! ملزم اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔ مجھے اس کی دو گھنٹے یا ایک گھنٹے کی مصروفیات کی وضاحت کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ یہ تو مؤکل ست اور وکیل چست والی بات ہوجائے گی۔ کیوں نہ اس سوال کا جواب ملزم ہی سے لیا جائے۔“

”بڑی مناسب بات ہے۔“ جج نے میری تائید کرتے ہوئے کہا پھر ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”وقوعہ کی رات گیارہ اور ایک بجے کے درمیان کا وقت تم نے کہاں گزارا تھا؟“

ملزم نے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا۔ ”جناب عالی! عدالت میں جس شخص کا کئی بار ذکر ہو چکا ہے اور اسے میرا ساتھی بتایا گیا ہے، وہ دراصل میرا دوست ہے۔ ہم بہت گہرے دوست ہیں اور میں معزز عدالت کو کچھ بتانے جا رہا ہوں، اگر اس میں سے کسی بات کا شبہ آئے تو اس کی تصدیق کے لیے زاہد کو عدالت میں بلا کر اس سے پوچھ گچھ کی جاسکتی ہے۔ زاہد طارق روڈ کے علاقے میں رہتا ہے۔“ وہ لمحے بھر کے لیے سانس لینے کو رکا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”زاہد ہر سال رمضان کے آخری دس دنوں میں دوستوں کے ساتھ مل کر فوڈ اسٹال لگاتا ہے جیسا کہ سب

جانتے ہیں اور طارق روڈ کی طرف شاپنگ کی غرض سے جانے والوں نے دیکھا بھی ہوگا کہ وہاں ان دنوں میں پاکستانی اور کانٹی نینٹل کھانوں کی ایک پوری فوڈ اسٹریٹ آباد ہوجاتی ہے جو سر شام آغاز ہو کر رات گئے بلکہ آخری دو تین دنوں میں تو اذانِ فجر تک چلتی ہے۔ شاپنگ کے لیے ادھر کا رخ کرنے والوں کی خاصی گہما گہمی ہوتی ہے اور کھانے پینے کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے۔“

”لیکن طارق روڈ کی فوڈ اسٹریٹ کا زیرِ سماعت کیس سے کیا تعلق ہے؟“ وکیل استغاثہ نے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم نے کون سی کہانی سنانا شروع کر دی ہے؟“

”میں تو وہ کہانی سنا رہا ہوں جناب جو اس کیس سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔“ ملزم عاقل نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”اور یہ کہانی ہی جائے وقوعہ سے میری عدم موجودگی کو ظاہر کر کے مجھے بے گناہ ثابت کرتی ہے لہٰذا اگر آپ میرے بیان کے دوران میں رکاوٹیں کھڑی نہ کریں تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

ملزم نے بڑے خوب صورت انداز میں وکیل استغاثہ کو کارنر کر دیا تھا۔ وہ تلملا کر رہ گیا تاہم منہ سے کچھ نہیں بولا۔ ملزم نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”عید کی آمد سے پہلے، رمضان کے آخری عشرے میں ہمارے علاقے میں بھی بڑی رونق اور گہما گہمی ہوتی ہے لہٰذا اس سال میں نے بھی فوڈ اسٹال لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے زاہد سے درخواست کی تھی کہ وہ ہمارے علاقے میں آ کر فوڈ اسٹال کے لیے کسی اچھی سی لوکیشن کا انتخاب کرے۔ وقوعہ کی رات وہ اسی غرض سے میرے پاس آیا ہوا تھا۔ ہم علاقے کے مختلف حصوں کا گھوم پھر کر جائزہ لے رہے تھے۔ اسی دوران میں ہم اخبار کے آفس کی طرف بھی آئے۔ وائن شاپ بھی ادھر قریب ہی میں واقع ہے۔ زاہد کو یہ بات معلوم تھی کہ چند روز پہلے وائن شاپ کے انچارج مورس سے میرا جھگڑا ہوگیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں اسے مورس کی جھلک دکھاؤں۔ پتا تو چلے، آخر وہ کون سورما ہے؟ میں زاہد کے ساتھ وائن شاپ کے سامنے پہنچا اور شاپ کے اندر جھانک کر اسے مورس کی شکل دکھا دی۔ پھر ہم وہاں سے آگے بڑھ گئے تھے۔“

”جب تم نے وائن شاپ کے اندر جھانک کر مقتول کو دیکھا تو اس وقت لگ بھگ رات کے گیارہ بجے تھے۔“ اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ”اس کے بعد کا وقت تم لوگوں نے کہاں گزارا؟“

”زاہد کو بھوک لگ رہی تھی۔“ ملزم نے بتایا۔

”ہمارے علاقے میں عمدہ نہاری کا ایک ہوٹل ہے۔ میں زاہد کو وہاں لے گیا تھا۔ ہم کم وبیش ایک گھنٹا اس ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اس ہوٹل کا ویٹر نذیر احمد اس بات کی گواہی دے سکتا ہے۔ ہم نے خوب سیر ہو کر نہاری روٹی کھائی۔ پھر برابر میں پٹھان کے ہوٹل سے دودھ پتی پی۔ اس کے بعد میں زاہد کو اپنی موٹر سائیکل پر طارق روڈ چھوڑنے چلا گیا تھا۔ طارق روڈ سے واپسی پر جب میں گھر پہنچا تو رات کا ایک بج چکا تھا۔“

”جب تم زاہد کو طارق روڈ چھوڑنے گئے، کیا وقت ہوا ہوگا؟“

”بارہ سے تو اوپر ہی کا وقت تھا۔“ ملزم نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے اس وقت رات کے سوا بارہ بجے ہوں گے۔“

”اور تمہارے علاقے سے طارق روڈ مشرق میں واقع ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور جائے وقوعہ ندی والا وہ پل مغرب میں۔“

”جی ہاں...... بالکل ایسا ہی ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”کیا تم لوگ طارق روڈ جانے کے لیے ندی کی طرف سے تو نہیں نکلے تھے؟“ میں نے برسبیلِ تذکرہ پوچھ لیا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب......!“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”یہ تو سراسر حماقت ہوتی۔ اگر ہم ندی والے راستے کی طرف سے بائیک نکالتے تو کبھی طارق روڈ نہیں پہنچ سکتے تھے اور...... اگر گھوم پھر کر بھی پہنچنے کی کوشش کرتے تو رات کے تین چار تو بج ہی جاتے جبکہ میں رات ایک بجے واپس اپنے گھر پر تھا۔“

میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! ملزم کا تفصیلی بیان اور مصروفیات اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ وقوعہ کے وقت، جائے واردات سے میلوں دور اپنے دوست کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھا نہاری روٹی کھا رہا تھا لہٰذا قتل کی اس واردات میں ملزم کے ملوث ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں اس تفصیل سے بہت سے ایسے امور کی بھی وضاحت ہوجاتی ہے جو استغاثہ کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں مثلاً وقوعہ کی رات ملزم وائن شاپ کے سامنے بڑے مشکوک انداز میں ٹہل رہا تھا اور اس نے بڑے خطرناک انداز میں ایک دو بار شاپ کے اندر بھی جھانک کر دیکھا تھا اور پھر اپنے دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار ہو کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ......“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بیگ صاحب!'' جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیا آیندہ پیشی پر آپ ملزم کے دوست زاہد اور ہوٹل کے ویٹر نذیر احمد کو ملزم کے بیان کی تصدیق کے لیے عدالت میں پیش کر سکتے ہیں؟''

''بالکل جناب.....'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ضرور پیش کر سکتا ہوں۔''

''آپ بھی وکیل صاحب.....!'' جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''استغاثہ کے جو گواہ باقی بچے ہیں انہیں اگلی پیشی پر لے آئیں تاکہ اس کیس کا جلد از جلد فیصلہ سنایا جا سکے۔''

وکیل استغاثہ نے جج کی ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا۔

جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ.....!''

☆☆☆

آیندہ پیشی پر سب سے پہلے صفائی کے گواہان یعنی ملزم کے دوست زاہد اور نہاری ہوٹل کے ویٹر نذیر احمد کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا جن کے حلفیہ بیان اور بعد ازاں ان پر ہونے والی جرح سے ثابت ہو گیا کہ وقوعہ کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے دوران میں میرا موکل جائے واردات سے پانچ میل کے فاصلے پر اپنے دوست کے ساتھ موجود تھا۔ جائے وقوعہ سے اس کی عدم موجودگی اس بات پر دلالت کرتی تھی کہ قتل کی اس واردات میں وہ کسی بھی طور پر ملوث نہیں تھا۔

اس کے بعد یکے بعد دیگرے تین گواہ استغاثہ کی طرف سے پیش کیے گئے جن میں وائن شاپ کا مالک مسٹر پیٹر اور دونوں ملازم رکی اور نیلسن شامل تھے۔ پیٹر کے بیان میں ایسی کوئی بات شامل نہیں تھی جو اس کیس میں کسی طرح معاون ثابت ہو سکتی۔

پیٹر کے بعد رکی اور نیلسن گواہی دینے کے لیے آئے۔ ان کے بیانات میں بہت کچھ مشترک تھا مثلاً یہ کہ ملزم اور مقتول کا جھگڑا ہوا تھا جس میں ملزم نے مقتول کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دی تھیں۔ پھر یہ کہ وقوعہ کی رات وائن شاپ بند ہونے سے تھوڑی دیر پہلے ملزم اپنے ایک دوست کے ہمراہ شاپ کے سامنے بڑے مشکوک انداز میں ٹہلتے ہوئے دیکھا گیا تھا اور اس نے ایک دو مرتبہ شاپ کے اندر جھانک کر بھی دیکھا تھا، وغیرہ وغیرہ..... البتہ نیلسن کا بیان اس حوالے سے قدرے مختلف اور اہمیت کا حامل تھا کہ اس نے ملزم اور اس کے دوست کو موٹر سائیکل پر سوار ہو کر جائے وقوعہ کی طرف جاتے ہوئے بھی دیکھا تھا لہٰذا میں یہاں پر نیلسن کے بیان کے بعد ازاں اس پر ہونے والی جرح کا احوال ہی پیش کروں گا۔

وکیل استغاثہ نے اسے فارغ کیا تو جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ نیلسن عمر پچیس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ میں نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''مسٹر نیلسن! آپ کو پیٹر کی وائن شاپ پر کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''پانچ سال.....!'' اس نے جواب دیا۔

''اور مقتول مورس کب سے وہاں کام کر رہا تھا؟''

''مجھ سے تین سال پہلے سے۔'' اس نے بتایا۔ ''یعنی آٹھ سال سے۔''

''میری معلومات کے مطابق مقتول کی آپ کے ساتھ بڑی گہری دوستی تھی۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''اور آپ دونوں ایک دوسرے کے ذاتی معاملات سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں جناب، آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''واقعی ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔''

''مجھے آپ کے دوست کی المناک موت کا بڑا دکھ ہے۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ سوال و جواب عدالتی کارروائی کا لازمی حصہ ہے لہٰذا آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن.....''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''آپ کو جو بھی پوچھنا ہے، ضرور پوچھیں۔ ان تکلفات سے مورس واپس تو نہیں آ جائے گا۔''

''بجا فرمایا آپ نے..... جانے والے کو کبھی کوئی واپس نہیں لا سکتا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں البتہ، اس کے بھیجے میں جس کا ہاتھ ہو اسے قرار واقعی سزا تو دلوائی جا سکتی ہے نا..... کیا خیال ہے آپ کا؟''

وہ جواب دینے کے بجائے الجھن زدہ نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی ایکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم عاقل کو دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اپنے مؤکل کو سزا دلوانے کی بات کیوں کی ہے۔ یہ بات اس لیے بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی کہ درحقیقت میں نے ایسا کہا نہیں کہا تھا۔

چند لمحات کے تذبذب پر مبنی توقف کے بعد اس نے اثبات

میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں..... بالکل، ضرور..... مورس کے قاتل کو قرار واقعی سزا ملنا چاہیے۔'' بات کے اختتام پر اس نے ایک مرتبہ پھر نفرت بھری نظروں سے ملزم عاقل کی طرف دیکھا۔

''قاتل کو عبرت ناک سزا دلوائی جا سکتی ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس کام میں آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا..... بولیں، ساتھ دیں گے مسٹر نیلسن؟''

''جی..... میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا یہ صحیح ہے کہ مقتول غیر شادی شدہ تھا؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مورس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔''

''مقتول کی شادی نہیں ہوئی تھی۔'' میں نے سرسری لہجے میں دہرایا پھر سوالیہ نظروں سے گواہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ایک جگہ بڑا زبردست معاشقہ چل رہا تھا..... یہ معاملہ آپ سے چھپا ہوا تو نہیں تھا مسٹر نیلسن؟''

''جی..... مجھے اس معاملے کی خبر تھی۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''کیا اس لڑکی کا نام اگنس تھا؟''

''جی ہاں.....!''

''اگنس اور مورس ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے.....؟''

''جی ہاں..... یہ ایک حقیقت تھی۔''

''اگنس کا ایک کزن جوزف بھی اسے بہت چاہتا تھا۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ جوزف، مورس کو سخت ناپسند کرتا تھا، میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''آپ بالکل درست بیان کر رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''جوزف اس معاملے میں مورس سے نفرت کرتا تھا لیکن اس کا بس نہیں چلتا تھا کیونکہ اگنس صرف اور صرف مورس ہی کو چاہتی تھی۔''

''جوزف کا بس نہیں چلتا تھا۔'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''اور پھر ایک روز اس کا بس چل گیا۔''

''جی، کیا مطلب.....؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ جوزف کا اٹھنا بیٹھنا آوارہ اور اوباش قسم کے لوگوں کے ساتھ تھا؟''

''جی ہاں..... یہ درست ہے۔''

''وہ کلائیوں اور گلے میں موٹی موٹی چینیں پہنے سارا دن آوارہ گردی کرتا رہتا تھا۔'' میں نے پوچھا۔ ''وہ کوئی کام کاج بھی نہیں کرتا تھا؟''

''جی ہاں، ایسا ہی ہے۔'' استغاثہ کے گواہ نیلسن نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اور یہی وجہ ہے کہ اگنس اسے سخت ناپسند کرتی تھی۔''

''اگنس، جوزف کو سخت ناپسند کرتی تھی اور جوزف، مورس سے نفرت کرتا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر یکلخت گواہ سے پوچھا۔ ''مسٹر نیلسن! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جوزف ہی نے مورس کو ٹھکانے لگا دیا ہو؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا، جلدی سے بولا۔ ''میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب!''

''آپ کچھ نہ کچھ تو کہہ سکتے ہیں۔ آخر آپ کو بھی اظہارِ خیال کا حق حاصل ہے۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''اس بات کے روشن امکانات تو ہیں نا کہ اپنی راہ صاف کرنے کے لیے جوزف نے مورس کو ایک طرف ہٹا دیا ہو.....؟''

''دیکھیں جناب! ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' وہ بے حد محتاط انداز میں بولا۔ ''لیکن میں نے چونکہ جوزف کو یہ کام کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا اس لیے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا۔''

''تو اس کا مطلب ہے، تم نے ملزم عاقل کو مورس کا قتل کرتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟'' میں یک دم آپ سے تم پر آ گیا اور جارحانہ لہجے میں کہا۔ ''اسی لیے تم ملزم کے خلاف گواہی دینے عدالت میں حاضر ہوئے ہو؟''

''جی.....'' وہ ہکا بکا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ ''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میں نے ملزم کو قتل کی واردات کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

''وقوعہ کی رات تم لوگوں نے وائن شاپ کتنے بجے بند کی تھی؟'' اس کی بات پر توجہ دیے بغیر میں نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''گیارہ بج کر دس منٹ پر.....'' گواہ نے جواب دیا۔

''تمہارا ساتھی رکی اسی علاقے کا رہنے والا ہے جہاں وائن شاپ واقع ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جرح جاری رکھی۔ ''رکی اپنے گھر چلا گیا اور مقتول اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گیا لیکن تم ادھر ہی وائن شاپ کے آس پاس گھومتے رہے..... ہیں نا؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نہیں جناب..... بالکل نہیں۔'' وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں ادھر ہی گھومتا رہا تھا؟''

''استغاثہ کے ایک دعوے سے تو یہی تاثر ابھرتا ہے۔''

میں توقع کر رہا تھا کہ اس موقعے پر وکیل استغاثہ ضرور بیچ میں چھلانگ لگائے گا لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی اور تشویش ناک سنجیدگی سے وہ میری جرح سماعت کرتا رہا۔ لگتا تھا، اس کیس کے حوالے سے اس کے تازیانے ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ زاہد اور نذیر کی گواہی نے میرے مؤکل کو جس طرح بے گناہ ثابت کرنے کی راہ ہموار کی تھی اس سے استغاثہ اور وکیل استغاثہ کی گویا کمر ٹوٹ گئی تھی۔

وکیل استغاثہ کی جانب سے تو کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا لیکن استغاثہ کے گواہ نیلسن نے تعجب خیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جناب! آپ کس دعوے کی بات کر رہے ہیں.....؟''

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا۔ ''استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ تم نے وقوعہ کی رات ملزم کو اپنے دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر مورس کے پیچھے جاتے دیکھا تھا۔ اگر تم وائن شاپ کے آس پاس نہیں گھوم رہے تھے تو پھر تم نے یہ منظر کیسے دیکھ لیا؟''

''یہ منظر میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔

''پھر کیا تمہیں الہام ہوا تھا؟'' میں نے دُرشت لہجے میں کہا۔

''مجھے یہ بات فاروق نے بتائی تھی۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

''فاروق..... کون فاروق؟'' میں نے پوچھا۔

''فاروق ایک کرائم رپورٹر ہے۔'' نیلسن نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ وہ اسی علاقے میں رہتا ہے جہاں ہماری وائن شاپ ہے۔''

''فاروق کس اخبار کے لیے رپورٹنگ کرتا ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

اس نے جواب میں مجھے جس اخبار کا نام بتایا وہ وہی اخبار تھا جس کا بیورو چیف ڈاکٹر واحد تھا۔ میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! اگر اجازت ہو تو میں ملزم کے بھائی ڈاکٹر واحد سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا ڈاکٹر واحد اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہیں؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔

''جی ہاں، ڈاکٹر صاحب موجود ہیں۔'' میں نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

''اجازت ہے!'' جج نے گمبھیر آواز میں کہا۔

ڈاکٹر واحد جج کے حکم پر وٹنس باکس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا جبکہ نیلسن وٹنس باکس کے اندر موجود تھا۔ میں نے ڈاکٹر واحد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا فاروق نامی یہ کرائم رپورٹر آپ کے اخبار سے منسلک ہے؟''

''جی ہاں، وہ اسی اخبار کے اسٹاف کا حصہ ہے۔'' ڈاکٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔''

ساری معلومات رکھنے کے باوجود بھی میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ کیا بات ہوئی ڈاکٹر صاحب..... وہ اخبار کے اسٹاف میں تو شامل ہے لیکن آپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اپنے اس بیان کی تھوڑی وضاحت کریں گے؟''

''میں جس اخبار کا انچارج ہوں وہ صرف دو صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ہمارے علاقے ہی کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ دو صفحات ایک سپلیمنٹ کی طرح اسی اخبار کے ساتھ بلکہ اسی کے اندر نیوز اسٹینڈ تک پہنچتے ہیں اور اس سپلیمنٹ ٹائپ اخبار پر بھی اسی اخبار کی لوح چھپی ہے جس کا یہ حصہ ہے۔'' ڈاکٹر واحد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''استغاثہ کے گواہ نیلسن نے جس کرائم رپورٹر کا ذکر کیا ہے اس کا تعلق مذکورہ اخبار کے ہیڈ آفس سے ہے۔ سلمان فاروقی صاحب کے لیے کام کرتا ہے جو کہ اس صحافی بزنس میں میرے پارٹنر ہیں۔ اسی بنا پر میں نے کہا ہے کرائم رپورٹر فاروق کا مجھ سے یا میرے اخبار سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔''

جیسا کہ میں ابتدا میں بتا چکا ہوں، ڈاکٹر واحد میری گہری دوستی تھی لہٰذا میں اس کے اخباری معاملات بھی تفصیلاً آگاہ تھا لیکن عدالت کے سامنے بعض چیزیں ڈرامائی انداز میں پیش کرنا ضروری ہوتا ہے اس لیے میں ڈاکٹر سے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ کو اپنا پرچہ (اخبار) مارکیٹ لائے لگ بھگ ایک ماہ ہو گیا تھا، یعنی وقوعہ کے وقت تک

لیکن تمام تر محنت اور توجہ کے باوجود بھی خاطر خواہ مثبت نتائج سامنے نہیں آئے تھے۔ اس کی کوئی خاص وجہ.....؟''

''سازش.....!'' اس نے مختصراً کہا۔

''کیسی سازش ڈاکٹر صاحب؟'' میں نے پوچھا۔

''ہیڈ آفس میں کچھ لوگوں کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ سلمان فاروقی صاحب میرے ساتھ مل کر بزنس کریں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''وہ سلمان صاحب کو اپنی مٹھی میں رکھ کر دھیرے دھیرے کاٹنا چاہتے تھے۔ جب میں نے سلمان صاحب کے آفس کا یہ حال دیکھا تو ہمدردی اور دوستی میں انہیں مشورے دینے لگا۔ میرا یہ عمل سازشی لوگوں کو بالکل پسند نہ آیا اور وہ چپکے چپکے سلمان صاحب کے کان بھرنے لگے۔'' اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''سلمان صاحب کو تو وہ لوگ میرے خلاف بھڑکا ہی رہے تھے۔ اس کے علاوہ بھی ان کی عملی کوششیں جاری تھیں۔''

''عملی کوششیں..... کیا مطلب؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''سلمان فاروقی صاحب کو صحافتی دنیا کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔'' وہ بتانے لگا۔ ''اسی لیے وہ ان لوگوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنے ہوئے ہیں جنہوں نے انہیں ایک موٹی مرغی سمجھ کر پہلے ہفت روزہ نکلوایا اور بعد میں اسے روزنامہ میں تبدیل کرایا۔ مسلسل نقصان کے باوجود بھی وہ لوگ سلمان صاحب کو مستقبل کے سنہرے خواب دکھانے میں مصروف تھے..... مصروف تھے، میں نے اس لیے کہا کہ جب سے میں اور مجھ جیسے چند دوسرے لوگ سلمان صاحب کے حلقے میں آئے ہیں، ان کے لیے کافی مشکلات کھڑی ہو گئی ہیں لہٰذا وہ لوگ پہلی فرصت میں مجھے سلمان فاروقی سے دور کر دینا چاہتے ہیں۔''

''اس دنیا میں یہ کھیل تماشے تو جاری ہی رہتے ہیں ڈاکٹر صاحب!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''خیر..... آپ سازشی عناصر کی سازشوں کے بارے میں بتا رہے تھے؟''

''انہوں نے اب تک کیا نہیں کیا وکیل صاحب!'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''کوئی ایک زیادتی ہو تو بتاؤں.....''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے فوراً اعتراض جڑ دیا۔ ''میرے فاضل دوست نے ایک نئی کہانی شروع کر دی ہے۔''

''جناب عالی!'' میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ٹھوس الفاظ میں کہا۔ ''یہ کہانی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس بات کا پتا چلانا بہت ضروری ہے کہ کرائم رپورٹر فاروق نے استغاثہ کے گواہ نیلسن کو مس گائیڈ کیوں کیا تھا۔ جب ملزم اپنے دوست کے ہمراہ مقتول کے تعاقب میں نہیں گیا تو کرائم رپورٹر کو اس غلط بیانی کی ضرورت کیوں پیش آئی.....؟''

''بیگ صاحب..... پلیز پروسیڈ!'' جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

میں دوبارہ ڈاکٹر واحد کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ بتانے لگا۔ ''وکیل صاحب! کئی روز تک تو میرے والے دو صفحات کے بغیر ہی اخبار ہمارے علاقے میں آتا رہا۔ میں نے سلمان صاحب سے شکایت کی۔ انہوں نے کارروائی کر ڈالی۔ اخبار میرے علاقے میں پہنچنے لگا لیکن ڈپو سے بنڈل جیسے بندھے ہوئے آتے تھے ویسے ہی نیوز اسٹینڈ کی بغل میں رکھے رہتے تھے۔ میری کوشش اور بھاگ دوڑ سے اخبار ڈسپلے ہونے لگا لیکن اس طرح کہ دوسرے اخبارات کے نیچے دبا کر۔ میرے رپورٹرز، فوٹو گرافرز اور اسٹاف کے دیگر افراد کو ورغلانے اور گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ میں ہی جانتا ہوں کہ میں نے حالات کا مقابلہ کس طرح کیا ہے۔''

''یہ تو وہ سازشیں ہیں جو ہیڈ آفس کے لوگ کر رہے تھے تاکہ وہ سلمان فاروقی کو اپنی گرفت میں رکھ کر فائدے حاصل کرتے رہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ اس امر پر بھی روشنی ڈالیں گے کہ کرائم رپورٹر فاروق نے استغاثہ کے گواہ نیلسن سے دروغ گوئی کیوں کی؟''

''اس لیے کہ میرے سپلیمنٹ سے سب سے زیادہ تکلیف اسی شخص کو پہنچی تھی۔'' ڈاکٹر نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''وہ کس طرح ڈاکٹر صاحب؟'' میں نے استفسار کیا۔

''فاروق بھی اسی علاقے کا رہنے والا ہے جہاں میں رہتا ہوں۔ ایک اخبار کا کرائم رپورٹر ہونے کے ناتے یہاں کے مقتدر حلقوں، نیوز اسٹینڈ والوں اور ہاکرز وغیرہ پر اس کے اثرات ہیں۔ میری فاروق سے اور فاروق کی مجھ سے کوئی ذاتی دشمنی تو نہیں لیکن سلمان صاحب کی زبانی مجھے جو حالات پتا چلے ہیں ان کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ فاروق کو میرے کام سے بڑا گہرا صدمہ پہنچا تھا۔''

''سلمان فاروقی نے آپ کو ایسی کون سی بات بتا دی تھی؟''

''سلمان صاحب کے مطابق فاروق اپنے علاقے کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیورو چیف بننا چاہتا تھا۔'' ڈاکٹر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن سلمان صاحب نے اس کی بات نہیں مانی اور مجھ سے پارٹنر شپ کرلی۔ سلمان صاحب کا یہ فیصلہ فاروق کو بہت ناگوار گزرا تھا اسی لیے اس نے میرے کام کی راہ میں مختلف انداز سے روڑے اٹکانا شروع کردیے تھے۔''

''ہوں.....!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ فاروق نے استغاثہ کے گواہ نیلسن سے جو غلط بیانی کی اس سے وہ کون سا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا؟''

''یہ تو اسے عدالت میں بلا کر ہی پوچھا جاسکتا ہے۔'' ڈاکٹر واحد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''دیٹس آل یور آنر!'' میں نے ڈاکٹر سے سوالات کا سلسلہ موقوف کردیا۔

جج تھوڑی دیر تک اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کو گھورتا رہا پھر وکیل استغاثہ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ آپ کی ڈیوٹی ہے کہ آیندہ پیشی پر کرائم رپورٹر فاروق عدالت میں حاضر ہو اور بیگ صاحب.....'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ جوزف نامی اس شخص کو عدالت میں لائیں گے جو مقتول سے شدید نفرت کرتا تھا۔''

میں نے نہایت ہی احترام سے کہا۔ ''اگرچہ جوزف کو عدالت میں حاضر کرنا بھی استغاثہ ہی کے فرائض کا حصہ ہے لیکن معزز عدالت کا حکم سر آنکھوں پر.....''

جج نے اثبات میں گردن ہلائی اور عدالت برخاست کردی۔

☆☆☆

اگلی پیشی پر میں نے مقتول کے رقیبِ روسیاہ کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کردیا۔ جوزف کے حلفیہ بیان نے اس کی جائے وقوعہ سے عدم موجودگی ثابت کرتے ہوئے اسے بے گناہ قرار دے دیا لہٰذا عدالت نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ جوزف کو مورس سے جذباتی دشمنی ضرور تھی لیکن وہ اس کی موت کا خواہاں ہرگز نہیں تھا۔ مورس کو پیش آنے والے واقعے کا اسے دلی افسوس تھا۔ وہ محبت میں حسد اور رقابت کا شکار ہوگیا تھا تاہم ان کیفیات میں بھی اس نے کبھی مورس کی جان لینے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔

اس پیشی پر وکیل استغاثہ کرائم رپورٹر فاروق کو عدالت میں پیش نہ کرسکا۔ پتا چلا کہ وہ اندرونِ سندھ ڈاکوؤں کی پناہ گاہوں کے حوالے سے کوئی خاص مہم سر کرنے گیا ہوا ہے۔ اس کے بعد والی دو، تین پیشیوں پر بھی جب وہ غیر حاضر رہا اور وکیل استغاثہ اس کی مصروفیات کے حوالے سے مختلف عذ گھڑنے میں مصروف نظر آیا تو میں نے جج سے کہا۔

''جناب عالی! اب تک کی عدالتی کارروائی کے نتیجے میں میرا مؤکل اور اس کیس کا ملزم عاقل مکمل طور پر بے گنا ثابت ہو چکا ہے لہٰذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ اس بے قصور کو عدالتوں میں مزید گھسیٹنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔ چنانچہ اس کی باعزت بریت کے احکامات صادر کرتے ہوئے، اس کے خلاف دائر اس کیس کو فی الفو خارج کیا جائے۔''

جج نے میری درخواست پوری توجہ سے سنی پھر وکیل استغاثہ کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگلی پیشی پر ہر صورت میں کرائم رپورٹر فاروق کو عدالت میں حاضر ہونا چاہیے ورنہ ملز کے حق میں فیصلہ سنا دیا جائے گا۔''

اس کے بعد جج نے سات دن کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

آیندہ پیشی کی تاریخ آنے سے پہلے ہی فاروق کی خبر آگئی اور وہ ایسی خبر تھی کہ اب اسے عدالت میں حاضر ہونے کی حاجت نہیں رہی تھی۔ وہ اس عدالت کی جانب بڑھ گیا تھا جہاں کے فیصلے حتمی ہوتے ہیں۔

واقعات کے مطابق لینڈ مافیا کے ایک گروہ سے اس کا جھگڑا ہوگیا تھا۔ کرائم رپورٹر ہونے کے ناتے اکثر جرائم پیشہ افراد سے اس کے رابطے استوار تھے اور وہ ہر ایک سے بھتہ بھی لیا کرتا تھا لیکن لینڈ مافیا کے مذکورہ گروہ کے ساتھ اس کی ایسی بگڑی کہ انہوں نے چلتی ہوئی سڑک پر اسے گولیوں سے بھون ڈالا۔

موقعے پر موجود افراد میں سے چند ایک نے ہمت کی اور اسے اٹھا کر قریبی اسپتال لے گئے لیکن اس کی جان نہ بچائی جاسکی۔ اپنی زندگی کی آخری سانسوں میں دیگر اعترافات کے ساتھ ہی اس نے مورس کے قتل کا اقرار بھی کرلیا۔

اس کی مورس کے ساتھ براہِ راست کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اس نے یہ خونیں ڈراما محض ڈاکٹر کے بھائی کو پھنسانے کے لیے کیا تھا لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ..... جسے اللہ رکھا، اسے کون چکھے۔

ڈاکٹر کا بھائی باعزت بری ہوکر گھر چلا گیا اور کرائم رپورٹر فاروق کو موت نے ایک ایسی عدالت میں پہنچا دیا جہاں صرف اور صرف انصاف ہوتا ہے۔

(تحریر: حُسام بٹ)

انسپکٹر شاہد علی ابھی تھانے پہنچا ہی تھا کہ اسے یہ اطلاع ملی کہ قریبی علاقے میں ایک قتل ہوگیا ہے۔ اسے فوری طور پر وہاں پہنچنے کا حکم دیا گیا تھا۔

انسپکٹر شاہد علی قتل کے کیس حل کرنے میں خصوصی شہرت رکھتا تھا۔ وہ مغربی طریقۂ تفتیش سے بہت متاثر تھا۔ اس نے ہالی وڈ کی تمام ایسی فلمیں دیکھ رکھی تھیں جن میں کسی کیس کو حل کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ وہ ان کی تفتیش پر مبنی رپورٹیں اور کہانیاں بھی بڑی دلچسپی اور توجہ سے پڑھتا تھا اور اس سے حاصل ہونے والے تجربے کو اپنی تفتیش میں استعمال کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب تک وہ بہت کامیاب رہا تھا۔ اسے اب تک کُل پندرہ قتل کے کیس دیے گئے تھے اور اس نے سب کیس بہت کم مدت میں حل کرلیے تھے۔ اس کے شاندار ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ سولہواں کیس بھی اسے ہی دیا گیا تھا۔

چند ضروری چیزیں لے کر وہ جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ مقتول کے ملازم نے اسے لاش تک پہنچا دیا۔ مقتول جاوید علی قریباً پینتالیس سال کے لگ بھگ تھا۔ اس کا قد لمبا اور جسم بھرا بھرا تھا۔ دیکھنے میں وہ اچھی صحت کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ لاش جائے وقوع پر اوندھے منہ غسل خانے اور بیڈ کے درمیان موجود جگہ پر پڑی تھی۔ لاش کے گلے میں سرخ رنگ کا مفلر تھا جس کی مدد سے اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔

عینی شاہد

نظارت نصر

عہدِ حاضر کا المیہ یہ ہے کہ جرم ہوتا دیکھ کر بھی آنکھیں بند کرنا پڑتی ہیں... کیونکہ نگاہوں کا نہ چرانا بھی جرم بنتا جارہا ہے... خوش قسمتی سے ابھی یہ مجبوری صرف انسانوں کے پیروں کی زنجیر بنی ہے۔ جانور فی الحال اس سے آزاد ہیں... معلوم نہیں وہ زندگی سے بے پروا ہوتے ہیں یا سچائی کے علمبردار... معاملہ چاہے جو بھی ہو یہاں نتیجہ انتہائی کارآمد نکلا۔

ایک قاتل کی کہانی..... ایک۔ بے زبان کی زبانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لاش کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے قتل ہوئے کافی وقت ہوگیا ہے۔ انسپکٹر کے اندازے کے مطابق کم از کم بارہ گھنٹے قبل یہ قتل ہوا تھا۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ایک تو مقتول نے قتل ہونے سے قبل کوئی خاص مزاحمت نہیں کی تھی۔ دوسرے یہ کہ قاتل یا قاتلوں نے کسی ہنگامی وجہ سے اسے قتل نہیں کیا تھا بلکہ وہ صرف اسے ہی قتل کرنے کے ارادے سے آئے یا آیا تھا۔ کمرے کی کسی چیز کو چھوا تک نہیں گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ یہ چوری کی واردات میں مزاحمت پر ہونے والا قتل بھی نہیں تھا۔ مزید تصدیق گھریلو ملازم انور حسین نے بھی کر دی۔ بہ ظاہر گھر سے کوئی چیز کم نہیں تھی۔

جائزہ لینے کے بعد انسپکٹر نے مقتول کے کپڑوں کی احتیاط سے تلاشی لی۔ وہ سلیپنگ گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ سونے کی تیاری کر چکا تھا۔ اس تلاشی کے دوران میں اسے کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں ملی تھی۔

اس کے بعد پہلے اس نے کمرے اور پھر الماری کی تلاشی لی۔ الماری کے اندرونی خانے سے اسے ایک سیاہ کور والی ڈائری ملی۔ انسپکٹر نے اسے جیب میں منتقل کرلیا۔

تفتیشی ٹیم کے ارکان پہنچ چکے تھے۔ وہ لاش اٹھوانے اور شواہد جمع کرنے کے انتظامات کر رہے تھے۔ انسپکٹر شاہد علی انہیں مصروف چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے ایک چکر پورے گھر کا لگایا۔ مقتول نے کافی پرندے پال رکھے تھے۔ جن میں طوطے، چڑیاں، کبوتر اور کئی دوسرے ملکوں کے پرندے بھی شامل تھے۔

انسپکٹر چند لمحے انہیں دیکھتا رہا پھر ملازم کے پاس آگیا جو ایک طرف خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ انسپکٹر اس سے کافی دیر تک سوال جواب کرتا رہا۔ جن کا خلاصہ یہ تھا کہ مقتول اپنے ماں باپ کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اس کی ایک بہن تھی جو شادی کے بعد لندن چلی گئی تھی۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ مقتول جاوید علی اس گھر میں اپنے ملازم اور پرندوں کے ہمراہ رہتا تھا۔ مقتول کا لوگوں سے زیادہ میل جول نہیں تھا۔ اس سے بہت کم لوگ ملنے کے لیے آتے تھے۔ وہ ایک درمیانے درجے کا کاروباری شخص تھا اور ابھی تک غیر شادی شدہ تھا۔

ملازم کے بقول وہ غصے کا کافی تیز مگر بہت خیال رکھنے والا مالک تھا۔ وقوعہ کی رات وہ چھٹی لے کر اپنے گھر گیا ہوا تھا۔ اس کی بیوی بیمار تھی۔ صبح آنے پر اسے دروازہ کھلا ملا جس سے وہ فکر مند ہوا۔ کمرے میں آنے پر اسے علم ہوا کہ [illegible] کے مالک کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس نے فوراً لندن اور پھر تھانے میں اطلاع کر دی۔ مقتول کی بہن کی اپروچ کی وجہ سے ہی اس کیس میں حکام بالاخصوصی دلچسپی لے رہے تھے۔

انور حسین نے کسی پر اپنے شک کا اظہار نہیں کیا تھا۔ انسپکٹر اسے کہیں جانے سے پہلے تھانے میں اطلاع کرنے کا پابند کر کے واپس تھانے کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

انسپکٹر نے اس ڈائری کی مدد سے مقتول کے دوستوں اور دشمنوں کے نام اور پتوں کے ساتھ بنائی گئی اپنی دونوں لسٹوں کو ڈائری کے اوپر رکھ دیا اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اٹھالی۔

اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ مقتول کو رات نو سے گیارہ کے درمیان گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ قتل سے قبل اس نے بالکل معمولی سی مزاحمت کی تھی۔ ایک دوسری رپورٹ بھی ہمراہ تھی جس میں درج تھا کہ مقتول کے گھر سے اس کے اور ملازم کے فنگر پرنٹس کے علاوہ کسی کے ہاتھوں کے نشانات نہیں ملے۔ باقی صفحات پر مقتول کے دیگر کوائف درج کیے گئے تھے۔ انسپکٹر نے اپنی ذاتی کوشش سے یہ رپورٹیں چند گھنٹوں میں حاصل کرلی تھیں، اس نے رپورٹ رکھ کر ایک مرتبہ پھر لسٹیں اٹھالیں۔ اس ڈائری کو پڑھ کر اسے اندازہ ہوا تھا کہ مقتول دشمنیاں پالنے کا شوقین تھا۔ اس نے سب دشمنوں کی باقاعدہ تفصیلات لکھ رکھی تھیں تاکہ دشمنی تازہ رہے اور وقت کی گرد اس کو دھندلا نہ سکے۔ دوستوں کی لسٹ میں صرف چند نام تھے جبکہ دوسری لسٹ کافی طویل تھی۔

انسپکٹر نے تحریر کے مطابق ان لوگوں کے ناموں کے گرد سرخ دائرہ لگایا۔ جن سے دشمنی کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ قتل جیسے جرم کا ارتکاب کر سکتے تھے جبکہ باقی لوگوں سے محض معمولی تلخ کلامی یا ہلکی پھلکی جھڑپ کو ہی اس نے دشمنی گردان لیا تھا۔

انسپکٹر نے فرداً فرداً سب سے ملنے کا فیصلہ کیا اور نکل کھڑا ہوا مگر پہلے ہی مقام پر اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ لسٹ کے مطابق پہلے شخص سے مقتول کا کاروباری جھگڑا تھا مگر وہ شخص پچھلے دو سالوں سے بیرونِ ملک سیٹل ہو چکا تھا۔ اس کا اب پاکستان سے کوئی رابطہ نہ تھا۔

لسٹ میں درج اگلا نام فیض علی کا تھا۔ یہ مقتول کا کوئی دور یا نزدیک کا رشتے دار تھا اور اسی شہر کی ایک مضافاتی کالونی میں رہائش پذیر تھا۔ اس سے وجہ عناد یہ تھی کہ مقتول اس کی بہن سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر فیض علی نے اسے اپنی بہن کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

اس شخص پر شک کیا جاسکتا تھا کیونکہ امکان تھا کہ مقتول نے رشتے کے تنازعے پر کبھی کوئی غلط بات کہہ دی ہو یا کوئی نازیبا حرکت کی ہو جس سے مشتعل ہو کر فیض علی نے اسے قتل کر دیا ہو۔

انسپکٹر کو فل یونیفارم میں ملبوس اپنے سامنے پاکر فیض علی کی حالت غیر ہوگئی۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے۔ وہ واضح طور پر لرز رہا تھا۔ انسپکٹر نے بہ غور اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لیا، پھر پوچھا۔

''کل رات تم کہاں تھے؟''

''میں...... میں جی اسپتال میں...... میرا بیٹا وہاں داخل تھا جی، ہم آج ہی گھر آئے ہیں جی۔'' وہ بری طرح ہکلا رہا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے کل رات تمہارا رشتے دار جاوید علی قتل ہوگیا ہے۔'' انسپکٹر نے گویا دھماکا کیا تھا۔ وہ ہکا بکا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس کے چہرے کے تاثرات عجیب سے ہوگئے۔ اب وہ پہلے کے مقابلے میں سنبھلا ہوا قدرے پُرسکون اور بے فکر بھی نظر آرہا تھا اور جب وہ بولا تو اس کی آواز کی لرزش بھی کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔ اس نے کہا۔

''صاحب جی مجھے اس کے قتل سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ کوئی نو برس قبل ہمارا رشتے کے لین دین پر جھگڑا ہوگیا تھا اس دن سے آج تک ہم ایک دوسرے سے نہیں ملے۔ نہ ہی میں اس کے قاتل کو گرفتار کرنے میں دلچسپی رکھتا ہوں نہ اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد کرسکتا ہوں۔''

انسپکٹر نے پُرسوچ نگاہوں سے اسے تادیر دیکھا پھر اس کے کہنے پر فیض علی نے اسپتال سے بھی اپنی بات کی تصدیق کروادی۔ انسپکٹر نے اسے بھی شہر سے باہر جانے سے قبل تھانے میں اطلاع دینے کی تاکید کی اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ شام جھک آئی تھی، باقی کارروائی کل پر ڈال کر وہ گھر روانہ ہوگیا۔

اگلے دن صبح صبح کا وقت تھا، اس لیے اسے یقین تھا کہ مذکورہ اشخاص گھر پر ہی مل جائیں گے۔ یہ دو بھائی پہلے مقتول کے ملازم رہ چکے تھے۔ بہت برس قبل، ایک مرتبہ آفس میں آگ لگ گئی جس سے فرنیچر کے ساتھ ساتھ بہت سا اہم ریکارڈ بھی جل گیا۔ جس کی وجہ سے مقتول کو کافی بھاری مالی نقصان بھی ہوا تھا۔ اس نے ان دونوں بھائیوں کو جیل میں الوا دیا مگر وہ بری ہوگئے تھے۔

دروازہ کھولنے پر جب انہوں نے انسپکٹر کو دیکھا تو بری طرح گھبرا گئے۔ وہ کام کے لیے گھر سے نکل رہے تھے کہ انسپکٹر کسی بلا کی طرح نازل ہوگیا۔ انہوں نے بنا کچھ سوچے سمجھے منت آمیز لہجے میں اس سے اپنی ناکردہ خطا کی معافی مانگنا اور رحم کی درخواست کرنا شروع کر دی۔ انسپکٹر جانتا تھا کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کی بدنامی کی وجہ سے پہلی مرتبہ پولیس کے چکر میں آنے والا اور پولیس کی تفتیش بھگت لینے والا بے گناہ دونوں اسی طرح گھبراتے اور ہونقوں جیسی حرکات کرتے ہیں۔ انسپکٹر نے ایک لمبا سانس لیا اور ان دونوں بھائیوں پر قتل کا الزام عائد کرتے ہوئے کہا۔

''تم دونوں نے بالآخر اتنے برس قبل ہونے والی زیادتی اور بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے سابقہ مالک جاوید علی کو قتل کر ہی دیا مگر دیکھو پولیس تم تک پہنچ گئی۔''

انسپکٹر کی بات سن کر ان کی آنکھیں باہر کو ابل آئی تھیں حیرت کی زیادتی سے۔ انسپکٹر اپنی تعلیم اور تجربے کے پیش نظر خاموشی سے انہیں بہ غور دیکھتا رہا۔ اس نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔ نتیجہ اس کی توقع کے برعکس بھی نکل سکتا تھا۔ چند لمحے لگے تھے انہیں حیرت کے اس شدید جھٹکے سے سنبھلنے میں۔ اب نفرت اور غصے کا تاثر ان کے چہرے پر بہ خوبی

پڑھا جارہا تھا۔ بڑا بھائی کچھ بولنے کو منہ کھول ہی رہا تھا جب چھوٹے نے تیز لہجے میں کہا۔

''سر جی! اس شخص پر ہم بہت سال پہلے ہی خاک ڈال چکے ہیں۔ پہلے بھی ایک مرتبہ اس نے ہمیں پولیس کے حوالے کیا تھا آج پھر مر کر ہمارے سر پر مسلط ہوگیا ہے۔ ہمیں تو اس کی شکل دیکھے بھی سالوں گزر گئے ہیں اور معاف کرنا سر جی اگر ہمیں اسے قتل ہی کرنا ہوتا تو تب کرتے جب اس نے ہمارے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اب تو اتنے سالوں بعد ہم بھول بھی چکے ہیں۔''

انسپکٹر نے ٹوکے بنا اس جوشیلے مقرر کا ایک ایک لفظ توجہ سے سنا۔ اس کے حرف حرف سے اس کے سچا ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ یہ انسپکٹر کا ذاتی تجربہ تھا مگر قانونی تقاضا بھی پورا کرنا تھا۔ سو اس نے ان سے اپنی پرسوں رات کی کہیں موجودگی کا ثبوت مانگا۔ وہ لوگ خوش ہوگئے کیونکہ خوش قسمتی سے پرسوں رات نائٹ شفٹ میں دونوں نے اوور ٹائم لگایا تھا اور پوری رات فیکٹری میں موجود رہے تھے۔ انہوں نے انسپکٹر کے کہنے پر آنے اور جانے کا وقت نوٹ کرا کے اپنی پوری رات کی فیکٹری میں موجودگی ثابت کرادی تھی۔

وہاں سے واپس آکر وہ مقتول کے سب ہمسایوں سے ملا۔ اردگرد کے لوگوں سے پوچھ گچھ کی مگر کسی نے بھی قاتل کو آتے یا جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ جس وقت یہ قتل ہوا، اس وقت اس سارے علاقے میں بجلی بند ہوتی تھی جس کا فائدہ اٹھا کر مجرم یا مجرموں نے اپنی کارروائی آسانی سے مکمل کی اور نکل جانے میں کامیاب ہوگئے۔ انور حسین بھی اب تک کی تفتیش میں بے قصور ثابت ہوا تھا۔ شام کو انسپکٹر شاہد علی وقت لے کر ایک معروف بزنس مین حبیب گورائیہ کے آفس چلا آیا۔ مقتول کی ڈائری میں اس شخص کا نام بھی درج تھا۔ جھگڑے کی وجہ نہایت عام سی تھی، حبیب گورائیہ ہوٹل کے کمرا نمبر سیون میں ٹھہرا ہوا تھا۔ سیون مقتول جاوید علی کا لکی نمبر تھا۔ اسے ایک بزنس ڈیل کرنا تھی اس نے جیب گورائیہ کو کمرا خالی کرنے کا کہا لیکن اس کے انکار پر آپے سے باہر ہوگیا۔ نوبت گالی گلوچ اور ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ جیب گورائیہ ڈھلتی عمر کا ایک دھان پان سا شخص تھا۔ باقی لوگوں کے بیچ بچاؤ کرانے تک مقتول نے اسے کافی چوٹیں لگا دیں۔ بعد میں کافی عرصے تک اس کا مقدمہ بھی چلتا رہا۔ پھر دونوں فریقوں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے بے نتیجہ ہی ختم ہوگیا تھا۔

حبیب گورائیہ نے اس کا استقبال بہت اچھی طرح کیا۔ حالانکہ وہ عام کپڑوں میں ملبوس تھا، انسپکٹر نے پہلا سوال کیا۔ ''سر اس ایک جھگڑے کے بعد بھی آپ کے درمیان کوئی لڑائی ہوئی تھی؟''

''تمہارے اس سوال کا مقصد؟'' حبیب گورائیہ نے کمر کرسی کی پشت سے ٹکا کر پُرسکون انداز میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ انسپکٹر نے صاف بات کی۔

''جناب آپ جانتے ہیں کہ جاوید علی قتل ہوگیا ہے۔'' اس کی بات سن کر حبیب گورائیہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے اس کا لہجہ بلند اور آواز تیکھی ہوگئی۔

''اور تم مجھ پر شک کر رہے ہو، حالانکہ ہمارے درمیان آن آفیشلی صلح ہوگئی تھی۔ میں نے یہ کیس تقریباً جیت لیا تھا۔ اس طرح جاوید کو ایک بھاری رقم بطور ہرجانہ مجھے ادا کرنی تھی۔ وہ پہلے ہی کاروبار میں نقصان اٹھا رہا تھا سو ایک شام میرے گھر آگیا۔ اس نے میری بیوی کے سامنے مجھ سے معافی مانگی اور کیس سے لاتعلق ہوجانے کی درخواست کی۔ اس نے یہ معافی تحریری طور پر بھی مانگی تھی۔ میں نرم دل آدمی ہوں پھر میری بیوی نے بھی سفارش کی تھی۔ میں نے اسے معاف کردیا، میں تمہیں معافی نامہ بھی دکھا سکتا ہوں۔''

اس نے اپنی سیکریٹری سے وہ معافی نامہ منگوا کر انسپکٹر کے سامنے ڈال دیا۔ شاہد علی نے دھیان سے تحریر پڑھی۔ وہ واقعی مقتول کی تحریر تھی، نیچے اس کے دستخط بھی موجود تھے۔

''اس واقعے کے بعد ہم کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملے۔ میں نے تب معاف کردیا تھا تو پھر اتنے عرصے کے بعد مجھے اسے قتل کرنے یا کرانے کی کیا ضرورت تھی اور ایکسکیوزمی تم پہلے ہی طے شدہ وقت سے زیادہ لے چکے ہو۔'' دوسرے لفظوں میں حبیب گورائیہ نے شائستگی کا چولا اتار کر اسے دفع ہوجانے کو کہا تھا۔ انسپکٹر اس کا شکریہ ادا کر کے نکل آیا۔

اگلے دو تین دنوں میں انسپکٹر نے مقتول کے سب دوستوں سے بھی ملاقات کرلی۔ وہ دو تین مرتبہ اس کے گھر سے بھی ہو آیا مگر ابھی تک کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔ بہ ظاہر آسان نظر آنے والا یہ کیس اس کے گلے کی ہڈی بنتا جارہا تھا۔ ابھی تک کسی قسم کی پیش رفت نہیں ہوسکی تھی۔ کئی دنوں کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر ڈائری کھول کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک ایک صفحہ پڑھ ڈالا مگر کوئی نئی بات نہ تھی۔ سب کچھ اسے پہلے سے معلوم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ بیٹھے بیٹھے اچانک کسی خیال کے تحت اس نے ڈائری کا سیاہ کور اتار لیا۔ اس کی آنکھوں میں تیز چمک لہرائی۔ کور کے ساتھ ایک تہ کیا ہوا کاغذ بھی اس کی گود میں آن گرا تھا۔ یقیناً اس میں کوئی خاص چیز تھی، اس نے جلدی سے کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

اس میں بھی دشمنی کا ذکر تھا۔ مقتول جوا کھیلنے کی عادت کا بھی شکار تھا، غالباً اسی وجہ سے فیض علی نے اس کے رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ہر جمعے کی شام جوا کھیلتا تھا اور شیدے نامی ایک شخص سے کبھی جیت نہ پایا تھا۔ اکثر وہ دوسروں سے بھی ہارتا رہتا تھا۔ اسے اس بات کا بہت قلق تھا، جب آخری مرتبہ اس نے شیدے سے جوئے میں ایک بھاری رقم ہاری تو برداشت نہ کر سکا اور اسے پینے لگا۔ نشے کا عادی، بیماریوں کا شکار شیدا مزاحمت بھی نہ کر سکا۔ مقتول نے نہ صرف اس کے سامنے کے دو دانت توڑ دیے بلکہ اس کی جیتی ہوئی رقم بھی چھین لی۔ یہ کوئی ڈیڑھ دو ماہ قبل کا واقعہ تھا۔ انسپکٹر نے سر ہلایا۔ ''واقعی یہ قتل کے لیے ایک معقول جواز ہے۔''

اس کے بعد اس نے اپنے مخبروں کے ذریعے شیدے کا ٹھکانا معلوم کرایا اور اگلے دن علی الصباح اس کے گھر پہنچ گیا۔ دروازہ اس کی مفلوک الحال بیوی نے کھولا تھا۔ انسپکٹر نے شیدے کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ پچھلے دو ہفتوں سے گھر نہیں آیا ہے۔ فیض علی اور ان دونوں بھائیوں کے برعکس وہ غریب ان پڑھ عورت بڑے سکون سے انسپکٹر کو جواب دے رہی تھی۔ شاید وہ اس طرح پولیس کا سامنا کرتے رہنے کی عادی تھی۔ انسپکٹر نے ایک ایک لفظ تولتے ہوئے کہا۔

''تمہارے شوہر پر قتل کا شبہ ہے تم بتا سکتی ہو کہ وہ کہاں ہوگا؟'' عورت نے تنفر سے ہاتھ جھٹکا۔

''بس اسی ایک کام کی کمی تھی۔ بھلے سے اسے پھانسی چڑھا دو۔ گولی مار دو، کچھ بھی کر دو پھر کوئی اس کا پوچھتا ہوا نہ آئے گا۔ میری بھی جان چھوٹ جائے گی۔''

عورت واقعی اس سے تنگ آئی ہوئی تھی۔ اس نے انسپکٹر کو تین چار جگہوں کے پتے بتائے جن پر شیدے کے پائے جانے کا امکان تھا۔ انسپکٹر نے ایسی گھٹیا جگہوں پر خود جانے کے بجائے اپنے مخبروں کو بھیجا۔ اس طرح کم وقت میں نتیجہ سامنے آ گیا۔

شیدا ان میں سے کسی اڈے پر بھی نہیں ملا تھا۔ سب جگہوں سے ایک ہی جواب موصول ہوا تھا کہ وہ کافی دنوں سے نظر نہیں آیا۔ انسپکٹر سوچ میں پڑ گیا۔ یقیناً یہ قاتل ہو سکتا تھا۔ اب تک کے سارے ثبوت اس کے خلاف گئے تھے۔ اب اسے شیدے کو گرفتار کرنے کے لیے منصوبہ بندی کرنی تھی۔ وہ اٹھنے کی تیاری کر رہا تھا جب اسے مقتول کی بہن کا فون موصول ہوا۔ وہ لندن سے پاکستان پہنچ گئی تھی اور مقتول جاوید علی کے کیس انچارج سے ملنا چاہتی تھی۔

گھر جانے سے قبل انسپکٹر نے اس سے ملنے کا فیصلہ کیا اور مقتول کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مذکورہ خاتون نے بڑے مہذب انداز میں اس کا استقبال کیا اور چائے سے اس کی تواضع کی۔ اس نے بڑی خاموشی سے اس کی اب تک کی کارکردگی کو سنا اور اس کی کوشش اور محنت کو بھی سراہا۔

مقتول کی بہن ذکیہ خاتون پچاس کے پیٹے میں ایک دلکش خاتون تھی۔ اس کے لباس اور رکھ رکھاؤ سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی امیر خاتون ہے۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر بولی۔

''انسپکٹر صاحب میں آپ کو اس قتل کی واردات کا احوال سناتی ہوں۔ آپ اس لائن پر کام کر کے قاتل کو گرفتار کیجیے۔ جاوید علی رات کو سونے سے قبل نہانے کا عادی تھا۔ لائٹ جانے پر اس نے متبادل روشنی کا انتظام خود کیا کیونکہ ملازم چھٹی پر گھر چلا گیا تھا۔ پھر وہ نہانے چلا گیا۔ اسی اثنا میں دو نوجوان لڑکے کمرے میں آہستہ سے داخل ہو کر پردوں کے پیچھے چھپ گئے۔ چھپنے سے پہلے انہوں نے جاوید کا مفلر اٹھا لیا۔ انہوں نے ہاتھوں میں دستانے پہنے ہوئے تھے۔ ان میں ایک لڑکے کا قد لمبا، بال چھوٹے جبکہ دوسرے کے بال لمبے اور سامنے کا ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا۔ اس نے ایک کان میں بالی بھی پہنی ہوئی تھی۔ جاوید جب نہا کر نکلا تو انہوں نے اچانک اس پر حملہ کر دیا۔ متبادل لائٹ کی کم روشنی اور لاعلمی کی وجہ سے اسے ان کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ انہوں نے اسے نیچے گرایا اور اس کا قتل کر دیا۔

خاتون نے سسکی لی اور رک کر خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی، رونے سے اس کی آنکھیں اور ناک سرخ ہو رہے تھے۔ چند لمحوں بعد وہ دوبارہ بولی۔

''یہ واقعہ بالکل اسی طرح ہوا ہے۔ آپ یوں سمجھیں کہ عینی شاہد نے مجھے یہ سب بتایا ہے مگر میں کسی مجبوری کی وجہ سے اس وقت آپ کو اس سے نہیں ملوا سکتی۔ جب قاتل کو گرفتار کر لیں گے تو میں آپ کو اس عینی شاہد سے

ملواؤں گی۔ میری گزارش ہے کہ جتنی جلد ہو سکے آپ میرے بھائی کے قاتلوں کو گرفتار کر لیں۔ میں آپ کو اس کا الگ سے انعام دوں گی اور اس سلسلے میں جو بھی اخراجات ہوں گے وہ دینے کو تیار ہوں بس مجھے رزلٹ جلد مل جانا چاہیے۔'' انسپکٹر نے کافی اصرار کیا، کئی مرتبہ گھما پھرا کر بات کی مگر خاتون نے اسے عینی شاہد سے نہ ملوایا۔ ناچار وہ وہاں سے اٹھ گیا۔

ساری رات سوچ و بچار..... کے بعد وہ ایک منصوبہ ترتیب دے چکا تھا، گو کہ اس کی اب تک کی محنت بالکل اکارت چلی گئی تھی تاہم قاتل کے گرفتار ہو جانے کی امید بندھنے پر وہ ایک مرتبہ پھر نئے سرے سے تازہ دم ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس حلیے کا شخص یقیناً کسی نہ کسی نیٹ کیفے پر ضرور بیٹھتا ہوگا۔ سو اس نے اردگرد کے سب کیفے چھان ڈالے۔ ہر جگہ اس کا حلیہ بتا کر مدد کی درخواست کی مگر کوئی ایسے لڑکے کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ بہرحال اب بھی وہ کیفے سے فارغ ہو کر مقتول کے اردگرد کے لوگوں سے ایک مرتبہ پھر پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔ دو مزید کیفے بھگتانے کے بعد وہ اس جگہ آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس جگہ سے ہو کر وہ واپس چلا جائے گا۔

اس نے کیفے کے مالک کو حسبِ سابق حلیہ بتا کر مدد کی درخواست کرتے ہوئے اتنی تیزی سے بات مکمل کی کہ اسے بیچ میں بولنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ جب وہ خاموش ہوا تو کیفے کے مالک نے پرجوش انداز میں اسے بتایا کہ یہ حلیہ شہزاد اور اس کے دوست کا ہے لیکن وہ دس بارہ دنوں سے نہیں آ رہے۔ وہ انہیں تلاش کر لینے کا دعویٰ کر رہا تھا۔ کیونکہ انعام کی رقم اس کی توقع سے زیادہ تھی۔ انسپکٹر نے اسے اپنا نمبر دیا اور جلد سے جلد شہزاد کو گرفتار کرانے کی ہدایت کر کے واپس آ گیا۔

بہ ظاہر جتنا مشکل لگ رہا تھا۔ حل اتنی ہی آسانی سے مل گیا تھا۔ اب مزید بھاگ دوڑ کی ضرورت نہیں تھی۔ تاہم اس نے اپنے ایک مخبر کو کیفے کے مالک کے پیچھے لگا دیا تاکہ وہ ڈبل کراس نہ کر سکے۔

اگلے روز شام کو ہی اس کا فون آ گیا۔ اس کی آواز مارے جوش کے پھٹ سی گئی تھی۔ اس نے انسپکٹر کو اطلاع دی کہ وہ قاتلوں کو گھیر کر اپنے کیفے میں لے آیا ہے۔ انسپکٹر آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں دونوں کو..... حوالات میں بند کر چکا تھا۔ ان کا حلیہ بالکل وہی تھا جو ذکیہ خاتون یا ان کے عینی شاہد نے بتایا تھا۔ دونوں نے بغیر کسی حیل وحجت کے اعترافِ جرم بھی کر لیا۔

وجہ تھی ایک لڑکی، جو مقتول کے آفس میں کام کرتی تھی۔ یہ لڑکا بھی اسی کا ملازم تھا۔ مقتول نے اس لڑکی میں دلچسپی لینا شروع کی تو شہزاد نے اسے فون پر منع کیا، کیونکہ وہ خود اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مقتول نے شہزاد کی آواز پہچان لی اور اگلے روز اس لڑکی کے سامنے اس کی نہ صرف بہت بے عزتی کی بلکہ اسے کام سے بھی نکال دیا جس پر اس نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر اس کے قتل کا منصوبہ بنا لیا۔ اس کے دوست نے مقتول کے ساتھ والے خالی گھر کا بالائی کمرا کرایے پر حاصل کر لیا جس کی بالکونی مقتول کی بالکونی کے بالکل سامنے تھی۔ وقوعہ کی رات انہوں نے لکڑی کی سیڑھی کے ذریعے مقتول کی بالکونی میں اتر کر اسے قتل کیا۔ دروازہ کھولا تاکہ تفتیش کا رخ موڑا جا سکے اور اسی سیڑھی کے ذریعے واپس اس گھر میں چلے گئے۔ کچھ دن قبل انہوں نے وہ گھر چھوڑ دیا تھا مگر اس کی ڈپلیکیٹ چابی کی بدولت وقوعہ کی رات انہوں نے اس گھر کو استعمال کیا تھا۔

انسپکٹر انہیں حوالات میں بند کر کے سیدھا ذکیہ خاتون کے پاس پہنچا۔ اسے قاتلوں کی گرفتاری کی خبر سنائی جسے سن کر وہ ایک مرتبہ پھر رونے لگی لیکن اس نے قاتلوں کی گرفتاری پر سکون کا اظہار کیا۔ مگر انسپکٹر کو اس عینی شاہد سے ملنے کی جلدی تھی جس نے پولیس کو مجرموں کے بارے میں بتانے کے بجائے مقتول کی بہن کی آمد کا انتظار کیا اور خود پولیس کے سامنے بھی نہیں آیا۔ انسپکٹر کے یاد دلانے پر وہ سر ہلاتے ہوئے اٹھ کر چلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ ایک پنجرے میں بند طوطے کے ساتھ واپس آ گئی۔ اس طوطے کو انسپکٹر پہلے بھی مقتول کے گھر میں کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔

''یہ ایک بولنے والا طوطا ہے انسپکٹر صاحب! قتل کی رات یہ کھڑکی کے عین سامنے تھا۔ اس نے قتل اپنی آنکھوں سے دیکھا، مگر کسی اور سے مانوس نہ ہونے کی وجہ سے اس نے اتنے دن تک کچھ نہ بتایا۔ میں چونکہ آتی جاتی رہتی ہوں اس لیے یہ مجھ سے مانوس تھا۔ اگر میں آپ کو اس کے بارے میں پہلے بتا دیتی تو آپ شاید اس طرح یقین نہ کرتے جس طرح اب کیا ہے۔ بہرحال میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے کیس حل کر لیا۔ آپ کا انعام آپ کو مل جائے گا۔'' انسپکٹر حیرت سے اس ننھے عینی شاہد کو دیکھتا رہ گیا۔

●●●

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محفلِ شعر و سخن

❁ صوبیدار (ر) انوار بنگش.....ملیر کینٹ، کراچی
ہمیشہ عزم والے توڑتے ہیں، غم کی زنجیریں
قفس میں رہنے والوں، بے کسی سے کچھ نہیں ہوتا

❁ راجا افتخار علی افتی.....چوآسدن شاہ
منتظر نگاہیں ہیں لب پہ بس دعائیں ہیں
پل دو پل بھی بچوں سے دور ہو رہی ہے ماں
کھیلنے سے مجھ کو روکتی تھی مٹی میں.....
اوڑھ کر وہی مٹی آج سو رہی ہے ماں

❁ محمد اقبال.....کورنگی کراچی
چراغ صبح سے شامِ وطن کی بات کرو
جو راہ میں ہے ابھی، اس کرن کی بات کرو

❁ وجاہت حسین فیصل.....آف بنگلہ اوکانوالہ
اے میرے بھولنے والے تیری عید کی قسم
مجھ کو اب کچھ بھی تیرے غم کے سوا یاد نہیں

❁ شکیل الرحمٰن سائرہ.....کھاٹاں
ہزار برق گرے، لاکھ آندھیاں اٹھیں
وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں

❁ حکیم سید محمد رضا شاہ.....نورنگہ ضلع میانوالی
میری یادوں کی ابتدا ہی تم سے ہوئی ہے محسن
پھر کیوں کہتے ہو مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا

❁ نی ایمان.....پنجاب
دل حسن کے شعلوں میں جلا کیوں نہیں دیتے
تم مجھ کو محبت کی سزا کیوں نہیں دیتے
بھیگی ہوئی پلکوں سے گزر جاتے ہو چپ چاپ
جو دل پہ گزرتی ہے بتا کیوں نہیں دیتے

❁ یاسین ساحل.....حافظ آباد
کبھی یوں بھی آ میری آنکھ میں کہ میری نظر کو خبر نہ ہو
مجھے ایک رات نواز دے مگر اس کے بعد سحر نہ ہو
کبھی دن کی دھوپ میں جھوم کے کبھی شب کے پھول چوم کر
یونہی ساتھ ساتھ چلیں سدا کبھی ختم اپنا سفر نہ ہو

❁ حیدر خان.....روکھڑی، ضلع میانوالی
پھر اس کی یاد میں انجم شناس روئے بہت
ستارہ ٹوٹ کر جب آسمان ہی چھوڑ گیا

❁ ماہا ایمان.....پنجاب
میں شجر شہرِ ملال کا، میری ٹہنیوں کو نہال کر
کبھی بھیج اپنی نوازشیں کسی جامِ ابر میں ڈال کر
مجھے خار خار مسافتوں کی ستم گری نے تھکا دیا
مجھے منزلوں کا پیام دے، میرے حوصلوں کو بحال کر

❁ تفسیر عباس بابر.....اوکاڑہ
کبھی پیغامِ الفت، کبھی مجھ سے بدگمانی
تیری وہ بھی مہربانی تیری یہ بھی مہربانی

❁ اشتیاق احمد.....پنجاب
دوست کیا خوب وفاؤں کا صلہ دیتے ہیں
ہر نئے موڑ پہ اک زخم نیا دیتے ہیں
کیسے ممکن ہے دھواں بھی نہ اٹھے اور دل بھی جلے
چوٹ لگتی ہے تو پتھر بھی صدا دیتے ہیں

❁ ریحانہ ظہیر.....چیچہ وطنی
روبرو جن کے نظریں بھی اٹھتی نہ تھیں
ان کے منہ پر انہیں بے وفا کہہ دیا

❁ دعا ایمان مغل.....ملتان
جھوٹ کی پاگل ہوا چہروں کو زخمی کر گئی
خود سے خوف آنے لگے تو آئینہ دیکھے گا کون

❁ محمد عدنان.....گولیمار، کراچی
زرد پتوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہاتھ آیا
میں نے آنگن میں کئی پیڑ اگا کر دیکھے

❁ محمد زریان سلطان.....اردو بازار، کراچی
تو بدلتا ہے تو بے ساختہ میری آنکھیں
میرے ہاتھوں کی لکیروں میں الجھ جاتی ہیں

❁ قاضی محمد قیصر شہزاد.....داجل محلہ، راجن پور
خوشی ملی تو کئی درد مجھ سے روٹھ گئے
دعا کرو میں پھر سے اداس ہو جاؤں

❁ ظہور احمد فاتح.....تونسہ شریف
ہم تیرے دستورِ دلداری کی شق ہو جائیں گے
التفاتِ اہلِ دل کے مستحق ہو جائیں گے

❁ محمد رشید سیال.....روہڑی، ضلع سکھر
خوشیوں کا دور بھی آجائے گا کبھی
غم بھی تو مل گئے تھے تمنا کیے بغیر

❁ خواجہ مدنی.....چوک ظاہر پیر
اے ساقیٔ گل فام برا ہو تیرا تو نے
باتوں میں لبھا کر ہمیں وہ جام پلایا
یہ حال ہے سو سال غلامی میں بسر کی
اور ہوش ہمیں اب بھی مکمل نہیں آیا

❁ انیلہ رشید سیال.....خیر پور، میرس
نجانے کون سا دکھ زہر بن کے پھیلا ہے
جسے بھی دیکھو وہی شخص ہے اداس بہت

❁ بابر عباس.....گلیانہ روڈ، کھاریاں
کوئی دھوکا نہیں ایسا جو نہ کھایا ہم نے
زندگی بھر ہی تیرا ساتھ نبھایا ہم نے

❁ اطہر حسین.....کراچی
گیلے کاغذ کی طرح زندگی ٹھہری اپنی
کوئی لکھتا بھی نہیں کوئی جلاتا بھی نہیں

❁ صائمہ احمد.....کراچی
الفاظ تو بہت ہیں میری محبت بیان کرنے کو
وہ میری خاموشی نہیں سمجھتا میرے الفاظ کیا سمجھے گا

❁ نعیم صابر.....لاہور
شمار اس کی سخاوت کا کیا کریں کہ وہ شخص
چراغ بانٹتا پھرتا ہے چھین کر آنکھیں

❁ ریاض بٹ.....حسن ابدال
کھڑکیاں جاگتی آنکھوں کی کھلی رہنے دو
چاند کو دل میں اترنا ہے اسی زینے سے

❁ محمد اشفاق سیال.....شورکوٹ سٹی
ایسا خاموشی کا عالم چھایا تمہارے جانے کے بعد محسن
کہ ہو کر اداس، پرندے بھی، میرا شہر چھوڑ گئے

❁ مسز ضیا القمر سلطانہ.....رتی ٹبی، ساہیوال
زندگی کا نصیب کیا کہیے؟
ایک ''سیتا'' تھی جو ستائی گئی

❁ امتیاز احمد.....عظیم پورہ کراچی
کتنے مفلس ہو گئے کتنے تونگر ہو گئے
خاک میں جب مل گئے دونوں برابر ہو گئے

❁ طاہرہ یاسمین.....سرگودھا
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد سے اجالا کر دے

❁ یمنیٰ احمد.....کراچی
آنکھوں میں طوفان چھپے ہیں، ساون میں کیا رکھا ہے
دل میں غم کے داغ لگے ہیں، دامن میں کیا رکھا ہے
کاجل آنکھ کا پھیلا کیوں ہے آنچل سر سے کیوں کیوں ڈھلکا
کیوں بیری پر پتھر آئے، آنگن میں کیا رکھا ہے

❁ محسن علی محرم.....بالاکوٹ
غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل

❁ محمد قدرت اللہ نیازی.....حکیم ٹاؤن، خانیوال
یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

❁ عون عباس بابر.....اوکاڑہ
میں تیری راہ میں بکھر جاؤں خوشبوؤں کی طرح
میرے لیے تو بس یہی ہے ملتجائے عید

❁ شکیل الرحمٰن.....ملتان
اک بچھڑے ہوئے انسان کی رفاقت کے بغیر
گلشنِ دل میرا ویران رہا عید کے دن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

❊ عمر تنہا بنگش......ہنگو
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

❊ حمیرا اقبال......کورنگی، کراچی
کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

❊ مون......اٹک
یہ کیا کہ ہر دفعہ ہی دوری میں عید ہو
تحفہ دو تو یہ دو جو تحفۂ دید ہو

❊ خرم......فیصل آباد
آنکھ نم کر گیا بچھڑے ہوئے لوگوں کا خیال
دردِ دل دے کر ڈوب گیا عید کا چاند

❊ رضوان احمد......لاہور
مکمل دو ہی دانوں پر یہ تسبیح محبت ہے
جو آئے تیسرا دانہ یہ ڈوری ٹوٹ جاتی ہے

❊ محمد جاوید بلوچ......تحصیل علی پور
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

❊ محمد فیصل......ملیر کراچی
یہ خدا کی دین عجیب ہے کہ اسی کا نام نصیب ہے
جسے تو نے چاہا وہ مل گیا جسے میں نے چاہا ملا نہیں

❊ احمر علی......گوجرانوالہ
جیسا سنتے تھے کبھی، ویسا زمانہ آگیا
روگ سستے ہوگئے، مہنگی دوائی ہوگئی

❊ قاسم نصیب...... صفدر آباد
فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

❊ ذیشان منہاس......گلشن اقبال کراچی
موت سے کس کو مفر ہے مگر انسانوں کو
پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے

❊ محمد امین......گلشن ظہور، کراچی
کچھ ایسے بھی ہیں لوگ یہاں جو اصل کو اپنی بھول گئے
اب انسانوں کے بھیس میں ہیں کل مٹی پتھر گارے تھے

❊ ریحانہ سلطان......ملتان
یہ میری عقل کا دھوکا ہے یا اس کی ہے یہ دانائی
میں بیٹھ گئی اک منزل پر، وہ منزل منزل ہرجائی

❊ رقیہ انجم......ساہیوال
خوش فہمی ہماری تھی کہ اپنا انہیں سمجھا
ہم سے جو یہ کہتے تھے سمجھدار بہت ہو

❊ تنویر زبیر......گوجرانوالہ
رنگ اڑ جاتا ہے تحریر تو رہ جاتی ہے
خواب کے بعد کی تعبیر تو رہ جاتی ہے

❊ شاہدہ ظفر......میانوالی
دل سوزِ غمِ ہجر سے جو گھبرائے بہت ہے
ساون کا مجھے ابر بھی ترسائے بہت ہے

❊ خرم گلزار......کراچی
محسوس ہوا یہ کہ اب اس صحنِ چمن میں
جو پھول کھلیں گے وہ پریشاں ہی رہیں گے

❊ ثنا چودھری......آزاد کشمیر
ہے کوئی یہاں شہر میں ایسا کہ جسے میں
اپنا نہ کہوں اور وہ اپنا مجھے سمجھے

❊ راحیل نواب......ملتان
سنتا ہوں آپ اپنی ہی آواز بازگشت
یا میرا اس جہاں میں کوئی ہمنوا بھی ہے

❊ عدنان صدیقی......ملتان
اس کہانی میں نہ جانے کیا مرا کردار ہے
اور اس کردار کی تفسیر کیا ہے کیا نہیں

❊ عبدالعزیز......جناح اسکوائر، کراچی
دل کہ تھا درد آشنا تنہا
جل بجھا اک چراغ تھا تنہا

کوپن
برائے شمارہ
دسمبر 2011

محفلِ شعر و سخن

نام : ------------------------------------
پتا : ------------------------------------

اگرچہ محبت بذاتِ خود ایک ایسا فلسفہ ہے جو مکمل زندگی بن کر بھی زندگی سے دور دکھائی دیتا ہے... مگر دل ہے کہ اس کے بغیر رہ بھی نہیں سکتا... اور جب عشق خود غرضی میں ڈھل جائے... جب محبت گلے کا ہار بنتے بنتے پھانسی کا پھندا بن جائے تو ایسے میں انسان کانوں کو ہاتھ نہ لگائے تو کیا کرے... اس نے بھی تائب ہونے میں ہی اپنی عافیت جانی۔

”ایک انار...... دو نہیں سو بیمار“ ایک اناڑی عاشق کی روداد

محبت زیردست

مسترم کے خان

پچاس کے عشرے کا شکاگو اگرچہ چالیس کے عشرے کے شکاگو سے مختلف تھا لیکن یہ اتنا بھی مختلف نہیں تھا۔ کم سے کم مافیا کے لحاظ سے یہ کچھ زیادہ نہیں بدلا تھا۔ بیس اور تیس کا عشرہ مافیا کے عروج کا تھا۔ اس وقت شکاگو میں مختلف خاندانوں کی حکومت تھی۔ اٹلی اور سسلی سے تعلق رکھنے والے ان خاندانوں نے یہاں منشیات اور دوسرے جرائم کو منظم کیا تھا اور اپنی اپنی اجارہ داریاں قائم کرلی تھیں لیکن ان کی اصل کمائی بھتا خوری سے ہوتی تھی۔ ان کی حدود میں کام کرنے والا ہر شخص ان کو بھتا دینے پر مجبور تھا، خواہ وہ بن کباب کا ایک معمولی سا ٹھیلا کیوں نہ لگاتا ہو۔ اس طرح یہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہت بڑی رقم جمع کر لیتے تھے۔ جنگ سے پہلے میں ایک معمولی سا بدمعاش ہوتا تھا اور ممکن ہے دوسری جنگ عظیم نہ ہوتی تو میں کسی مافیا کا ایک حصہ بن جاتا مگر جنگ میں، میں بھی جبری بھرتی کی زد میں آ گیا۔ میری تعلیم صرف اسکول تک محدود تھی جبکہ جسمانی طور پر بہت مضبوط تھا۔ اس لیے مجھے فوری فوج میں بھرتی کر لیا گیا اور چند.... مہینے بعد ہی مجھے یورپ بھیج دیا گیا تھا۔

خوش قسمتی سے وہاں میرے کمانڈر نے میری جاسوسی کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور مجھے کچھ خاص کورس کرانے کے بعد جاسوسی کے شعبے میں بھیج دیا۔ چار سال بعد میں واپس آیا تو میں نے فوج چھوڑ دی اور اپنی ایک جاسوس ایجنسی کھول لی۔ یہاں فوج میں کرائے گئے کورسز کا تجربہ میرے کام آیا لہٰذا جلد ہی میں اپنا بزنس جمانے میں کامیاب رہا۔ بائیسویں شاہراہ پر میرا دفتر ایک شاندار عمارت میں تھا۔ پانچ سال بعد میرے دفتر میں مزید تین افراد کام کر رہے تھے۔ ان میں ایک میری سیکریٹری این، ایک نوجوان ڈیک جو دفتری امور دیکھتا تھا اور ایک سابق پولیس افسر ٹیڈ گورج تھا جو میرا نائب تھا۔

چالیس کے عشرے میں مافیاؤں کا زور ٹوٹنے لگا تھا۔ خاص طور سے انہیں بھتا خوری کے میدان سے پسپا ہونا پڑا تھا۔ کیونکہ لوگ اپنی خون پسینے کی کمائی میں سرکار کے ساتھ مافیا کو حصہ دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔ اس لیے سیاستدانوں اور پولیس کو میدانِ عمل میں آنا پڑا۔ اس سے مافیا کی طاقت کم ضرور ہوئی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔ کم سے کم اس کی دہشت برقرار تھی لیکن اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے انہوں نے عام لوگوں کو نہ چھیڑنے کی پالیسی اپنائی تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ عام آدمی کی زندگی سے مافیا غائب ہوگئی اور اب وہ پسِ پردہ رہ کر کام کرتی تھی۔ کچھ عرصے بعد حالات مزید بدلے۔ اٹلی کے ساتھ جرمن اور مشرقی یورپ سے تعلق رکھنے والی کمیونٹیز بھی منظم جرائم کے شعبے میں داخل ہو رہی تھیں اور اب مقابلہ سخت ہوگیا تھا۔ میرے پاس آنے والے بہت سارے کیسز کا تعلق کسی نہ کسی طرح مافیاؤں سے ہوتا تھا، اس لیے یہ سارے حالات میرے علم میں ہوتے تھے۔ لیکن میری کوشش ہوتی تھی کہ براہِ راست ان کے کسی معاملے میں نہ پڑوں جس کا مجھے یا میرے کاروبار کو نقصان ہو۔ اس وجہ سے میں بہت سارے کیسز لینے سے انکار کر دیتا تھا اگرچہ ان کا معاوضہ پرکشش بھی ہوتا تھا۔

میرا دفتر شہر میں تھا لیکن میرا گھر جھیل مشی گن کے ایک خوب صورت کنارے پر تھا۔ یہاں سے مجھے روزانہ ایک گھنٹے کی ڈرائیو کر کے دفتر جانا پڑتا تھا لیکن اس جگہ رہنے کے لیے میں یہ قیمت ادا کرنے کے لیے تیار تھا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ مصروفیت کی وجہ سے مجھے دیر ہو جاتی اور ایک گھنٹے کی ڈرائیو کی ہمت نہ ہوتی تو میں واپس آنے کے بجائے دفتر میں ہی رک جاتا تھا۔ اس صبح بھی میں حسبِ معمول چھ بجے بیدار ہوا۔ نیچے سے اخبار اور دودھ کی بوتل لے کر اوپر آیا۔ پہلے اخبار دیکھا، کوئی خاص خبر نہیں تھی سوائے اس کے کہ جرمن فیملی کے سربراہ ایڈم بورنے نے سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تھا لیکن یہ افواہ کئی دنوں سے گردش میں تھی اور اب اس نے باقاعدہ اعلان کر دیا تھا وہ ڈیموکریٹ پارٹی میں شامل ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اخبار دیکھ کر میں اپنے لیے ناشتا بنا کر مکان کے ٹیرس میں چلا آیا کہ نیچے کوئی تیزی سے لکڑی کا جنگلا کھول کر اندر آیا۔ میں اس کی ایک جھلک دیکھ سکا تھا لیکن جب وہ اوپر آیا تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ''لارنس تم۔۔۔۔؟''

لارنس میرا اسکول کے زمانے کا دوست تھا اور ہم دونوں ایک ہی سڑک چھاپ گروہ کا حصہ تھے۔ اسے مافیا کی نرسری کہہ سکتے ہیں۔ ان سڑک چھاپ گروہوں سے لڑ کے نکل کر مافیا میں جاتے تھے۔ لارنس معمولی ذہانت اور کم ہمت قسم کا لیکن خوب صورت لڑکا تھا اور لڑکیوں میں خاصا مقبول تھا۔ جب مجھے بھرتی کر لیا گیا تو دوسروں کی طرح اس سے بھی میرا رابطہ ختم ہوگیا۔ لیکن جب مجھے اس کا خیال آتا تو میرے ذہن میں یہی آتا کہ وہ معمولی سا بدمعاش ہوگا اور بس۔ اس میں اس سے زیادہ اوپر جانے کی صلاحیت نہیں تھی۔ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ جنگ سے آنے کے بعد مجھے شاید ہی اس کا خیال آیا ہو اس لیے اسے غیر متوقع طور پر سامنے پا کر میں حیران ہوا تھا۔ اس نے بڑا نفیس قسم کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے سنہری بال اس کے ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ تیس سال کا ہونے کے باوجود وہ اپنی متناسب جسامت اور دلکش نقوش کی وجہ سے بیس سال کا نوجوان لگ رہا تھا۔ واحد چیز جو اس کے خلاف تھی وہ پریشان کن تاثرات تھے جس میں خوف کی آمیزش بھی تھی۔

''کرس۔'' اس نے بلاتمہید کہا۔ ''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''آؤ پہلے سکون سے تو بیٹھو۔'' میں اسے ناشتے کی میز پر لے آیا۔ ''تم نے ناشتا کیا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھ سے کچھ نہیں کھایا جائے

گا کچھ پینے کو ہے؟''

وہ یقیناً چائے کافی کی بات نہیں کر رہا تھا۔ میں اس کے لیے اندر سے بیئر کی بوتل نکال لایا۔ اس نے بے تابی سے ایک ہی سانس میں آدھی بوتل خالی کر دی اور بولا۔ ''اس وقت مجھے کسی تیز چیز کی ضرورت تھی لیکن خیر یہ بھی ٹھیک ہے۔''

میں نے ناشتا شروع کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہیں کس قسم کی مدد کی ضرورت ہے؟''

''میری جان خطرے میں ہے۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''میں بری طرح پھنس گیا ہوں۔''

اس کی کہانی سننے سے پہلے میں نے اس سے یہ معلوم کرنا ضروری سمجھا کہ وہ میرے گھر تک کس طرح آیا۔ ''تمہیں میرا پتا کہاں سے ملا؟''

''فون ڈائریکٹری سے۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ ''مجھے اتنا تو معلوم تھا کہ تم ایک بڑی جاسوس ایجنسی چلا رہے ہو۔''

''تم مجھ سے دفتر میں بھی مل سکتے تھے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''شہر میں، میں کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ لوگ میری تلاش میں ہیں، کارنیلا فیملی کے لوگ۔'' اس نے جواب دیا۔ ''جب کہ بورنے فیملی اور شاید شولر فیملی والے بھی مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔''

لارنس کے جواب نے مجھے اتنا حیران کیا کہ میں نوالہ چبانا ہی بھول گیا۔ میرا منہ کھلا ہوا تھا۔ کارنیلا فیملی سسلی مافیا کا سب سے طاقت ور خاندان تھا۔ بورنے مشرقی یورپ کا خاندان تھا جب کہ شولر جرمن خاندان تھا۔ مافیاؤں میں یہی سب سے بڑے خاندان تھے مگر لارنس نے ایسا کیا کیا تھا کہ تینوں خاندانوں کے بدمعاش اس کے پیچھے تھے۔ میں چونکا اور جلدی سے نوالہ حلق سے اتار کر اس سے پوچھا۔

''لارنس تم نے ایسا کیا کیا ہے؟''

اس نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ ''سچی بات یہ ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میں تو بلاوجہ لپیٹ میں آ رہا ہوں۔''

میری بھوک مر گئی تھی اس لیے میں نے کافی نکالی اور لارنس سے تفصیل معلوم کرنے لگا۔

☆☆☆

لارنس واقعی معمولی بدمعاش ہی تھا۔ بس اتنا ہوا تھا کہ وہ ترقی کر کے شولر خاندان کے آدمیوں میں شامل ہوگیا تھا، خود لارنس بھی نسلاً جرمن تھا۔ اس لیے بھی شاید اس نے شولر خاندان کو ترجیح دی۔ ورنہ ہم جس سڑک چھاپ گروہ میں تھے وہ کارنیلا فیملی کے علاقے میں سرگرم ہوتا تھا۔ لارنس کیونکہ کم ہمت تھا اس لیے اسے گن والا کام نہیں دیا گیا تھا۔ بہ وقتِ ضرورت وہ ڈنڈا چلا لیتا تھا۔ اس کی ذمے داری چھوٹے منشیات فروشوں کو مال کی فراہمی اور ان سے رقم کی وصولی تھا۔ یہ کام خطرناک ہوتا ہے اس لیے مافیا کے اہم کارندوں کے بجائے ہمیشہ چھوٹے درجے کے اور نئے آنے والوں سے یہ کام لیا جاتا تھا۔ ایک تو وہ پکڑے جاتے تو زیادہ فرق نہیں پڑتا تھا دوسرے وہ اتنا نہیں جانتے تھے کہ پولیس ان سے کوئی فائدہ اٹھا سکتی۔ ان کو معاوضہ بھی معمولی دیا جاتا تھا اور اس کے مقابلے میں یہ کہیں زیادہ کما کر دیتے تھے۔ لارنس بھی ایک ایسا ہی مافیا مین تھا۔

لارنس کی رہائش ایک معمولی سے علاقے میں تھی اور وہ شہر کے وسط میں کام کرتا تھا۔ اپنی ڈیوٹی ادا کر کے وہ عام طور سے پیدل ہی اپنی رہائش کی طرف جاتا تھا کیونکہ درمیان میں صرف ایک بڑا سا پارک آتا تھا۔ ایک شام وہ کام ختم کر کے اسی پارک کے راستے گھر جا رہا تھا کہ اس نے کسی عورت کے چلانے کی آواز سنی۔ وہ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ لارنس اگرچہ کم ہمت آدمی تھا لیکن اس نے سوچا کہ دیکھ لینا چاہیے، ہوسکتا ہے وہ اس عورت کے کام آ سکے۔ وہ درختوں کے اس جھنڈ میں پہنچا تو وہاں دو سڑک چھاپ قسم کے بدمعاش ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ نہایت بہادری سے ان کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اس کوشش میں اسے کچھ چوٹیں بھی آئی تھیں اور اس کے کپڑے بھی پھٹ گئے تھے لیکن اس نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ لارنس نے محسوس کیا کہ اسے قابو کرنے والے طاقتور ہونے کے باوجود اپنی طاقت اور وحشت استعمال کرنے سے گریز کر رہے تھے اور درحقیقت وہ لڑکی سے دب رہے تھے۔ ورنہ اس نازک سی لڑکی کی ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ گالیاں دیتے ہوئے انہیں نوچ کھسوٹ رہی تھی۔ پھر اس نے ایک کو اس طرح کاٹا کہ اس نے بلبلا کر لڑکی کے سر پر گھونسا مارا۔ یہ پیشہ ور قسم کا زوردار مکا تھا، لڑکی چکرا کر گر پڑی۔ اس کی مزاحمت جواب دے گئی تھی۔ لارنس کا خیال تھا کہ اب مرد اس پر ٹوٹ پڑیں گے لیکن وہ متذبذب سے کھڑے تھے۔ اس دوران میں لارنس نے انہیں جانچ لیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بیک وقت ان دونوں سے نمٹ سکتا تھا۔ اس کے پاس ڈیڑھ فٹ کی فولادی چھڑی تھی۔ اس کی چند ضربیں انہیں ٹھکانے لگانے کے لیے کافی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھیں۔اس لیے وہ ان کے سامنے آ گیا۔

''کیا ہو رہا ہے۔کون ہو تم لوگ؟''

حسب توقع وہ دونوں غرّا کر اس پر چڑھ دوڑے۔ لارنس نے آگے آنے والے پر اچانک چھڑی سے وار کیا۔سر پر لگنے والی ضرب نے اسے تقریباً بے ہوش کر دیا تھا۔اس کے دوسرے ساتھی کو لارنس نے ہاتھ پیروں پر نشانہ بنایا۔وہ بے خبری میں مارے گئے تھے۔ چوٹوں نے انہیں مجبور کر دیا اور وہ وہاں سے فرار ہو گئے۔ لارنس لڑکی کے پاس آیا۔ درختوں میں اندھیرا تھا وہ اسے اٹھا کر ایک لیمپ کے پاس بنچ پر لے آیا اور اس کے گال تھپتھپا کر ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔وہ خاصی دلکش لڑکی تھی اور یہ بات اس کے پھٹے لباس سے جھانکتے بدن سے بھی نمایاں تھی۔اس کی عمر بیس بائیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔لڑکی کچھ دیر میں ہوش میں آ گئی اور اس نے لارنس کو بھی ان بدمعاشوں کا ساتھی سمجھ کر مزاحمت کرنا چاہی۔

''آرام سے آرام سے۔'' لارنس نے اسے روکتے ہوئے کہا۔''میں نے ان بدمعاشوں کو بھگا دیا ہے۔میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

لڑکی رک گئی، اس نے گھور کر لارنس کو دیکھا۔''کون ہو تم؟''

لارنس نے محسوس کیا کہ وہ اونچے طبقے سے تعلق رکھتی تھی کیونکہ اس کا پھٹ جانے والا لباس بہت قیمتی تھا اور اس نے کانوں میں اصلی ہیروں کے ٹاپس پہنے ہوئے تھے۔وہ اس سے بالکل بھی خوف زدہ نہیں تھی۔لارنس نے اپنا تعارف کرایا اور تفصیل بتائی۔''اب اگر تم ٹھیک محسوس کر رہی ہو تو میں جاؤں؟''

لڑکی نے سوچا اور کہا۔''نہیں تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''اگر تم ان غنڈوں سے خوف زدہ ہو تو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس وقت وہ اپنے چوٹوں کی سکائی کر رہے ہوں گے۔''

''نہیں تم نے مجھے ان سے بچایا ہے میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔'' لڑکی نے تحکمانہ انداز میں کہا اور پھر لارنس کو اس کے ساتھ جانا پڑا تھا اور اس وقت وہ پریشان ہو گیا جب لڑکی کی قیمتی رولز رائس کار بورنے خاندان کے سربراہ ایڈم بورنے کے محل نما پیلس میں داخل ہوئی۔گارڈز نے لڑکی کی کار اور اسے دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا تھا۔اپنا پھٹا لباس چھپانے کے لیے لڑکی نے اوپر ایک قیمتی سرخ فر کوٹ پہن لیا تھا۔لارنس نے فکرمند ہو کر کہا۔

''یہ تو ایڈم بورنے کی رہائش ہے؟''

''ہاں تو۔۔۔۔؟''

''لڑکی نے بے پروائی سے کہا۔اس نے کار پورچ میں روک دی اور لارنس کے ساتھ اندر آئی۔محل میں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ لڑکی اسے اوپری منزل پر ایک وسیع اور خوب صورت نشست گاہ میں لائی اور اسے وہاں بٹھا کر خود اندر چلی گئی۔دس منٹ بعد وہ لباس بدل کر ایک ٹرے میں وہسکی کی بوتل اور دو بلوریں جام لے آئی۔اس نے جام بنا کر لارنس کو پیش کیا جس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔اسے اچھے طرح معلوم تھا کہ شولر خاندان کی بورنے خاندان سے لڑائی چل رہی تھی۔تنازعہ ایک چھوٹے سے بار پر تھا دونوں اس کے دعوے دار تھے۔ بار تو بہانہ تھا اصل میں وہ اپنی طاقت ظاہر کرنا چاہتے تھے۔اگر اس کے اوپر والوں کو پتا چل جاتا کہ وہ اس وقت ایڈم بورنے کے گھر میں بیٹھا ہے تو یقیناً اس کی خیر نہ ہوتی۔اس وجہ سے وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔اس نے شکر ادا کیا کہ اس نے لڑکی کو اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا صرف نام بتایا تھا ورنہ اسے پتا چل جاتا کہ وہ کن کے لیے کام کرتا ہے تو اس کی یہاں سے بہ عافیت واپسی مشکوک ہو جاتی۔لارنس نے ہچکچاتے ہوئے لڑکی سے پوچھا۔

''تمہارا ایڈم بورنے سے کیا تعلق ہے؟''

''میں اس کی اکلوتی بیٹی جین بورنے ہوں۔'' لڑکی نے اطمینان سے جواب دیا۔''تم اتنے پریشان کیوں ہو؟''

لارنس نے گلاس رکھ دیا۔''نہیں میں پریشان نہیں ہوں لیکن میں ایک معمولی سا آدمی ہوں اور اس قابل نہیں ہوں کہ آپ کے ساتھ بیٹھ کر شراب پیوں۔''

''گلاس اٹھا لو۔'' جین نے اسے حکم دیا۔''میں بہتر سمجھتی ہوں کہ کون میرے ساتھ بیٹھ سکتا ہے اور کون نہیں۔''

اس روز لارنس بڑی مشکل سے اس سے پیچھا چھڑا کر وہاں سے نکلا اور اس نے سوچ لیا کہ اب دوبارہ جین کو دیکھے گا تو مخالف سمت میں دوڑ لگا دے گا۔ کیونکہ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔کئی دن تک وہ چھپا رہا اور بیماری کا بہانہ کر کے کام پر نہیں گیا لیکن تیسرے دن جین اس کے چھوٹے سے اپارٹمنٹ آ پہنچی اور اس نے لارنس سے صاف کہہ دیا کہ وہ اسے پسند کرنے لگی ہے اور اس کی خیریت اسی میں ہے کہ وہ اس سے ملتا رہے۔ مجبوراً لارنس نے اسے بتا دیا کہ وہ شولر فیملی کے لیے کام کرتا ہے۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔'' جین بے پروائی سے بولی۔''ہم چھپ کر ملتے رہیں گے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔''

لارنس یہاں مجبور ہو گیا پھر جین بہت خوب صورت لڑکی تھی اور اس کا محبوب ہونا معمولی بات نہیں تھی۔لیکن یہ جین کی خوش فہمی تھی کہ ان کا معاشقہ چھپا رہے گا۔ایک رات جب جین اس کے فلیٹ میں کیف آور لمحات گزار کر رخصت ہوئی اور اس کے چند منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی تو لارنس سمجھا کہ جین کچھ بھول گئی ہے اسے بھول جانے کی عادت تھی اور وہ اکثر اپنی چیزیں اس کے اپارٹمنٹ میں بھول جاتی تھی۔اس وقت بھی وہ اپنا سونے کا سگریٹ لائٹر بھول گئی تھی جس پر جین بورنے کا نام کندہ تھا۔مگر دروازے پر جین کے بجائے دو خوف ناک صورت مسٹنڈے کھڑے تھے۔ لارنس نے دروازہ بند کرنا چاہا لیکن وہ اس سے پہلے ہی اسے دھکیل کر اندر گھس آئے اور پھر ان کے پیچھے جو شخصیت آئی تھی اسے دیکھ کر لارنس کے ہوش اڑ گئے۔ یہ کارنیلا فیملی کا ایک نوجوان انٹونیو کارنیلا تھا۔مافیا میں اس کی حیثیت خاندان کے سربراہ اولیون کے دست راست کی تھی اور مشہور تھا کہ آنے والے سالوں میں خاندان کا سربراہ وہی ہوگا۔انٹونیو نے اندر آ کر ایک گہری سانس لی اور بولا۔

''خوب جین ابھی یہاں سے گئی ہے یہ اس کی پسندیدہ خوشبو ہے۔''

''کون جین جناب؟'' لارنس نے انجان بننے کی کوشش کی۔

انٹونیو نے آگے بڑھ کر میز پر رکھا لائٹر اٹھایا۔''جس کا یہ لائٹر ہے وہ جین بورنے۔'' اس کا لہجہ سرد تھا۔

''ٹھیک ہے وہ جین بورنے تھی۔'' لارنس نے دلیر بننے کی کوشش کی۔''لیکن اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

اس بات کا جواب ایک مسٹنڈے نے دیا، اس کے چند گھونسوں نے لارنس کے غبارے سے بہادری کی ساری ہوا نکال دی۔ انٹونیو نے سرد لہجے میں کہا۔''اب تمہیں سمجھ آ گیا ہوگا کہ میرا اس سے کیا تعلق ہے؟'' انٹونیو نے زیادہ سلیس زبان میں سمجھایا کہ وہ جین کو پسند کرتا ہے اور کوئی اس کے پاس ہو۔اس بات کو بالکل پسند نہیں کرتا اس لیے اگر لارنس چاہتا ہے کہ وہ زندہ رہے تو اسے جین سے دور ہو جانا چاہیے۔لارنس نے بڑی مشکل سے کہا۔

''میں مجبور ہوں، جین سے ملنے سے انکار نہیں کر سکتا۔تم جانتے ہو وہ ایڈم بورنے کی بیٹی ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اور تم شولر فیملی کے ایک معمولی کارندے ہو۔'' انٹونیو کا لہجہ حقارت آمیز ہوگیا۔ ''ٹھیک ہے تم جین کے سامنے مجبور ہو لیکن میرے پاس ایک طریقہ اور بھی ہے تم جین سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاؤ گے۔ اسے لے چلو۔'' انٹونیو نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

''یہ یہاں سے نہیں جائے گا۔'' دروازے کی طرف سے جین کی آواز آئی۔ لارنس نے دیکھا وہ اکیلی نہیں تھی اس کے ساتھ بھی ایسے ہی دو عدد مسٹنڈے موجود تھے۔ انٹونیو چونک گیا پھر اس نے مسکرا کر کہا۔

''آہا مس بورنے کیسی ہو تم؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' وہ مسکرائی۔ ''میرا خیال ہے تم نے میری بات سن لی ہوگی۔''

''بالکل سن لی ہے۔'' اس نے کہا۔

''تب مہربانی کر کے اپنے ان کتوں کے ساتھ یہاں سے رخصت ہو جاؤ ورنہ۔۔۔۔'' اس نے جان کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ورنہ تم اپنے کتوں کو آزاد چھوڑ دو گی؟'' انٹونیو نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ جین نے کوئی جواب نہیں دیا بس اسے گھورتی رہی۔ کچھ دیر بعد انٹونیو نے شانے اچکائے۔ ''ٹھیک ہے ابھی میں چلا جاتا ہوں لیکن بعد میں اس کے ساتھ۔۔۔۔''

''بعد میں کیا؟''

''تم ہر وقت تو اس کے ساتھ نہیں رہو گی؟'' انٹونیو مسکرایا اور اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے چلا گیا۔ لارنس نے سکون کا سانس لیا۔ اس کی جان عارضی طور پر بچ گئی تھی۔ اس نے جین سے التجا کی کہ وہ اس کو چھوڑ دے ورنہ انٹونیو اسے نہیں چھوڑے گا لیکن جین نے اس کی تجویز مسترد کر دی۔

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تم مجھے صرف ایک صورت میں چھوڑ سکتے ہو جب تم اس دنیا میں نہ رہو۔''

جین کے جواب نے لارنس کو چکرا دیا تھا۔ اگر وہ اسے نہیں چھوڑتا تو مارا جاتا اور اگر چھوڑ دیتا تب بھی مارا جاتا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے اپنی چیزیں اور دوسرا ضروری سامان سمیٹا اور اپارٹمنٹ سے نکل آیا۔ اسے خدشہ تھا کہ جین یا انٹونیو کے آدمی اپارٹمنٹ کی نگرانی کر رہے ہوں گے، اس لیے اس نے ایک ایسا راستہ اختیار کیا جو عمارت کے تہ خانے سے ہو کر ایک متروک سیوریج لائن میں نکلتا تھا۔ اس نے اس راستے کو کسی ایسے برے وقت کے لیے ذہن میں رکھا ہوا تھا۔ وہ وہاں سے نکلا اور جھیل کے کنارے ایک ایسے موٹل میں مقیم ہو گیا جو کسی عام گزرگاہ سے ہٹ کر ایک سڑک پر تھا اور یہاں کا رخ کم ہی لوگ کرتے تھے۔ اسے امید تھی کہ جین یا انٹونیو کے آدمی یہاں اسے تلاش نہیں کر سکیں گے پھر اسے میرا خیال آیا اور وہ صبح سویرے میرے پاس دوڑا آیا۔

☆☆☆

''میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'' اس کی کہانی سن کر میں نے پوچھا۔

''پلیز کچھ کرو۔'' اس نے گھگیا کر جواب دیا۔ ''میری سمجھ میں تو اس جنجال سے نکلنے کا کوئی طریقہ نہیں آ رہا سوائے اس کے کہ شکاگو چھوڑ کر کسی دور دراز علاقے میں چلا جاؤں مگر یہ بھی اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ ان لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں سارے ملک میں جرائم پیشہ لوگ ان کے غلام ہوتے ہیں اور وہ کبھی بھی مجھے تلاش کر لیں گے۔''

لارنس نے درست تجزیہ کیا تھا۔ فرار اس مسئلے کا عارضی حل ہو سکتا تھا مستقل نہیں۔ مافیا والے کسی کے پیچھے پڑ جاتے تو وہ اسے زمین کھود کر بھی نکال سکتے تھے۔ لارنس بڑی مشکل میں پڑ گیا تھا۔ شاید میں بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے جین کو دیکھا نہیں تھا لیکن سنا تھا کہ وہ نہایت ضدی اور اکھڑ مزاج لڑکی ہے۔ اگر وہ لارنس کے معاملے میں جذباتی تھی تو اس کی موت گوارا کر سکتی تھی لیکن اس سے جدائی نہیں۔ پھر وہ ایڈم بورنے جیسے سفاک آدمی کی بیٹی تھی اس کی کچھ خصوصیات تو بیٹی میں بھی آئی ہوں گی۔ میں نے لارنس سے کہا۔

''تم فی الحال جہاں چھپے ہو وہیں رہو بلکہ اگر ہو سکے تو کوئی چھوٹا موٹا ہٹ کرائے پر لے لو۔ موٹل میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا اور دو دن بعد مجھ سے گھر کے نمبر پر رابطہ کرنا۔ مہربانی کر کے میرے دفتر فون مت کرنا اور نہ اب دوبارہ یہاں آنا۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں خود تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ اب میں نہیں آؤں گا۔''

''امید ہے میں دو دن میں تمہارے لیے کوئی مناسب حل نکال لوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''اب تم جھیل کی طرف سے نکل جاؤ سامنے سے مت جانا۔ ممکن ہے کوئی تمہیں دیکھ لے اور یاد بھی رکھے۔''

لارنس کو رخصت کر کے میں دفتر جانے کے لیے تیار ہوا اور اپنی واکس ویگن میں روانہ ہو گیا۔ پچاس کے عشرے

میں یہ جرمن گاڑی نہایت مقبول ہوئی تھی۔ میں دفتر پہنچا تو این اور ڈیک آ چکے تھے اور انہوں نے شاید ہلکا پھلکا رومان بھی کیا تھا یہ بات ان کے تمتمائے چہروں سے ظاہر ہو رہی تھی وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ ڈیک اکاؤنٹنٹ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور شام کو پڑھتا تھا۔ این سے معمول کی رپورٹ لے کر میں اپنے کمرے میں آیا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور خلافِ توقع این کے بجائے مجھے وہاں ایک نہایت حسین اور خوش پوش لڑکی دکھائی دی۔ اس نے نیلا اسکرٹ اور آسمانی رنگ کی نہایت چست شرٹ پہن رکھی تھی اور بال کسی پارلر سے سیٹ کرائے تھے۔ بالوں میں ایک قیمتی سن گلاس ٹکا ہوا تھا اور اس کی کلائی میں اصلی موتیوں کا بریسلٹ تھا۔ اس کے پیچھے گھبرائی ہوئی این اندر آئی۔

''کرس میں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن۔۔۔۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''تم جاؤ میں بات کرتا ہوں۔''

این کے جانے کے بعد لڑکی جو نہایت سرد مہری سے میرے دفتر کا جائزہ لے رہی تھی بنا اجازت کے میرے سامنے بیٹھ گئی اور ذرا آگے جھک کر بولی۔ ''مسٹر کرسٹوفر ریان۔۔۔۔''

''ہاں میں ہوں لیکن کسی کے دفتر آنے کا یہ کوئی مناسب طریقہ نہیں ہے۔''

وہ مسکرائی۔ ''میں جانتی ہوں یہ بدتہذیبی ہے لیکن میں نہیں چاہتی کہ میری یہاں آمد کا زیادہ لوگوں کو علم ہو۔''

''ٹھیک ہے مس۔۔۔۔''

''بورنے۔۔۔۔ جین بورنے۔'' اس نے تعارف کرایا تو میں نے بڑی مشکل سے اپنے تاثرات پر قابو رکھا۔ میں چونک جاتا تو وہ بھی چونک جاتی۔

''یس مس بورنے۔'' میں نے یوں کہا جیسے یہ نام عام سا ہو۔

''میں ایڈم بورنے کی بیٹی ہوں۔'' اس نے کہا تو میں نے چونکنا مناسب سمجھا۔

''ایڈم بورنے۔۔۔۔ بورنے فیملی کا سربراہ؟''

''ہاں۔'' اسے خوشی ہوئی تھی۔ میں نے گرم جوشی سے کہا۔

''میری خوش قسمتی کہ تم یہاں آئی ہو میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں مس بورنے؟''

''مجھے ایک آدمی کی تلاش ہے۔'' اس نے میری توقع کے مطابق کہا۔ ''لیکن تمہیں یہ کام رازداری سے کرنا ہوگا تم کہیں ظاہر نہیں کرو گے کہ میرے لیے کام کر رہے ہو۔ میرا خیال ہے تمہارے ملازم بھی مجھے نہیں پہنچانتے ہیں۔''

''جب میں نہیں پہچان سکا تو وہ کیسے پہچان سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ آدمی کون ہے؟''

جین نے اپنے پرس سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ ''اس میں اس کی تصویر اور اس کے بارے میں تمام معلومات ہیں۔'' پھر اس نے پرس سے ایک اور لفافہ نکالا۔ ''اس میں تمہارے لیے کچھ ایڈوانس ہے کامیابی کی صورت میں تمہیں اس سے دس گنا زیادہ ملے گا۔'' وہ لفافہ رکھتے ہی کھڑی ہو گئی۔ ''میں روزانہ تم سے صبح دس سے بارہ کے درمیان رابطہ کروں گی۔''

''اگر مجھے تم سے رابطہ کرنا ہو تو۔۔۔۔؟''

وہ سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے مجھے ایک نمبر دیا۔ ''تو تم اس نمبر پر کال کرو گے اور اپنا تعارف رالف ٹیلر کے طور پر کراؤ گے۔''

وہ جس طرح اچانک آئی تھی اسی طرح اچانک رخصت ہو گئی۔ اس نے مجھ سے یہ پوچھنے کی زحمت بھی نہیں کی کہ میں یہ کام لینے کے لیے تیار ہوں یا نہیں۔ میں نے پہلے تصویر والا لفافہ دیکھا اس میں لارنس کی تصویر کے ساتھ اس کے بارے میں تمام معلومات تھیں سوائے اس کے کہ وہ شولر فیملی کے لیے کام کرتا تھا۔ دوسرے لفافے میں ایک ہزار ڈالرز کی بھاری رقم تھی اور کامیابی کی صورت میں وہ دس ہزار ڈالرز کا وعدہ کر کے گئی تھی۔ میں ہونٹ سکیڑ کر رہ گیا۔ یہ میری دو مہینے کی آمدنی کے برابر تھی۔ جین کے جانے کے کچھ دیر بعد این نے اندر جھانکا لیکن میرا موڈ دیکھ کر واپس چلی گئی۔ ٹیڈ چند دوسرے کیسز میں مصروف تھا اور پھر رازداری کا تقاضا بھی تھا۔ اس لیے میں نے کسی کو اس میں شامل نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

درحقیقت مجھے کچھ کرنا ہی نہیں تھا کیونکہ لارنس میرے پاس تھا اور مجھے اس کو ان لوگوں سے بچانا تھا۔ تصویر والے لفافے میں جین نے جو فون نمبر دیا تھا۔ یہ یقیناً بورنے کے محل کا کوئی نمبر تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے کہ سہمی ہوئی این اندر آئی اور اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''کرس باہر ایک آدمی دو بدمعاشوں کے ساتھ آیا ہے اور تم سے ملنا چاہتا ہے۔''

میں این کے ساتھ باہر آیا تو انٹونیو کارنیلا کو دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ ایک لمحے کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے لگا کہ وہ جین کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں آیا ہے اور مجھے اس کام سے روکنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے تاثرات دیکھ کر مجھے کچھ تسلی ہوئی کہ وہ جین کی یہاں آمد سے بے خبر تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

''کرس تم نے خاصی ترقی کر لی ہے۔''

''شکریہ مسٹر انٹونیو۔'' میں نے کہا۔ ''آؤ اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

وہ میرے ساتھ اندر آ گیا۔ اس نے بھی جین کے انداز میں میرے دفتر کا جائزہ لیا اور پھر بغیر پوچھے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''مجھے تم سے ایک کام لینا ہے۔''

میں نے معذرت کی۔ ''میں نے شروع سے اصول بنا رکھا ہے فیملیز سے متعلق کوئی کیس نہیں لوں گا۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''مجھے معلوم ہے لیکن اس کا تعلق فیملی سے نہیں ہے۔''

''اگر فیملی سے نہ ہوتا تو تم اکیلے آتے ان لوگوں کو نہ لاتے۔''

''یہ مجبوری ہے آج کل حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ میں اکیلے نہیں نکل سکتا ہوں۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''ٹھیک ہے تم بتاؤ کام کیا ہے؟''

انٹونیو کا جواب بھی میری توقع کے عین مطابق تھا۔ ''مجھے ایک شخص کو تلاش کروانا ہے۔'' اس نے لارنس کی ایک تصویر نکال کر میری طرف بڑھائی۔ ''اس کے پیچھے تمام ضروری معلومات لکھی ہیں۔ میں چاہتا ہوں تم جلد از جلد اسے تلاش کرو۔''

''اگر میں اسے تلاش کر لوں تو؟''

''تو اس نمبر پر مجھے اطلاع دو گے اور اس کے ساتھ ہی تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔''

میں نے نمبر اپنی پاکٹ ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ ''کہیں یہ معاملہ بعد میں پولیس کی حد میں تو نہیں چلا جائے گا؟''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' اس نے تسلی دینے والے انداز میں کہا لیکن ظاہر ہے وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ پھر اس نے ایک عدد لفافہ برآمد کیا۔ ''اس میں تمہارے کام کا مکمل معاوضہ ہے۔''

انٹونیو کے جانے کے بعد میں نے لفافہ کھول کر دیکھا اس میں پانچ ہزار ڈالرز کے کڑکڑاتے نوٹ تھے۔ سو ڈالرز والے نوٹوں کی آدھی گڈی تھی۔ آج کا دن میرے لیے عجیب و غریب تھا۔ پہلے ایک پرانا دوست ملا اور اس نے مدد طلب کی لیکن بدلے میں دینے کے لیے اس کے پاس شاید نہیں تھا پھر اس کی جان کے دشمن آئے اور مجھے اتنا دے گئے جو میری کئی مہینوں کی آمدنی کے برابر تھا۔ وہ چاہتے تھے میں لارنس کو تلاش کرکے ان کو بتا دوں اور میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ کام دینے والے انکار سننے کے عادی نہیں تھے اور نہ ہی انہیں ناکامی کی خبر اچھی لگتی تھی۔

میں این کو بعض ضروری ہدایات دے کر دفتر سے نکلا اور لارنس کے اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جین اور انٹونیو دونوں نے اس کا پتا بتایا تھا۔ راستے میں، میں اس بات پر غور کرتا رہا کہ جین اور انٹونیو کا یکے بعد دیگرے میرے دفتر میں نازل ہونا کوئی اتفاق تھا؟ لیکن خاصے غور کرنے کے بعد میرے ذہن نے اس امکان کو مسترد کر دیا۔ یہ اتفاق ہرگز نہیں تھا۔ دونوں کا تعلق دو بڑی مافیاؤں سے تھا۔ ان کے ذرائع وسیع تھے اور شاید انہوں نے پتا چلا لیا تھا کہ لارنس کسی زمانے میں میرا دوست ہوا کرتا تھا۔ ان کے خیال میں شاید لارنس نے مجھ سے رابطہ کیا ہو اور میں اس کی پناہ گاہ سے واقف ہوں اسی وجہ سے میرے پاس آئے تھے اور چارے میں بھاری معاوضہ پیش کر گئے تھے۔ یہ اتفاق ہو سکتا تھا کہ انہوں نے بیک وقت مجھے چُنا اور وہ اس بات سے بے خبر ہوں کہ دوسرے نے بھی یہی کام مجھے سونپ دیا ہے۔

راستے میں، میں نے تعاقب کا خیال رکھا تھا۔ جان بوجھ کر ایسی جگہوں سے گزرا جہاں پیچھا کرنے والا چھپ نہیں سکتا تھا لیکن مجھے اپنے پیچھے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ میں لارنس کے اپارٹمنٹ پہنچا۔ یہ ایک معمولی سی عمارت کی ساتویں منزل پر تھا وہاں لفٹ تھی لیکن نہایت قدیم اور گندی سی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ جین جیسی نفیس لڑکی لارنس سے ملنے یہاں آتی تھی حالانکہ وہ چاہتی تو اسے اپنے کسی بہترین ٹھکانے پر بلوا سکتی تھی۔ جہاں وہ پوری رازداری سے اس سے مل سکتی تھی۔ اسے ایسی جگہ آ کر اپنی بدنامی کا خطرہ مول لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لارنس کا اپارٹمنٹ لاک تھا لیکن میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا ایک مخصوص آلے کی مدد سے میں نے ایک منٹ سے بھی پہلے لاک کھول لیا تھا۔ اندر داخل ہوا تو بدبو نے استقبال کیا جو کچن سے اٹھ رہی تھی جہاں گندے برتن اور کھانے کی بچی ہوئی چیزیں پڑی سڑ رہی تھیں۔

پورا اپارٹمنٹ صرف ایک بیڈروم، ایک باتھ روم اور ایک کچن پر مشتمل تھا۔ عقب میں صرف دیوار تھی۔ بیڈروم خاصا بڑا تھا دیوار کے ساتھ ایک بیڈ تھا۔ بائیں طرف باتھ روم اور کچن تھا اور دائیں طرف دیوار کے ساتھ بنی الماری تھی۔ سامنے کتابوں اور ٹی وی وغیرہ رکھنے کے لیے دیوار میں بنا ریک تھا جو داخلی دروازے کے ساتھ ہی تھا۔ کچن اور باتھ روم کے دروازے کے درمیان میں ایک چھوٹا صوفہ لگا ہوا تھا۔ میں نے پہلے الماری کی تلاشی لی۔ اگرچہ مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کیا چیز تلاش کر رہا ہوں۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ لارنس کہاں ہے۔ الماری میں سوائے چند پرانے کپڑوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ اپنے کام کے کپڑے لارنس اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے ریک کی تلاشی لی۔ جس میں بیئر کے خالی کارٹن بھرے ہوئے تھے۔ میں نے درمیان میں ایک کارٹن اٹھانا چاہا تو خلافِ توقع وہ وزنی نکلا۔ شاید اس میں کچھ تھا میں نے یہ کارٹن بیڈ پر ڈالا۔ اس میں تاریں، ان کو جوڑنے والے جوائنٹر اور کاغذات کا ایک بنڈل نکلا لیکن یہ سب سادہ کاغذ تھے شاید ان کو فلنگ کے لیے استعمال کیا جاتا تھا لیکن کس قسم کی فلنگ کے لیے؟ میں نے کارٹن کا معائنہ کیا تو مجھے بیئر کے ڈبے کی تصویر کے درمیان میں بنے گول دائرے میں کارٹن کٹا ہوا دکھائی دیا۔ غور سے دیکھے بغیر یہ کہنا ناممکن تھا کہ دائرہ اصل میں کٹا ہوا ہے اور درحقیقت یہ بیئر کے ڈبے پر بنا نشان نہیں ہے۔ میں نے ڈبا اور اس میں رکھی چیزیں ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا اور سارا سامان واپس ڈبے میں ڈال لیا۔ ریک اور باقی اپارٹمنٹ میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو قابلِ توجہ ہوتی۔ میں نے ناک پر رومال رکھ کر کچن کا معائنہ بھی کر لیا تھا۔

کارٹن لے کر میں نیچے آیا اور اسے ڈکی میں رکھ کر دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے خیال میں لارنس اتنا ذہین نہیں تھا لیکن اس نے فرار کے معاملے میں نہایت ہوشیاری دکھائی اور اپنے پیچھے کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا جس سے اس تک رہنمائی ہو سکے۔ مجھے کچھ نہیں ملا تھا اور جب میں اپارٹمنٹ کی تلاشی لے رہا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے پہلے کسی نے وہاں کی تلاشی نہیں لی۔ کم سے کم مافیا والوں نے وہاں گھسنے کی کوشش نہیں کی تھی ورنہ اپارٹمنٹ اس حالت میں نہ ملتا۔ واپسی میں بھی میں نے اپنے تعاقب کا خیال رکھا۔ ٹیڈ آ گیا تھا اور اس نے مجھے رپورٹ دی۔

''اب تم کیا کرو گے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے شانے اچکائے۔ ''ابھی میں فارغ ہوں اس لیے شام کو کیرن کی طرف جانے کا سوچ رہا ہوں۔''

کیرن اس کی سابق بیوی اور حالیہ گرل فرینڈ تھی۔ ٹیڈ کا دعویٰ تھا کہ سابق بیوی بہترین گرل فرینڈ ثابت ہوتی ہے۔ میں نے اس سے اتفاق کیا۔ ''اچھا پروگرام ہے لیکن ساتھ ہی تم ایک چھوٹا سا کام نمٹاتے جاؤ تو بہتر ہوگا۔''

''کہو۔'' وہ راضی ہو گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میری کار کی ڈکی میں ایک کارٹن پڑا ہے جس میں کچھ تاریں اور ان کو ملانے والے جوڑ ہیں۔ وہ یہ پتا چلائے کہ یہ تاریں اور جوڑ کس برقی آلے میں استعمال ہوتے ہیں۔ ''تم مجھے گھر کے نمبر پر اطلاع کر سکتے ہو۔ لیکن یہ کام آج ہی ہو جانا چاہیے۔''

''ہو جائے گا۔'' ٹیڈ نے سر ہلایا۔ ''کار کی ڈکی کھلی ہے؟''

''ہاں میں نے کھلی چھوڑ دی تھی۔''

ٹیڈ چلا گیا۔ میرے پاس بھی کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا اور مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی اس لیے میں لنچ کرنے نزدیکی ریستوران چلا گیا۔ شام پانچ بجے میں دفتر سے نکل گیا تھا۔ میں نے گھر کا رخ کیا اور ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد میں گھر پر تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس بار بھی میرا تعاقب نہیں کیا گیا ہے کیونکہ میں ہائی وے سے ہٹ کر ایسی سڑکوں سے گزرا تھا جہاں عام طور سے بہت کم ٹریفک ہوتا ہے اور اگر کوئی میرا تعاقب کر رہا ہوتا تو میری نظر میں ضرور آ جاتا۔ دراصل شروع سے یہ بات میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی کہ جین اور انٹونیو دونوں مجھ پر شک کر رہے تھے کہ میں لارنس کے ٹھکانے سے واقف تھا اور اسی بنا پر انہوں نے یہ کیس میرے سپرد کیا۔ لیکن میرا یہ خیال اب تک غلط ثابت ہوا تھا، نہ تو کسی نے میرا تعاقب کیا تھا اور نہ ہی مجھے مافیا کا کوئی فرد اپنے آس پاس نظر آیا تھا۔ تو کیا وہ سچ مچ میری مدد سے لارنس تک پہنچنے کے خواہاں تھے۔

گھر پہنچ کر میں نے اپنے لیے جن کی بوتل نکالی اور ٹیڈ کی کال کا انتظار کرنے لگا۔ ٹیڈ ان لوگوں میں سے تھا جو تفریح کرنے سے پہلے اپنی تمام ذمے داریاں ادا کر دینے کے قائل تھے تاکہ کھل کر تفریح کر سکیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ پہلے کام کرے گا اس کے بعد کیرن کی طرف جائے گا۔ سات بجے اس کی کال آ گئی۔ ''کرس میں نے معلوم کرا لیا ہے۔ یہ تار اور جوڑ جدید ویڈیو کیمرے میں استعمال ہوتے ہیں۔''

''ویڈیو کیمرا۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''کیا ویڈیو کیمرا اتنے سے کارٹن میں آ سکتا ہے؟''

''بالکل آ سکتا ہے۔'' ٹیڈ نے جواب دیا۔ ''یہ جدید کیمرا ہے اور اس کا سائز بھی چھوٹا ہوتا ہے اس میں بیٹری بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگ جاتی ہے لیکن لگتا ہے اسے کہیں سے پاور دی گئی تھی کیونکہ کارٹن میں بیٹری نہیں آسکتی ہے۔''

میں تیزی سے سوچ رہا تھا۔''سنو ٹیڈ اگر کہیں مووی کیمرا چل رہا ہو تو اس کا شور بتا دیتا ہے کیا یہ شور نہیں کرتا؟''

''نہ ہونے کے برابر۔''اس نے کہا۔''میں نے بتایا نا یہ جدید ترین مووی کیمرا ہے اور حال ہی میں مارکیٹ میں آیا ہے۔''

میں نے اتنا چھوٹا ویڈیو کیمرا پہلی بار سنا۔ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ یہ کارٹن بھی دوسرے کارٹنوں .... کی طرح ریک میں ٹھونسنے کے انداز میں رکھا تھا لیکن یہ ٹھنسا ہوا نہیں تھا بلکہ بہت نپے تلے انداز میں رکھا تھا اور یہ لارنس کے کمرے میں بچھے ڈبل بیڈ کے عین سامنے تھا۔ یہ سمجھنے کے لیے جاسوس ہونا ضروری نہیں تھا کہ ویڈیو کیمرا کس مقصد کے لیے عین بیڈ کے سامنے لگایا گیا تھا اور یہ بھی ظاہر تھا کہ یہ کام لارنس نے کیا تھا۔ لیکن کیوں کیا تھا یہ میں سمجھنے سے قاصر تھا اور اس معمے کو جاننے کے لیے مجھے اپنی جاسوسی کی صلاحیت کو استعمال کرنا تھا۔

مجھے بھوک نہیں تھی اس لیے اپنے لیے انڈے اور پنیر سے کچھ سینڈوچز تیار کیے اور کافی کے ساتھ انہیں حلق سے اتار کر میں نے دوبارہ جن کی بوتل سنبھالی اور اپنے مکان کے ٹیرس میں آ گیا۔ یہاں سے جھیل اور اس کے دوسرے نظر آنے والے کنارے پر موجود مکانوں کی جھلملاتی روشنیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ دراصل یہ جھیل کا اصل کنارہ نہیں تھا بلکہ جھیل کے کنارے موجود ایک کھاڑی تھی۔ اس کھاڑی کے گرد لوگوں نے مکان بنا رکھے تھے لیکن کوئی باقاعدہ قصبہ نہیں تھا۔ میرا مکان کسی معروف جگہ نہیں تھا لیکن لارنس نے اس کا سراغ لگا لیا۔ میں اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر لارنس، جین اور انٹونیو نے مجھ سے ہی رابطہ کیوں کیا تھا؟ اس میں کیا رمز تھا؟ خاصی دیر تک غور کرنے پر بھی سمجھ میں نہیں آیا تو تنگ آ کر میں سونے کے لیے اٹھ گیا۔

جب جنگ کے دوران میں مجھے جاسوس کی حیثیت سے کام کرنا پڑا تو اس وقت مجھے لگتا تھا یہ دنیا کا مشکل ترین کام ہے اور جب میں نے نجی جاسوس کی حیثیت سے کام شروع کیا تو اس وقت میرا اندازہ تھا کہ شاید مجھے اتنی پیچیدگی سے واسطہ نہیں پڑے گا لیکن انسان عام زندگی میں بھی اتنا پیچیدہ ہو سکتا ہے یہ میں نے اس پیشے میں آنے کے بعد جانا تھا۔

لارنس ایک عام لیکن بہت خوش رو جوان شخص تھا وہ کسی طرح بھی جین کا ہم پلہ نہیں لیکن جین اسے پسند کیا مگر یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ جین اوپری طبقے سے تعلق رکھنے والی اور ایک مافیا فیملی کے سربراہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اسے ضدی اور اپنی مرضی بہرصورت پوری کرنے والی لڑکی ہونا چاہیے تھا اور وہ ایسی ہی تھی۔ اس نے لارنس کو ایک وقتی ساتھی کے طور پر چنا تھا۔ اسی وجہ سے اس کے باپ کو بھی اس کی سرگرمیوں پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ یہ ناممکن تھا کہ ایڈم بورنے کو اپنی اکلوتی بیٹی کی ان سرگرمیوں کا علم نہ ہو۔

دوسری طرف انٹونیو خود بھی جین کے چکر میں تھا۔ وہ اسے پسند کرتا تھا لیکن اسے حاصل کرنا انٹونیو کے بس کی بات نہیں تھی۔ جین سے شادی تو ناممکن تھی کیونکہ مافیا میں شادی صرف فیملی میں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے بچے دنیا جہاں میں منہ مارتے پھریں انہیں پروا نہیں ہوتی۔ انٹونیو جانے کس چکر میں تھا۔ وہ جین کو اس کی مرضی کے بغیر حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ مافیا میں ایک دوسرے سے میل جول رکھنا اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے۔

عجیب بات تھی کہ جین لارنس کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ جین کو اس کی فکر نہیں تھی کہ لارنس زندہ رہتا ہے یا نہیں بس وہ چاہتی تھی کہ لارنس صرف اس کا رہے۔ یہ بات بھی لارنس نے بتائی تھی۔

مگر ویڈیو کیمرے والی بات نے لارنس کی کہانی کو مشکوک کر دیا تھا۔ اگر یہ درست تھا کہ وہ خود جین کی طرف نہیں بڑھا اور یہ جین تھی جس کی خواہش پر دونوں کے درمیان تعلقات قائم ہوئے تھے۔ تب لارنس نے اس کی اور اپنی ویڈیو کیوں بنائی؟ کیا وہ جین کو بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جین کو بلیک میل کرنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی چوہا کسی شیرنی کو بلیک میل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ بات کسی طرح میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔ شاید جین اور انٹونیو مجھے بے وقوف نہیں بنا رہے تھے یہ لارنس تھا جس نے دوست ہونے کے باوجود مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی اور یہ لارنس ہی تھا جو مجھے حقیقت تک لے جا سکتا تھا۔ دوسری صبح میں نے دفتر جانے کے بجائے ایک پبلک فون بوتھ سے جین کے دیے ہوئے نمبر کو ڈائل کیا۔ اس کی ہدایت کے مطابق اپنا نام رالف بتایا۔ کچھ دیر بعد وہ فون پر تھی۔ میں نے کہا۔''مس بورنے آپ کا سوٹ تیار ہو گیا ہے۔ کیا آپ چیک کرنے کے لیے آسکتی ہیں؟''

''ہاں میں آجاؤں گی لیکن دوپہر بارہ بجے مجھے کریمر کیفے جانا ہے وہاں سے میں تمہارے پاس آؤں گی۔''

کریمر کیفے سترھویں شاہراہ پر تھا اور جین نے مجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملاقات کے لیے وہاں بلایا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو کچھ دیر بعد جین بھی اندر آئی اس نے سفید اسکارف کے ساتھ بڑے سائز کا سن گلاس لگا رکھا تھا آج اس نے معمولی سا لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ یقیناً اپنے آدمیوں سے چھپ کر آئی تھی اور اس نے آتے ہی عجلت میں کہا۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے مجھے آدھے گھنٹے میں واپس جانا ہوگا۔''

''میں دس منٹ سے زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ اس وقت کیفے میں رش نہ ہونے کے برابر تھا اور میں نے ایک دور کی میز منتخب کی تھی جہاں ہماری گفتگو سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ''یہ ملاقات بہت ضروری ہوگئی تھی۔''

''کہو۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔ ''لارنس کا پتا چلا؟''

''اتنی جلدی تو یہ کام مشکل ہے۔ وہ اپنے گھر پر نہیں ہے۔ وہ کہاں ہے اس کا پتا چلانے کے لیے مجھے اپنے چند سوالوں کے جواب درکار ہیں۔''

''پوچھو۔''

''مس بورنے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''لارنس کی تلاش کے لیے تم نے میرا انتخاب ہی کیوں کیا ہے؟ جبکہ شکاگو میں اعلیٰ درجے کے نجی سراغ رسانوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔''

''تم ذہین آدمی ہو۔'' وہ بولی۔

''یہاں مجھ سے بھی زیادہ ذہین لوگ ہیں۔''

''تم لارنس کو نوجوانی سے جانتے ہو شاید تم دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھے ہوئے ہو اور ایک ہی گروہ میں شامل تھے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''مجھے بھی یہی خیال آیا تھا تو تم نے میرا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ میں لارنس کو نوجوانی سے جانتا ہوں اور شاید دوسروں کی نسبت اسے بہتر طور پر تلاش کر سکتا ہوں؟''

''یہی بات ہے۔''

''مجھے افسوس ہے تم نے غلط اندازہ لگایا ہے لارنس سے میری آخری ملاقات کوئی ایک عشرے پہلے ہوئی تھی جب میں فوج سے چند دن کی چھٹیوں پر گھر آیا تھا اور ایک شام میں نے اسے نشے میں دُھت ایک بار میں دیکھا تھا۔ اسے تو شاید یاد بھی نہیں ہوگا۔ یعنی میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا ہوں۔''

''لیکن تم اس کے مزاج سے تو واقف ہو؟'' اس نے اصرار کیا۔

''ہاں یہاں تم کہہ سکتی ہو کہ میں دوسروں سے زیادہ اسے جانتا ہوں۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''لیکن وہ کیوں غائب ہے یہ جاننے کے لیے مجھے جاننا ہوگا کہ وہ کس وجہ سے غائب ہوا ہے۔''

''وجہ۔'' جین چونکی۔ ''وجہ مجھے کیا معلوم؟''

''اچھا تم کو اس کی تلاش کیوں ہے؟''

اس بار بھی جین نے جھوٹ بولا۔ ''میں نے اسے ایک کام دیا تھا اور وہ غائب ہے۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''مس بورنے، مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے تم غلط بیانی سے کام لے رہی ہو اس طرح میں لارنس کو تلاش نہیں کر سکوں گا۔''

''میں تمہیں تمہارے معاوضے سے کئی گنا زیادہ اسی لیے دے رہی ہوں کہ تم اسے تلاش کرو۔'' اس کا لہجہ سرد ہو گیا۔

''ٹھیک ہے مس بورنے تم مجھے کئی گنا معاوضہ دے رہی ہو لیکن میں ایک جاسوس ہوں اور مجھے لگے بندھے اصولوں کے تحت ہی کام کرنا ہوتا ہے۔ میں جادوگر نہیں ہوں جو یہاں بیٹھے بیٹھے لارنس کا سراغ لگا لوں۔ اگر تم میرے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتی ہو تو میرے پاس کیس سے دست برداری کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہوگا۔''

''تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' اس نے کسی قدر اضطراب سے کہا۔

''تب میرے سوالوں کا جواب۔۔۔۔؟''

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے گہری سانس لی۔ ''ٹھیک ہے پوچھو۔''

''تم لارنس کو کیوں تلاش کروا رہی ہو؟''

''وہ میرا محبوب ہے۔'' اس بار اس نے بلا جھجک اعتراف کر لیا۔ ''ہم اکثر ملتے تھے۔''

''کیا مسٹر بورنے کو ان ملاقاتوں کا علم ہے؟''

''بالکل ہے اور پاپا کو اس پر اعتراض نہیں ہے۔''

''اس کا امکان ہے کہ کسی نے لارنس کو غائب کر دیا ہو؟''

''نہیں وہ اپنی مرضی سے گیا ہے۔'' جین نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''اس کے جانے کی وجہ؟''

''یہ میں نہیں جانتی۔'' جین نے انکار کیا۔

''مس بورنے کیا تم اس سے اس کے اپارٹمنٹ ملتی تھیں یا تم لوگوں نے کوئی اور جگہ مخصوص کر رکھی تھی؟''

جین کا چہرہ ذرا سرخ ہوا تھا۔ ''میں صرف ایک

س کے اپارٹمنٹ گئی تھی۔ ورنہ ہم جھیل کے ساتھ ایک اک ہاؤس میں ملتے تھے یہ میری ملکیت ہے۔''

لارنس نے اس بارے میں بھی جھوٹ کہا تھا۔ جین اس کے گندے اپارٹمنٹ میں صرف ایک بار آئی تھی۔

''کیا لارنس نے اپنے اپارٹمنٹ میں ملاقات پر صرار کیا تھا؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں اس کی طبیعت کسی قدر خراب تھی اور وہ سفر نہیں کرنا چاہتا تھا۔''

''تمہاری لارنس سے کس طرح ملاقات ہوئی؟''

اس سوال کا جواب اس نے کسی قدر اکتائے ہوئے انداز میں دیا اور وہی کچھ بتایا جو لارنس مجھے اس بارے میں بتا چکا تھا۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ ''تم نے کسی دھمکی کا ذکر کیا ہے۔ کون اسے دھمکا رہا تھا؟''

''اس نے مجھے بتایا نہیں صرف اتنا کہا کہ اسے کچھ لوگوں سے خطرہ ہے۔ میں نے اسے پیشکش کی تھی کہ وہ میری حفاظت میں آجائے لیکن اس نے انکار کر دیا۔''

''تم جانتی ہو کہ اس کا تعلق شولر فیملی سے ہے؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں جانتی ہوں لیکن کسی کو نہیں معلوم کہ وہ مجھ سے ملتا ہے۔''

''ممکن ہے یہ بات کھل گئی ہو اور شولر فیملی ہی لارنس کی گم شدگی کی ذمے دار ہو۔''

''میں کہہ چکی ہوں وہ اپنی مرضی سے گیا ہے۔'' اس نے پہلے کی طرح دوٹوک انداز میں کہا اور کھڑی ہوگئی۔ ''میں مزید نہیں رک سکتی۔''

میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے باہر نکل کر ایک فون وتھ سے انٹونیو کا دیا ہوا نمبر ملایا۔ اس نے خود فون ریسیو کیا۔ ''مسٹر انٹونیو کرس بات کر رہا ہوں۔''

''مسٹر کرس۔'' اس نے بے تابی سے کہا۔ ''اس کا سراغ ملا؟''

''نہیں۔۔۔۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ میں نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس نے کوئی سراغ بھی نہیں چھوڑا ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ میں تم سے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں کیا ہم کہیں مل سکتے ہیں؟''

''نہیں فی الحال میں تم سے نہیں مل سکتا تم نے جو پوچھنا ہے فون پر پوچھ لو۔''

''تم لارنس کو کیوں تلاش کروا رہے ہو؟''

''یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔'' اس نے فوراً انکار کر دیا۔

''اچھا تمہارے خیال میں کچھ اور لوگ بھی لارس میں دلچسپی لے رہے ہیں؟''

اس سوال پر وہ خاموش ہو گیا تھا پھر اس نے بدلے ہوئے انداز میں کہا۔ ''تمہیں اس کا کیسے پتا چلا؟''

''مجھے پتا نہیں چلا ہے میں تمہارا خیال پوچھ رہا ہوں مسٹر انٹونیو کارنیلا۔''

''مجھے اس بارے میں نہیں معلوم۔'' اس نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔

''ایک آخری سوال۔۔۔۔ کیا تمہیں معلوم ہے لارنس اصل میں شولر فیملی کا ایک معمولی درجے کا کارکن ہے؟''

''معلوم ہے۔'' اس نے کچھ دیر بعد کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور فون بوتھ سے نکل آیا۔ اس دن مجھے کئی کام نمٹانے پڑے تھے۔ اس لیے گھر کی طرف روانہ ہوتے ہوتے سات بج گئے تھے۔ اب تک لارنس نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ گزشتہ دن اسے مجھ سے رابطہ کر لینا چاہیے تھا۔ میں نے گھر جانے کے بجائے اس موٹل کا رخ کیا جہاں لارنس چھپا ہوا تھا۔ یہ چھوٹا سا موٹل تھا، اس کے مالک نے بتایا کہ مذکورہ حلیے کا نوجوان کل رات سے غائب ہے اور وہ اطلاع دیے بغیر غائب ہوا تھا لیکن اس نے کرایہ پورا دے دیا تھا اور کوئی چیز بھی غائب نہیں تھی۔ اس لیے موٹل کے مالک کو پروا نہیں تھی۔ میں باہر جا رہا تھا کہ مجھے خیال آیا اور میں پلٹ کر مالک کے پاس آیا۔

''کیا کوئی اور بھی اسے پوچھتا ہوا آیا ہے؟''

''پتا نہیں اس آدمی میں کیا بات ہے تم سے پہلے بھی دو افراد اس کے بارے میں پوچھنے آئے تھے اور میں نے انہیں بھی یہی بتایا ہے۔'' اس نے کسی قدر بیزاری سے کہا لیکن میرے اندر خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ میرے علاوہ اگر کوئی آسکتا تھا تو اس کا تعلق لازمی جین یا انٹونیو سے ہو سکتا تھا۔ بلکہ شاید دونوں کے آدمی لارنس کو تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آپہنچے تھے۔ میں دفتر سے نکل کر اس کمرے تک آیا جہاں لارنس مقیم تھا۔ ہر کمرے کے سامنے ڈسٹ بن تھے میں نے لارنس کے کمرے والے ڈسٹ بن کا معائنہ کیا اور مجھے اس میں ایک تڑ مڑا اخبار مل گیا۔ اسے نکال کر میں نے جائزہ لیا اور بالآخر اپنے کام کی چیز تلاش کر لی۔ میں نے اخبار واپس نہیں پھینکا بلکہ اپنے ساتھ لے آیا۔

اس بار بھی میرا رخ گھر کی طرف نہیں تھا بلکہ میں مشی گن جھیل کی ایک اور کھاڑی کی طرف جا رہا تھا جس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کناروں پر بہت سارے چھوٹے بڑے ہٹ، ڈاکس ہاؤس اور ولاز بنے ہوئے تھے۔ مطلوبہ مکان کو تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ یہ سڑک سے کسی قدر نشیب میں اور جھیل سے کچھ ہی دور تھا۔ مکان تاریک تھا اور اس کے آس پاس کوئی حرکت نظر نہیں آرہی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ مکان خالی نہیں تھا اور اس کے آس پاس کچھ اور لوگوں کی موجودگی بھی یقینی تھی۔ میں نے سوچا سامنے کی طرف سے جانا خطرے سے خالی نہیں ..... اس لیے میں نے اپنی گاڑی کچھ آگے سڑک سے اتار کر جھاڑیوں کے درمیان کھڑی کر دی یہاں یہ اتنی آسانی سے نظر نہیں آتی اور پھر پیدل ہی جھیل کے کنارے کی طرف روانہ ہو گیا۔ جھیل تک آنے کے بعد میں نے رخ اس مکان کی طرف کیا۔ مجھے امید تھی کہ وہاں کچھ لوگ موجود ہوئے تو بھی ان کی توجہ جھیل کی طرف اتنی نہیں ہوگی۔ وہ سڑک کی نگرانی کر رہے ہوں گے۔

میں دبے قدموں مکان تک آیا تو مجھے عقبی طرف موجود ایک کھڑکی میں ہلکی سی روشنی دکھائی دی۔ مکان بالکل تاریک نہیں تھا۔ اس کا عقبی باغ خاموش تھا اور یہاں کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ میں دبے قدموں کھڑکی تک آیا۔ اس کا نچلا سرا زمین سے پانچ فٹ اونچا تھا۔ اس لیے مجھے اندر جھانکنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ یہ نشست گاہ تھی اور اس کے وسط میں لارنس کرسی پر بندھا بیٹھا تھا۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ کر گردن تک آرہا تھا۔ اس کے سامنے جین موجود تھی اور اس کے عقب میں اس کا دیو قامت آدمی موجود تھا جو کھا جانے والی نظروں سے لارنس کو دیکھ رہا تھا اور شاید اس کے سر کی چوٹ کا ذمے دار بھی وہی تھا۔ جین کے چہرے پر غصے کے تاثرات تھے۔ وہ بے چینی سے ٹہل رہی تھی پھر وہ لارنس کے سامنے رکی اور ذرا جھک کر بولی۔

''لارنس مجھے ہر صورت وہ اسپول چاہیے۔''

''میں تمہیں بتا چکا ہوں میں نے ویڈیو بنائی ہی نہیں تھی۔'' لارنس نے جواب دیا۔

''بکواس کرتے ہو تم۔'' وہ بپھر کر بولی۔ ''اگر تم نے ویڈیو نہیں بنانی تھی تو وہاں کیمرا کیوں لگایا تھا۔''

''میں اس کام کے لیے مجبور تھا۔'' لارنس نے مردہ لہجے میں کہا۔ ''تم شاید یقین نہ کرو لیکن مجھے اس کام کے لیے انتونیو نے مجبور کیا تھا۔ اسی نے سارا پلان بنایا تھا۔ پارک میں تم پر حملہ کرنے والے اسی کے آدمی تھے۔''

جین بولی۔ ''تمہارا مطلب ہے وہ میری ویڈیو بنانا چاہتا تھا لیکن اس کا فائدہ.....؟ اسے معلوم نہیں کہ وہ نہ یا میرے باپ کو بلیک میل نہیں کر سکے گا اور اس کی حرکت کی وجہ سے خاندانوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی۔''

''میرا خیال ہے وہ خود سامنے نہیں آتا اور مجھ سے کام لے کر مجھے بھی مروا دیتا۔'' لارنس نے کہا۔ ''تم یہ جانتی ہو کہ میرا تعلق شولر فیملی سے ہے اس لیے تمہارا شک بھی انتونیو کی طرف نہیں جاتا۔''

''تو کیا اب تم شولر فیملی کے لیے کام نہیں کر رہے ہو؟'' جین کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ ''تم نے ویڈیو بنائی ہے اور وہ تمہارے پاس ہے۔''

''بے بی یہ اس طرح نہیں مانے گا۔'' جین کے دیو قامت گرگے نے کہا۔ ''اسے دو منٹ کے لیے میرے حوالے کر دو۔''

جین نے ہاتھ اوپر کیا۔ ''نہیں ابھی مجھے بات کرنے دو۔'' اس نے کہا اور لارنس کی طرف دیکھا۔ ''دیکھو تمہارے پاس آخری موقع ہے ورنہ میں مجبوراً تمہیں بوگ کے حوالے کر دوں گی۔''

''ویڈیو کا کوئی وجود نہیں ہے۔'' لارنس نے کسمسا کر کہا۔ ''جو چیز ہے ہی نہیں اسے میں تمہارے حوالے کیسے کروں؟''

''اگر تم نے ویڈیو نہیں بنائی تو تم فرار کیوں ہوئے؟''

''کیونکہ انتونیو مجھے نہیں چھوڑتا۔ اسے ویڈیو درکار تھی اور جب میں اسے ویڈیو نہ دیتا تو وہ میرے ٹکڑے کروا دیتا۔''

''یہ کام تو میں بھی کروں گی۔'' جین نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''ویڈیو تمہارے پاس ہے اور تم جلد بتاؤ گے کہ کہاں ہے۔ بوگ اس کی زبان کھلواؤ میں دیکھتی ہوں اس میں کتنی ہمت ہے۔''

بوگ خوفناک انداز میں بندھے ہوئے لارنس کی طرف بڑھا اور وہ جین کی طرف دیکھ کر گڑگڑایا۔ ''پلیز اسے روکو میں سچ کہہ رہا ہوں میں اپنی مری ماں کی قسم کھاتا ہوں۔''

جین شاہانہ انداز میں صوفے پر جا بیٹھی تھی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''اگر تم نے اسپول میرے حوالے نہ کیا تو کچھ بعد اپنی مری ہوئی ماں کے پاس ہی ہو گے۔''

بوگ اس کے پاس آ گیا اور میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ لارنس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا اس لیے دوستی والا معاملہ تو ختم ہو گیا تھا۔ لیکن بہر حال وہ ایک انسان تھا اور میں اپنے سامنے ایک انسان پر تشدد ہوتے

سکتا تھا۔ مگر میں براہِ راست مداخلت بھی نہیں کر سکتا تھا ورنہ جین میری دشمن بھی بن جاتی۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ نشست گاہ کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔ بوگ پھرتی سے مڑا اور اس کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف گیا لیکن اندر آنے والے انتونیو نے پہلے فائر کر دیا۔ گولی بوگ کے سینے پر لگی اور وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ زمین پر گر کر ساکت ہو گیا۔ انتونیو نے پستول کا رخ جین کی طرف کر دیا جو اپنے اسکرٹ میں ہاتھ ڈالنے والی تھی۔ انتونیو کے ساتھ آنے والے آدمی نے اسکرٹ میں چھپا اس کا پستول قبضے میں لے کر اس کی مکمل تلاشی لی اور پھر اسے صوفے پر دھکیل دیا۔ اس دوران میں انتونیو بے نیازی سے سگریٹ سلگا رہا تھا۔ لارنس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ انتونیو نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

''مس بورنے یہ بے چارہ ٹھیک کہہ رہا ہے اس نے ویڈیو سرے سے بنائی ہی نہیں۔ عین موقعے پر اس نے کیمرے سے تاریں نکال دیں جس سے کیمرا کام نہیں کر سکا تھا۔''

جین کا چہرہ بگڑ گیا۔ ''تو لارنس سچ کہہ رہا تھا یہ سب تمہارا احرامی پن ہے۔''

''تم چاہو تو ایسا بھی کہہ سکتی ہو۔'' انتونیو نے اطمینان سے جواب دیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے تم اس طرح مجھے حاصل کر لو گے۔''

انتونیو نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں جین کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں حاصل کرنا.....؟ یہ کس گدھے نے کہا کہ میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے تو تمہاری ویڈیو درکار ہے۔ اس وقت تو اس نے گڑبڑ کر دی تھی لیکن اب شوٹنگ میرے آدمی کریں گے اور اس میں کوئی گڑبڑ نہیں ہو گی۔''

''تم ہمیں بلیک میل کرنا چاہتے ہو؟''

اس دوران میں انتونیو کے دو آدمی اور اندر آ گئے تھے ان میں سے ایک نے کیمرا اٹھا رکھا تھا۔ دوسرے کے ہاتھ میں ڈرائی جن کی بوتل تھی۔ انتونیو نے حکم دیا۔ ''ان دونوں کو پلاؤ۔''

جین نے انکار کیا لیکن اسے زبردستی پچھاڑ کر بوتل اس کے منہ سے لگا دی گئی تھی۔ انتونیو کے عزائم واضح تھے۔ وہ جین اور لارنس کو اتنا پلانا چاہتا تھا کہ وہ نشے میں حیوان بن جائیں اور وہ ان کی حرکات کو ریکارڈ کر سکے۔ میں کھڑکی سے ہٹ کر مکان کے سامنے والے حصے میں آیا۔ یہاں دو افراد بندھے پڑے تھے اور ان کے سروں پر تھیلیاں چڑھا دی گئی تھیں۔ ایک آدمی ان کے سر پر مسلط تھا۔ گویا جین اور انتونیو دونوں تین تین مسٹنڈے لے کر آئے تھے۔ اس کے بعد میں عقبی راستے سے کار کی طرف روانہ ہو گیا۔ وقت کم تھا اس لیے مجھے بھاگنا پڑ رہا تھا۔ کار کی ڈکی سے میں نے کچھ چیزیں نکالیں اور واپس مکان کی طرف روانہ ہو گیا جہاں انتونیو کے آدمی شوٹنگ کے لیے بالکل تیار تھے۔

☆☆☆

لارنس اپنے سر کی چوٹ کی برف سے سکائی کر رہا تھا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''تم بروقت کیسے پہنچے اور تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں وہاں موجود ہوں۔''

''اس اخبار کی مدد سے جو تم نے دیکھ کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا تھا۔ تم نے اس مکان کے اشتہار پر نشان لگایا تھا۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہاں جین اور انتونیو بھی ہوں گے۔''

لارنس نے جھرجھری لی۔ ''تم وقت پر آ گئے ورنہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔''

''وہ ناکام رہا ہے اور آنے والے چند دنوں میں دونوں خاندانوں میں خون ریز تصادم یقینی ہے۔''

''مکان پر کیا ہوا تھا؟''

''میں نے پہلے گیس کے بم اندر پھینکے باہر والے کو پہلے ہی قابو میں کر کے دروازے باہر سے بند کر چکا تھا۔ اس لیے اندر والے بے ہوش ہو گئے۔ تمہیں نکالنے کے بعد میں نے دونوں حریفوں کو اطلاع کر دی تھی کہ ان کے لوگ کہاں ہیں۔ دونوں ساتھ ساتھ پہنچے اور جب دونوں طرف سے زور و شور سے گولیاں چل رہی تھیں تو پولیس بھی آ گئی۔ اب تک کی اطلاعات کے مطابق انتونیو سمیت کارنیلا فیملی کے سات اور بورنے فیملی کے چھ آدمی مارے جا چکے ہیں۔''

انتونیو کے مارے جانے کا سن کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ ''مجھے زیادہ خطرہ اسی سے تھا۔''

''لیکن جین کو بھی کم مت سمجھو اگر تم اسے دوبارہ نظر آ گئے تو سمجھ لو تمہاری خیر نہیں ہو گی۔ اب تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ امریکا سے نکل جاؤ۔''

لارنس نے سر ہلایا۔ ''میں نے بھی یہی سوچا ہے۔ میں باز آیا ایسی محبت سے۔ میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

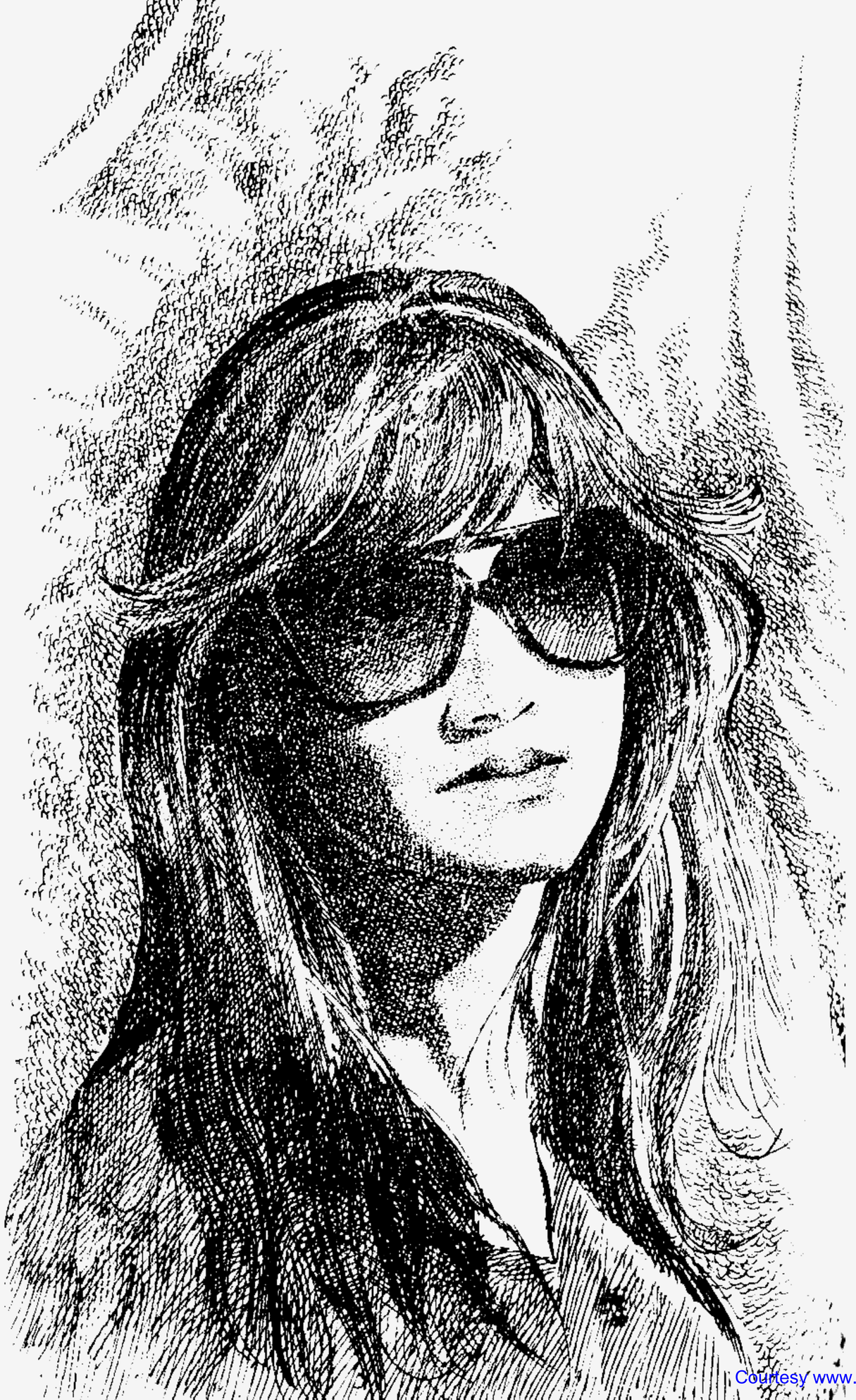

اناڑی

قسط: 67

خوب صورت وگل رنگ جذبوں سے گندھی ایک تیز رفتار کہانی

قسمت کے پھیر میں الجھے ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہاؤ اسے دیارِ غیر لے گیا جہاں وہ اناڑی تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کا اناڑی پن اسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اسے پردیس راس آگیا تھا جہاں کی ہنگامہ خیزیاں اس کا دل لبھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اس کی لاٹری کھل گئی، ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اسے لوٹنا تھا۔ اناڑی سے کھلاڑی بننے کے بعد... وہ لوٹا... تو ہنگامے اور شرارتیں اس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لمحہ لمحہ قہقہوں سے لبریز اس اناڑی کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

دورِ حاضر کے فتنوں اور حالات کی عکاس ایک داستان، رنگ برنگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

گردوپیش کا احوال۔ منظرکشی کا کمال۔ ایک داستان لازوال، آج کے زندہ کرداروں کی حقیقی کہانی جسے احمد اقبال کی زمانہ شناس نگاہ اور سحر آفریں اندازِ تحریر نے تخلیق کیا۔

نئے پڑھنے والے یہاں سے شروع کریں۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں انگریز فوج کو شاہ افغانستان کے لشکر نے ایک عبرت ناک شکست دی۔ بچ جانے والا واحد شخص ایک ڈاکٹر تھا جسے زخمی حالت میں میرے پردادا کے پردادا نے اپنی بیل گاڑی میں ڈال کر بہ حفاظت رہتاس کے قلعے میں انگریزی چھاؤنی تک پہنچا دیا۔ انعام کے طور پر انگریز حاکم نے اجازت دی کہ وہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک جتنی زمین کا چکر اپنی بیل گاڑی دوڑا کے لگائیں گے وہ ان کے نام کردی جائے گی۔ یوں ست بدھائی کی ریاست وجود میں آئی۔ میرے آباواجداد نواب کہلائے۔ ریاست کے چوتھے حکمران کو ایک فقیر کی بددعا لگی اور اس کے چھ جوان بیٹے باری باری مختلف حادثات کا شکار ہو کے مر گئے۔ آخری بیٹے کو باپ نے جان بچانے کے لیے سات سمندر پار لندن بھیج دیا لیکن کسی خرابی کے باعث جہاز بحرالکاہل میں غرق ہو گیا۔ باپ نے عالم دیوانگی میں اپنی تین بیویوں کو مارا اور پھر خودکشی کرلی...... حویلی نصف صدی سے زیادہ عرصہ غیر آباد پڑی رہی۔ میرے والد لاہور کے ایک کالج سے ریٹائر ہوئے۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں میرا تعلق ایک سیاسی تنظیم کے دہشت گردوں سے ہوگیا۔ میری زندگی بچانے کے لیے والد صاحب نے مجھے اعلیٰ تعلیم کے بہانے امریکا بھیج دیا۔ ہاورڈ سے ایم بی اے کرنے کے بعد مجھے لندن میں لارڈ ارنسٹ کی بزنس فرم میں اعلیٰ عہدے پر کام کرنے کا موقع ملا لیکن فرم کے مالک کی اکلوتی بیٹی ایلیشا مجھ پر فریفتہ ہوگئی اور اپنا نام تک بدل کر عائشہ بن گئی...... مگر میں نے اسے ٹھکرا دیا کیونکہ میں فریال کو چاہتا تھا۔ فریال پہلے ماڈل اور ایکٹریس تھی اور اپنی بےوقوفی کے باعث ایک عیاش اور فلمساز چودھری سلطان سے منگنی بھی کر بیٹھی تھی...... میں نے اور فریال نے چھ سال تک اس کی عداوت کا مقابلہ کیا۔

اچانک لندن میں مجھے ایک وکیل کے ذریعے اپنے کسی رشتے کے پردادا نے طلب کیا۔ وہ عمر کے آخری حصے میں تھے اور دماغ کے سوا ان کا سارا جسم مفلوج تھا...... ان کی معلومات کے مطابق میں ان کا رشتے دار تھا۔ چنانچہ اپنی وصیت کی رو سے انہوں نے مجھے ست بدھائی کا وارث بنا دیا۔ یہ وہی ساتویں بیٹے تھے جن کا جہاز لندن جاتے ہوئے سمندر میں گر گیا تھا...... وہ بچ جانے والے واحد مسافر تھے جو بےہوشی میں کسی تختے پر تیرتے ہوئے برطانیہ کے ساحل تک پہنچ گئے تھے۔ کسی سراغرساں ادارے کی مدد سے انہیں لندن میں میری موجودگی کا علم ہوا۔ لہٰذا وہ مجھے اپنا وارث مقرر کر کے مر گئے۔

اب مجھے لوٹ کے پاکستان جانا پڑا۔ ست بدھائی کی عالی شان مگر منحوس سمجھی جانے والی حویلی اور جاگیر ساٹھ ستر سال سے غیر آباد پڑی تھی۔ ریاست جی ٹی روڈ پر لاہور اور جہلم کے درمیان دینہ جانے والی سڑک پر رہتاس کے تاریخی قلعے کے کھنڈر سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی...... حویلی کے تہ خانوں، بند تجوریوں اور مقفل الماریوں سے مجھے قیمتی ہیرے جواہرات، سونے چاندی کے زیور، برتن اور بیش بہا نوادرات کا، جن میں گاڑیاں بھی شامل تھیں اتنا بڑا خزانہ ملا جس کی مالیت کروڑوں سے بڑھ کر اربوں تک پہنچ چکی تھی۔

اپنے چند دوستوں کی عملی حمایت سے میں نے اپنے علاقے کی ترقی کے لیے ایک پروگرام بنایا جس میں اسکول اور اسپتال قائم کرنے کے علاوہ جنگلات کا فروغ، فرنیچر بنانے اور ایکسپورٹ کرنا اور دریائے کیہان سے پن بجلی پیدا کرنے کا منصوبہ شامل تھا۔ مجھے دوستوں سے مدد اور لوگوں سے پذیرائی ملی لیکن علاقے کا جدی پشتی جاگیردار میرا دشمن ہوگیا۔ میری انسان دوستی اور غربا پروری کی شہرت پھیلی تو رانا کو اپنی صوبائی اسمبلی کی سیٹ خطرے میں نظر آنے لگی جسے وہ اپنا موروثی حق سمجھتا تھا۔

ابتدا میں شہر چھوڑ کر میرے ساتھ آنے والوں میں میرا نامور صحافی دوست راجا اور اس کی منگیتر ڈاکٹر شہناز کے علاوہ میری چچازاد بہن رابعہ اور میرے والدین شامل تھے۔ پھر علاقے کا نامی گرامی ڈاکو میرا حمایتی اور دوست بن گیا۔ شامی بادشاہ نے میرے کہنے سے فیصلہ کیا کہ معافی ملنے کے بعد ست بدھائی میں باعزت زندگی گزارے گا لیکن اس خفیہ پروگرام کی خبر دشمنوں کو مل گئی اور انہوں نے پولیس مقابلے کا ڈراما رچا کے سب کو راستے میں مار ڈالا...... زخمی شامی بادشاہ کو اس کی بیوی گولی نکال کرلے گئی۔

شرعی قانون وراثت کے مطابق مجھ سے پہلے ریاست کے وارث میرے والد اور چچا ہی ہوتے لیکن مجھے وصیت کی رو سے مالک و مختار بنانے والا برطانوی شہری تھا اور خود میں نے برطانیہ میں قیام اور ملازمت کے دوران برطانوی شہریت حاصل کرلی تھی چنانچہ اس فیصلے کو پاکستان کی کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چچا اور چچی کی خواہش کے مطابق اگر میں ان کی اکلوتی بیٹی رابعہ سے شادی کرلیتا تو حق تلفی کا ازالہ ہوسکتا تھا لیکن میں فریال کے سوا کسی کو قبول نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے رابعہ کو بہن کا درجہ دیا اور وہ ست بدھائی میں میرے ساتھ رہی۔ اس نے محبت کی شادی میں دوبار دھوکا کھایا۔ بدقسمتی سے دھوکا دینے والے میرے دوست تھے رفتہ رفتہ رابعہ بھی مجھے حق تلفی اور اپنے والدین کی موت کا ذمے دار سمجھنے لگی۔

حویلی میں آنے کے بعد میں نے ایک پرانے محافظ کی بیوی نور جہاں کو دیکھا جو درحقیقت اس کی داشتہ تھی۔ بردہ فروشی سے منشیات فروشی تک ہر کاروبار میں نور جہاں کو استعمال کرتا تھا۔ میں نے دنیا دیکھی تھی لیکن نور جہاں جیسی حسین عورت نہیں دیکھی...... اس نے مجھ سے مراسم استوار کرنے میں جائز و ناجائز کو نہیں دیکھا۔ فریال سے محبت اور شادی کے عہد و پیمان کے باوجود میں نور جہاں کے جال میں بری طرح پھنس گیا۔ اس نے میرے لیے اپنے نام نہاد شوہر کو بھی قتل کردیا اور میں نے اسے قانون کی گرفت سے بچانے کے لیے دن رات ایک کردیے۔ فریال میرے ساتھ لندن، پیرس اور نیویارک جیسے شہروں کی چکاچوند والی زندگی کے خواب دیکھتی تھی۔ نور جہاں کے معاملے نے اسے جواز فراہم کردیا اور وہ لوٹ کر شوبزنس میں چلی گئی جہاں چودھری سلطان کے ذریعے اسے زبردست کامیابی ملی۔ موقع ملتے ہی اس نے چودھری سلطان کو قتل کرادیا اور اپنے اعلیٰ سطحی مراسم کے باعث قانون کی گرفت میں آنے سے بھی محفوظ رہی۔

نور جہاں نام نہاد شوہر کے قتل کے الزام سے بچنے کے لیے طویل عرصہ روپوش رہی۔ پھر ماہ نور بن گئی۔ ایک جعلی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کا حصول مشکل نہ تھا۔ میں اسے لندن لے گیا تاکہ وہ اپنی نئی شخصیت کے ساتھ ست بدھائی واپس آجائے۔ میں اسے لارڈ ارنسٹ کی مدد سے برطانوی شہریت بھی دلوانا چاہتا تھا۔ ... سال بعد لندن پہنچ کر مجھ پر انکشاف ہوا کہ عائشہ دوبارہ ایلیشا بن چکی ہے اور ڈپریشن کے باعث نشہ کرتی ہے۔ اس کی ماں مر چکی تھی اور باپ سیاسی اور کاروباری معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ عائشہ کا عشق مجھے دیکھتے ہی پھر ایک جنون کی شکل میں لوٹ آیا، اس نے نور کو اغوا کرا کے مجھے مجبور کیا کہ میں اس سے شادی کرلوں۔ نور کی جان بچانے کے لیے مجھے یہ ڈراما بھی کرنا پڑا۔ چند دن بعد اس کے عیاش باپ کو دل کا دورہ پڑا اس کی وارث صرف عائشہ تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ عائشہ اس کی بزنس ایمپائر کو چلا نہیں سکتی، اس نے مرنے سے پہلے اپنی ایک سو بیس ملین پاؤنڈز کی جائداد اور وسیع کاروبار کا مالک مجھے بنا دیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مجھ سے شادی کے بعد عائشہ بھی ٹھیک ہوجائے گی۔ میرے انکار اور ماں باپ کی موت نے عائشہ کے احساس جرم کو شدید تر کردیا اور وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے ترک دنیا کر کے چرچ میں نن ہوگئی۔ قدرت کی طرف سے خوش نصیبی کی یہ دوسری لاٹری میرے لیے ایک آزمائش بن گئی، نور یہاں اکیلی رہنے پر راضی نہ تھی اور نہ میں یہاں رہتا یا واپس جاتا...... پھر کچھ اور غیر معمولی واقعات پیش آئے۔ اچانک مجھے وہ شخص مل گیا جو چیف کہلاتا تھا۔ اس نے دس سال پہلے لاہور میں مجھے اپنی سیاسی تنظیم میں دہشت گردی کے لیے استعمال کیا تھا۔ اب وہ لندن میں جلاوطنی اور روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر میں اسے اپنا سیاسی مشیر بنالوں تو آئندہ انتخابات میں اپنے حریف رانا کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی میں پہنچ سکتا ہوں۔ میں نے بظاہر اس کی پیشکش قبول کرلی۔

ست بدھائی کے اسپتال کو وسعت دینے میں میرے ساتھ ایک ڈاکٹر باپ بیٹا شامل تھے، اس فیملی کی تیسری رکن نیتا بھی ڈاکٹر تھی لیکن محبت میں ناکامی اور پھر شوہر کے قتل نے اسے نفسیاتی مریض بنادیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے مجھے اپنا سابق محبوب وحید مان لیا اور کسی حد تک نارمل بھی ہوگئی۔ وحید ایک لاابالی مصور تھا جو لندن میں عریاں تصاویر بنا کے اپنا فن اونے پونے بیچ رہا تھا اور استحصال کا شکار تھا۔ نیتا نے اپنی جان چھڑانے کے لیے وحید کو پاکستان لے جانا ضروری تھا۔ وہ ہو بہو میری کاربن کاپی تھا۔ میں نے اس کے تمام قرضے بےباق کیے اور اسے اپنے ہمراہ پاکستان لے جانے پر آمادہ کرلیا۔ چیف نے مجھے پٹی پڑھائی کہ میں وحید کو اپنے ڈپلی کیٹ کے طور پر بھی استعمال کرسکتا ہوں۔ چیف کا اصل نام غلام علی تھا۔

اگرچہ میں یہ کرسکتا تھا کہ ست بدھائی کو رابعہ کے سپرد کردوں تاکہ اس کا حق تلفی کا احساس ختم ہو اور خود نور کے ساتھ لندن میں ... کاروبار کو مزید پھیلاؤں۔ مگر نور کے سمجھانے سے میں نے لندن اور ست بدھائی دونوں جگہ رہنے کا فیصلہ کیا۔ لارڈ ارنسٹ کے تمام ملازم مجھے ساری ... تھے۔ وہ سب احتجاجاً ملازمت چھوڑ گئے...... لارڈ کے سابق شوفر اور باڈی گارڈ نے میری ... راستوں سے ناواقفیت کے باعث مجھے ایک ویران احاطے میں لے جا کر قتل کرنے کی کوشش کی انہیں ناک آؤٹ کر کے میں نے غلام علی کو طلب کیا اور خود ایلیشا سے ملنے چرچ چلا گیا۔ غلام علی نے احاطے میں کھڑا ریڈی میڈ ملبا کر ریت کے ڈھیر میں لاشوں کو دبا دیا جو وہاں پہلے سے موجود تھا۔ چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے وہ گرفتار ہوگیا...... میں نے اپنے بیان میں وہ سب بتادیا جو غلام نے اعتماد میں مجھے بتایا تھا۔ چارلی کے مددگار اپنی جان بچانے کے لیے وعدہ معاف گواہ بن گئے۔ حالات نے پلٹا کھایا اور مجھے اغوا کرلیا گیا۔ مگر سرغنہ کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ جس کا مقصد تھا کہ میں سارے الزامات اپنے سر لے لوں۔ چیف کی شکل دیکھ کر میں چونک گیا۔ اسی دوران چیف کی ایک نفسیاتی کمزوری کی بدولت میں نے یہ جان لیا کہ سرغنہ اصل چیف نہیں بلکہ اس کا ڈپلی کیٹ ہے۔ ادھر لندن پولیس کی مہارت اور جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے چیف اور اس کے گرگے گرفتار کرلیے گئے۔ میں قید خانے سے نکل کر ایک معمر انگریز جوڑے کی مدد سے اپنے گھر پہنچا۔ پھر میں نور کے ساتھ مل کر اپنی ذمے داریوں کو ادا کرنے میں مصروف ہوگیا۔ میں اور نور تمام امور سے نمٹ کر مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ اچانک ایلیشا بر قعے میں ملبوس پہنچ گئی۔ اب وہ اپنی جائداد کی واپسی کا مطالبہ کررہی تھی مگر مجھے اس کی ذہنی حالت پر شبہ تھا لہٰذا میں نے اس کا مطالبہ پورا کرنے سے انکار کردیا جس پر مشتعل ہو کر اس نے پستول نکال لیا اور دیوانگی کی حالت میں مجھ پر فائر کردیا۔ پولیس اسے لے گئی۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو ایلیشا نے جواباً مجھ پر الزامات کی بوچھار کردی لیکن وہ اب کچھ نہیں کرسکتی تھی لارڈ ارنسٹ کے وکیل نے مجھے جذباتی بلیک میل کرتے ہوئے ایلیشا کی حالت کے پیش نظر اس سے شادی کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے یہ تجویز سختی سے مسترد کردی۔ دوسری جانب نور مجھے قائل کرنے کی کوشش کررہی تھی کہ میں ست بدھائی رابعہ کے نام کردوں اور لندن میں اس کے ساتھ رہوں میں نے ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ بہرحال حالات کے پیش نظر میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا نور بڑی مشکل سے تنہا لندن میں رہنے پر راضی ہوئی۔ ایئرپورٹ پر میرا بریف کیس چوری ہوگیا جس کے باعث فلائٹ سے میری روانگی خطرے میں پڑ گئی۔ اسی کشمکش میں غیر معمولی مہارت سے مجھے بےہوش کردیا گیا اور ایمبولینس میں ڈال کر نہ معلوم مقام پر منتقل کردیا گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے اغوا کار کون ہیں پھر جب رابعہ میرے سامنے آئی تو میں بھونچکا رہ گیا اور مزید یہ کہ اسی نے میرے حریف زوہیب کے ساتھ مل کر یہ ڈراما رچایا تھا۔ اس کا دیرینہ مطالبہ تھا کہ جاگیر اس کے نام کی جائے۔ مجھے اس پر مجبور کرنے کے دوران ایک بات پر مشتعل ہو کر اس نے ریوالور سے مجھ پر فائر کردیا۔ اس کا نشانہ خطا گیا۔ اسی اثنا میں اس کے کارندے داخل ہوئے اور اسے لے کر چلے گئے۔ ایک دن میرے کمرے میں ٹی وی رکھ دیا گیا جس کے ذریعے رابعہ نے مجھ سے رابطہ کیا اور اپنا مطالبہ دہرایا۔ مسلسل قید اور ذہنی اذیت کے باعث میں اتنا بےزار تھا کہ میں نے اس کا مطالبہ منظور کرلیا۔ معاملہ یہ طے پایا کہ میں جاگیر رابعہ کو گفٹ کردوں گا۔ بعدازاں رابعہ نے مجھ سے رابطہ کر کے اپنی محبت کا اظہار کیا اور شادی کی درخواست کی میں نے انکار کیا تو وہ اپنی ناکامی پر دوبارہ مخالفت پر کمربستہ ہوگئی۔ یہاں مجھے یہ اطمینان ضرور ہوگیا تھا کہ اب میری زندگی محفوظ ہے کیونکہ وکیل اور راجا کے درمیان میں آجانے سے جان کا خطرہ ٹل گیا تھا۔

قید کے دوران ایک دن میری نگرانی پر مامور افراد میں سے ایک کے دل میں آخر دم نیکی کا جذبہ بیدار ہوا اور اس نے قید خانے کی دیوار میں رخنہ ڈال کر مجھے رہائی دلا دی۔ میں باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی متروک گیسٹ ہاؤس تھا۔ ویرانے میں مجھے ایک دیہاتی جوڑا نظر آیا جو مجھے ایک سابق فوجی خلیل صاحب کے گھر تک لے گیا جہاں خلیل صاحب اور ان کی اہلیہ نے میری بہت مدد کی اور میں راجا سے رابطہ کرنے اور وہ مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ رابعہ کی پراسرار گمشدگی پریشان کن تھی۔ راجا مجھے ایک اسپتال لے گیا تاکہ میری صحت پر سے منفی اثرات زائل ہوں۔ پھر مجھے ریشم کے ہاں ولادت اور نیتا کے ساتھ وحید کی شادی کی خوشخبری ملی۔ اچانک رابعہ نے بھی فون پر مجھ سے بات کرنا چاہی مگر راجا نے اسے جھڑک دیا۔ کچھ وقت گزرا تھا کہ پولیس انسپکٹر نے اطلاع دی کہ کسی عورت کی لاش پاس کے علاقے میں ملی ہے۔ میں نے اسپتال جا کے دیکھا تو لاکٹ اور دیگر نشانیوں سے وہ رابعہ ثابت ہوئی جس کا چہرہ مسخ تھا۔ میں افسردہ واپس آرہا تھا کہ میرے عقب میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آتی گارڈز کی گاڑی دھماکے سے تباہ ہوگئی اور ایک خونی معرکہ کے بعد میں حویلی واپس پہنچا تو نور نے فون پر بتایا کہ وہ پاکستان آرہی ہے لہٰذا میں اسے لینے کے روانہ ہوا لیکن راستے میں مولا داد نامی ڈاکو نے مجھے اغوا کرلیا۔ مولا داد کے ڈیرے پر نیلم نامی لڑکی نے مجھے اس کے عزائم سے آگاہ کیا اور میری مدد کی۔ یہاں سے ڈاکوؤں سے نمٹ کر جب ائرپورٹ پہنچا تو دیکھا نور نہیں آئی بلکہ فون پر مجھے الزام دیا کہ میں نے رابعہ کے بارے میں اس سے غلط بیانی کی ہے۔ میں نے وضاحت کی تو اس نے فون پر رابعہ کی موجودگی کا انکشاف کیا اور اس کی آواز سن کر میں چکرا کر رہ گیا۔

رابعہ میرے لیے دردسر بن چکی تھی جبکہ اس نے نور کو بھی میرے خلاف بھڑکا دیا تھا۔ لیکن نور نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے رابعہ کی نگرانی کی جس کے ذریعے انکشاف ہوا کہ رابعہ کا حویلی میں کسی سے رابطہ قائم ہے۔ لہٰذا نتیجے میں ایک گارڈ سردار خان مجرم ثابت ہوا اور ایک مختصر لڑائی کے بعد میں نے اس پر قابو پالیا۔ دوسری جانب وحید کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک مقابلے کے بعد اغوا کار بھی قیدی بنا لیے گئے۔ میں نے نور کو کنٹرول میں خفل ہونے اور رابعہ کی نگرانی سخت کرنے کی ہدایت کی اور لندن جانا چاہا لیکن راجا نے مجھے مصلحتاً روکا اور خود لندن جانے کا فیصلہ کیا جبکہ قیدیوں سے حاصل کی گئی معلومات کے مطابق ان ساری کارروائیوں کے پیچھے دلاور کا ہاتھ تھا۔ یہ نام میرے لیے نیا تھا جو اسلحے اور منشیات کا ایک بین الاقوامی اسمگلر تھا۔ وہ الیکشن میں اپنے حق میں میری دستبرداری کا خواہش مند تھا مگر میں نے اسے چیلنج کردیا۔ رات کی تاریکی میں مجھے ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ میں نے اپنے کمرے سے نکل کر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ چیخ نیلم کی تھی جسے کسی نقاب پوش نے دبوچ رکھا تھا۔ میری مداخلت پر وہ فرار ہوگیا۔ حملہ آور کی حویلی میں موجودگی باعث تشویش تھی۔ اسی دوران ڈاکٹر شہناز کی کزن شہلا جو ڈاکٹر تھی، بھی ہماری ٹیم کا ایک رکن بن گئی۔ سخت تفتیش کے بعد سجاد نامی حملہ آور کو ڈھونڈ نکالا گیا جو دلاور خان کا آدمی تھا۔ بعدازاں سجاد نے اپنی ایک جھوٹی کہانی سنائی کہ کس طرح وہ دلاور کے شکنجے میں پھنسا۔ مگر اب وہ حقیقت جان کر دلاور کا دشمن بن گیا ہے۔ میں اس کے جھانسے میں آگیا میں نے یقین کرکے اسے اپنے دوست کی حیثیت سے حویلی میں رکھ لیا جبکہ ڈاکٹر شہناز نے حقیقت محسوس کرلی۔ راجا کا فون آیا اور اس نے اطلاع دی کہ رابعہ فرار ہوگئی ہے۔ ہم نے سجاد کے بارے میں معلومات کے لیے ایک شخص کو روانہ کیا۔ جس کی روانگی کے بعد ایک نامعلوم کال کے ذریعے اطلاع دی گئی کہ وہ اسپتال میں زخمی حالت میں ہے۔ ہم حیران تھے کہ اتفاقیہ صوبے دار میجر صاحب نے میرے پستول کی صفائی کے دوران ٹرانسمیٹر ٹائپ ایک ڈیوائس دریافت کی اور سجاد جس پر جو شک تھا وہ یقین میں بدل گیا لہٰذا اس سے تہ خانے میں تشدد کے ذریعے معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں وہ شدید زخمی ہوگیا اور اسی حالت میں فوت ہوگیا۔ اس امر کی تصدیق ہوگئی کہ اسے بھیجنے والا زوہیب تھا۔ راجا نے اطلاع دی تھی کہ وہ اور نور پاکستان آرہے ہیں لہٰذا اسے لینے میں اپنے گارڈ کے ساتھ ائرپورٹ پہنچا جہاں ایک گارڈ نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ اسی دوران ایک فائر ہوا اور میں نے ایک گارڈ کو گرتے دیکھا۔ ایئرپورٹ پر اس صورت حال پر پولیس بروقت پہنچ کر پوچھ تاچھ کا سلسلہ شروع کرتی ہے۔ راجا اور نور ایئرپورٹ سے برآمد ہوتے ہیں۔ نور بڑی فکرمند ہے معاملہ کچہری کا ہے لہٰذا انہیں وہیں رکنا پڑتا ہے۔ اسی دوران راجا کا ایک کرائم رپورٹر دوست اثر رسوخ کا حامل ہے ان کی مدد کرتا ہے۔ فراغت کے بعد یہ لوگ ست بدھائی پہنچ جاتے ہیں جہاں ڈاکٹر شہلا کو اپنے گھر سے بلاوے پر لاہور سرور کے ذریعے روانہ کیا جاتا ہے لیکن سرور زخمی حالت میں آکر اطلاع دیتا ہے کہ شہلا کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ یہاں بھی راجا کا دوست ناصر کام آتا ہے اور شہلا کو بازیاب کرالیا جاتا ہے۔ اس کے بعد رفیق سکون کا سانس لیتا ہی ہے کہ ایک فون کال اس کا سکون غارت کردیتی ہے۔

کال رابعہ کی تھی اور اس نے اپنی مظلومیت کا ایسا نقشہ کھینچا کہ کئی بار جھڑکنے کے بعد بالآخر میں اس کی مدد پر آمادہ ہوگیا اور اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا جہاں مجھے قید کرکے ذہنی ٹارچر کیا جاتا ہے لیکن ایک بار پھر غنی کی بروقت مداخلت سے اسے رہائی ملتی ہے اور ساتھ ہی رابعہ کو بھی آزاد کرالیا جاتا ہے اس کے ساتھ ہی ایک شخص مچھو کو بھی یرغمال بنا کر قید کردیا جاتا ہے۔ رابعہ اپنی رام کہانی سناتی ہے۔ لاہور میں ہم غنی کے ایک دوست کی کوٹھی میں قیام کرتے ہیں۔ جہاں مجھ پر ایک حملہ کیا جاتا ہے۔ گولی لگنے سے زخمی ہوجاتا ہوں۔ یرغمالی کے منہ سے ایک نیا نام شاکر سامنے آتا ہے جو لاہور کا غنڈا ہے۔ اس حملے کے سلسلے میں بیان لینے پولیس افسر آتا ہے اور شاکر کے متعلق بتاتا ہے لیکن رفیق لاعلمی کا اظہار کرتا ہے۔ اسی دوران دروازے کے باہر غنی کی کسی سے بحث کی آواز آتی ہے۔

حویلی میں ایک پگلی عورت گھس آئی تھی جس سے گارڈز الجھے ہوئے تھے۔ میں نے گارڈز کو ان کی بے پروائی پر سرزنش کی اور پگلی کو روانہ کردیا۔ راولپنڈی سے ناصر کا فون آیا، اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ ہم نے اس کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال جانے کا فیصلہ کیا جبکہ نیلم نے بھی اپنے والد سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا لہٰذا وہ بھی ساتھ تھی۔ راستے میں نہ معلوم افراد نے ہم پر حملہ کیا۔ نیلم نے بھرپور انداز میں مدد کی اور گجرات کے ڈپٹی کمشنر کی مدد کی بدولت میں اسپتال تک پہنچ سکا جہاں سے راجا کو فون پر اطلاع دی اور وہ آکر ست بدھائی لے گیا۔ اس معرکے کے دوران میرا موبائل وہیں گر گیا تھا۔ اسی دوران خبر ملی کہ فریال کو قتل کردیا گیا ہے اور اس کی لاش کے پاس ہی میرا موبائل ملا ہے۔ یہ انتہائی تشویشناک صورت حال تھی لیکن راجا کے تعلقات اور ڈپٹی کمشنر کی مدد سے اس صورت حال پر قابو پالیا گیا۔ ایک دن مجھے شاکر کا فون موصول ہوا جو مجھ سے فوراً ملنا چاہتا تھا۔ غنی نے پریشانی کے عالم میں مجھے رابعہ کے متعلق خبر دی۔

رابعہ نے ڈراما کرکے بیمار بننے کی کوشش کی لیکن اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ پگلی نے ایک بار پھر حویلی میں داخل ہونے کی جرات کی جس پر اسے حویلی بلالیا گیا جس نے انکشاف کیا کہ وہ پاگل پن کا ڈھونگ رچا رہی تھی رانا کے ظلم کی وجہ سے۔ لیکن بعدازاں وہ جھوٹی ثابت ہوئی اور حویلی سے فرار ہوگئی۔ اسی دوران لندن سے سوشی کا فون آیا اور ایک بڑے معاہدے کے سلسلے میں نور کو لندن واپس بلایا۔ رابعہ کو اسپتال لے جایا گیا جہاں سے وہ بیماری کی حالت میں فرار ہوگئی۔ لندن روانگی سے پہلے نور کی شاپنگ کے سلسلے میں لاہور جاتے ہوئے راستے میں ایک ہوٹل میں شاکر سے حادثاتی ملاقات ہوئی اور اس نے اپنے اور دلاور کے درمیان جاری تنازعات کے بارے میں بتایا۔ واپسی میں کچھ لوگوں نے مجھے رفیق اور نور کو اغوا کرکے قید کرلیا۔ جہاں میں نے مشتعل کرکے ایک ڈاکو کو قابو کرلیا۔

قید خانے سے فرار کے بعد کئی سنسنی خیز واقعات پیش آئے جن کی پشت پر رفیق کے دشمن دیرینہ دلاور کا ہاتھ تھا، قید خانے کے بعد دوبارہ ان پر حملہ کیا لیکن انجام کار رفیق محفوظ رہا لیکن حملہ آور نور کو لے جانے میں کامیاب رہے۔ قید خانے میں نواب رفیق کی قابل اعتراض ویڈیوز ڈپٹی سیکریٹری کی بیٹی ثمرہ کے ساتھ اتاری گئی تھیں، لہٰذا رفیق اینڈ کمپنی نے نور کے بازیابی اور مسکین شاہ تک رسائی اور اسے بے نقاب کرنے کے لیے اس کے آلہ کاروں کو قابو کرکے ان سے معلومات کی حکمت عملی اختیار کی۔ رفیق نے بھی مسکین شاہ کے خاص آدمی آفتاب کو اغوا کرکے اس سے پوچھ کی بعدازاں اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے اس کی بیٹی کو بھی اغوا کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

"دروازہ کھولیں سر!" باہر سے غنی کی آواز سنائی دی۔

ناصر نے دروازہ کھول دیا لیکن اس کے ہاتھ میں ابھی تک ریوالور تھا۔

اندر داخل ہوکر غنی نے پہلے دروازہ بند کیا اور میرے سامنے مؤدب انداز میں کھڑا ہوگیا۔

"غنی! اس سورما کی زبان کھلواؤ۔ اس سے پوچھو کہ سندھو اس وقت کہاں ہے؟ پہلی دفعہ میں نہ بتائے تو اس کے دونوں کان کاٹ دینا۔"

"او کے سر!" غنی نے کہا اور اپنی پنڈلی سے بندھا ہوا دو دھاری خنجر نکال لیا، پھر وہ انتہائی درشت لہجے میں بولا۔

"اب شروع ہوجاؤ ورنہ میں نے آج تک کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی ہے۔ اکبر سندھو ہمیں کہاں ملے گا؟" یہ کہتے ہوئے غنی نے اس کے بال پکڑ لیے۔

"میں بتا تو چکا ہوں کہ....."

غنی نے اس کے بازو پر ہلکا سا چرکا لگایا اور بولا۔

"اگر تم نے ایک منٹ کے اندر اندر زبان نہ کھولی تو میں تیرے دونوں کان کاٹ دوں گا۔"

غنی نے اس کی ٹانگوں میں پاؤں اڑا کر اسے گرایا اور اس کے سینے پر گھٹنا رکھ کر اس کا ایک کان مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"اکبر اس وقت شکور کے اڈے پر ہے۔" بابو نے جلدی سے کہا۔

"اور یہ شکور کون ہے اور اس کا اڈا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں جانتا ہوں۔" ناصر نے کہا۔ "کہ شکور کا اڈا کہاں ہے۔"

"ٹھیک ہے، ہم لوگ شکور کے اڈے کی طرف جارہے ہیں۔" میں نے غنی سے کہا۔ "تم اس وقت تک ان دونوں کو مت چھوڑنا جب تک اکبر ہمارے ہاتھ نہ لگ جائے۔ اگر یہ شور شرابا کرنے یا ہوشیاری دکھانے کی کوشش کریں تو انہیں ذبح کرکے کہیں ڈال دینا۔"

"او کے سر!" غنی نے مستعدی سے جواب دیا۔

ہم باہر نکلنے ہی والے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ بابو اور نورین کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میں نے غنی کو اشارہ کیا۔ وہ بابو کو دھکیل کر اندر لے گیا۔

"تم دروازہ کھولو۔" میں نے سرگوشی میں نورین سے کہا لیکن میرا لہجہ انتہائی درشت تھا۔

ہم دونوں پہلے کی طرح دروازے کے دائیں بائیں طرف دیوار سے لگ کر کھڑے ہوگئے۔

نورین نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

"اتنی دیر کیوں کردی جان؟" آنے والے نے چہک کر کہا۔ "کیا سورہی تھیں؟"

"تم..... اندر تو آؤ۔" نورین جلدی سے بولی۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں آنے والے کو خفیف سا اشارہ بھی کیا تھا جو میری نظروں سے چھپا نہ رہ سکا۔

میں نے نورین کو ایک طرف دھکا دیا اور پلک جھپکتے میں آنے والے کا گریبان پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا۔

آنے والے نے جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی لیکن ناصر نے سخت لہجے میں کہا۔ "تو! اپنے ہاتھوں کو قابو میں رکھو اکبر ورنہ میں کھوپڑی اڑادوں گا۔"

اکبر طنزیہ انداز میں ہنسا، پھر بولا۔ "اوہو، یہاں تو میرے استقبال کی زبردست تیاریاں ہیں۔"

"اپنے ہاتھ سر پر رکھو۔" ناصر نے کہا۔

"اور رونا شروع کردوں۔" اکبر مزاحیہ انداز میں بولا۔ "ماں اکثر بچپن میں کہتی تھی کہ سر پہ ہاتھ رکھ کے روئے گا۔"

جواب میں ناصر نے جھنجلا کر اس کے چہرے پر تھپڑ مار دیا۔ "بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اکبر نے نتائج کی پروا کیے بغیر ناصر پر چھلانگ لگائی اور اسے رگیدتا ہوا دیوار تک لے گیا۔

میں نے فلیٹ کا دروازہ بند کیا اور ڈپٹ کر بولا۔

"پیچھے ہٹو ورنہ....."

ناصر نے اس وقت تک اسے سامنے کی طرف اچھال دیا تھا۔ وہ میرے سامنے آکر گرا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا ہاتھ جیب میں ڈالنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کی کلائی پر مضبوطی سے پاؤں رکھ دیا۔

ناصر کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھ کے نیچے بھی نیل کا نشان تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر پہلے تو اکبر کی تلاشی لے کر اس کی جیب سے ایک جرمن لیوگر اور پینٹ کی بیلٹ میں پشت کی طرف اڑسا ہوا ایک ریوالور نکالا، پھر اس کے چہرے پر اتنا زوردار گھونسا مارا کہ اس کے دو تین دانت ٹوٹ گئے۔

"تو نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔" ناصر نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ "دو ٹکے کے بدمعاش! کل تک تو لوگوں کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیبیں کاٹتا تھا اور عورتوں کے پرس چھین کر بھاگتا تھا۔"

میں نے بال پکڑ کر اسے اٹھا کر بٹھا دیا۔

"وہ کل کی بات تھی ناصر صاحب!" اکبر نے تلخ لہجے میں کہا۔ "کل تک آپ بھی تو تیسرے درجے کے اخبارات میں ملازمت کرتے تھے، جہاں کبھی سیلری دو مہینے بعد ملتی تھی، کبھی تین مہینے بعد اور کبھی ملتی ہی نہیں تھی۔ آج آپ پولیس کے ایک افسر کے سامنے بہت باعزت اور معزز بن رہے ہیں۔"

ناصر نے تابڑ توڑ اس کے چہرے اور جسم پر کئی گھونسے رسید کر دیے۔

"کھڑے ہو جاؤ اکبر!" میں نے کہا۔ "اور اندر بیڈ روم میں چلو۔"

وہ آہستہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے خون تھوکنے کی کوشش کی تو اس کے ساتھ اس کے دو دانت بھی باہر آ گرے۔

میں نے راجا کا نمبر ملایا اور اس سے کہا۔ "تم بھی اوپر آ جاؤ۔"

"میں اس تشدد اور مار پیٹ کا مطلب نہیں سمجھا؟" اکبر نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ سامنے کے دانت ٹوٹنے کی وجہ سے اس کے الفاظ بھی گڈمڈ ہو کر رہ گئے تھے۔

"ابھی سمجھ جاؤ گے۔" میں نے کہا، پھر کچھ توقف کے بعد اچانک بولا۔ "تم دلاور اور رانا زوہیب کے لیے کب سے کام کر رہے ہو؟"

اکبر نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں رانا زوہیب کے لیے تو نہیں لیکن دلاور کے لیے ضرور کام کرتا ہوں۔"

"تم نے ابھی حال ہی میں ایک لڑکی اغوا کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کس لڑکی کی بات کر رہے ہیں؟" اکبر نے پوچھا۔

"دیکھو، مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔ جو کچھ پوچھ رہا ہوں، اس کا صحیح صحیح جواب دو ورنہ....."

"ورنہ آپ مجھے تھانے لے جائیں گے اور....."

"وہاں کی نوبت تو بعد میں آئے گی۔ تم سے جو کچھ پوچھا جا رہا ہے۔ اس کا جواب دو۔"

"میں جواب دے تو رہا ہوں۔" اکبر نے کہا۔ "میں نے اس ہفتے میں دو لڑکیاں اغوا کی تھیں۔ ان میں سے ایک تو فرار ہو گئی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ کسی ڈپٹی سیکریٹری کی بیٹی تھی۔"

"اور دوسری؟" میں نے پوچھا۔

"دوسری لڑکی کسی نواب کی منگیتر تھی۔" اس نے کہا۔

"وہ لڑکی اس وقت کہاں ہے؟" میں نے بہ مشکل تمام اپنے غصے اور جذبات پر قابو پا کر کہا۔

"دیکھو آفیسر!" اکبر نے کہا۔ "میرا کام صرف اتنا ہی ہے کہ میں لڑکیوں کو اٹھا کر اس شخص کے حوالے کر دوں جو مجھے اس کا معاوضہ دیتا ہے۔ پھر میں نہیں جانتا کہ وہ لڑکیاں کہاں جاتی ہیں؟"

"تم معلوم تو کر سکتے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "کہ وہ لڑکیاں اس کے بعد کہاں جاتی ہیں؟"

وہ تلخ انداز میں مسکرا کر بولا۔ "اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میرے اس بیان کو میرے خلاف استعمال کر سکتے ہیں تو....."

"مجھے قانون مت سکھاؤ اکبر!" میں نے کہا۔ "میں بھی جانتا ہوں کہ تمہارے اس بیان کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ میں نے قانونی کارروائی کی بھی نہیں ہے اور میں ایسا کر بھی نہیں سکتا....." میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "کیونکہ میرا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔"

میرے اس انکشاف سے اکبر اور نورین دونوں ہی چونک اٹھے۔ "تمہارا تعلق پولیس سے نہیں ہے؟" اکبر نے حیرت سے پوچھا۔ "تو..... پھر..... تم....."

"دیکھو اکبر!" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "میں تم سے ایک ڈیل کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسی ڈیل؟" اکبر نے الجھ کر پوچھا۔

"جتنا معاوضہ دلاور نے تمہیں اس لڑکی کے اغوا کا دیا تھا، میں اس سے دگنا معاوضہ دوں گا۔ تم اس لڑکی کو واپس لے آؤ۔"

"سوری!" اکبر نے کہا۔ "یہ تو دلاور کو ڈبل کراس کرنا ہوا۔"

"اچھا، تم اتنا ہی بتا دو کہ اس لڑکی کو اغوا کرنے کے بعد تم نے کس کے حوالے کیا تھا؟ دلاور تو یہاں موجود ہی نہیں ہے۔"

"دلاور یہاں کبھی کبھار ہی آتا ہے۔" اکبر نے کہا۔ "لیکن اس کا خاص آدمی بلکہ اس کا پورا نیٹ ورک یہاں کام کر رہا ہے۔"

"مجھے اس خاص آدمی کا نام پتا بتا دو۔" میں نے جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔

"اتنے معمولی سے کام کے میں پیسے نہیں لیتا۔" اکبر نے کہا۔ "ویسے بھی وہ آدمی اتنا طاقتور ہے کہ تم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔"

"تم صرف نام بتاؤ پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ آدمی کتنا طاقتور ہے؟" میں نے کہا۔

"اس آدمی کا نام ہے مسکین شاہ۔" اکبر کے انکشاف نے میرے جسم میں گویا آگ بھر دی۔

"مسکین شاہ نے کیا خود تم سے کہا تھا کہ اس لڑکی کو اغوا کرو۔"

"وہ اس قسم کے کام خود کب کرتا ہے۔" اکبر نے جواب دیا۔ "اس کے خاص آدمی آفتاب خان نے مجھ سے کہا تھا۔"

"آفتاب خان!" میرے ذہن کو دھچکا سا لگا۔ "گویا نور کو آفتاب خان نے اغوا کرایا تھا۔"

"جھوٹ مت بولو۔" میں نے اسے آزمانے کو کہا۔ "آفتاب خان اور شاہ جی میں تو اچھے خاصے اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔"

"وہ اختلافات تو ابھی پیدا ہوئے ہیں لیکن دنیا کے سامنے وہ اب بھی ایک ہی ہیں۔" اکبر نے جواب دیا۔

"تم نے اس لڑکی کو آفتاب خان کے حوالے کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، میں نے اسے آفتاب خان کے حوالے کر کے اپنا معاوضہ وصول کر لیا تھا۔" اکبر کے لہجے میں سچائی تھی۔

"میں نہیں جانتا کہ آفتاب خان سے تم نے کتنا معاوضہ وصول کیا تھا" میں نے کہا۔ "لیکن میں تمہیں اس سے دگنا معاوضہ دوں گا۔ تم آفتاب خان کی بیٹی کو اٹھا لاؤ۔" مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے آفتاب خان کو اتنی آسانی سے چھوڑ کیسے دیا؟

"کیا تم سنجیدہ ہو؟" اکبر نے حیرت سے پوچھا۔

"اس میں تمہیں کون سی بات مذاق لگ رہی ہے؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ایک دفعہ خود ہی میں نے آفتاب خان کی بیٹی کو اغوا کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا کیونکہ اس وقت تک مجھے علم نہیں تھا کہ اسی نے نور کو اغوا کرایا ہے۔"

"میں نے آفتاب خان سے پانچ لاکھ روپے لیے تھے۔" اکبر نے کہا۔ "میں پروفیشنل آدمی ہوں اور لگی لپٹی رکھے بغیر بات کرتا ہوں۔"

"میں تمہیں دس لاکھ دوں گا۔" میں نے کہا۔ "کہو تو پیشگی دے دوں؟"

"نہیں۔" اکبر نے کہا۔ "میں پوری رقم کام کرنے کے بعد ہی وصول کرتا ہوں۔"

"اور اگر کوئی کام کرانے کے بعد رقم دینے سے انکار کر دے تو؟"

"تو پھر اس کی زندگی کے دن پورے ہو جاتے ہیں۔" اکبر نے سفاک لہجے میں کہا۔ "میں وعدہ خلافی کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "لڑکی تمہیں کب اور کہاں چاہیے؟"

"میں تمہیں سیل فون پر بتا دوں گا۔ فی الحال میرے پاس کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔"

"کل شام تک تمہارا کام ہو جائے گا۔" اکبر نے کہا۔ پھر وہ ہنس کر بولا۔ "میں نے تو تمہارا نام بھی نہیں پوچھا۔"

"میرا نام آصف ہے، آصف خان!" میں نے کہا۔ "میں کل شام کو تمہیں فون کروں گا۔"

"تم اپنا سیل نمبر مجھے دے دو۔ میں خود ہی تم سے رابطہ کر لوں گا۔"

میں نے غنی کو اشارہ کیا اس نے اپنا سیل نمبر اکبر کو بتا دیا۔

ہم لوگ ایک ایک کر کے وہاں سے نکل آئے۔

راجا نے کہا۔ "فیکے پتر! تو کیا سمجھتا ہے، یہ سندھو تیرا کام کرے گا؟"

"میرا خیال ہے کہ کرے گا۔" میں نے کہا۔ "وہ دلاور یا مسکین شاہ کے ساتھ باقاعدہ شامل نہیں ہے بلکہ وہ لوگ پیسے دے کر اس سے کام کراتے ہیں۔ شاہ جی صرف لڑکیاں ہی اغوا نہیں کراتا ہوگا بلکہ اپنے مخالفین کے سیاسی جلسے بھی درہم برہم کراتا ہوگا۔ ممکن ہے، مخالف سیاسی جماعتوں کے کارکنان کو اغوا بھی کرتا ہو۔"

"ہاں، میں نے اس وکیل سرور ڈھلون کے بارے میں بھی معلوم کر لیا ہے۔ وہ دو تین ہفتے کے لیے بیرون ملک گیا ہوا ہے۔" ناصر نے کہا۔ "اس کی قانونی فرم میں دو تین وکیل اتنے سینئر ہیں کہ سرور ڈھلون اگر دو تین مہینے بھی ملک سے باہر رہے تو اس کے مقدمات کی پیروی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

"سرور ڈھلون گیا بھاڑ میں۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو نور کی طرف سے پریشانی ہے۔ مسکین شاہ نے اسے اغوا کرایا ہے تو رانا زوہیب کے کہنے پر کرایا ہوگا۔"

"کیا ہم اس کے دوسرے چچے قدوائی کی خبر لیں؟" ناصر نے کہا۔

"کل شام تک انتظار کر لیتے ہیں۔" راجا نے کہا۔ "اگر اکبر سندھو واقعی آفتاب خان کی بیٹی کو اغوا کر لایا تو پھر صورتِ حال کچھ اور ہی ہوگی۔"

"راجا!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "تو ایسا کر کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ست بدھائی چلا جا۔ وہاں بھی تو کسی ذمے دار آدمی کی ضرورت ہے۔ یوں بھی وہاں تعمیراتی کام جاری ہے۔ ڈاکٹر مہدی حسن آخر یہ سارے کام کہاں تک سنبھالیں گے۔''

''ست بدھائی تو میں خود بھی جانا چاہ رہا ہوں۔ ویسے انگریزوں میں رہ کر تیری ذہنیت بھی انگریزوں والی ہو گئی ہے۔'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''ٹھیکے پتر! تو بھی ڈیوائڈ اینڈ رول کی پالیسی پر عمل کر رہا ہے۔ تو نے شاکر کو دلاور کے پیچھے لگا دیا ہے اور اب اکبر کو آفتاب خان کے پیچھے لگایا ہے۔''

''اکبر تو کل تک اپنے مشن میں کامیاب ہو جائے گا لیکن مجھے نہیں لگتا کہ شاکر دلاور پر قابو پا سکے گا۔''

''یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''فی الحال تو مجھے نور کی فکر ہے۔ اس حرامزادے ٹرک ڈرائیور نے نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا؟''

رات کو راجا ست بدھائی کے لیے روانہ ہو گیا۔

رات کو کھانے کے بعد میں نے کچھ دیر لان میں چہل قدمی کی۔ مجھے دیکھ کر ناصر بھی وہیں آ گیا۔

''یار ناصر!'' میں نے کہا۔ ''میری وجہ سے تمہارے کام کا بھی حرج ہو رہا ہے۔ اخبارات میں اتنی چھٹی تو کبھی نہیں ملتی۔''

''میں بھی اب راجا کی طرح فری لانسنگ کر رہا ہوں۔'' ناصر نے کہا۔ ''اخبار سے میرا تعلق تو ہے لیکن میں اسے صرف اپنا ہفتہ وار کالم اور پولیٹیکل اور کرائم انویسٹی گیشن کی اسٹوریز ہی دوں گا۔ مثلاً کس محکمے میں کتنے گھپلے ہوئے، کتنے کروڑ بلکہ اب تو اربوں روپے کس نے کھائے۔ کون سا کام صرف کاغذوں کی حد تک ہوا اور کس ٹھیکیدار نے متعلقہ افسروں کو کاغذی سڑک بنانے کے لیے کتنا کمیشن دیا اور خود کتنا پیسا ہڑپ کیا؟''

''یہ بھی تو فل ٹائم جاب ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں متعلقہ محکموں میں جانا پڑے گا۔ جرائم کی خبروں کے لیے پولیس افسران سے ملنا پڑے گا۔''

''میں برسوں سے یہی سب کچھ کر رہا ہوں نواب صاحب! ہر سرکاری، نیم سرکاری اور دوسرے اہم محکموں میں میرے آدمی موجود ہیں۔ وہ مجھے خود ہی خبریں پہنچا دیتے ہیں۔''

''گویا اب تم نے بھی راجا کے نقش قدم چلنے پر کا فیصلہ کر لیا ہے؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''میں نے اپنے اخبار سے یہ بھی طے کر لیا ہے کہ میری اسٹوریز اور خبریں دوسرے اہم اخباروں میں بھی لگیں گی۔''

''تمہاری ان اندر کی کہانیوں سے کوئی فرق تو پڑتا نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''فرق تو بہت پڑتا ہے نواب صاحب! لیکن یہاں تو آوے کا آوے ہی بگڑا ہوا ہے۔ وزیر اور سفیر سے لے کر معمولی کلرک تک بھی اپنے اپنے طور پر پیسا بٹور رہے ہیں۔ مسکین شاہ کی مثال آپ کے سامنے ہی ہے، اس سے پہلے وہ کریلا تھا، رانا زوہیب ہے اور بھی بے شمار سیاست دان ہیں جو صرف اپنا مفاد دیکھتے ہیں، اس تالاب کی تو ہر مچھلی ہی گندی ہے۔''

تھوڑی دیر مزید چہل قدمی کے بعد میں اپنے بیڈروم کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے غنی اور احمد شاہ کو دیکھا۔ وہ بہت مستعدی سے کوٹھی کی نگرانی کر رہے تھے۔ غنی کا کتا بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ ابھی مشکل سے تین ہفتے کا ہوگا لیکن غنی کو خوب پہچانتا تھا۔

میں بیڈروم میں داخل ہوا تو نیلم نے کمرے میں جھانکا۔ میں نے اسے اشارے سے اندر بلا لیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو مجھے دھچکا سا لگا۔ اس نے نور کی ایک ساری باندھی ہوئی تھی۔

''تمہارے پاس یہ ساری کہاں سے آئی!'' باوجود کوشش کے میں اپنی تلخی کو نہ چھپا سکا۔

''یہ ...... یہ ...... بیگم ...... صاحبہ نے مجھے خود دی تھی صاب جی!'' وہ ہکلا کر بولی اور سہمے ہوئے انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

مجھے غصہ اس بات پر آیا تھا کہ وہ بغیر پوچھے نور کے کپڑے استعمال کر رہی ہے۔ اس کی وضاحت کے بعد میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، اب تم جا کر سو جاؤ۔ تم اتنی رات تک جاگتی کیوں رہتی ہو؟''

''وہ جی ...... ڈاکٹر صاحبہ اور بیگم صاحبہ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کافی کے بہت شوقین ہیں۔ رات کو جب تک جاگتے رہتے ہیں، کافی پیتے رہتے ہیں اس لیے ......''

''مجھے کافی کی طلب ہوگی تو میں غنی سے کہہ دوں گا۔ وہ تو ساری رات جاگتا رہتا ہے۔ تم اپنی نیند خراب مت کرو۔''

نیلم کے جانے کے بعد میں نے دوا لی اور خود بھی بیڈ [illegible] لیٹ گیا۔ جب سے نور اغوا ہوئی تھی، مجھے سونے کے [illegible] خواب آور گولیاں کھانا پڑتی تھیں۔

اس کے بعد بھی مجھے پرسکون نیند نہیں آتی تھی۔ ا[illegible] وقت بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی مندر میں گھنٹیاں بج ر[illegible] ہوں۔ وہ سلسلہ تھما تو خاصا سکون ملا۔ دوسری مرتبہ مجھے ای[illegible] جیسے میں کسی تیسرے درجے کے ایرانی ہوٹل میں بیٹھا ہ[illegible] اور وہاں کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا سیٹھ وقفے وقفے سے تیز اور کا[illegible]

میں چبھتی ہوئی گھنٹیاں بجا رہا ہو۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔

میرے سیل فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ میں نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی، وہ ساڑھے آٹھ بجا رہی تھی۔

میں نے سیل فون اٹھا کر دیکھا۔ اسکرین پر شاکر کا نام تھا۔ صبح صبح اسے فون کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟ میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ہاں شاکر! بولو، کوئی خاص خبر ہے؟''

''اب آپ کو شاکر سے جواب لینے کے لیے عالم بالا کا رخ کرنا پڑے گا نواب صاحب!'' دوسری طرف سے کوئی کرخت لہجے میں بولا لیکن وہ آواز میرے لیے مانوس تھی۔ میں اس سے پہلے بھی وہ آواز کہیں سن چکا تھا۔

''آپ بھی کیا عالم بالا ہی سے گفتگو فرما رہے ہیں؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ دوزخ میں ابھی تک سیل فون کی سہولت میسر نہیں ہے۔''

''میری بات توجہ سے سنیں نواب صاحب!'' دوسری طرف سے جھنجلائی ہوئی آواز آئی۔ ''میں دلاور بول رہا ہوں۔''

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''کون دلاور؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کی یادداشت اتنی کمزور تو نہیں ہے نواب صاحب!'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''تم تو منہ چھپائے چھپائے پھرتے ہو، اس لیے مجھے پوچھنا پڑا۔ تم پاکستان میں رہتے ہی کب ہو؟''

''لیکن میں اچانک ہی پہنچ جاتا ہوں۔ بہرحال، شاکر ابھی میرے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ وہ بہت اونچا اڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''لیکن یہ اطلاع تم مجھے کیوں دے رہے ہو؟ پولیس کو دو، اپنے آقا رانا زوہیب کو دو۔ ویسے بھی شاکر تمہارا ہی آدمی تھا۔''

''وہ میرا آدمی تھا لیکن مجھے بھی آنکھیں دکھانے لگا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ وہ آپ کے پاس ست بدھائی بھی آیا تھا؟''

''ہاں، وہ ست بدھائی آیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں پھر پوچھوں گا کہ تم نے یہ غیر متعلقہ اطلاع دینے کے لیے میری نیند کیوں خراب کی ہے؟''

''آپ نیند کی خرابی کی بات کر رہے ہیں۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''آپ کی نیندیں تو اڑنے والی ہیں۔ میں اس مرتبہ پاکستان میں کچھ زیادہ عرصہ ٹھہروں گا۔ چلیے، آپ سو جائیں، جلد ہی آپ سے دوبارہ ملاقات ہوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد سونے کا کیا سوال تھا۔ میں نے تصدیق کے لیے شاکر کے سیل نمبر پر فون کیا کہ مبادا کسی نے مذاق کیا ہو یا اس کا سیل فون کسی کے ہاتھ لگ گیا ہوگا۔

دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی، تیسری گھنٹی پر کسی نے فون اٹھا لیا اور پھر مجھے دلاور کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو! نواب صاحب، لگتا ہے آپ کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔ اب غالباً آپ کو یقین آ گیا ہوگا اور ابھی تھوڑی دیر میں شاکر کی موت کی خبر آپ کو ٹی وی کے چینلز پر بھی مل جائے گی۔ ویسے میں اتنا بتا دوں کہ اس بیچارے کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔''

''سانپ نے ڈس لیا ہے؟'' میں نے حیرت سے دہرایا۔

''اور سانپ بھی ایسا مہلک کہ اس بیچارے کو دوسری سانس لینے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ دلاور اتنا ہی زہریلا سانپ ہے نواب صاحب!''

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور مجھے ان سوئیوں کا خیال آ گیا جو مجھے ڈاکٹر کے قبضے سے ملی تھیں۔

''مجھے امید ہے کہ اب آپ کی تسلی ہو گئی ہوگی۔'' دلاور نے کہا۔ ''میری مجبوری یہ ہے کہ میں یہ سم فوری طور پر ضائع بھی نہیں کر سکتا۔ مختلف افراد کے فون آ رہے ہیں جو میرے لیے کام کرتے تھے اور شاکر نے انہیں مجھ سے بدظن کر دیا تھا۔ وہ دوبارہ میرے ساتھ شامل ہو رہے ہیں۔''

''ان میں سے ایک اکبر سندھو بھی ہے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

دوسری طرف لمحے بھر کو خاموشی چھا گئی، پھر دلاور کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''نواب صاحب! اکبر سندھو میرا آدمی نہیں ہے۔ اسے تو میں ٹھیکے پر کام دیتا ہوں۔ اچھا کام کرتا ہے اور بہترین معاوضہ وصول کرتا ہے۔ بس اب فون کرنے کی زحمت نہ کیجیے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں باتھ روم میں گھس گیا۔ مجھے شاکر کی موت کا افسوس تھا۔ ویسے مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ شاکر واقعی مر چکا ہے یا پھر دلاور کی قید میں ہے؟

میں باتھ روم سے نکلا تو سینٹرل ٹیبل پر اخبارات اور کافی کا مگ موجود تھا۔

میں کافی پینے کے ساتھ ساتھ اخبارات بھی دیکھنے لگا۔ ان اخبارات میں ناصر کا اخبار بھی شامل تھا۔ اس کا کالم ''قلم گزیدہ'' بہت ہی بے باکی سے لکھا گیا تھا اور اس نے نام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے بغیر مسکین شاہ کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔ میں نے پہلی دفعہ ناصر کا کوئی کالم پڑھا تھا۔ اس کے قلم میں راجا کی طرح کاٹ تھی بلکہ بعض جگہ تو وہ راجا سے بھی دو ہاتھ آگے نظر آتا تھا۔

نیلم نے کمرے میں جھانکا تو میں نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ جھجکتے ہوئے اندر آگئی۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''نیلم! یہ تم کمرے میں جھانکتی کیوں ہو؟ یہ کوئی مناسب طریقہ نہیں ہے۔ مہذب لوگ دروازے پر دستک دیتے ہیں۔''

وہ ایک دم بوکھلا گئی اور بولی۔ ''صاب جی...... میں دروازے پر...... دستک...... اس لیے نہیں دیتی کہ اگر...... آپ سو رہے ہوں گے تو...... آپ کی نیند خراب...... ہوگی۔''

''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کب سو کر اٹھتا ہوں، پھر تاک جھانک!''

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

''آجاؤ!'' میں نے کہا۔

دوسرے ہی لمحے ناصر کمرے میں داخل ہوا۔

''ایک کپ کافی اور لے آؤ۔'' میں نے نیلم سے کہا۔

''میں کافی پی چکا ہوں سر!'' ناصر نے کہا۔

نیلم خاموشی سے باہر نکل گئی۔

''کوئی خاص خبر؟'' ناصر نے میرے آگے اخبارات بکھرے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

''خاص الخاص!'' میں نے کہا۔ ''شاکر مارا گیا۔''

ناصر بری طرح چونک اٹھا۔ ''شاکر مارا گیا؟ لیکن وہ اتنی آسانی سے مرنے والا تو ہے نہیں۔'' ناصر نے کہا۔ ''وہ تو اکیلا ہی دس پر بھاری تھا۔ کس اخبار میں ہے یہ خبر؟''

''کسی اخبار میں نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ اطلاع مجھے سیل فون پر ملی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اطلاع بھی شاکر ہی کے سیل فون سے ملی ہے اور اطلاع دینے والا ہے دلاور!'' میں نے کہا۔

''دلاور!'' ناصر حیرت سے بولا۔ ''وہ تو پاکستان سے باہر تھا؟''

''ایسے لوگوں کا کوئی شیڈول نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ جب چاہتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں چلے جاتے ہیں۔''

''اس نے آپ ہی کو یہ اطلاع کیوں دی؟'' ناصر نے پوچھا۔

''اسے معلوم ہوگیا ہوگا کہ شاکر میرے لیے کام کر رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''مجھے تو اکبر سندھو کی فکر بھی پیدا ہوگئی ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''ویسے میرا خیال ہے کہ ہمیں اس وقت ست بدھائی میں ہونا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''دلاور سے کچھ بعید نہیں کہ وہاں کا رخ کرے۔''

''ایک دفعہ رخ کرے تو۔'' ناصر ہنس کر بولا۔ ''وہ وہاں سے زندہ نہیں جائے گا۔ وہاں صوبیدار میجر صاحب ہیں، سرور ہے، راجا ہے اور حویلی کے ہر کونے پر آپ کے گارڈز ہیں۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ حویلی کا رخ کرے گا۔ رانا زوہیب بھی کبھی اسے حویلی کی طرف جانے کا مشورہ نہیں دے گا۔''

اس مرتبہ نیلم دروازے پر دستک دے کر اندر آئی اور اس نے اطلاع دی کہ ناشتا تیار ہے۔ وہ اطلاع دے کر چلی گئی۔

ناصر نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کھول لیا اور یوں ہی چینل تبدیل کرنے لگا۔

ایک چینل پہ آخر شاکر کی خبر مل ہی گئی۔ ''ہیلتھ کلب کے مالک شاکر علی کا پراسرار قتل! پولیس ذرائع کا خیال ہے کہ ان کی موت زہر خورانی سے ہوئی ہے۔''

اس کے ساتھ ہی شاکر کی تصویر بھی تھی۔

اب تک جو ایک فیصد امید تھی کہ شاکر کی موت کی خبر جھوٹ بھی ہوسکتی ہے، وہ دم توڑ گئی۔ مجھے اس کی موت کا واقعی افسوس ہوا تھا لیکن وہ جن راہوں پر چل رہا تھا، ان کا اختتام بہرحال یہی ہوتا ہے۔

ہم لوگ وہاں سے اٹھ کر ڈائننگ روم میں آگئے۔

میں نے ناشتا شروع کیا ہی تھا کہ میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ اسکرین پر راجا کا نام تھا۔ میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگالیا۔ ''ہاں مہاراجا!'' میں نے کہا۔

''نیکے پتر! تو نے ٹی وی دیکھا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں یار! میں ٹی وی دیکھ چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تو شاکر کی موت کے بارے میں کہہ رہا ہے شاید؟''

''ہاں، وہ اچانک کیسے مر گیا؟''

''وہ اچانک مرا نہیں ہے، اسے دلاور نے قتل کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر میں نے مختصراً اسے دلاور کی فون کال کے بارے میں بتایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ خطرے کی گھنٹی بج گئی ہے نیکے پتر! تیری پریشانیوں میں مزید اضافہ ہونے والا ہے۔''

''دلاور کا خطرہ...... ہائی فٹ!'' میں نے کہا۔ ''مجھے تو بی بی اللہ نور کی فکر ہے۔ وہ نہ جانے کس حال میں ہوگی؟''

''تو وہاں لاہور میں کیا کر رہا ہے۔ ست بدھائی کیوں نہیں آتا؟'' راجا نے کہا۔

''یہاں کئی ضروری کام ہیں مہاراجا!'' میں نے کہا۔

''نمبر ایک نور کی تلاش، نمبر دو نور کی بازیابی نمبر تین نور...... نمبر چار نورا!'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تو میرا مذاق اڑا رہا ہے؟'' میں نے بھنا کر کہا۔

''تو خود اپنا مذاق اڑا رہا ہے۔ اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ نور کو اب تک ان لوگوں نے لاہور ہی میں رکھا ہوگا؟''

''کوئی گارنٹی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تلاش شروع کرنے کے لیے کوئی سراغ تو چاہیے۔''

''تو پھر مجھے تو نے ست بدھائی کیوں بھیج دیا ہے؟'' راجا کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''ارے مہاراجا! میں نے تجھے شہناز کی وجہ سے وہاں بھیجا ہے۔ وہ بے چاری بھی تو تنہائی محسوس کر رہی ہوگی۔''

''وہ تنہائی کی عادی ہوگئی ہے۔ میں لاہور آرہا ہوں۔'' یہ کہہ کر راجا نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ابھی میں اپنے کمرے سے نکل کر باہر لاؤنج میں آیا ہی تھا کہ اکبر سندھو کا فون آگیا۔

''ہاں اکبر!'' میں نے پوچھا۔ ''کوئی پیش رفت؟''

''آپ کو مال کی ڈلیوری کہاں چاہیے؟'' اس نے یوں کہا جیسے کسی کمپنی کا نمائندہ اپنی پروڈکٹ کے بارے میں پوچھتا ہے۔ ''میں زیادہ دیر اسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔''

''تم اس وقت کہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اس وقت میں شادمان ٹاؤن کی طرف ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔''

''میں ایک ہی جگہ کھڑا نہیں رہ سکتا۔'' اکبر نے کہا۔

''تو پھر تم ایسا کرو، نورین کے فلیٹ کے نزدیک پہنچو، میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ اس کا فلیٹ یہاں سے نزدیک ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔''

میں نے فوری طور پر غنی سے گاڑی نکالنے کو کہا۔ اس کے علاوہ میں نے صرف احمد شاہ کو ساتھ لیا اور گلبرگ کے اس علاقے میں پہنچ گیا جہاں نورین کا فلیٹ تھا۔

وہاں لوگوں کی اور گاڑیوں کی خاصی آمدورفت تھی۔ میں نے سیل فون پر اکبر سے کہا کہ ہمارے پیچھے پیچھے آؤ، کوئی مناسب جگہ دیکھ کر ہم مال کی ڈلیوری لے لیں گے۔

☆☆☆

آفتاب خان کی بیٹی بے ہوش تھی۔ میں نے اسی حالت میں اسے اپنی کوٹھی کے ایک بیڈروم میں منتقل کر دیا۔

پھر میں نے آفتاب خان کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے فون ریسیو نہیں کیا۔

احمد شاہ نے بتایا کہ لڑکی کو ہوش آرہا ہے۔

میں نے اسے کمرے سے باہر بھیج دیا اور خود اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس لڑکی کے چہرے پر ایسی معصومیت تھی کہ لمحے بھر کو تو میرا دل بھی کٹ کر رہ گیا۔ وہ انتہائی حسین، نازک اندام بچی تھی۔ اکبر نے شاید اسے کلوروفارم کے ذریعے بے ہوش کیا تھا۔

آہستہ آہستہ اس نے آنکھیں کھول دیں اور خالی الذہنی کے عالم میں کمرے کی چھت کو گھورتی رہی۔ اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے۔ پھر اس نے اردگرد نظر دوڑائی تو اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں اس وقت تھری پیس سوٹ میں تھا، چہرے پر بھی مشفق مسکراہٹ تھی لیکن اس کے باوجود لڑکی گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور اس نے ایک فلک شگاف چیخ ماری۔

''ڈرو مت بیٹا!'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔''

''کک...... کون ہیں آپ...... اور...... مم...... مجھے...... یہاں...... کیوں لائے ہیں...... میں تو کالج سے...... گھر جا...... رہی تھی۔'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں ہکلا کر بولی۔

''بیٹا! مجھ سے بالکل مت ڈرو۔ میں تمہارا انکل ہوں۔'' میں نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔ ''مجھے تمہارے باپ سے کچھ حساب بے باق کرنا ہے۔ اگر تم نے مجھ سے تعاون کیا تو تمہیں یہاں بالکل تکلیف نہیں ہوگی۔''

''تعاون...... مطلب؟''

''تعاون یعنی کوآپریشن!'' میں نے دل ہی دل میں جھنجلا کر کہا۔ آج کل کی نسل کو اردو زبان کے روزمرہ استعمال کے الفاظ بھی انگریزی میں سمجھانا پڑتے ہیں۔

''اگر...... پاپا...... سے...... آپ کی...... کوئی ڈیل...... ہوئی ہے تو...... مجھے...... یہاں کیوں لائے ہیں؟''

وہ اب کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے گڑیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا نام ارم آفتاب ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن آپ نے مجھے یہاں لاکر...... بہت بڑی مسٹیک (Mistake) بلکہ بلنڈر کیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خاطر پاپا کچھ بھی کر گزریں گے...... وہ مجھے...... اتنا ہی چاہتے ہیں۔"

"جانتی ہو تمہارے پاپا نے کیا کیا ہے؟" میں نے اس مرتبہ سرد لہجے میں کہا۔ "انہوں نے میری منگیتر کو اغوا...... میرا مطلب ہے کہ کڈنیپ کرایا ہے۔"

"نور!" وہ پر یقین لہجے میں بولی۔

"اٹ از فیکٹ بے بی!" میں نے خالص انگریزی لہجے میں کہا تھا کہ وہ مجھے اغوا برائے تاوان کا کوئی مجرم نہ سمجھے۔ "میں تمہارے پاپا سے ابھی تمہارے سامنے بات کرتا ہوں۔ اسپیکر فون آن کردوں گا تا کہ تم بھی اپنے باپ کی آواز سن سکو، او کے!"

میں نے جیب سے سیل فون نکالا۔ اس کی سم بدلی اور آفتاب خان کا نمبر ڈائل کیا۔

دوسری طرف سے دوسری ہی گھنٹی میں کال ریسیو کرلی گئی اور آفتاب خان کی مکروہ آواز سنائی دی۔ "ہیلو آفتاب خان!"

"آپ کون؟" اس نے پوچھا۔

"اتنی جلدی مجھے بھول گئے۔ تم تو میرے مہمان رہے ہو؟"

"اب میں پہچان گیا۔ بولو، اب کیا تکلیف ہے؟"

"تمہارے جانے کے بعد میں نے اکبر سندھو کو پکڑ لیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے تمہارے کہنے پر نور کو اغوا کیا ہے؟"

"وہ کہنے کو تو کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔" آفتاب خان ڈھٹائی سے بولا۔

"اچھا یہ بتاؤ، ارم گھر پہنچ گئی؟" میں نے اچانک پوچھا۔

"نہیں، ہم لوگ گزشتہ دو گھنٹے سے اس کا انتظار کر رہے ہیں لیکن وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچی ہے۔ تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" آفتاب خان مضطرب ہو کر بولا۔

"وہی جو تم نور کے بارے میں جانتے ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ پھر میں کچھ توقف کے بعد بولا۔ "ایک منٹ، تم پہلے اسی سے بات کرلو۔" میں نے سیل فون ارم کی طرف بڑھا دیا۔ "ہیلو پاپا!" ارم گلوگیر آواز میں بولی۔ "وہاٹس گوئنگ آن پاپا!"

"تم ٹھیک تو ہو بیٹا...... تم کہاں ہو میری جان...... میں......"

میں نے سیل فون ارم کے ہاتھ سے لے لیا۔ "آفتاب خان! اب بولو کیا کہتے ہو؟ ہاں، یہ نمبر ٹریس کرنے کی کوشش مت کرنا، فضول میں وقت اور توانائی ضائع ہوگی۔ اب بتا نور کہاں ہے؟"

"تم نواب رفیق احمد شیرازی ہو؟" آفتاب خان نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اور نواب صاحب اس قسم کے کام نہیں کرتے۔ انہیں ایسے کام کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟"

"دیکھو، میری بیٹی کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔" آفتاب خان کے لہجے میں خوشامد تھی۔

"تم اپنی ہی بکواس کیے جا رہے ہو۔" میں نے بھنا کر کہا۔ "میں پوچھ رہا ہوں کہ نور کہاں ہے؟"

"نور کل تک میرے ہی پاس تھی لیکن......"

"تھی کیا مطلب؟" میں چیخ کر بولا۔ "اب وہ کہاں ہے؟"

"آج صبح دلاور کے لوگ اسے یہاں سے لے گئے۔"

"آفتاب خان!" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "اگر نور کو کسی بھی قسم کی گزند پہنچی تو میں تمہارے پورے خاندان کو برباد کردوں گا۔ جب تک نور مجھے نہیں مل جاتی، تمہاری یہ خوب صورت اور نازک اندام بیٹی میرے پاس رہے گی۔ علاوہ ازیں خواہ تم پورے پاکستان کی پولیس اکٹھی کرلو۔ میں اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔"

"پاپا!" ارم روتے ہوئے بولی۔ "مجھے بچالیں پاپا!"

"تم گھبراؤ مت بیٹی!" آفتاب خان نے کہا۔ "میں تمہیں زیادہ دیر وہاں نہیں رہنے دوں گا۔"

"تو پھر آپ انکل کی منگیتر کو ان کے حوالے کردیں۔" ارم نے روتے ہوئے کہا۔ "آپ نے ایسا کام ہی کیوں کیا! مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آرہا ہے کہ آپ کڈنیپنگ جیسے گندے کام میں بھی انوالو ہو سکتے ہیں۔"

"سن لیا آفتاب خان!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میں نے ابھی تو ارم پر کوئی سختی نہیں کی ہے لیکن ہر گزرنے والا دن اس کے لیے پہلے سے زیادہ برا ہوگا۔ تمہیں یاد ہے، تم نے دوسروں کی بیٹیوں کی کیسی کیسی وڈیوز بنائی ہیں؟ اب یہی سب کچھ ارم کے ساتھ بھی ہوگا۔ میں تمہیں تین دن کی مہلت دے رہا ہوں۔ اس دوران میں نور میرے پاس آ جائے، ورنہ تم جانتے ہی ہو کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟" میں نے سلسلہ منقطع کردیا اور سم نکال کر سیل فون میں دوبارہ اپنی سم لگالی۔

"انکل! آپ نے تو کہا تھا کہ مجھے آپ سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لیکن آپ......" ارم بلک بلک کر رونے لگی۔

"وہ تو میں نے تمہارے باپ کو دھمکی دی ہے بیٹا!" میں نے کہا۔ "تم تو بہت اچھی بیٹی ہو، میں تمہارے ساتھ زیادتی کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

ارم نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لیے اور معصومیت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ "انکل! تین دن بعد آپ مجھے گھر جانے دیں گے نا؟" اس نے بچوں کی طرح پوچھا۔

"ہاں بیٹا!" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "اگر تمہارے پاپا نے نور کو میرے حوالے کردیا تو میں تمہیں ضرور جانے دوں گا۔ ویسے تمہیں یہاں کسی بھی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ بس تم اس کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ میرے گارڈز بہت خونخوار اور اجڈ قسم کے لوگ ہیں۔ وہ تم سے کچھ پوچھے بغیر گولی ماردیں گے۔"

"انکل! کیا آپ واقعی نواب ہیں؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"کیا میں شکل سے گھسیارا لگتا ہوں؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"آپ تو بہت ڈیشنگ پرسنالٹی کے مالک ہیں۔ میرے ذہن میں کسی نواب کا امیج کچھ اور تھا۔"

"مثلاً کہ وہ شلوار اور شیروانی پہنتا ہوگا، سر پر کلف لگی ہوئی طرح والی پگ ہوگی۔"

خوف زدہ ہونے کے باوجود ارم ہنسنے لگی۔ "ہاں، میرے ذہن میں کسی نواب کا ایسا ہی امیج تھا۔ آپ تو نواب سے زیادہ......"

"میونسپل کارپوریشن کے کلرک لگتے ہیں۔" اچانک راجا کی آواز آئی۔ وہ بہت خاموشی سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آگیا تھا۔

ارم نے چونک کر راجا کی طرف دیکھا۔ پھر وہ سہمے ہوئے انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

"تم یہاں آرام سے رہو۔ بس باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا۔" میں نے بلند آواز میں احمد شاہ کو پکارا۔ "احمد شاہ!"

احمد شاہ فوراً ہی کمرے میں آگیا۔ "یس سر!"

"دیکھو، یہ ہماری مہمان ہیں لیکن اگر یہ اس کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کریں تو انہیں بلا جھجک گولی مار دینا۔ ...ے گارڈز کو بھی بتادو اور کتے تو کھلے ہوئے ہیں نا!"

"یس سر!" احمد شاہ نے جواب دیا۔ "چاروں کتے کھلے ہوئے ہیں۔"

میرے لہجے میں کچھ ایسی سفاکی تھی کہ ارم کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید ہوگیا۔ میں نے راجا کو کمرے سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا اور خود بھی باہر آگیا۔ احمد شاہ پہلے ہی کمرے سے جا چکا تھا۔

"یہ کسے پکڑ لایا فیکے پتر؟" راجا نے پوچھا۔

"میں نے تجھے بتایا تو تھا کہ اس کے باپ نے نور کو اغوا کرایا ہے۔"

"تو نے یہ بات مجھے کب بتائی تھی؟" راجا نے کہا۔

"ہوسکتا ہے بتائی ہو لیکن آفتاب خان کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ وہ زمین آسمان ایک کردے گا، اپنی بیٹی کے لیے کنووں میں جال ڈلوادے گا۔"

وہ الٹا لٹک جائے۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ جب تک نور کو واپس نہیں کرے گا۔ اس کی بیٹی اسے نہیں ملے گی۔"

"فیکے پتر! تیری ذہنیت بھی غیر محسوس طریقے پر روایتی جاگیرداروں اور نوابوں والی نہیں ہوتی جارہی ہے؟"

"میں نے کتنے ہاریوں کے گھر جلوائے، کتنی لڑکیاں اٹھا کرلایا، مخالفین سے نمٹنے کے لیے کتنے ڈاکو پالے ہیں اور کتنے مخالفین کو قتل کرایا ہے؟" میں نے بھنا کر کہا۔

"تو، تو واقعی برا مان گیا۔" راجا نے کہا، پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ "شاکر تو مارا ہی گیا ہے، مجھے اب اکبر سندھو کی فکر پیدا ہوگئی ہے۔"

"اس قسم کے لوگ اسی طرح مرتے ہیں، کبھی گینگ وار میں، کبھی پولیس مقابلے میں اور کبھی اپنے ہی بندوں کے ہاتھوں۔"

"فیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "تو آج کل کچھ زیادہ ہی قنوطی نہیں ہوگیا ہے؟"

"خدانخواستہ اگر شہناز اس طرح اغوا ہوجائے تو تو گلیوں کی خاک چھانتا پھرے گا، پاگل ہوجائے گا۔ میں تو صرف قنوطی ہوا ہوں۔" میں نے کہا۔

اسی وقت مجھے لاؤنج میں نیلم نظر آئی۔ وہ شاید ابھی ابھی نہا کر آئی تھی۔ اس کے بالوں سے اب بھی پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے اور وہ پہلے سے زیادہ نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ اس نے فیشن ایبل اور پڑھی لکھی لڑکیوں کی طرح لمبی قمیص اور ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔

"یار یہ نیلم......"

اگر تو نے فضول قسم کی بکواس کی تو میں جان سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماردوں گا۔'' میں نے راجا کے تیور دیکھ کر کہا، پھر میں نے نیلم سے کہا۔ ''نیلم! اس کوٹھی میں ایک لڑکی بھی ہے۔ تم اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھو گی۔ وہ جس چیز کی بھی فرمائش کرے، اسے پورا کر دینا۔ یہ سمجھ لو، وہ ہماری مہمان ہے۔ ہاں، اس سے بات کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں کریدنے کی کوشش کرے گی۔''

نیلم نے سر جھکا کر کہا۔ ''جی صاب جی!'' پھر وہ چونک کر بولی۔ ''وہ لڑکی کس کمرے میں ہے سر؟''

''اس کے بارے میں تمہیں احمد شاہ بتا دے گا۔''

نیلم کے جانے کے بعد راجا نے چونک کر کہا۔ ''ناصر کیا چلا گیا؟''

''ناصر ابھی دو گھنٹے پہلے تک تو یہیں تھا۔'' میں نے کہا۔ ''ممکن ہے اپنے کسی کام سے گیا ہو۔''

''فیکے پتر!'' راجا نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اب تیرا دشمن صرف رانا زوہیب ہی نہیں بلکہ دلاور اور مسکین شاہ بھی ہے۔ ان لوگوں کے بے شمار ساتھی بھی ہوں گے، پھر اب تو نے آفتاب خان سے بھی پنگا لے لیا ہے، تیرا یہ حسین مکھڑا سب ہی پہچانتے ہیں۔''

''تو میں اپنے چہرے کو کیا کروں؟'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''کیا برقع پہننا شروع کر دوں یا پھر یہ چہرہ اتار کر دوسرا چہرہ لگا لوں؟''

پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز آئی تو راجا کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''میرے خیال میں ناصر آ گیا؟'' راجا نے کہا۔

دوسرے ہی لمحے ناصر لاؤنج میں داخل ہوا اور مجھ سے بولا۔ ''کیا رہا سر! اس اکبر سندھو نے دھوکا تو نہیں دے دیا؟''

''وہ زبان کا کھرا آدمی ہے۔ آفتاب خان کی بیٹی یہاں موجود ہے۔'' پھر میں نے اسے اپنی اور آفتاب خان کی گفتگو کے بارے میں بتایا۔

''آفتاب خان سمجھ گیا ہوگا کہ آپ ہی نواب رفیق شیرازی ہیں۔ آپ باہر نکلیں گے تو اس کے آدمی، دلاور یا مسکین شاہ کے آدمی آپ کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آ جائیں گے۔''

''یہی بات راجا کہہ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب میں اپنے اس چہرے کو کیا کروں؟ کیا پلاسٹک سرجری کروالوں؟''

''اس کا بھی حل ہے۔'' ناصر مسکرا کر بولا۔ ''فلم انڈسٹری کا ایک ماہر میک اپ مین میرا جاننے والا ہے۔ آج کل پاکستان میں فلم انڈسٹری تو رہی نہیں ہے۔ وہ بے چارہ آج کل بہت کسمپرسی کی زندگی گزار رہا ہے لیکن اپنے فن میں ماہر ہے۔''

''تو کیا وہ میرے چہرے کی جگہ اپنا بھدا چہرہ لگا دے گا؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''چہرہ تو آپ ہی کا ہوگا لیکن وہ اس میں ایسی تبدیلیاں کرے گا کہ آپ خود بھی اپنے آپ کو نہیں پہچان پائیں گے۔''

''اگر ایسا ہے تو پھر صرف میرا چہرہ بدلنے سے کام نہیں چلے گا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ راجا جو سائے کی طرح میرے ساتھ رہتا ہے، اسے دیکھ کر لوگ مجھے بھی پہچان جائیں گے۔''

''راجا کے چہرے میں بھی ترمیم کرنا پڑے گی اور مجھے خود بھی اپنے چہرے کی مرمت کرانا پڑے گی۔ میں بھی کافی عرصے سے آپ کے ساتھ دیکھا جا رہا ہوں۔''

''تو پھر اسے بھی بلا لو، ایک تجربہ یہ بھی سہی!''

''میں ابھی جا کر اسے لے آتا ہوں لیکن میک اپ کے سامان کے لیے اسے کچھ رقم کی ضرورت بھی پڑے گی، پھر وہ ام الخبائث کا بھی رسیا ہے، دو بوتلیں وہ بھی چاہئیں۔''

میں نے جیب سے پرس نکالا اور اس میں سے نوٹ نکالے تو ناصر بولا۔ ''اتنے اخراجات تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ اصل میں میرا اے ٹی ایم کارڈ مشین میں پھنس گیا ہے۔''

''ایک ہی بات ہے یار!'' میں نے ہزار ہزار کے کئی نوٹ اس کی جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

ناصر زیادہ دیر رکا نہیں، وہ ایک کپ چائے پی کر اس ماہر فن کی طرف نکل گیا، جسے میک اپ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

''فیکے پتر! یہ نوابی وغیرہ چھوڑ، ہم دونوں مل کر ایک جاسوس ایجنسی بنا لیتے ہیں۔''

''ہاں اگر زندہ بچ گئے تو تیرے مشورے پر ضرور عمل کروں گا۔''

''نور سے ملے بغیر ہی مر جائے گا۔'' راجا نے کہا ''پھر وہ تیری یاد میں گائے گی۔ جو وعدہ کیا، وہ نبھانا پڑے گا.....''

''تو بار بار مجھے نور کا طعنہ کیوں دے رہا ہے؟'' میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

''اس لیے کہ آج کل تیرے ذہن پر نور سوار ہے، تجھے اس کے علاوہ کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا۔'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''یہ جو دنیا میں شاہ جہاں اور تاج محل کی مثال دی جاتی ہے، اس کی حقیقت میں بھی مجھے شبہ ہے۔''

''تو ٹھہرا صحافی!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اپنی پیدائش پر بھی شبہ ہو سکتا ہے۔ پھر بھلا شاہ جہاں اور ممتاز محل کیا بیچتے ہیں۔''

ناصر لاؤنج میں داخل ہوا تو ہم دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

میں اس ماہر فن میک اپ مین کو لے آیا ہوں۔''

''یار! وہ آدمی اعتبار کا تو ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''تو نے اسے ہمارا یہ ٹھکانا بھی دکھا دیا۔''

''وہ بالکل بے ضرر آدمی ہے۔ اسے خود بھی معلوم نہیں ہوگا کہ اس وقت وہ لاہور کے کس علاقے میں ہے، لاہور میں ہے بھی یا کسی اور شہر میں ہے۔ میں نے اس کے گھر پہنچ کر سب سے پہلے اسے شیمپین کی ایک بوتل پیش کر دی تھی۔ بس بوتل دیکھ کر تو وہ گویا پاگل ہی ہو گیا۔ آدھی بوتل تو اس نے گھر ہی میں چڑھا لی، پھر وہ کچھ بات کرنے کے قابل ہوا۔ آدھی بوتل اس نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد ڈکار لی اور ٹن ہو گیا۔''

''ابے ایسا آدمی کیا خاک میک اپ کرے گا؟'' راجا نے منہ بنا کر کہا۔

''یہی تو اس کا کمال ہے۔ جب وہ کام شروع کرتا ہے تو صرف کام کرتا ہے، نشے میں ہو تو مزید اچھا کام کرتا ہے۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔''

''اسے میرے بیڈ روم میں لے آؤ۔'' میں نے کہا۔ ''ڈرائنگ روم میں تو کوئی بھی آ سکتا ہے۔''

☆☆☆

وہ مجہول سا ایک آدمی تھا۔ سر اور ڈاڑھی کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا لیکن آنکھوں میں بھرپور چمک تھی۔ اس نے مجھے شرٹ اور بنیان اتارنے کا حکم دیا۔

''آرٹسٹ صاحب!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے اپنے چہرے میں ردوبدل کرانا ہے، جسم میں نہیں۔''

اس نے ناصر کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، کن جاہلوں میں لائے ہو مجھے؟

''سوری صاحب، ماہر فن سر!'' ناصر نے جلدی سے کہا۔ ''ان کی ہدایات پر عمل کیجیے۔''

میں نے اپنی شرٹ اور بنیان اتار دی۔ باہر اچھی خاصی خنکی تھی۔ میرے کمرے میں اگر روم ہیٹر نہ ہوتا تو میری قلفی جم جاتی۔

اس مجہول ماہر فن کا نام سوری تھا۔ اس نے میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر یوں جائزہ لیا، جیسے جوتے بیچنے والے دکان دار جوتے کا جائزہ لیتے ہیں۔

لفظ لفظ موتی

☆ دوست کی مجبوری کو اس کی بے رخی مت سمجھو۔

☆ اخلاق اچھا ہونا اللہ سے محبت کی دلیل ہے۔

☆ نیک بننے کی کوشش ایسے کرو جیسے حسین بننے کی کوشش کرتے ہو۔

☆ کبھی نہ گرنا کمال نہیں بلکہ گر کر سنبھل جانا کمال ہے۔

☆ کسی کا برا چاہنے والا کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔

☆ خوش رہنا چاہتے ہو تو دوسروں کو خوش رکھو۔

فاطمہ واحد، سمن آباد - کراچی

مختلف زاویوں سے میرے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد اس نے کہا۔ ''میں آپ کو کچھ تصویریں دکھاتا ہوں۔ ان میں سے جو تصویر آپ پسند کریں گے، میں آپ کو اس جیسا بنا دوں گا۔''

''کوئی تصویر شہزادہ گلفام کی بھی ہے؟'' میں نے ازراہِ تمسخر پوچھا۔

''ناصر صاحب! یہ صاحب کام کرانے میں سیریس نہیں ہیں۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔ ''آپ نے فضول میں میرا وقت اور اتنا پیسا ضائع کیا۔ مجھے اجازت دیں۔''

''ارے ارے..... سر کی تو مذاق کی عادت ہے سوری صاحب! آپ ان کی باتوں کا خیال مت کریں۔ آپ تصویریں دکھائیں۔''

سوری نے اپنے بوسیدہ بیگ سے تصویروں کا ایک بنڈل نکالا۔ اس میں شین کونری، گریگوری پیک اور دلیپ کمار سے لے کر شاہ رخ اور سلمان خان کی تصویریں بھی تھیں۔ اس کے علاوہ مجھ سے ملتی جلتی عام نوجوانوں کی تصویریں بھی تھیں۔ ایک تصویر مجھے پسند آئی۔ میں نے سوری سے کہا۔ ''یہ تصویر کچھ بہتر ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔

''لیکن یہ تصویر ہے کس کی؟ یہ نہ ہو کہ یہ نوجوان پولیس کو مطلوب ہو اور میں باہر نکلتے ہی پکڑا جاؤں؟''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' سوری مسکرایا۔ ''غور سے دیکھیں، یہ وان ڈیم کی نوجوانی کی تصویر ہے، میں پلاسٹک سرجن تو ہوں نہیں کہ آپ کو بالکل ایسا ہی بنا دوں گا۔ ہاں، کوشش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کروں گا کہ آپ کی موجودہ شکل پہچانی نہ جائے۔''

اس نے بوتل اٹھا کر ہونٹوں سے لگائی اور وہسکی کے دو تین گھونٹ پی کر وہ میرے چہرے پر جت گیا۔ اس نے نہ جانے کون کون سی کریمیں اور لوشن میرے چہرے پر ملے۔ ساتھ ساتھ وہ بولتا بھی جارہا تھا۔'' اس لوشن سے شدید جلن ہوتی ہے لیکن یہ میک اپ کم از کم دو مہینے کے لیے پائیدار ہوتا ہے۔ اس قسم کا میک اپ کرتے ہوئے فلم اسٹار محمد علی نے مجھے تھپڑ مار دیا تھا کہ میرا میک اپ کررہے ہو یا چہرے کی کھال اتار رہے ہو۔''

اس نے میرے بال پہلے پیچ کیے، پھر انہیں بہت لائٹ براؤن کلر میں ڈائی کیا، ہیئر اسٹائل بدلا، آنکھوں میں گرین کلر کے لینس لگائے، دونوں بازوؤں پر ٹیٹو بنائے اور مجھ سے بولا۔'' اگر آپ فرنچ کٹ ڈاڑھی بھی رکھ لیں تو ناصر صاحب بھی آپ کو نہیں پہچان سکیں گے۔ ڈاڑھی تو میں نقلی بھی لگا سکتا ہوں لیکن اصل ڈاڑھی کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔''

''پھر ڈاڑھی پر بھی وہی شیڈ دینا ہوگا جو بالوں کا ہے۔'' میں نے کہا۔'' ڈاڑھی کو چھوڑو۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' اس نے کہا۔ پھر اپنے سامان سے نفیس فریم کا ایک چشمہ نکالا اور مجھے لگا دیا۔'' اب آپ اگر پائپ یا سگار پینا شروع کردیں تو آپ خود کو بھی نہیں پہچان سکیں گے۔''

اس نے مجھے آئینہ دکھایا تو میں حیران رہ گیا۔ آئینے میں نواب رفیق احمد شیرازی کی جگہ کوئی اور نوجوان تھا جو مقامی سے زیادہ یورپین لگ رہا تھا۔ میں خود بھی اپنے آپ کو نہ پہچان سکا۔ واقعی سوری اپنے فن کا ماہر تھا۔

راجا اور ناصر لاؤنج میں تھے۔ میں نے آزمانے کے لیے خاموشی سے باہر کا رخ کیا تو احمد شاہ نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر اس نے آگے بڑھ کر میرا راستہ روک لیا۔

''آپ کون ہیں مسٹر اور اندر کیسے آئے؟''

''مجھے..... ناصر صاحب سے ملنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''گیٹ پر کوئی تھا نہیں اس لیے میں مجبوراً اندر آگیا۔''

''گیٹ پر کوئی موجود نہیں ہے؟'' احمد شاہ نے حیرت سے کہا۔'' لیکن گیٹ تو بند ہے۔''

''جب میں آیا تو گیٹ کھلا ہوا تھا۔'' میں نے آواز اور لہجہ بدل کر ناگواری سے کہا۔'' اگر ناصر صاحب یا نواب صاحب ہیں تو آپ میری ملاقات کرادیں۔ میرا وقت ضائع مت کریں۔''

''آیئے، میں آپ کو ناصر صاحب سے ملوا دوں۔'' احمد شاہ میرے پراعتماد لہجے سے کچھ نرم پڑ گیا۔

''ناصر صاحب! کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں؟'' احمد شاہ نے کہا۔

ناصر نے بہ غور میرا جائزہ لیا، پھر الجھ کر بولا۔'' جی فرمایئے؟''

''مجھے آصف صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔''

''کون آصف؟'' ناصر نے ذہن پر زور دینے کی کوشش کی۔

''آپ کیسے صحافی ہیں، آپ کے آصف کو نہیں جانتے؟'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''کے آصف؟'' راجا نے حیرت سے دہرایا۔'' وہ مغل اعظم والے؟''

''واہ! آپ کی معلومات تو بہت اچھی ہیں۔'' میں نے توصیفی انداز میں کہا۔

''آصف صاحب خیریت سے ہیں، سنا ہے وہاں بھی کوئی فلم بنا رہے ہیں؟'' راجا نے اپنے خیال میں مجھے گھسنا شروع کردیا۔'' آپ یہاں کس فلائٹ سے آئے ہیں، کیا عالم بالا کی فلائٹس شروع ہوچکی ہیں؟''

''زیادہ بذلہ سنج بننے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے لہجہ بدل کر کہا۔'' وہ لڑکی کہاں ہے جسے تم لوگ اٹھا لائے ہو؟'' یہ کہتے ہوئے میں نے پھرتی سے اپنا ریوالور نکال لیا۔

''نو!'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔'' حرکت مت کرنا ورنہ کھوپڑی اڑا دوں گا۔'' میں نے ناصر کو مخاطب کیا جو غیر محسوس انداز میں ریوالور نکالنے کی کوشش کررہا تھا۔

اچانک میرے دائیں شانے پر اتنی زوردار ضرب لگی کہ چند لمحے کے لیے تو میرا ہاتھ بے جان ہوکر پہلو میں جھول گیا۔ میں خود سامنے والی دیوار سے ٹکرا گیا اور میرا ریوالور میرے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔

''اب اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔'' احمد شاہ نے کرخت لہجے میں کہا۔'' ورنہ یہاں سے سیدھا آصف صاحب کے پاس پہنچا دوں گا۔''

''اگر تم اتنے ہی بڑے سورما ہو تو اس کھلونے کے بغیر مجھ پہ قابو پا کر دکھاؤ، پھر میں بتاؤں گا کہ کون کسے کہاں بھیجتا ہے۔''

احمد شاہ کے ذہن پر بھی اس وقت شاید دھند چھا گئی تھی۔ اس نے اپنا ریوالور ایک طرف اچھال دیا اور مجھ سے

بولا۔'' آؤ!''

میں دیوار سے ٹکرانے کے بعد اس کا سہارا لیے کھڑا تھا۔ میرا دایاں ہاتھ ابھی تک شل تھا لیکن تکلیف میں اب وہ پہلی سی شدت نہیں تھی۔

میں نے اچانک اس کے سینے پر فلائنگ کک ماری اور الٹی قلابازی کھا کر پھر اس کے مقابل آگیا۔

احمد شاہ نے میری ناف پر لات مارنے کی کوشش کی لیکن میں نے تھوڑا سا ترچھا ہوکر خود کو اس کے داؤ سے بچایا اور اس کا پیر ٹخنے کے پاس سے پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اگر زوردار جھٹکا دیتا تو اس کے پیر کا جوڑ نکل جاتا۔

احمد شاہ نے دوسرے پیر سے میرے چہرے پر لات مارنے کی کوشش کی۔ میں اگر عین وقت پر پیچھے کی طرف نہ جھکتا تو میرے جبڑے کے ساتھ ساتھ میرے کئی دانت بھی ٹوٹ جاتے۔

میں نے جھپٹ کر اس کی کلائی جوڑ کے پاس سے پکڑ لی۔ وہ اگر زور لگاتا تو اس کا جوڑ نکل جاتا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر آہستہ سے بولا۔'' سوری سر! میں نے آپ پر ہاتھ اٹھایا۔''

''بس بہت ہوگیا۔'' ناصر نے اچانک ریوالور نکال لیا۔'' پیچھے ہٹو۔'' اس نے غرا کر کہا۔

''فائر مت کیجیے گا ناصر صاحب!'' احمد شاہ نے چیخ کر کہا۔'' یہ نواب صاحب ہیں۔''

''تم گھاس کھا گئے ہو احمد شاہ!'' ناصر نے جھلا کر کہا۔

''گھاس احمد شاہ نے نہیں کھائی بلکہ تم لوگوں نے کھائی ہے۔'' میں نے اپنی اصل آواز میں کہا۔

سوری لاؤنج میں داخل ہوا اور فخریہ انداز میں بولا۔

''کہیے سر، کیسا میک اپ کیا ہے؟''

''حیرت انگیز!'' ناصر نے کہا، پھر وہ احمد شاہ سے مخاطب ہوا۔'' احمد شاہ! تم نے رفیق صاحب کو کیسے پہچانا؟''

''سر کی فلائنگ کک بہت منفرد ہے۔ مجھے اسی وقت شبہ ہوا تھا، جب سر نے مجھے فلائنگ کک ماری تھی، یقین مجھے اس وقت آیا جب انہوں نے میری کلائی جوڑ کے پاس سے پکڑ لی۔ یہ ان کا خاص اسٹائل ہے۔ مجھے آج خود تو اس تجربہ پہلی بار ہوا ہے لیکن میں اس سے قبل بھی انہیں یہ د استعمال کرتے دیکھ چکا ہوں۔''

''ویسے سوری بھی کمال کا آدمی ہے۔ فیکے پتر! اب تجھے فیکے پتر کہتے ہوئے بھی مجھے سوچنا پڑے گا۔''

''تو سوچتا رہ۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔'' ناصر! تم بھی اپنا حلیہ کچھ بدلو الو۔''

پھر سوری نے ناصر اور راجا کا حلیہ بھی اس طرح بدلا کہ وہ بھی پہچانے نہیں جارہے تھے۔

ناصر اپنے حلیے سے کسی ملٹی نیشنل کمپنی کا ڈائریکٹر لگ رہا تھا۔ راجا کو سوری نے کالج کا کھلنڈرا لڑکا بنا دیا تھا۔

''یہ بتاؤ کہ یہ میک اپ کب تک برقرار رہے گا؟'' میں نے سوری سے پوچھا۔

''یہ کم سے کم ایک مہینے تک تو اسی طرح رہے گا۔ آپ کے بالوں کا اسٹائل، ان کا رنگ اور جلد کا رنگ ایک مہینے سے پہلے نہیں ختم ہوگا۔ آپ چاہیں تو اپنے طور پر بھی بالوں کا وہ اسٹائل زیادہ دن تک برقرار رکھ سکتے ہیں۔ میں کچھ کریمیں اور لوشنز آپ کو دے جاؤں گا۔ انہیں اپنے چہرے اور جسم کے کھلے ہوئے حصوں پر لگاتے رہیے گا۔ ویسے آپ کی قدرتی رنگت بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے اس لیے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ بال رنگنے کے لیے میں کلر بھی دے دوں گا۔ راجا صاحب اور ناصر صاحب کو بھی ہیئر کلر کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ضرورت پڑے گی۔“

میں نے سوری کو بیس ہزار روپے دیے تو وہ خوش ہوگیا اور بولا۔ ”جب بھی میری ضرورت پڑے، مجھے بلوا لیجیے گا۔ ہاں، ایک بوتل میں وہ محلول بھی ہے جس سے فوری طور پر یہ میک اپ ختم ہوسکتا ہے۔“

”تم نے کیا، کیا ہے؟“ راجا نے آئینہ دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے صرف مختلف رنگوں کے ہلکے اور گہرے شیڈز دیے ہیں۔ اصل کمال ان ہی شیڈز کا ہے۔ بس یہی میرا فن ہے۔“

میں نے ناصر کو اشارہ کیا کہ سوری کو شراب پلاؤ تاکہ یہ یہاں سے واپسی پر ہوش وحواس میں نہ رہے۔

ناصر نے اسے لاؤنج میں بٹھا کر ایک مرتبہ پھر شیمپین کی بوتل اس کے حوالے کردی۔

تھوڑی دیر بعد وہ کائنات کے مسائل پر گفتگو کرنے لگا۔ انسان کے اس دنیا میں آنے کا مقصد معلوم کرنے لگا اور کسی فلاسفر کی طرح نیم باز آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگا۔

ناصر نے اسے سہارا دے کر گاڑی میں بٹھایا اور اسے لے کر روانہ ہوگیا۔

ابھی تک غنی، نیلم اور اس مالی نے مجھے اس حلیے میں نہیں دیکھا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ غنی بھی کوئی ہنگامہ کھڑا کردے۔ میں نے خود ہی اسے دن میں سونے کی اجازت دی تھی کیونکہ وہ رات رات بھر جاگ کر پوری کوٹھی کی نگرانی کرتا تھا۔

نیلم اچانک ہی لاؤنج میں آگئی۔ وہ مجھے اور راجا کو دیکھ کر ٹھٹکی، پھر فوراً ہی سنبھل کر بولی۔ ”کون ہیں آپ لوگ؟“

”ہم نواب صاحب کے مہمان ہیں۔“ راجا نے کہا۔

”نواب صاحب کہاں ہیں؟“ نیلم نے پوچھا اور ہمارے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”اور آپ اندر کب آئے۔ نہ دروازے کی گھنٹی بجی، نہ مجھے گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔“

”آپ شاید نواب صاحب کی بیگم ہیں؟“ راجا نے کہا۔

نیلم نے جھک کر اچانک اپنی پنڈلی پر بندھا ہوا ریوالور نکال لیا اور سخت لہجے میں بولی۔ ”کون ہیں آپ لوگ اور یہاں لاؤنج میں کیا کررہے ہیں؟ نواب صاحب اپنے مہمانوں کو ہمیشہ ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہیں۔“

”فائر مت کردینا نیلم!“ میں نے جلدی سے اپنی اصلی آواز میں کہا۔

وہ چونک کر مجھے گھورنے لگی۔ ”صاحب جی...... آپ ...... یہ...... آپ نے......“

”دشمنوں سے بچنے کے لیے ہم نے فوری طور پر یہ حلیہ بدلا ہے۔ ناصر بھی بدلے ہوئے حلیے میں ہے۔“

مجھے خوشی ہوئی تھی کہ نیلم عام لڑکیوں کی طرح نازک اور چھوئی موئی نہیں تھی۔ وہ خطرے سے نمٹنا بھی جانتی تھی۔ اس کی جگہ اگر ریشم ہوتی تو شاید چیخ مار کے بھاگ جاتی۔

میں نے اس سے کہا کہ غنی کو بھی جا کر بتادو ورنہ ممکن ہے وہ بے خبری میں ہم پر حملہ کردے۔

”ہاں، ارم کا کیا حال ہے؟“

”صاب جی! وہ تو جب سے آئی ہے روئے جارہی ہے۔ وہ بار بار یہی کہہ رہی ہے کہ میرے باپ کے کیے کی سزا مجھے کیوں دے رہے ہو؟“

”اس سے کہنا کہ سزا تو ابھی شروع ہی نہیں ہوئی ہے، سزا تو اسے اس وقت ملے گی جب اس کے باپ کو دی ہوئی تین دن کی مہلت ختم ہوجائے گی۔“

نیلم نے غنی کو بھی ہمارے بدلے ہوئے حلیوں کے بارے میں بتادیا تھا۔ ناصر اور غنی دونوں ایک ساتھ ہی ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئے۔

میں نے نیلم سے کافی لانے کو کہا تھا۔ وہ ہم سب کے لیے کافی کے مگ لے آئی تھی۔

غنی بہت غور سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

ناصر کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے کھنکارا تو غنی ہنس کر بولا۔ ”ناصر صاحب کو تو میں پہچان گیا ہوں۔“

”فیکے پتر! یہ اس نے کیسا میک اپ کیا ہے؟“

غنی ہنسنے لگا پھر بولا۔ ”راجا صاحب میک اپ واقعی لاجواب ہے لیکن آپ کو فیکے پتر چھوڑنا پڑے گا۔“

”اوئے اس کے بغیر تو اس پر اثر ہی نہیں ہوتا۔“ راجا نے کہا۔

”پھر آپ یہ احتیاط کریں کہ دوسروں کے سامنے سر کو فیکے پتر کہہ کر مخاطب نہ کریں۔“

میں نے ایک پرانا سیل فون نکالا۔ اس میں ایک دوسری سم لگائی اور آفتاب خان کا نمبر ڈائل کردیا۔

اس نے پہلی ہی گھنٹی میں ریسیور اٹھا لیا اور بولا۔ ”میری بات پوری سنے بغیر فون بند مت کرنا۔“

مجھے مذاق سوجھا، میں نے کہا۔ ”ماجد صاحب! یہ آپ کیسی باتیں کررہے ہیں، آپ نے ابھی تک جوتوں کا اسٹاک بھی نہیں بھیجا۔“

”سوری، میرے خیال میں رانگ نمبر مل گیا ہے۔“

میں نے دس منٹ بعد پھر آفتاب خان کو اسی سم سے فون کیا۔

”یار! میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ یہ رانگ نمبر ہے۔“ آفتاب خان جھنجلا کر بولا۔

”لیکن یہ رانگ نمبر نہیں ہے۔“ میں نے اپنی اصل آواز میں کہا۔

”دیکھو، تمہیں خدا کا واسطہ! میری بیٹی پر رحم کرو۔ وہ تو خوف ہی سے مرجائے گی۔“

”تم نے کبھی دوسروں کی بہنوں اور بیٹیوں کا خیال کیا ہے آفتاب خان؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تمہارے جرائم کی فہرست تو بہت لمبی ہے!“ میں نے کہا۔ ”لیکن فی الحال مجھے صرف نور چاہیے ورنہ اپنی بیٹی کو بھول جاؤ۔“

”تم کیا ست بدھائی میں ہو؟“ آفتاب خان نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”میں ہڑپہ کے کھنڈرات میں ہوں۔“ میں نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ ”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں کہاں ہوں۔ تم بھی یہ اطمینان رکھو کہ دو دن کے لیے تمہاری بیٹی مکمل محفوظ ہے۔“

”تم نے تو مجھے تین دن کا وقت دیا تھا؟“

”اس میں سے ایک دن تو گزر چکا ہے۔“ میں نے کہا۔

”دیکھو، میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرے ہاتھ میں اب کچھ نہیں ہے۔“ آفتاب خان نے لجاجت سے کہا۔

”لیکن میرے ہاتھ میں بہت کچھ ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

”یار! اس لڑکی کو ہم کب تک قید رکھیں، فیکے پتر؟“ راجا نے کہا۔

”جب تک آفتاب خان، نور کو ہمارے حوالے نہیں کر دیتا۔ وہ اتنا بے بس نہیں ہے جتنا ظاہر کررہا ہے۔ وہ نور کو واپس لانے کے لیے اپنی جان پر کھیل جائے گا۔“

اچانک سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی، یہ میری رنگ ٹون نہیں تھی۔

ناصر نے جیب سے سیل فون نکالا اور بولا۔ ”ہیلو!...... وعلیکم السلام!...... ہاں، ابھی میں لاہور ہی میں ہوں...... کیا؟ اچھا کب......؟...... تم نے خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے......؟ اچھا...... اچھا...... ہاں، تمہارے کام کے لیے میں نے کہہ دیا ہے، بس دو چار دن میں ہوجائے گا۔ خدا حافظ؟“

”کون تھا؟“ راجا نے پوچھا۔

”میرے اخبار کا ایک جونیئر صحافی تھا۔“ ناصر نے کہا۔ ”وہ بتا رہا تھا کہ بیرسٹر سرور ڈھلون واپس آگیا ہے۔“

”لیکن وہ تو کئی ہفتے کے دورے پر گیا تھا۔“ راجا نے کہا۔

”او یار! سیدھی سی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آفتاب خان نے اس سے کہا ہوگا کہ اب میدان صاف ہے، تم واپس آجاؤ۔ یوں بھی وہ زیادہ دن باہر نہیں رہ سکتا تھا۔“

”پھر کیا خیال ہے، اس وکیل سے نمٹ لیا جائے؟“ ناصر نے کہا۔

”تم تو ہم سے بھی دو قدم آگے چل رہے ہو۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”پہلے اس کا گھر معلوم کرنا پڑے گا۔ اس کے معمولات پر نظر رکھنا ہوگی۔ پھر اس سے کچھ پوچھا جاسکتا ہے۔“

”وہ سب میں کرچکا ہوں۔“ ناصر نے کہا۔ ”وکیل شادمان ٹاؤن میں رہتا ہے۔ کورٹ سے وہ کچھ دیر کے لیے گھر جاتا ہے۔ کھانا وغیرہ کھانے اور آرام کرنے کے بعد وہ اپنے آفس چلا جاتا ہے۔ اس کے آفس میں تین جونیئر وکیل، ایک ٹائپسٹ اور ایک ریکارڈ کیپر ہے۔ ٹائپسٹ، استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھتی ہے اور وہی سرور ڈھلون کے کلائنٹس کو ملاقات کا وقت دیتی ہے۔“

اس کا جملہ پورا ہوا ہی تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نام دیکھا تو سوشی کا نام دیکھ کر چونک اٹھا۔ ”ہیلو!“ میں نے کہا۔

”سر، میں کب سے میڈم نور کا انتظار کررہی ہوں۔ وہ کیا ابھی تک وہاں سے روانہ نہیں ہوئیں؟“

”سوشی! نور کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ وہ اس وقت اسپتال میں ہے۔ میں خود اس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔“

”سر، یہ تو بہت بڑا پرابلم ہوگیا۔ اسٹیٹ ایجنٹ بھی اب ارنسٹ مینشن خالی کرنے کا تقاضا شروع کردے گا۔ میں اس سے کیا کہوں؟“

”میں ایسا کرتا ہوں، پاور آف اٹارنی دے کر راجا کو لندن بھیج دیتا ہوں۔ وہ میری طرف سے تمام ڈیل کرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گا۔"

"میڈم کی طبیعت کیا بہت زیادہ خراب ہے؟" سوشی نے فکرمندی سے پوچھا۔ "انہیں ہوا کیا ہے؟"

"کوئی وائرل انفیکشن ہے۔ فی الحال تو ان کی حالت خطرے سے باہر ہے لیکن وہ آئی سی یو میں ہیں۔" میں نے کہا۔ مجھے سوشی جیسی مخلص لڑکی سے جھوٹ بولتے ہوئے... شرمندگی ہو رہی تھی۔

"تو پھر آپ..... لیکن میڈم کو اس حال میں چھوڑ کر آپ بھی کیسے آسکتے ہیں؟"

"تم فکر مت کرو سوشی!" میں نے کہا۔ "فوری نوعیت کے تمام مسائل راجا سنبھال لے گا۔ میں بھی پہلی فرصت میں لندن آنے کی کوشش کروں گا۔"

"سر، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے۔" سوشی نے بے چارگی سے کہا۔

"تم جس طرح کام چلا رہی ہو، چلاتی رہو۔ اپنے کلائنٹس کو بھی یہ بتا دو کہ میڈم بیمار ہیں اس لیے فوری طور پر ان کا آنا ممکن نہیں ہے۔ میں کل ہی راجا کو بھیج دیتا ہوں۔ اس سے تمہیں بھی کچھ ریلیف مل جائے گا۔ او کے، ڈونٹ وری بے بی! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بائے!" میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"فیکے پتر! تو نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا کہ میں فوری طور پر لندن چلا جاؤں گا؟" راجا نے کہا۔

"تو نے پہلے بھی نور اور سوشی کے ساتھ وہاں کام کیا ہے۔ کام کی نوعیت کو تو، تو بھی سمجھتا ہی ہے۔"

"چل اب تو نے کہہ ہی دیا ہے تو مجھے تیری بات تو رکھنا ہی ہوگی۔"

"بڑی نوازش ہوگی آپ کی!" میں نے کہا۔ "میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

"اس سے پہلے کے تو سارے احسان تو بھول گیا۔" راجا نے مجھے چڑانے والے انداز میں کہا۔ "حالانکہ ہر موقع پر تو نے یہی کہا تھا کہ یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

"راجا! تجھ میں کسی پچھتر، اسی سالہ بڑی بی کی روح سما گئی ہے کیا؟ میں محسوس کر رہا ہوں کہ تو ہر بات میں طنز اور طعنے کی گنجائش نکال لیتا ہے۔"

"تو تو نواب بننے کے بعد ہر بات بھول جاتا ہے۔ انسان کو اپنا ماضی کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔ محمود غزنوی کا غلام ایاز، وہی ایاز جس کے لیے علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز! وہ اپنا غلامی کے دور کا لباس بہت سنبھال کر رکھتا تھا اور وقتاً فوقتاً اسے دیکھ کر اپنے نفس کو مارا کرتا تھا۔"

"میں نفس کے بجائے بندے کو مارنے کا قائل ہوں۔ ذرا اس وقت سے جب میں تیری گردن مروڑ دوں۔"

"بات طے ہوگئی۔" راجا نے منہ بنا کر کہا۔ "جب تو نے فیصلہ کر لیا ہے فیکے پتر کہ مجھے لندن جانا ہے تو پھر جانا ہے۔ پاسپورٹ پر ملٹی پل ویزا ہے، بس مجھے لندن کی سیٹ کنفرم کرانا ہوگی۔"

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے پہلے تو اس کال کو نظر انداز کرنا چاہا، پھر یہ سوچ کر کال ریسیو کر لی کہ مبادا کوئی کام کا فون ہو۔

"ہیلو!" میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔

"کیا میں نواب رفیق احمد شیرازی سے بات کر سکتا ہوں۔" دوسری طرف سے کوئی انتہائی مہذب انداز میں بولا۔

"جی فرمائیے، میں رفیق بول رہا ہوں۔"

"رفیق صاحب! ہمارے ایک دوست ہیں آفتاب خان! ان کی بیٹی آپ کی مہمان ہے، اسے اب واپس بھیج دیں۔"

"آپ کون صاحب بول رہے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"میرا نام جان کر کیا کریں گے نواب صاحب، بس آپ ہمارے دوست کی بچی کو گھر پہنچا دیں۔"

"یہی بات آپ آفتاب صاحب سے بھی کر دیں۔" میں نے کہا۔ "میری بھی منگیتر ان کی مہمان ہے، وہ اسے واپس چھوڑ جائیں اور اپنی بیٹی لے جائیں۔"

"نواب صاحب!" دوسری طرف سے بولنے والے کا لہجہ ایک دم درشت ہوگیا۔ "آفتاب کی بیٹی کو تو ہم تلاش کر ہی لیں گے لیکن یہ سمجھ لیں کہ پھر نور آپ کو زندہ نہیں ملے گی۔"

"چلیے یوں ہی سہی۔ اگر نور کو تھوڑی سی خراش بھی آئی تو میں اس لڑکی کے اتنے ٹکڑے کروں گا کہ آفتاب کے لیے سمیٹنا مشکل ہو جائے گا۔"

"آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟"

"اس کی ابتدا تو آپ نے کی تھی قبلہ!" میں نے کہا۔ "میں صرف دھمکیاں نہیں دیتا بلکہ اپنے کہے پر عمل بھی کرتا ہوں۔"

"میری بات غور سے سنو جعلی نواب!" بولنے والا تمام ادب آداب بھول گیا۔ "تم نے آفتاب خان کو تین دن کی مہلت دی ہے نا! میں تمہیں بارہ گھنٹے دے رہا ہوں۔ میں

اس دوران میں آفتاب کی بیٹی کو لے جاؤں گا، مجھے روک سکتے ہو تو روک لینا۔"

یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

"کون تھا؟" راجا نے پوچھا۔ ناصر بھی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"اس نے اپنا نام نہیں بتایا۔" میں نے کہا، پھر انہیں بتایا کہ وہ کس قسم کی دھمکی دے رہا تھا۔ میں اضطراب کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ بولنے والا کوئی بھی رہا ہو لیکن اس کے لہجے میں تحکم اور اعتماد کی جھلک تھی۔

"کہیں اسے ہمارے اس ٹھکانے کے بارے میں علم تو نہیں ہوگیا؟" میں نے راجا سے کہا۔ پھر خود ہی بولا۔ "لیکن اگر اسے یہاں کا علم ہوتا تو فون کرنے کے بجائے براہ راست یہاں ہلا بولتا۔ اس نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔"

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور صوبیدار میجر صاحب کا نمبر ملانے لگا۔

انہوں نے دوسری ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی۔

"السلام علیکم!" میں نے کہا۔

"وعلیکم السلام!" صوبیدار میجر صاحب نے جواب دیا۔ "خیریت تو ہے رفیق میاں؟"

"خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔" میں نے مبہم سا جواب دیا۔ "آپ حویلی کی سیکیورٹی مزید الرٹ کر دیں۔ حویلی کے باہر لگی ہوئی سرچ لائٹس آن کر دیں اور آپ نے جو کیمرے مختلف جگہ لگوائے ہیں، انہیں بھی چیک کر لیں۔"

"یہ سب انتظام تو اب ہر وقت رہتا ہے۔" انہوں نے کہا۔ "اب کوئی خاص بات ہے؟" انہوں نے الجھ کر پوچھا۔

"خاص بات ہو بھی سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو یہ صرف میرا اندازہ ہے۔"

"حویلی کی سیکیورٹی کی طرف سے تم بے فکر رہو۔ یہاں سے چڑیا کا بچہ بھی اندر نہیں جا سکتا۔"

"صوبیدار میجر صاحب!" میں نے کہا۔ "اگر حویلی پر حملہ ہوا تو بہت بھرپور انداز میں ہوگا۔ حملہ آور دستی بم اور راکٹ لانچر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔" صوبیدار میجر صاحب نے اطمینان سے کہا۔ "وہ لوگ اگر ہماری ریاست کی حدود میں داخل بھی ہوئے تو زندہ بچ کر نہیں جا سکیں گے۔" پھر چونک کر بولے۔ "تم اس وقت کہاں ہو؟"

"میں آپ سے زیادہ دور نہیں ہوں اور ہر طرح سے محفوظ ہوں۔"

پھر رسمی کلمات ادا کرنے کے بعد میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"فیکے پتر!" راجا نے ہنس کر کہا۔ "نور کے بغیر تو تیرا دماغ خوب چلتا ہے، پھر اس کی موجودگی میں کیوں چل جاتا ہے؟ میں نے خود بھی یہی سوچا تھا کہ ست بدھائی میں سیکیورٹی کو مزید الرٹ کرا دوں۔ وہ لوگ تو یہی سمجھ بیٹھے ہیں نا کہ ہم ست بدھائی کی حویلی میں موجود ہیں۔"

"میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔" میں نے کہا۔ "جنگ کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ دفاع کرنے کے بجائے کبھی کبھی آگے بڑھ کر دشمن پر حملہ کرنا پڑتا ہے۔"

"فیکے پتر! تو کس ملک کی فوج میں کمانڈر تھا؟" راجا نے ہنس کر کہا۔

"وقت اور حالات سب کچھ سکھا دیتے ہیں مہاراجا!" میں نے کہا۔ "کیا تو نے قلم کے علاوہ کبھی کوئی ہتھیار چلایا ہے؟ لیکن اب تجھے قلم کے ساتھ ساتھ ہتھیار بھی چلانا پڑ رہا ہے۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں، ہم دلاور پر براہ راست حملہ کر دیں؟" ناصر نے کہا۔

"دلاور جیسے لوگ اتنا آسان شکار نہیں ہوتے۔" میں نے کہا۔ "میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اس شاہ جی کے دوسرے چمچے کی بھی خبر لے لیں۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ قدوائی....."

"ہاں، میرا یہی مقصد ہے۔ بہ ظاہر وہ شاہ جی کا بے ضرر سا سیاسی کارکن ہے۔ اس قسم کے کارکن کسی بھی سیاسی پارٹی میں ہزاروں کی تعداد میں ہوتے ہیں بلکہ اگر سیاسی پارٹی بڑی ہو تو ان کی تعداد لاکھوں میں پہنچ سکتی ہے۔ یہ شاید پارٹی کے بہت سے عہدے داروں کو بھی معلوم نہ ہو کہ قدوائی شاہ جی کے لیے کیا کام کرتا ہے؟"

"اس کا پتا....."

"اس کا پورا پتا غنی اور احمد شاہ کے پاس موجود ہے۔ وہ ایبٹ روڈ کے عقب میں معمولی سے ایک مکان میں رہتا ہے۔ اس کی وجہ بھی شاید یہی ہے کہ وہ دوسروں کی نظروں میں نہ آئے ورنہ میرا خیال ہے کہ قدوائی لکھ پتی سے کم نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

"تو پھر قدوائی ہی سے شروعات کرتے ہیں۔" راجا نے کہا۔ "ہم لوگ اسے پوچھ گچھ کے لیے کسی ایسی جگہ لے جائیں گے جہاں اس کی چیخ پکار سننے والا کوئی نہ ہو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر پھر کوئی نیا نمبر تھا۔ میں نے بٹن دبا کر کال ریسیو کر لی۔

''ہیلو!''

''بارہ گھنٹے میں سے دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔'' وہی مکروہ آواز سنائی دی۔

''اچھا!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی، گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور بتا دی۔ ویسے تم بھی نوٹ کر لو کہ میری دی ہوئی مہلت میں سے ایک دن گزر چکا ہے۔ اب صرف اڑتالیس گھنٹے باقی ہیں۔''

''تم کیا سمجھتے ہو، ست بدھائی کے بل میں گھس کر تم مجھ سے بچ جاؤ گے؟''

''میں تو تمہاری آمد کا منتظر ہوں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اور ہاں، یہ شاکر اور اکبر جیسے چھوٹے موٹے پلے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ شاکر کا انجام تو تمہارے سامنے ہی ہے، اب اکبر سندھو کی لاش بھی کسی کوڑے کے ڈھیر پر پڑی مل جائے گی۔''

''اپنے قد سے بڑی باتیں مت کرو۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم میں اتنی جرأت تو ہے نہیں کہ مجھے اپنا سیل نمبر ہی بتا سکو۔ میرا تو سیل نمبر بھی تمہارے پاس ہے اور پتا بھی۔ تم تو خود کو شیر سمجھتے ہو تو پھر اپنا پتا کیوں نہیں بتا دیتے۔ تم تو ست بدھائی آنے کی جرأت نہیں کرو گے لیکن میں دنیا کے کسی بھی کونے میں تمہاری گردن ناپ لوں گا۔''

''میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ بارہ گھنٹے میں سے اب ایک گھنٹا دس منٹ گزر چکے ہیں۔''

''گھڑی میرے پاس بھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب تم بارہ گھنٹے بعد اس لڑکی کو لے جانے کے بعد ہی فون کرنا۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے مختصراً ناصر اور راجا کو اس کال کے بارے میں بتایا۔

''اسے کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ وہ صرف اندھیرے میں تیر چلا رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''چلو، اب ذرا اس قدوائی سے بھی ملاقات کر لیں۔''

ڈرائیونگ سیٹ پر غنی تھا۔ اس کے ساتھ راجا بیٹھا تھا۔ میں اور ناصر عقبی نشست پر تھے۔ احمد شاہ دوسری گاڑی میں ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔

غنی نے ایبٹ روڈ کے عقب میں اس مکان کا ایک چکر لگایا اور گاڑی کو ایسی جگہ پارک کر دیا جہاں سے نکلنے میں دشواری نہ ہو۔

میں قدوائی کے مکان کی طرف بڑھا۔ ناصر مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔

قدوائی کا مکان پرانی طرز کا بنا ہوا تھا۔ اس نے غالباً حال ہی میں دیواروں اور دروازوں پر پینٹ کرایا تھا۔ دروازے سے ابھی تک پینٹ کی مخصوص بو آ رہی تھی۔

دروازے کی دائیں جانب اطلاعی گھنٹی کا بٹن لگا ہوا تھا۔ میں نے چند لمحے سوچا، پھر گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔

اندر کہیں گھنٹی کی آواز پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی عورت اندر سے بولی۔ ''کون؟''

''میں..... شکور ہوں جی!'' میں نے کہا۔ ''قدوائی صاحب گھر میں ہیں تو انہیں ذرا باہر بھیج دیں۔''

''قدوائی صاحب تو گھر میں نہیں ہیں۔'' عورت نے کہا۔

''اچھا، ان سے کہیے گا کہ شکور آیا تھا۔ شاہ جی کا پیغام لے کر۔''

اندر سے کھسر پھسر کی آواز آئی، پھر عورت بولی۔ ''بھائی! اگر کوئی ضروری کام ہے تو آپ تھوڑی دیر انتظار کر لیں، قدوائی صاحب بازار تک گئے ہیں، بس آنے ہی والے ہیں۔ میں بیٹھک کھولتی ہوں۔''

فوراً ہی مرکزی دروازے کے ساتھ ہی واقع ایک اور دروازہ کھل گیا اور اسی عورت کی آواز سنائی دی۔ ''شکور بھائی! آپ بیٹھیں۔ قدوائی صاحب بس آ ہی رہے ہوں گے۔''

''میرے پاس وقت بہت کم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر وہ پانچ منٹ میں آ گئے تو ٹھیک ہے ورنہ میں چلا جاؤں گا، پھر قدوائی صاحب کو آپ شاہ جی کے پاس ہی بھیج دیجیے گا۔''

دو منٹ سے بھی کم عرصے میں ایک شخص ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس کے سر پر لمبے لمبے بال تھے، چہرے پر چھوٹی سی ڈاڑھی بھی تھی، اس کا جسم اکہرا تھا اور وہ اس وقت پان چبا رہا تھا۔ کسی سیاسی پارٹی کے عام کارکن کے برعکس اس کے چہرے پر پژمردگی نہیں تھی بلکہ خوش حالی کا احساس ہوتا تھا۔

اس نے پلکیں جھپکا کر غور سے مجھے دیکھا، پھر بولا۔ ''شکور صاحب! میں پہچانا نہیں آپ کو؟''

''مجھے پہچاننے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ آپ شاہ جی کے پیغام پر فوری طور پر عمل کریں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''پارٹی میں بے شمار آدمی ہیں، کیا آپ سب کو پہچانتے ہیں؟''

''ارے، ناراض کیوں ہوتے ہیں جناب؟'' وہ ہنس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر بولا۔ ''میں پارٹی کے تقریباً ہر آدمی کو جانتا ہوں۔''

''آپ اس جان پہچان کے چکر کو چھوڑیے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''شاہ جی نے فوری طور پر آپ کو بلایا ہے۔ انہیں آپ سے بہت ضروری کام ہے۔''

''شاہ جی نے بلایا ہے؟'' وہ حیرت سے بولا۔ ''لیکن.....''

''وقت ضائع مت کریں قدوائی صاحب!'' میں نے کہا۔ ''ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔''

''میں ابھی حاضر ہوا۔'' یہ کہہ کر وہ چھپاک سے اندر داخل ہوگیا۔

وہ پانچ منٹ سے بھی کم عرصے میں تیار ہوگیا۔ اس کے جسم پر اجلا شلوار قمیص اور پیروں میں چمڑے کی قیمتی چپل تھی۔ اس نے شلوار قمیص پر واسکٹ بھی پہن رکھی تھی۔ وہ اپنی پانوں کی ڈبیا جیب میں رکھتے ہوئے میرے ساتھ باہر آ گیا۔

غنی کی نظریں مجھ ہی پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے گاڑی نزدیک لانے کا اشارہ کیا۔

غنی نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے لے کر گلی میں آ گیا۔

''بیٹھیے قدوائی صاحب۔'' میں نے اس کے لیے عقبی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

وہ جھجکتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں بھی اس دروازے سے گاڑی میں بیٹھا۔

اچانک دوسری طرف کا دروازہ کھلا اور ناصر گاڑی میں داخل ہوا۔

قدوائی نے چونک کر ناصر کو دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔ اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے۔

وہ اب میرے اور ناصر کے درمیان بیٹھا تھا۔

قدوائی بہ ظاہر پارٹی کا ایسا عام سا کارکن تھا کہ اگر وہ ڈاکٹر ہمیں اس کے بارے میں نہ بتاتا تو ہمارے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوتا کہ یہ آدمی کتنا اہم ہے؟

''شکور بھائی! خیریت تو ہے؟'' قدوائی نے خاموشی سے تنگ آ کر پوچھا۔

''ہاں یار خیریت تو ہے لیکن اس نواب نے ایک مصیبت کھڑی کر رکھی ہے۔ اسے نہ جانے کیسے علم ہوگیا ہے کہ اس کی وڈیو بنانے میں شاہ جی کا ہاتھ ہے۔''

''وہ بہت حرام کا تخم ہے شکور بھائی! دیکھا نہیں تھا، کیسے وہ اس لونڈیا کو نکال کر لے گیا تھا اور جاتے جاتے شاہ جی کے آدمیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔''

''وہ وڈیو اس وقت کہاں ہے؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''کون سی وڈیو؟'' قدوائی چونک کر بولا۔

''اسی نواب اور اس ڈپٹی سیکریٹری کی بیٹی کی وڈیو؟'' میں نے کہا۔

''کون ہو تم؟'' قدوائی ایک دم بدک گیا۔

''میں نے بتایا تو تھا کہ میں شکور ہوں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''تم شکور ہو یا غفور!'' قدوائی نے کہا۔ ''لیکن اب مجھے اتنا یقین ہوگیا ہے کہ تمہیں شاہ جی نے نہیں بھیجا ہے۔''

''یہ الہام تمہیں کیسے ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''شاہ جی کسی ایرے غیرے سے ایسی خاص بات نہیں کرتا۔''

''میں تمہیں ایرا غیرا نظر آ رہا ہوں؟'' میں نے غرا کر کہا۔ ''آیندہ میرے لیے اس قسم کے الفاظ استعمال کیے تو میں زبان کاٹ کر ہاتھ پر رکھ دوں گا۔''

''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' اس نے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شاہ جی کا بنگلا اس طرف تو نہیں ہے۔''

''خاموشی سے بیٹھو۔'' ناصر نے پہلی دفعہ کہا۔ ''تم بولتے بہت ہو۔''

وہ خاموش ہوگیا لیکن اس کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار تھے۔

''میں نے پوچھا تھا کہ نواب اور اس لڑکی کی وڈیو کہاں ہے؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''اگر تمہیں شاہ جی نے بھیجا ہے تو یہ سوال بھی تم شاہ جی سے کرنا۔'' قدوائی نے جواب دیا۔

''فی الحال تو میں یہ سوال تم سے کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں نہیں جانتا۔'' اس نے کہا۔ ''میں وڈیو بنا کر شاہ جی تک پہنچا دیتا ہوں۔''

میں نے گاڑی سے باہر نظر دوڑائی۔ غنی گاڑی کو ماڈل ٹاؤن کے غیر آباد علاقے کی طرف لے گیا تھا۔ وہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اکا دکا بنگلے زیر تعمیر تھے۔ کچھ بنگلوں کی تعمیر جاری تھی۔ کچھ بنگلوں کے صرف ڈھانچے کھڑے ہوئے تھے۔

میں نے ایک دم ریوالور نکال کر قدوائی کی کنپٹی پر رکھ دیا۔

''کک..... کیا مطلب؟'' وہ بوکھلا کر بولا۔

''میں نے پوچھا ہے کہ وہ وڈیو فلم کہاں ہے؟''

''مم..... میں..... نہیں..... جانتا..... وہ..... شاہ جی کے..... پاس.....''

''ٹھیک ہے سر!'' ناصر نے کہا۔ ''اگر اسے کچھ معلوم نہیں تو اس کا فائدہ ہی کیا ہے؟ اسے یہیں کہیں مار کے پھینک دیتے ہیں۔ ہم شاہ جی سے بعد میں اس وڈیو فلم کے بارے میں پوچھ لیں گے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تمہیں شاہ جی نے نہیں بھیجا؟'' قدوائی خوف زدہ لہجے میں بولا۔ وہ کمزور دل کا بزدل سا آدمی تھا۔ ایسے لوگ عموماً بہت سازشی اور مکار ہوتے ہیں لیکن جب جان پر بن جائے تو سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ غنی نے گاڑی اچانک ایک زیر تعمیر عمارت کے اندر لے جا کر روک دی۔ اس بنگلے کا ابھی تک پھاٹک بھی نہیں لگا تھا۔

گاڑی رکتے ہی میں باہر نکلا اور قدوائی کو گریبان سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔ اس کے گھٹنوں میں شدید چوٹ آئی ہوگی کیونکہ میں نے بالکل غیر متوقع طور پر اسے باہر گھسیٹ لیا تھا۔ پھر میں نے اس کا کالر پکڑ کر اسے کھڑا کیا اور گھسیٹتے ہوئے ایک زیر تعمیر کمرے کی طرف چلا۔ کمرے بھی دروازوں اور کھڑکیوں سے محروم تھے۔

''دیکھیے شکور بھائی! آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔'' اس نے پان کی پیک نگلتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے اس وڈیو فلم کا پتا بتا دو۔ میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کروں گا۔''

''مم..... میں..... میں.....''

''بکری کی طرح سے ممیانا چھوڑو۔'' ناصر نے کہا۔ ''جلدی بتاؤ، وہ وڈیو فلم اور دوسری فلمیں کہاں ہیں؟''

''میں نے وہ فلم شاہ جی کے ایک آدمی نادر کو دی تھی۔'' قدوائی نے کہا۔

''نادر کون؟'' میں نے پوچھا۔

''نادر، آفتاب خان کا خاص آدمی ہے۔ وہ ساری فلمیں آفتاب خان تک پہنچا دیتا ہے۔'' قدوائی نے کہا اور اچانک وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔

غنی نے پاؤں اڑا کر گرا دیا۔ وہ ان سریوں پر گرا جو دروازے کے گیٹ کے لیے بنائے جانے والے پلر میں ابھرے ہوئے تھے۔ دوسرے اس کے سینے اور پیٹ کے آر پار ہوگئے۔

مجھے لمحے بھر کو جھرجھری آ گئی۔ کچھ لمحے پہلے ہنستا، کھیلتا ایک آدمی اچانک موت کی اندھی وادیوں میں اتر گیا تھا۔

اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ بے بسی کی تصویر بنا پڑا تھا۔

ناصر بھی تاسف بھرے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے جھک کر اس کی نبض دیکھی، پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ ان سریوں کے آر پار ہونے کے بعد کوئی معجزہ ہی اسے بچا سکتا تھا۔

''اس کی جیبوں کی تلاشی لو اور یہاں سے نکل چلو۔'' میں نے غنی سے کہا۔

غنی نے بہت پھرتی سے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کی جیبوں میں کچھ وزیٹنگ کارڈز، ساڑھے چار ہزار روپے کے کرنسی نوٹ اور ایک سیل فون تھا جو اس وقت آف تھا۔

میں نے وہ چیزیں گاڑی کے ڈیش بورڈ میں رکھیں اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

دوسرے ہی لمحے ہماری گاڑی واپسی کا سفر تیز رفتاری سے طے کر رہی تھی۔ احمد شاہ سائے کی طرح ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا لیکن اتنی مہارت اور احتیاط سے کہ مجھے خود بھی اس تعاقب کا احساس نہیں ہو سکا تھا۔

''واقعات کی تمام کڑیاں گھوم پھر کر آفتاب خان سے جا کر ملتی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ہم نے اسے اتنی آسانی سے چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔''

''اس کی بیٹی ہمارے قبضے میں ہے سر!'' غنی نے کہا۔

''وہ کب تک ہم سے بچا رہے گا۔''

ہمیں اس آپریشن میں مشکل سے چالیس منٹ لگے تھے۔

میں نے گھر پہنچ کر سب سے پہلے ارم کی خبر لی۔ وہ نڈھال سی بیڈ پر پڑی ہوئی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ اچھل کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ''آپ کون ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا، پھر مجھے یاد آ گیا کہ ارم بدلے ہوئے حلیے کی وجہ سے مجھے پہچان نہیں سکی ہے۔

''کیسی ہو ارم بیٹی؟'' میں نے بدلی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''وہ انکل کہاں ہیں جو مجھے یہاں لائے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ انکل ایک ضروری کام سے گئے ہیں بیٹا!'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''لیکن تم ڈرو مت، انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اس بچی کا خاص خیال رکھنا۔'' میں نے بدلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے لہجے اور آواز میں کہا۔
''آپ لوگ آخر مجھے گھر کیوں نہیں پہنچا دیتے؟'' وہ رونے لگی۔
''پہنچا دیں گے بیٹا، پہنچا دیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''بس دو دن کی بات ہے۔''
''دو دن؟'' اس نے روتے ہوئے کہا۔
''بیٹا! تمہیں یہاں کوئی تکلیف ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''مجھے سب سے بڑی تکلیف یہ ہے کہ میں آپ کی قید میں ہوں۔'' اس نے کہا۔ وہ خاصی ذہین اور حاضر جواب لڑکی تھی۔
''اس کا ذمے دار تمہارا باپ ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''وہ اگر آج نور کو واپس کر دے تو میں آج ہی تمہیں گھر چھوڑ آؤں گا۔ مشکل تو یہ ہے کہ تمہاری ماں بھی تمہارے باپ کے ساتھ برابر کی شریک ہے۔''
''ہاں، مما! بزنس پارٹنر ہیں پاپا کی؟'' اس نے کہا۔
''جانتی ہو تمہارے پاپا کیا کرتے ہیں؟'' میں نے کہا۔
''میں جانتی ہوں۔'' اس نے کہا۔
''بس تم اسی طرح ہم سے کوآپریٹ کرتی رہو۔'' میں نے کہا۔ میں نے جان بوجھ کر تعاون کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا ورنہ وہ پھر اس کا مطلب پوچھتی۔
میں ارم کے کمرے سے باہر نکلا تو ناصر نے کہا۔ ''سر! میرا خیال ہے کہ آپ یہاں مزید سیکیورٹی کا بندوبست کر دیں۔ ممکن ہے دلاور کو یہاں کا علم ہو ہی گیا ہو۔''
''یہاں جتنے لوگ ہیں کافی ہیں ناصر!'' میں نے کہا۔ ''میں اب مزید کسی پر اعتبار کر بھی نہیں سکتا۔ ست بدھائی سے لوگوں کو بلانے میں یہ نقصان ہے کہ ممکن ہے ان کے پیچھے پیچھے دلاور یا رانا کے آدمی یہاں تک پہنچ جائیں۔ پھر ست بدھائی میں بھی قابلِ اعتبار آدمیوں کی ضرورت ہے۔''
''ہاں، سر وہ وکیل سرور ڈھلون بھی تو واپس آ گیا ہے اس کا کیا کرنا ہے؟'' ناصر نے کہا۔
''اس وکیل سے بعد میں نمٹیں گے، پہلے میں آفتاب خان سے نمٹ لوں۔''
''سر، ایسا نہ ہو کہ شاہ جی آفتاب خان کو قتل کرا دے۔'' ناصر نے کہا۔ ''اس نے میڈیا کے سامنے شاہ جی پر انتہائی گھٹیا الزامات لگائے ہیں۔''
''شاہ جی اتنا احمق نہیں ہے ناصر!'' میں نے کہا۔ ''اگر آفتاب خان فوری طور پر قتل ہوا تو شاہ جی پر شبہ کیا جائے گا وہ آفتاب خان کو کسی اور طرح خاموش کرنے کی کوشش کریں گا۔ ممکن ہے اس کے خلاف عدالت کا رخ کرے، یہ بھی ممکن ہے کہ ان دونوں کے درمیان ڈیل ہو جائے اور ان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔'' پھر میں ہنس کر بولا۔ ''میں خود بھی ایک بار شاہ جی سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں بھی تو دیکھوں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے؟ وہ اگر مجھے پہچانتا بھی ہوگا تو اس حلیے میں نہیں پہچانے گا۔''
میں نے غنی اور احمد شاہ کو تاکید کی کہ یہاں سے ایک لمحے کو بھی نہ ہٹیں اور اس لڑکی کی پوری حفاظت کریں۔
''ہم پوری طرح سے تیار ہیں سر!'' غنی نے کہا۔ ''اگر کسی نے ہماری اجازت کے بغیر بنگلے میں گھسنے کی کوشش کی تو وہ زندہ واپس نہیں جائے گا۔''
''اور لڑکی کی طرف سے آپ بے فکر رہیں۔'' احمد شاہ نے کہا۔ ''اس تک پہنچنے کے لیے آنے والوں کو پہلے ہماری لاشوں پر سے گزرنا پڑے گا۔''
''فلمی ڈائلاگ بولنے سے پرہیز کرو۔'' میں نے کہا اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے ناصر اور راجا کو بھی گھر میں چھوڑ دیا تھا اور نیلم کو بھی خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ مجھے حیرت تو اس بات پر ہوئی تھی کہ نیلم بھی مسلح رہتی تھی۔ اس نے خطرہ دیکھ کر اپنی پنڈلی سے بندھا ہوا ریوالور پلک جھپکتے میں نکال لیا تھا۔ میں نے اسے تاکید کر دی تھی کہ تم زیادہ سے زیادہ لڑکی کے کمرے میں رہنا۔
میں گاڑی لے کر باہر نکل آیا۔ فوری طور پر میں بے مقصد ہی گاڑی دوڑا رہا تھا۔ میں مسکین شاہ سے ملنا چاہتا تھا لیکن اس سے مل کر حاصل کیا ہوتا؟ میں مال روڈ کی طرف مڑا تو ٹریفک جام تھا۔ گاڑیوں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ میں سمجھا کہ یا تو کسی سیاسی پارٹی نے کوئی ریلی نکالی ہے یا پھر لوگ کسی بات پر احتجاج کر رہے ہیں۔ میں نے اپنی گاڑی روکی اور صورت حال معلوم کرنے کے لیے گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ دو گاڑیاں آپس میں ٹکرا گئی ہیں اور ان کے مالکان آپس میں بحث و تکرار کر رہے ہیں۔ ایسے موقعے پر ٹریفک پولیس ہمیشہ کی طرح غائب تھی۔
میں نے اکتائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھا واپسی کا راستہ بھی مسدود ہو چکا تھا۔ میری گاڑی کے پیچھے بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں اور ان کے ڈرائیور جاہلوں کی طرح ہارن بجا رہے تھے۔ انہیں کم سے کم یہ تو معلوم

یہ تھا کہ ٹریفک کیوں رکا ہوا ہے؟ میں نے تو بہت سے ں کو ٹریفک سگنل پر بھی ہارن بجاتے دیکھا تھا۔
اچانک ایک شخص کو دیکھ کر میں بری طرح چونک اٹھا۔ ں آنکھوں میں خوشگوار حیرت تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر لوگوں بھیڑ سے بچتا ہوا آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ شامی تھا، ں بادشاہ!
میں نے اسے آواز دی۔ ''شامی بادشاہ!''
اس نے چونک کر اردگرد دیکھا۔ پھر محتاط انداز میں ے بڑھنے لگا۔
میں نے دوبارہ اسے آواز دی۔ ''شامی!''
اس مرتبہ اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے حیرت سے دیکھا، پھر محتاط انداز میں آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے
''تم کہاں چلے گئے تھے شامی؟'' میں نے بے تابی پوچھا۔
''آپ ہیں کون اور مجھے کیسے جانتے ہیں؟'' شامی ناگواری سے کہا۔
مجھے فوراً خیال آ گیا کہ میں اس وقت بدلے ہوئے میں ہوں۔ شامی بے چارہ مجھے کیسے پہچان سکتا ہے؟
''تم نے مجھے پہچانا نہیں شامی!'' میں نے ہنس کر کہا۔
شامی نے غور سے مجھے دیکھا، پھر والہانہ انداز میں سے بغل گیر ہو گیا۔ ''نواب صاحب! میں آپ کو کیسے ل سکتا ہوں۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آپ کی آواز سن کر مجھے پہلے ہی شک ہوا تھا لیکن جب بارہ آپ نے مجھے مخاطب کیا تو میں نے آپ کی آواز ان لی۔'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''یہ..... آپ ..... حلیہ کیوں بدل رکھا ہے اور اس وقت.....''
''لمبی کہانی ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''آؤ گاڑی ں بیٹھ جاؤ۔''
اس وقت تک دونوں گاڑی والوں کے درمیان تصفیہ چکا تھا یا پولیس کی مداخلت سے ٹریفک بحال ہوا تھا کیونکہ ب وہاں ٹریفک پولیس کا ایک وارڈن بھی نظر آ رہا تھا اور ڑیاں آہستہ آہستہ رینگنے لگی تھیں۔
میں نے شامی کو گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی اسٹارٹ ر کے آگے بڑھا دی۔
تھوڑی دیر تک رینگنے کے بعد سڑک صاف ہو گئی اور ڑی تیز رفتاری سے دوڑنے لگی۔
''اب بتائیں نواب صاحب!'' شامی نے کہا۔ ''کیسے ہیں آپ اور یہ حلیہ کیوں بدل رکھا ہے؟''
''میں تو اسی وقت سے مصیبتوں میں گھرا ہوا ہوں شامی بادشاہ جب تم سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔'' میں نے کہا اور مختصراً اسے ساری بات بتا دی۔
''تو کیا رانا زوہیب ابھی تک زندہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''کیوں! تم نے کیا اسے حالتِ نزع میں چھوڑا تھا یا وہ مرنے کے قریب تھا جو تم اس انداز میں پوچھ رہے ہو؟''
''اس کی حرکتیں تو ایسی ہی تھیں کہ اسے اب تک مر جانا چاہیے تھا۔''
''وہ اگر مرتا تو اس کی خبر نمایاں طور پر اخبارات میں شائع ہوتی۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم اخبارات نہیں دیکھتے؟''
''میں پاکستان میں تھا ہی نہیں۔'' شامی بادشاہ نے بتایا۔ ''پرسوں ہی واپس آیا ہوں۔''
''تم اچانک غائب کہاں ہو گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اور گولی کیسی ہے؟''
''بس حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے۔'' شامی نے کہا۔ ''کیا آپ ست بدھائی جا رہے ہیں؟''
''نہیں، میں نے لاہور میں ایک کوٹھی خرید لی ہے اور فی الحال وہیں مقیم ہوں۔''
''چلیں پھر گھر چل کر آپ سے تفصیلی بات ہوگی۔ پہلے تو میں کھانا کھاؤں گا۔ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔''
میں نے گاڑی کا رخ ماڈل ٹاؤن کی طرف موڑ دیا اور انتہائی تیز رفتاری سے گھر پہنچ گیا۔
گیٹ پر وہ گارڈ موجود تھا جو کوٹھی میں مالی کے طور پر کام کرتا تھا۔ اس نے میری گاڑی دیکھ کر اور مجھے پہچان کر گیٹ کھول دیا۔
''نادر بخش! سب خیریت تو ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔
''جی سر! سب خیریت ہے۔'' اس نے جواب دیا اور گیٹ بند کرنے چلا گیا۔
شامی نے پہلے تو خوب ٹوٹ کر کھانا کھایا، پھر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بولا۔ ''نواب صاحب! یہ زندگی بھی عجیب شے ہے۔ جب انسان زندگی سے مایوس ہو جاتا ہے تو وہ اس پر اچانک مہربان ہو جاتی ہے۔''
''یہ تم نے آپ جناب کب سے شروع کر دی شامی؟'' میں نے پوچھا۔ ''تم مجھ سے اس انداز میں بات تو نہیں کرتے تھے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اس وقت کے شامی بادشاہ اور اس شامی میں بہت فرق ہے نواب بھائی!" اس نے کہا پھر اس نے تفصیلاً بتانا شروع کیا۔

☆☆☆

"میں اس رات گہری نیند سو رہا تھا کہ اچانک گولی نے مجھے اٹھا دیا اور آہستہ سے بولی۔ "باہر شاید پولیس آئی ہے۔"

"پولیس!" میں جھپٹ کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنا ریوالور نکالا اور گولی کو لے کر بنگلے کی اندرونی سمت دوڑا۔

فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ بنگلے کے عقب میں بھی پولیس موجود ہوگی۔ میں نے خود کو پولیس کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

گولی نے میرے اس فیصلے کی مخالفت کی۔ اس کا خیال تھا کہ مجھے اتنی آسانی سے خود کو پولیس کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔

بنگلے کے عقب میں پرانا سا برگد کا ایک درخت تھا۔ مجھے اور تو کچھ نہیں سوجھا، میں پھرتی سے اس درخت پر چڑھ گیا اور خود کو پتوں کے درمیان چھپا لیا۔ گولی کو واپس میں نے بنگلے میں بھیج دیا۔

اس وقت کسی نے اطلاعی گھنٹی بجانے کے بجائے جاہلانہ انداز میں زور زور سے آہنی گیٹ پیٹنا شروع کر دیا۔

"کون ہے؟" مجھے گولی کی آواز سنائی دی۔

"دروازہ کھولو۔" باہر سے کوئی کرخت لہجے میں بولا۔

"لیکن تم ہو کون؟" گولی نے بھی سخت لہجے میں کہا۔

"پولیس!" باہر سے پھر وہی کرخت آواز سنائی دی۔

گولی نے دروازہ کھول دیا۔ پولیس کے چار پانچ کانسٹیبل اور ایک سب انسپکٹر دندناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔

"کیا چاہتے ہیں آپ لوگ؟" گولی نے پوچھا۔ "یہ ڈاکٹر مہدی حسن کا بنگلا ہے اور وہ ایسے آدمی نہیں ہیں کہ ان کے گھر میں پولیس اس انداز میں دھاوا بولے۔"

"ڈاکٹر صاحب موجود ہیں؟" سب انسپکٹر کا کرخت لہجہ کچھ نرم ہو گیا۔

"ڈاکٹر صاحب اپنی فیملی کے ساتھ آج کل باہر گئے ہوئے ہیں۔ میں ان کی ملازمہ ہوں۔" گولی نے بہت اعتماد سے جواب دیا۔

"ہمیں اطلاع ملی ہے کہ یہاں بدنام ڈکیت شامی بادشاہ چھپا ہوا ہے۔"

"شامی بادشاہ؟" گولی نے حیرت کی اداکا[ری] کی۔ "یہ کون ہے؟"

"یہ بہت ہی خطرناک ڈکیت ہے بی بی!" س[ب] انسپکٹر نے کہا۔

"میرے علاوہ یہاں صرف ایک بوڑھا چوکید[ار] ہے۔ وہ بھی آج چھٹی پر ہے۔ آپ چاہیں تو بنگلے کی تلاش[ی] لے لیں۔"

"تم شامی بادشاہ کو نہیں جانتیں؟"

"آپ ہی بتا رہے ہیں کہ وہ کوئی ڈکیت ہے۔ میرا[...] ڈاکٹر صاحب کا بھلا اس سے کیا تعلق؟"

"لیکن ہمیں تو اطلاع ملی تھی کہ......"

"آپ محض اطلاعات پر شریف لوگوں کے گھروں [...] دھاوا بول دیں گے؟" گولی نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ڈاک[ٹر] مہدی حسن کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ ان کی پہنچ بہت او[پر] تک ہے۔" گولی کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ "ویسے آپ چاہیں تو اس بنگلے کی تلاشی لے سکتے ہیں۔ بعد میں ڈاک[ٹر] صاحب آپ سے خود ہی نمٹ لیں گے۔"

انسپکٹر تذبذب سے گولی کو دیکھتا رہا۔ میں درخت [پر] بیٹھا ہوا سب کچھ دیکھ بھی رہا تھا اور سن بھی رہا تھا۔ گولی [نے] گیٹ پر لگے ہوئے دونوں لیمپ روشن کر دیے تھے۔

انسپکٹر اچانک اپنے ایک سپاہی کی طرف گھوما۔

"اوئے، تو تو کہہ رہا تھا کہ شامی بادشاہ یہاں چھپا ہوا ہے؟" وہ درشت لہجے میں بولا۔

"اس کے ساتھی کریمو نے اطلاع دی تھی سر!" سپاہی نے کہا۔ "اس نے بہت وثوق سے کہا تھا کہ شامی بادشاہ اس بنگلے میں چھپا ہوا ہے۔ وہ خود بھی اس سے ملاقات کر کے گ[یا] تھا۔"

"اس بنگلے میں؟" سب انسپکٹر نے پوچھا۔

"ہاں، وہ یہی بتا رہا تھا۔"

"اب وہ آئے تو اسے حوالات میں بند کر دینا۔ میں خود اس سے پوچھوں گا کہ غلط مخبری کرنے کا کیا انجام ہے۔" سب انسپکٹر گولی کی طرف گھوما۔ "مجھے اس بنگلے کی تلاشی بھی لینا ہوگی۔"

"میں تو ملازمہ ہوں جناب!" گولی نے [...] "اس سے کیا فرق پڑے گا۔ آپ شوق سے تلاشی لیں۔ [...] صاحب برا مانیں گے تو وہ خود ہی نمٹ لیں گے۔"

سب انسپکٹر بہت کائیاں تھا۔ وہ گولی کے پراع[تماد لہجے] سے مرعوب تو ہو گیا تھا لیکن اس نے پوری طرح گولی پر اعتبار نہیں کیا تھا۔

گولی نے اس وقت ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے کہا۔ "انسپکٹر صاحب! آپ کے پاس اگر سگریٹ ہو تو مجھے ایک سگریٹ دے دیں۔ مجھے سگریٹ کی شدید طلب محسوس ہو رہی ہے۔ میرے سگریٹ کمرے میں ہیں۔"

سب انسپکٹر نے اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ گولی کی طرف بڑھا کر دوسری خود بھی سلگا لی۔

میں گولی کی ذہانت پر حیرت زدہ رہ گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ پولیس والے ابھی بیڈروم کی تلاشی لیں گے۔ میرا سامان تو سرونٹ کوارٹر میں تھا لیکن میں رات میں ڈاکٹر صاحب کے بیڈروم میں ائرکنڈیشنڈ چلا کر سوتا تھا۔ بیڈروم میں ڈاکٹر صاحب کے سامان کے علاوہ صرف ایک سگریٹ کا پیکٹ ہی تھا جو میرا تھا۔ میری چپل بھی کمرے میں ہی رہ گئی تھی لیکن گولی اس کے بارے میں بھی کوئی بہانہ بنا سکتی تھی۔

پولیس والے تھوڑی دیر بعد مایوسی سے باہر نکل آئے۔

"صاحب جی! آپ کہیں تو میں سرونٹ کوارٹرز بھی کھول دوں۔" گولی نے کہا۔ "آپ وہاں کی بھی تلاشی لے لیں۔"

"سرونٹ کوارٹرز میں کون رہتا ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ وہاں ڈاکٹر صاحب کا بوڑھا چوکیدار رہتا ہے۔ اکثر گاؤں سے اس کا ایک بھتیجا بھی آ جاتا ہے لیکن اس وقت ان دونوں میں سے کوئی موجود نہیں ہے۔"

"رب نواز!" سب انسپکٹر نے کہا۔ "تم سرونٹ کوارٹر کی تلاشی بھی لے ہی لو تاکہ میں اس کریمو کی اچھی طرح خبر لے سکوں۔ میں اس کے ساتھ وہ سلوک کروں گا کہ آئندہ وہ غلط مخبری کرنا بھول جائے گا۔"

تھوڑی دیر بعد رب نواز نے آ کر بتایا کہ سرونٹ کوارٹر تو بالکل خالی ہے، ہاں ایک کمرے میں چوکیدار اور اس کے بھتیجے کا سامان ہے۔

اصل میں وہاں کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ میں ہی ایک کمرے میں رہتا تھا۔ وہاں تمام سامان میرا ہی تھا۔

"اس کے بھتیجے کا حلیہ بتاؤ؟" سب انسپکٹر نے گولی سے پوچھا۔

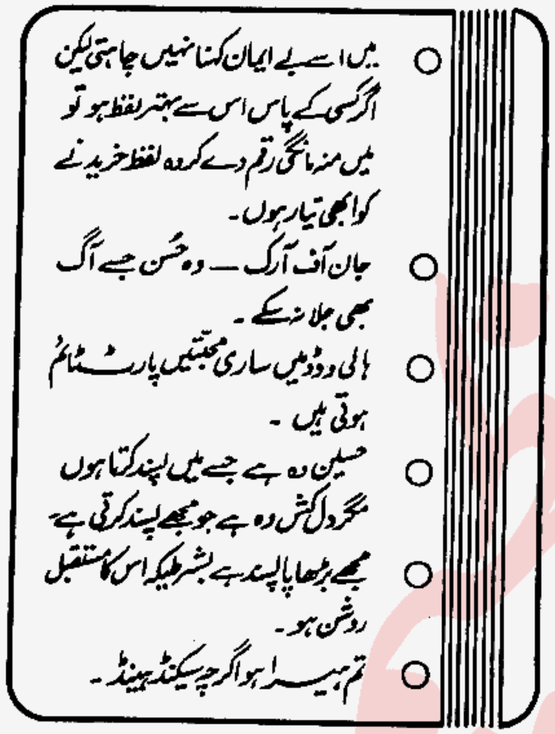

- میں اسے بے ایمان کہنا نہیں چاہتی لیکن اگر کسی کے پاس اس سے بہتر لفظ ہو تو میں منہ مانگی رقم دے کر وہ لفظ خریدنے کو ابھی تیار ہوں۔
- جان آف آرک — وہ حُسن جسے آگ بھی جلا نہ سکے۔
- ہالی ووڈ میں ساری محبتیں پارٹ ٹائم ہوتی ہیں۔
- حسین وہ ہے جسے میں پسند کرتا ہوں مگر دلکش وہ ہے جو مجھے پسند کرتی ہے۔
- مجھے بڑھاپا پسند ہے بشرطیکہ اس کا مستقبل روشن ہو۔
- تم ہیرا ہو اگرچہ سیکنڈ ہینڈ۔

"وہ پچیس، تیس سال کا آدمی ہے لیکن دیکھنے میں پچاس سال کا لگتا ہے۔ وہ شاید چرس یا ہیروئن کا عادی ہے کیونکہ وہ جب بھی آتا ہے، سارا وقت چوکیدار کے کمرے میں پڑا رہتا ہے۔ دبلا پتلا اور چھوٹے قد کا وہ آدمی مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔"

حلیہ سن کر تو سب انسپکٹر بالکل ہی مایوس ہو گیا۔ میرا حلیہ اس حلیے سے بالکل مختلف تھا جو گولی نے انسپکٹر کو بتایا تھا۔

پولیس والے مایوس ہو کر چلے گئے۔

گولی تھوڑی دیر تک انتظار کرتی رہی، پھر وہ اس درخت کی طرف آئی تو میں بھی آہستگی سے نیچے آ گیا اور اسے بتایا کہ پولیس کا کوئی آدمی یہاں چھپا ہوا ہے۔ میں نے جاتے وقت ان کی گنتی کی تھی۔ ان میں سے ایک آدمی کم تھا۔ مجھ پر لاکھوں روپے کا انعام ہے۔ پولیس یوں آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑ سکتی۔ تم واپس جاؤ، میں رات اس درخت پر ہی گزاروں گا۔

گولی کی سمجھ میں میری بات آ گئی اور وہ جس طرح دبے پاؤں آئی تھی اسی طرح دبے پاؤں لوٹ گئی۔

وہ پوری رات میں نے نیند سے لڑتے ہوئے اسی درخت پر گزار دی۔ صبح گولی باہر لان میں نکلی تو میرا شبہ درست ثابت ہوا۔ سرونٹ کوارٹر سے پولیس کا ایک سپاہی بھی باہر نکل آیا اور بولا۔ "معاف کرنا بی بی! ہم نے تم پر شبہ کیا۔ ایس آئی صاحب نے تو فضول میں میری ساری رات کالی کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دی۔ میں یہاں بیٹھا ہوا ڈیوٹی دیتا رہا کہ اگر شامی بادشاہ کسی کونے کھدرے میں چھپا ہوگا تو میدان صاف ہونے کے بعد ضرور باہر نکلے گا۔ میں نے کئی دفعہ جا کر اندر کے کمروں کا جائزہ بھی لیا لیکن یہاں تو واقعی کوئی نہیں ہے۔''

''کیا نام ہے تمہارے اس سب انسپکٹر کا؟'' گولی نے پوچھا۔

''ان کا نام اصغر چودھری ہے، سب انسپکٹر اصغر چودھری!'' سپاہی نے جواب دیا۔

''میں ابھی ڈاکٹر صاحب کو فون کرتی ہوں کہ اب پولیس قاتلوں اور ڈاکوؤں کی تلاش میں آپ کے گھر پر دھاوا بولنے لگی ہے۔ وہ بھی تلاشی کے وارنٹ کے بغیر۔''

''تم تو قانون بھی جانتی ہو۔'' سپاہی نے کہا۔

''میں ڈاکٹر صاحب کے پاس برسوں سے ملازم ہوں۔ یہ قانون تو عام آدمی بھی جانتا ہے کہ تلاشی کے وارنٹ کے بغیر کسی کے گھر میں گھسنا جرم ہے۔''

اس کے جانے کے بعد میں چند ہی منٹ میں درخت سے اترا۔ میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا لیکن میں اس وقت آرام نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے گولی سے کہا۔ ''اب یہاں سے نکلنے کی تیاری کرو۔''

''میں نے تو رات ہی میں اپنا سامان ایک بیگ میں بھر لیا تھا۔'' گولی نے کہا۔ ''مجھے تو تمہاری فکر ہے، تم ابھی کچھ دن پہلے تو لمبی بیماری سے اٹھے ہو۔''

مجھے یاد آیا کہ شامی بادشاہ تو وہیل چیئر پر تھا۔ یہ یقیناً گولی کی محبت اور محنت کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے پیروں پر دوبارہ کھڑا ہو گیا تھا۔

میں گولی کو وہاں سے لے کر چھپتا چھپاتا شاہدرہ میں اپنے ایک دوست کے مکان پر پہنچا۔ وہ بھی کسی زمانے میں میرے گروہ میں رہ چکا تھا لیکن اب شریفانہ زندگی گزار رہا تھا۔

''یار مجید!'' میں نے کہا۔ ''تو میرا ایک کام کر سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تو نے جرم کی دنیا سے اب توبہ کر لی ہے لیکن میری خاطر.....''

''تم کام بتاؤ شامی بادشاہ؟'' مجید نے کہا۔

''مجھے کہیں سے ایک گاڑی لا دے۔''

''یہ کسی زمانے میں میرے لیے بہت معمولی کام تھا۔'' مجید نے کہا۔ ''لیکن شامی بادشاہ! تمہارے مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ میں انکار نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں ابھی گاڑی لا دیتا ہوں۔''

''ایک کام اور ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم کریمو کو جانتے ہو؟''

''ہاں، اچھی طرح جانتا ہوں۔'' مجید نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''وہ بھی پہلے ہمارے ساتھ ہی ہوتا تھا پھر اس نے جب معاملات خراب دیکھے تو پولیس کا مخبر بن گیا وہ تو مجھے پرسوں بھی ملا تھا۔''

''تم کسی بہانے سے اسے یہاں بلا لو۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے اس سے بھی کچھ پرانے حساب بے باق کرنا ہیں۔''

''یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' مجید نے کہا اور اسی وقت باہر چلا گیا۔

اسے واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ گاڑی لے آیا تھا۔ گاڑی مرگلہ تھی اور بہت بہترین کنڈیشن میں تھی۔

مجید ہنس کر بولا۔ ''شامی بادشاہ! یہ تمہاری قسمت ہے۔ اس گاڑی کے ڈیش بورڈ میں ایک ریوالور اور چار پانچ ہزار روپے کا کیش بھی موجود ہے۔''

''تم اب کریمو کو کسی بہانے سے یہاں بلا لو، پھر میں یہاں سے نکلتا ہوں۔''

مجید نے گاڑی نہ جانے کہاں جا کر چھپا دی۔ پھر اس نے سیل فون پر کریمو سے رابطہ کیا اور کہا۔ ''یار کریمو! تجھے معلوم ہے کہ شامی بادشاہ آج کل کہاں ہے؟''

''یار، مجھے معلوم تو تھا لیکن وہ حرام زادہ عین وقت پر وہاں سے نکل گیا اور میرا انعام مارا گیا۔''

''میں جانتا ہوں کہ شامی بادشاہ اس وقت کہاں ہے؟'' مجید نے کہا۔ ''تو میرے پاس آجا! ہم دونوں مل کر اسے گھیر لیں گے۔ پولیس کو بلائیں گے تو وہ پھر بھاگ نکلے گا۔''

تھوڑی دیر بعد کریمو وہاں پہنچ گیا اور بولا۔ ''مجید کہاں ہے شامی بادشاہ؟ پولیس نے کل مجھے بہت ذلیل کیا ہے۔ انہوں نے اچھی خاصی چھترول بھی کی ہے۔''

''حرام زادے!'' اچانک گولی کمرے سے باہر آئی۔ ''تجھے شامی بادشاہ کی تلاش ہے؟'' گولی نے اچانک آگے بڑھ کر اس کا گلا دبوچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گھٹنے سے اس کی ناف پر وار کیا۔ کریمو لمحوں میں بے دم ہو کر اس کے ہاتھ میں جھول گیا۔

''یہ تو نے کیا، کیا؟'' مجید فکرمندی سے بولا۔ ''یہ مر گیا۔''

''اسے مر ہی جانا چاہیے تھا۔'' گولی نے بھرے لہجے میں کہا۔

''لیکن تم فکر مت کرو۔'' میں نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کی لاش بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور اسے کسی ویرانے میں پھینک دوں گا۔ تم گاڑی لے آؤ۔''

وہاں سے فرار ہو کر میں گجرات پہنچا اور وہاں اپنے ایک اور ساتھی سے کچھ قرض لے کر کراچی کے راستے دبئی نکل گیا۔

گولی میرے ساتھ تھی۔ میں نے دبئی میں کچھ دن تو محنت مزدوری کی پھر وہاں مجھے اپنے دو پرانے ساتھی مل گئے۔ ہم نے پھر وہی دھندا شروع کر دیا لیکن وہاں کی پولیس پاکستانی پولیس کی طرح کاہل اور کام چور نہیں ہے۔ ہم لوگ زیادہ دن وہ دھندا نہ کر سکے اور عمان کی طرف فرار ہو گئے۔

وہاں ہم لوگ تقریباً ایک مہینا روپوش رہے۔ پھر جس طرح غیر قانونی طور پر پاکستان سے گئے تھے اسی طرح لانچ کے ذریعے واپس بھی آ گئے۔ ''تم فکر مت کرو نواب بھائی!'' شامی بادشاہ نے کہا۔ ''اب میں آ گیا ہوں تو تمہارے ایک ایک دشمن سے نمٹ لوں گا۔ میں آج ہی اپنے دوسرے ساتھیوں کا پتا لگاتا ہوں کہ وہ کہاں ہیں؟''

''گولی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''گولی بھی مغل پورہ کے اس مکان میں ہے جہاں میں رہ رہا ہوں۔''

''تم رات میں جا کر اسے بھی لے آنا۔'' میں نے کہا۔

شامی بادشاہ کے ملنے سے مجھے بہت تقویت پہنچی تھی۔ وہ سیاست دانوں کو بھی جانتا تھا اور ان کے ہتھکنڈوں کو بھی، کئی معزز و معروف سیاست داں شامی بادشاہ سے کٹی کام لیتے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ دلاور کو بھی جانتا تھا لیکن اس کے موجودہ ٹھکانے سے واقف نہیں تھا۔

''میں ایک دن کے اندر اندر معلوم کر لوں گا نواب بھائی کہ دلاور اس وقت کس بل میں چھپا ہوا ہے؟'' شامی بادشاہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''مجھے تو زیادہ فکر نور کی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''دلاور نے اسے کوئی تکلیف نہ پہنچائی ہو؟''

''دلاور انتہائی گھٹیا اور کمینہ آدمی ہے۔'' شامی نے کہا۔ ''لیکن اس وقت وہ نور کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ آفتاب خان کی بیٹی جو تمہارے قبضے میں ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''ہاں اس نے تمہیں بارہ گھنٹے کی مہلت دی تھی نواب بھائی! اس میں اب کتنا وقت باقی ہے؟''

میں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اس میں ابھی کچھ گھنٹے باقی ہیں۔''

اچانک میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ دوسری طرف میرا گارڈ سرور تھا۔ غنی کے بعد میں سرور پر اعتماد کرتا تھا اور اسے حویلی کی حفاظت کے لیے ست بدھائی میں چھوڑ آیا تھا۔

''ہاں سرور! بولو۔''

''سر، ابھی کچھ دیر پہلے دو جیپوں میں کچھ لوگ ست بدھائی کی حدود میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ہمارے گارڈز نے انہیں ست بدھائی کی حدود میں داخل ہی نہیں ہونے دیا۔''

''بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے سرور!'' میں نے کہا۔ ''وہ لوگ پیدل بھی تو حویلی کی طرف آ سکتے ہیں۔''

''وہ لوگ ہیلی کاپٹر میں بھی آئیں گے سر تو میں انہیں مار گراؤں گا۔'' سرور نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

''ویری گڈ!'' میں نے کہا۔ ''مجھے تم سے یہی امید ہے۔ اس لیے تو میں تمہیں وہاں چھوڑ کر آیا ہوں۔''

شامی بادشاہ سیل فون لے کر بیٹھ گیا اور نہ جانے کن کن لوگوں کو فون کرنے لگا۔ میں اسے کمرے میں مصروف چھوڑ کر باہر آ گیا۔

ناصر اور راجا واپس آ چکے تھے۔

''تم لوگ کیا تیر مار آئے؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''یہ تیر، تفنگ اور تلواروں کا زمانہ نہیں ہے نواب صاحب!'' راجا نے کہا۔

''ہم لوگ صرف سیل فون ہی پر اپنے لوگوں سے رابطہ کر سکتے ہیں۔'' ناصر نے کہا۔ ''اپنی موجودہ حیثیت میں کسی سے مل نہیں سکتے۔''

''لیکن ہم سیل فون پر کام چلا سکتے ہیں۔'' راجا نے کہا۔ ''اپنے حلیے فی الحال بدلنا مناسب نہیں ہے۔ دلاور اگر پاکستان میں ہے تو اس نے اپنی ساری توجہ ست بدھائی اور ہماری طرف کر رکھی ہوگی۔ اسے ہم میں سے کسی پر شبہ بھی ہو گیا تو وہ ہماری بو سونگھتا ہوا یہاں تک پہنچ سکتا ہے۔'' پھر راجا چونک کر بولا۔ ''فیکے پتر! تو کمرے میں کس سے باتیں کر رہا تھا، کیا اندر ٹی وی چل رہا ہے آواز تو اب بھی آ رہی ہے؟''

''اندر میرا ایک پرانا دوست ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو دیکھے گا تو خوش ہو جائے گا۔ موجودہ حالات میں وہ ہمارے بہت کام آ سکتا ہے۔ وہ ان تمام سیاست دانوں اور جاگیرداروں کی رگ رگ سے واقف ہے۔''

''ایسا تیرا کون سا دوست ہے؟'' راجا نے کہا۔ ''تو نے اب تک اسے کہاں چھپا رکھا تھا؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''سر! یہ نہایت خطرناک آدمی ہے۔ پولیس کے بڑے بڑے افسران اور اعلیٰ بیوروکریٹس اس کے نام سے آج بھی دہشت زدہ ہوجاتے ہیں۔ آخری بار پولیس نے اس کی تلاش میں چھاپہ مارا تھا تو یہ وہاں موجود نہیں تھا۔ پولیس کا خیال ہے کہ شامی مر چکا ہے اور اس کا گروہ منتشر ہوگیا ہے۔''

''تم اس کے بارے میں اتنی معلومات کیسے رکھتے ہو ناصر؟''

''سر! آپ بھول جاتے ہیں کہ میں نے اب تک صرف اور صرف کرائم رپورٹنگ کی ہے۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''ایک زمانے میں شامی بادشاہ پورے پنجاب خاص طور پر مرکزی پنجاب میں دہشت کی علامت تھا۔ اس کی پشت پر دو تین صوبائی وزیر تھے۔ شامی کے تعلقات اس زمانے میں رانا سے بھی تھے۔''

''ہاں، شامی ہی نے ایک موقعے پر میری اور رانا کی ملاقات کرانے کا بندوبست کیا تھا۔ وہ تو عین وقت پر رانا نہیں پہنچا ورنہ آج حالات یہ نہ ہوتے۔'' میں نے کہا۔ ''میں......''

میرا جملہ ادھورا رہ گیا تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ اسکرین پر سرور کا نام تھا۔

میں نے فوراً ہی کال ریسیو کرلی۔ ''ہاں سرور!''

''سر ابھی کچھ نامعلوم آدمیوں نے حویلی میں داخلے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے داخلے کے لیے حویلی کا عقبی حصہ استعمال کیا تھا لیکن ہمارے گارڈز نے انہیں بھون کر رکھ دیا۔ ان کی لاشیں حویلی کے اندر اور باہر پڑی ہیں۔''

''یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی پانچ منٹ پہلے ہی سب کچھ ہوا ہے۔'' سرور نے بتایا۔

''تم فکر مت کرو۔ صوبیدار میجر صاحب سے کہو کہ وہ مجھ سے بات کریں۔ وہ خود ہی پولیس میں رپورٹ بھی درج کرادیں گے۔''

''او کے سر!'' سرور نے کہا۔

''او کے۔'' میں نے جواب میں کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔

رابطہ منقطع کرتے ہی سیل فون کی گھنٹی پھر بجی۔ اس مرتبہ اسکرین پر صوبیدار میجر صاحب کا نام تھا۔

اسی وقت شامی بادشاہ باہر نکل آیا۔

اسے دیکھ کر راجا کھل اٹھا۔ ''ارے شامی بادشاہ!'' وہ والہانہ انداز میں اس سے لپٹ گیا۔ ''تم کہاں چلے گئے تھے؟''

''میں تو اسی دنیا میں ہوں راجا صاحب!'' شامی مسکرا کر بولا۔ ''آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ شاید شامی بادشاہ کہیں مر کھپ گیا۔''

''شامی بادشاہ اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے تو موت سے پنجہ آزمائی کر کے اسے بھی مات دے دی تھی۔ اس وقت جب ہمیں تمہاری موت کا یقین ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی کوئی تو تمہاری موت کا یقین نہیں تھا۔''

''میں اگر اب سچ مچ مر جاؤں تو بھی اسے یقین نہیں آئے گا۔'' شامی بادشاہ نے کہا۔ ''وہ میرے لیے اتنی ہی دیوانی ہے۔'' پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''میں نے ابھی دلاور کے دو ٹھکانوں کے بارے میں معلوم کیا ہے۔''

''تم نے یہاں بیٹھے بیٹھے معلوم کرلیا؟'' راجا نے حیرت سے کہا۔

''راجا صاحب! میری پوری عمر ان ہی راستوں پر چلتے ہوئے گزری ہے۔ میں پاکستان سے باہر ضرور تھا لیکن اس دوران میں یہاں کوئی انقلاب نہیں آیا ہے۔ لوگ بھی وہی ہیں، ان کی سوچ بھی وہی ہے اور ان کی ذہنیت بھی وہی ہے۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''میں ذرا ان دونوں ٹھکانوں کے بارے میں کنفرم کرلوں، پھر کوئی ایکشن لوں گا۔'' پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''نواب بھائی! اگر اعتراض نہ ہو تو میں کچھ دیر آرام کرلوں۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔''

''واہ شامی بادشاہ! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، میں ابھی تمہارے آرام کا بندوبست کیے دیتا ہوں۔''

میں نے غنی کو بلا کر کہا کہ شامی بادشاہ کو اوپر کے بیڈ روم میں لے جاؤ۔

غنی بھی اسے دیکھ کر خوش ہوگیا اور بولا۔ ''تم کب آئے، شامی؟'' وہ اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولا۔

''میں آج ہی آیا ہوں۔'' شامی نے کہا اور غنی کے ساتھ بالائی منزل پر چلا گیا۔

''آپ شامی بادشاہ کو کیسے جانتے ہیں؟'' ناصر نے پوچھا۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے ناصر!'' میں نے کہا۔ ''کبھی فرصت سے سناؤں گا۔''

یہ پر پیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

اچھی یادیں بھی اندھیروں میں ہمیشہ اجالوں کے مانند ساتھ رہتی ہیں... بدقسمتی سے جب اندھیرا گہرا ہو جائے تو ایک انجانی سی کسک بے شمار سوالات اپنے دامن میں چھپائے ساتھ ساتھ چل رہی ہوتی ہے جن کے جوابات کسی بھی ناکام انسان کے پاس ممکن نہیں... اور اگر ناکامی شرمندگی میں ڈھل جائے تو پچھتاوے کی جلن کسی کل چین نہیں لینے دیتی۔

ٹھکرائے ہوئے لوگوں کی قدردانی کا ایک دلچسپ انداز

سوئے دار

ثمر عباس

گلی میں داخل ہوتے ہی اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں۔ اس کا دل اس تیزی سے دھڑک رہا تھا گویا وہ ابھی پسلیوں کو توڑ کر اس کے قدموں میں آگرے گا۔ اس کے جسم میں ہلکی سی لرزش اور قدموں کی لڑکھڑاہٹ نمایاں تھی۔ اس گلی میں داخل ہوتے ہی گویا اسے خود پر قابو رکھنا مشکل ہوگیا تھا۔

گھر کے دروازے میں داخل ہوتے وقت البتہ اس کے دل میں مختلف کیفیات کے انبوہ کے ساتھ خوشی بھی لہریں لے رہی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی برآمدے میں کھڑی آپا جی نے دوڑ کر اسے سینے سے لگایا تو وہ کسی چھوٹی بچی کی مانند بلک بلک کر رو دی اور امی سے تو وہ دیر تک چمٹی رہی۔

کچھ عرصہ پہلے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اپنے ہی گھر میں ایک دن چوروں کی طرح داخل ہوگی۔ اس گھر میں، جہاں وہ ممتا کے دلکش نغمے سن کر جوان ہوئی تھی۔ جہاں ابو نے اسے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے کا سبق سکھایا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ سبق کچھ اور ہوتے ہیں اور حقائق کچھ اور......!

اسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کی زندگی میں کبھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایسے لمحے بھی آئیں گے جب وہ ابو جی کی نظروں سے بچتی، بچاتی اس گھر میں داخل ہوگی جو کسی زمانے میں چند گھنٹے بھی سیماب کی صورت نہ دیکھ پاتے تو بے چین ہوجاتے تھے۔ وہ چند گھنٹے ان کی ڈیوٹی کے ہوتے تھے ورنہ شاید وہ انہیں اپنی زندگی سے ہی نکال دیتے۔ دفتر سے آتے ہی وہ سیماب کو یوں گود میں اٹھاتے گویا برسوں کی جدائی کے بعد اسے دیکھا ہو۔ چند لمحوں میں کیے جانے والے بعض فیصلے اتنے سنگین ہوتے ہیں کہ برسوں کے معمولات بدل کر رکھ دیتے ہیں، محبت کو نفرت میں تبدیل کردیتے ہیں۔ دلوں کو پتھر بنا دیتے ہیں اور انسانوں کو بے حس مجسمے۔ ایسا ہی ایک فیصلہ کچھ عرصہ پہلے سیماب نے بھی کیا تھا لو میرج کر کے۔

اس کی امی اور آپا جی کی نظر میں تو اس کا یہ اقدام اگر اچھا نہیں تھا تو بہت برا بھی نہیں تھا لیکن ابو کی وضع داری کو خاندان میں ایسی ٹھیس لگی تھی کہ انہوں نے زندگی بھر سیماب کی صورت نہ دیکھنے کی قسم کھالی۔ تین سال سیماب نے اپنے گھر کے کسی فرد سے ملے بغیر گزار دیے اور آج جب وہ ابو جی کی عدم موجودگی میں امی اور آپا جی کے بلاوے پر چوری چھپے ان سے ملنے آئی تو ابو کی نفرت کے تصور سے اس کا دل خون ہورہا تھا۔ تین سال میں ایک تبدیلی یہ بھی آئی تھی کہ آپا جی، جن کی شادی اس کے سامنے ہوئی تھی، ان کی گود میں ایک بڑا پیارا گول مٹول سا بچہ ہمک رہا تھا۔

قدرت نے کوئی بھی چیز ہم دونوں بہنوں کو یکساں عطا نہیں کی۔ سیماب نے دل ہی دل میں سوچا۔ آپا جی کو ممتا نچھاور کرنے کے لیے قدرت نے دوسرا بچہ بھی دے دیا تھا اور سیماب کی گود ابھی تک ویران تھی۔ آپا جی بچپن ہی سے بڑی فرماں بردار اور خاموش طبع تھیں اور سیماب کے مزاج میں شروع ہی سے سرکشی اور شوخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

طبیعت اور شخصیت کے تضاد نے دونوں کی زندگی کی راہیں بھی جدا کردی تھیں۔ آپا جی کی شادی والدین کی مرضی سے ہوئی اور وہ ہنسی خوشی باجے گاجے، برات اور دیگر ہنگاموں کے ساتھ رخصت ہوئیں۔ چنانچہ وہ جب چاہتیں بڑی شان سے سر اونچا کر کے میکے آتی تھیں۔ سیماب نے اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ خود کیا تھا، اس لیے وہ آج چوری چھپے میکے آئی تھی۔ وہ اپنے گھر کے ایک ایک گوشے میں گھومی، ایک ایک چیز کو معصومانہ حسرت سے چھو کر دیکھا۔ باغیچے میں جامن کا وہ ننھا سا پودا جو اس نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا، تناور درخت بن چکا تھا۔

شام کو باغیچے میں پتھر کی بینچ پر بیٹھے بیٹھے اس کے ذہن کے ملگجے افق پر کتنی ہی یادیں جھلملا اٹھیں۔ اس کے کان میں ایک سرگوشی سی ابھری۔ یہ دانش کی آواز تھی۔

’’چاہت ایک دلچسپ سپنا ہوتی ہے سیماب! نیند آنکھیں بھلا سکتی ہیں مگر اس کا سرور زندگی بھر ہماری نس نس میں بسا رہتا ہے۔ چاہت کے جو چراغ ہم آج جلا رہے ہیں۔ شاید لمحوں کی تیز و تند آندھیوں میں بجھ جائیں مگر یہ وہ چراغ ہیں جن کی روشنی بجھنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتی۔ صدیوں بعد بھی ملاقات ہوگی تو اسی غیر مرئی روشنی کی بدولت ہم ایک دوسرے کو پہچانیں گے اور پھر صدیوں کے فاصلے سمٹ کر رہ جائیں گے اور ہم سوچیں گے کہ محبت ایک ایسا سحر ہے جو درحقیقت زندگی کے ہر موڑ پر ہمارے ساتھ رہتا ہے۔‘‘

آج صدیوں کے فاصلے سمٹ گئے تھے اور پتھر کی بینچ پر بیٹھی سیماب یہی محسوس کررہی تھی جیسے یہ سب کل کی باتیں ہوں، شام گزشتہ کا قصہ ہو اور آج جب دانش سے اس کی راہیں جدا ہوئے مدت گزر گئی تھی تو وہ بڑے دکھ سے سوچ رہی تھی کہ آخر صدیوں کے فاصلوں کا سمٹنا کیا ضروری ہے؟ کیوں یہ یادیں دل کے زخم کھرچنے چلی آتی ہیں؟

کل ہی کی تو بات تھی کہ دانش تعلیم کے سلسلے میں ان کے ہاں آکر ٹھہرا تھا اور اس کی قربت میں تھوڑا سا عرصہ گزرتے ہی سیماب کو محسوس ہوا کہ بعض راہوں پر نہ چاہتے ہوئے بھی قدم اٹھنے لگتے ہیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی دھڑکنوں میں سماتے گئے لیکن دانش کو شدت سے احساس تھا کہ وہ اپنی کم مائیگی کے سبب سیماب کو اپنا نہیں سکے گا۔ وہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں بسنے والے ایک چھوٹے سے گھرانے کا فرد تھا، جس کا مستقبل بظاہر زیادہ روشن بھی نہیں تھا۔ سیماب خوابوں میں رہنے والی لڑکی تھی لیکن دانش کو حقائق کی سنگینی کا ہمہ وقت احساس رہتا تھا۔

ایک بار اس نے کہا تھا۔ ’’سیماب! محبت ایک نشہ ہوتی ہے جس میں ڈوب کر ہر چیز خوبصورت لگتی ہے۔ محبوب کی ہر ادا حسین لگتی ہے۔ شادی کے بعد جب خوابوں کے شیش محل حقائق کی سنگینی سے ٹکرا کر بکھرنے لگتے ہیں تو احساسات لہولہو ہوجاتے ہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو سیماب! تم نے آسائشوں میں پرورش پائی ہے۔ ہمارے گھر میں داخل ہوکر شاید تمہیں سانس لینا بھی مشکل محسوس ہو۔ آؤ، محبت کی آگ میں جل جانے سے پہلے ہم ایک بار پھر سوچ لیں کہ جس راہ کا ہم نے انتخاب کیا ہے وہ ہمیں کس منزل پر پہنچائے گی۔‘‘

دانش کی یہ صاف گوئی اسے کچھ اچھی نہیں لگی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس نے جواب میں کیا کہا تھا۔ ’’دانش! محبت

ضی کا کوئی اصول نہیں جس میں تم جمع، تفریق میں الجھے ہو۔ محبت تو جنون کا نام ہے، خرد سے اس کا کیا تعلق؟ مجھے تم سے پیار ہے نا، اس لیے تمہاری ہر چیز سے پیار ہے۔ تمہاری غربت سے بھی اور تمہارے گاؤں سے بھی۔‘‘

اور دانش نے اس بحث میں ہار مان لی۔

وہ سوچا کرتی تھی، محبت زندگی کو کتنا دلکش بنا دیتی ہے، لیکن یہ دلکشی زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوئی۔ کالج میں چار سال گزارنے کے بعد یونیورسٹی جاتے ہی سیماب کو احساس ہوا کہ سوشل اسٹیٹس بہرحال زندگی کے اہم عناصر میں سے ایک ہے...... چاہے انسان کتنا ہی پڑھ لکھ جائے، بالغ نظر ہوجائے، درویشی کی افادیت اور جھوٹے معیار زندگی کی مخالفت میں کتنے ہی لیکچر جھاڑ لے، مگر اپنے دل کی تہہ سے بہرحال وہ سوشل اسٹیٹس کی اہمیت کو کھرچ نہیں سکتا۔

صنم نے بڑے فخر سے سہیلیوں کے جمگھٹے میں کہا تھا۔ ’’میرے منگیتر عنقریب کینیڈا سے انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کر کے آنے والے ہیں۔ ہر آنے جانے والے کے ہاتھ مجھے اتنے قیمتی پریزنٹس بھیجتے ہیں کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔‘‘

فضیلہ کے بارے میں بھی وہ جانتی تھی کہ اس سے ایک صاحب شادی کی آس لگائے بیٹھے ہیں جو کسی بہت بڑی فرم کے مالک ہیں اور ہر سال گاڑی بدلتے ہیں۔ انیلا کو اس کا جو کزن اسکوٹر پر یونیورسٹی چھوڑنے آتا تھا، اس کے متعلق بھی سیماب کو معلوم تھا کہ وہ عنقریب ایم بی بی ایس کر کے ڈاکٹر بننے والا ہے اور ڈاکٹر بننے کا مطلب بھی وہ بخوبی جانتی تھی۔

ان سب سہیلیوں کے چہروں پر رقص کرتی مسرت کی چمک دیکھ کر وہ حیرت سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے سوچا کرتی تھی کہ وہ کیسے کسی کو بتا سکتی ہے کہ اس کا محبوب ایک مزارع کا بیٹا ہے جو فلاسفی میں ایم اے کرنا چاہتا ہے۔

نئے خیالات پرانے خیالات کو نگل جاتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ حالات تھے جنہوں نے سیماب کے تصورات کے صنم کدوں میں موجود پرانے بت پاش پاش کردیے اور ان کی جگہ خواہشوں، خوابوں اور امنگوں کے نئے بت ایستادہ کردیے۔ یہ نئے بت بے حد دلکش، چمکیلے اور قدآور تھے۔ وہ ان سے مسحور ہوکر رہ گئی۔

شہزاد ان کا دور کا رشتے دار تھا۔ اس کے والد ایک میڈیسن کمپنی کے مالک تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ جوں جوں شہزاد کی آمدورفت ان کے گھر بڑھتی گئی توں توں سیماب کے ابو کی اس کے بارے میں رائے خراب ہوتی چلی گئی۔ وہ اسے اچھا لڑکا نہیں سمجھتے تھے لیکن جوں جوں دن

گزرتے گئے وہ نہ جانے کس طرح سیماب کے قریب آتا چلا گیا۔ اتنا قریب کہ دانش کا تصور پس منظر میں چلا گیا اور پھر دھیرے دھیرے دھندلانے لگا۔

وہ بڑے فخر سے شہزاد کی مرسیڈیز میں بیٹھ کر کالج سے آتی۔ تاریک چشمہ لگائے، بھورے بال ماتھے پر بکھرائے، سرخ و سپید چہرے سے کبھی کبھی پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پونچھتے ہوئے شہزاد، خوابوں کا شہزادہ ہی لگتا تھا۔ لمبی سی نئی کار جب یونیورسٹی کی روش پر رینگتی ہوئی آگے بڑھتی تو سیماب کو احساس ہوتا کہ کئی لڑکیاں حسرت سے اس کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ تب اس کے انداز میں غیر ارادی طور پر ایک امیرانہ سی تمکنت اور گردن میں ایک خفیف سا تناؤ آجاتا اور اسے یاد بھی نہ رہتا کہ کل دانش لان میں پورا ڈیڑھ گھنٹا اس کا انتظار کرتا رہا تھا۔ وہ اس سے ملنے ضرور گئی تھی، لیکن بمشکل ایک آدھ منٹ اکھڑے اکھڑے انداز میں باتیں کر کے اور پھر سر درد کا بہانہ بنا کر اپنے کمرے میں لوٹ آئی تھی۔

لمحے پر لگا کر اڑتے رہے۔ اسے خود بھی احساس نہ ہوسکا کہ وہ دانش سے راہ بدل کر کتنی دور چلی آئی ہے۔ اسے ایک مرتبہ بھی خیال نہ آیا کہ دانش سے کم از کم اتنا ہی پوچھ لے کہ تم اتنے کھوئے کھوئے سے کیوں رہتے ہو؟ مگر وہ اس سے کچھ بھی نہ پوچھ سکی۔ پوچھتی بھی کیسے، مجرم تو وہ خود تھی۔

وہ ایک بھیگی بھیگی سی شام تھی۔ سیماب لان میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی کہ دانش آیا اور خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ سیماب نے نظر اٹھائی اور صرف اتنا ہی دیکھ سکی کہ دانش کی آنکھوں میں گلابی ڈورے پھیلے ہوئے تھے۔ دانش کی چبھتی ہوئی نظروں کا اسے احساس تھا مگر وہ بدستور سر جھکائے اخبار کی طرف متوجہ رہی۔

’’سیماب!‘‘ آخرکار دانش کی سرگوشی ابھری۔ ’’مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تمہاری سوچ بالکل نوخیز اور نوعمر اسکول گرلز کی سی ہوگی جو ہر چمکتی چیز سے عموماً متاثر ہوجاتی ہیں۔‘‘

’’دانش!‘‘ سیماب نے یک لخت سر اٹھا کر نہایت نپے تلے لہجے میں کہا۔ ’’دراصل میں نے اب تمہارے فلسفے کو سمجھ لیا ہے اور وہ محض فلسفہ نہیں، زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے۔ میں نے واقعی آسائشوں میں پرورش پائی ہے، ہمیشہ آگے جانے کے خواب دیکھے ہیں...... تمہارا یہ کہنا درست تھا کہ تمہارے چھوٹے سے دیہاتی مکان میں داخل ہوکر مجھے دھوئیں اور اُپلوں کی بُو میں سانس لینے میں بھی دقت پیش آئے گی...... اور مجھے معلوم ہے کہ تم اس قابل کبھی نہیں ہوسکو گے کہ شہر میں رہ سکو اور ایک آئیڈیل قسم کی زندگی گزار سکو۔‘‘

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''لیکن یہ فیصلہ کرنے میں تم نے بہت دیر لگائی سیماب!'' دانش نے مجروح لہجے میں کہا۔ ''تم نے شاید یہ نہیں سوچا کہ کوئی تمہارا ہاتھ تھام کر انجانی راہوں پر اتنا آگے آچکا ہے کہ واپسی کا تصور بھی اس کے لیے محال ہے۔''

''یادوں کو بھلانا کچھ مشکل نہیں۔'' سیماب نے اخبار پر نظریں جما کر کہا۔

''یہ تم کہہ رہی ہو سیماب؟'' دانش کے لہجے میں حیرت تھی۔

سیماب خاموش رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا، یا اس نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ چند لمحے تک اعصاب شکن سکوت طاری رہا پھر دانش اٹھ کر چل دیا۔ اس کے کندھے ہارے ہوئے جواری کی طرح جھکے ہوئے تھے۔

اس وقت تو سیماب نے بے دردی سے کہہ دیا تھا کہ یادوں کو بھلانا کچھ مشکل نہیں لیکن آج شام، ان گزرے ہوئے لمحوں کو یاد کر کے اس کے دل میں ہوک سی اٹھی، کوئی چوٹ ابھری، کوئی درد جاگا۔ بڑے دکھ سے اس نے سوچا کہ یادوں کو بھلانا کس قدر مشکل ہے۔ یادیں تو وقت کی راکھ میں دفن ہو کر بھی زندہ رہتی ہیں۔ یہ یادیں اس لیے اسے بھی ڈس رہی تھیں کہ تین سالہ ازدواجی زندگی نے اسے کچھ نہیں دیا تھا، البتہ یہ احساس ضرور دلایا تھا کہ شہزاد کا انتخاب کر کے اس نے کچھ اچھا نہیں کیا تھا۔ پیار محبت، گھریلو سکون یا اولاد، کچھ بھی تو اس کے پاس نہیں تھا۔ سوائے دولت کے، جو اسے ذرا سا بھی سکون نہیں دے سکی تھی۔

شادی سے پہلے وہ شہزاد کو پارٹیوں میں اور یونیورسٹی میں لڑکیوں کے درمیان گھرا دیکھ کر سوچا کرتی تھی کہ وہ بڑا ایڈونچس لڑکا ہے اور اس پر وہ خوش ہوا کرتی تھی مگر شادی کے بعد جب شہزاد خود اسے اپنے ساتھ تقریبات میں لے جانے لگا تو وہ بات بات پر کڑھنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ مسز خورشید کی سانولی لڑکی شہزاد کو دیوانہ وار چاہتی ہے اور شہزاد خود روز بروز انیس احمد خان کی لڑکی سے قریب ہونے کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ مسز نسیم اگرچہ شادی شدہ ہیں لیکن شہزاد کے سامنے کنواری لڑکیوں سے زیادہ شرمانے لجانے کی ایکٹنگ کرتی ہیں۔

یہ سب باتیں سیماب کی برداشت سے باہر تھیں لیکن ایک سال تک وہ احساس کے جہنم میں سلگتی رہی اور ایک سال بعد جب شہزاد کی وہ محنت رنگ لے آئی جو وہ انیس احمد خان کی لڑکی کے حصول کے لیے کر رہا تھا تو اس کی نظروں میں سیماب کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ آج وہ ایک ایسے مقام پر کھڑی تھی جہاں سے نہ پیچھے لوٹ سکتی تھی اور نہ آگے بڑھنے کی اس میں ہمت تھی۔

آٹھ دن اس نے امی، آپا جی اور دوسرے بھائی بہنوں کے درمیان یوں گزار دیے جیسے کوئی سہانا سپنا دیکھ رہی ہو۔ نویں دن اس کے ابو دورے سے واپس آنے والے تھے۔ اس لیے اس نے اپنا سامان سوٹ کیس میں ڈالا اور چلنے کی تیاری کرنے لگی۔ چھوٹے بھائی بہن اپنی معصوم آنکھوں میں سوال لیے اس کے اردگرد کھڑے تھے۔ ان کی آنکھیں پوچھ رہی تھیں۔ ''باجی! تم اتنے دن بعد تو آئی ہو اتنی جلدی کیوں جا رہی ہو؟''

ان کی امی انہیں سمجھانے لگیں۔ ''دیکھو بچو! اپنے ابو کے سامنے سیماب کے آنے کا بالکل ذکر نہ کرنا۔ اچھا..... ورنہ میں سب کا جیب خرچ بند کر دوں گی۔''

سیماب کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس نے ایک ایک کو گلے لگایا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سب کو سینے میں چھپا لے مگر اسے تو یہاں سے جانا تھا۔ ابو کے آنے سے پہلے وہ اپنے دل پر صبر کی وزنی سل رکھ کر وہاں سے رخصت ہو گئی۔

جب سیماب اپنے گھر پہنچی تو بڑا عجیب حادثہ ہوا۔ شہزاد اس وقت انیس احمد خان کی لڑکی فیروزہ کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ سیماب نے انہیں ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا تو اس کے ذہن میں ایک آندھی سی چل پڑی۔ اس کی رگوں میں لہو کی جگہ گویا دہکتا ہوا لاوا ابلنے لگا۔ اس نے بہ مشکل خود پر قابو رکھا اور کچھ کہے بغیر الٹے قدموں اپنے کمرے میں لوٹ آئی اور نڈھال سی ہو کر بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔ پچھتاووں کے کانٹوں سے گویا اس کی روح تک تار تار ہو رہی تھی۔ اسے شدت سے احساس زیاں ستانے لگا۔

شہزاد اس کے پیچھے پیچھے آیا اور آتے ہی بے حد تلخ لہجے میں بولا۔ ''ایٹی کیٹس تو تمہیں ذرا نہیں آتے۔ گھر میں آئے مہمان سے سلام نہ دعا، آئیں اور منہ پھلا کر لیٹ گئیں۔ تمہاری یہ نخرے بازیاں میرے لیے ناقابل برداشت ہیں۔''

ایک تو سیماب پر افسردگی، تھکن اور احساس زیاں طاری تھا۔ اس پر شہزاد کا یہ اہانت آمیز اندازِ گفتگو۔ وہ بپھر ہی تو گئی۔ مدتوں سے پکتا ہوا لاوا آخر کار ابل پڑا۔

''کان کھول کر سن لیجیے۔ میرے لیے ایسے مہمانوں کا وجود ناقابل برداشت ہے۔ میرے جاتے ہی ان مہمانوں نے گھر میں بھی ڈیرے ڈالنے شروع کر دیے۔'' اس نے پہلی مرتبہ اتنے سخت لہجے میں شہزاد سے بات کی تھی۔

''آہستہ بات کرو۔ وہ سن رہی ہوگی۔'' شہزاد دانت پیس کر غرّایا۔

''میں کسی سے نہیں ڈرتی جو آہستہ بات کروں۔ وہ سنتی ہے تو سنا کرے..... یہ میرا گھر ہے اور اگر آپ ایسی ہی باتوں سے یہ گھر آباد کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ کی نظروں سے دور ہو جاؤں گی۔'' سیماب کی آواز بھرا گئی۔ اسی شہزاد سے کتنا مان تھا اور اسی مان سے اس نے آخری جملہ کہا تھا۔ اسے امید تھی کہ ان الفاظ پر شہزاد کا رول بدل جائے گا۔

لیکن اس وقت اس کے بچے کھچے اعتماد کی بھی دھجیاں بکھر گئیں جب شہزاد نے غرّا کر کہا۔ ''ٹھیک ہے..... ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ میرے سامنے نہ رہو۔''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا لیکن اگلے دن اس وقت وہ سن ہو کر رہ گئی جب نوکر نے اسے ایک لفافہ لا کر دیا۔ شہزاد نے لفافہ آفس سے بھیجا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل سے لفافہ کھولا۔ لفافے سے برآمد ہونے والا طلاق نامہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ ساتھ ایک چٹ پر شہزاد نے لکھا تھا کہ حق مہر کا چیک اس کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیا گیا ہے اور باقی ضابطے کی کارروائی اس کا وکیل پوری کرے گا۔ وہ چاہے تو اپنے گھر جا سکتی ہے۔

سیماب کو گمان بھی نہ تھا کہ شہزاد اتنی جلد اتنا اہم فیصلہ کر لے گا لیکن آج اسے شہزاد کی کافی عرصہ پہلے کہی ہوئی ایک بات یاد آ گئی۔ اس نے کہا تھا۔ ''کامیاب بزنس مین وہ ہے جو فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگاتا ہو'' اور شہزاد اپنے باپ کا جانشین بن چکا تھا یعنی ایک کامیاب بزنس مین!

سیماب نے بیڈ سائڈ ٹیبل پر سر رکھ کر کلائی کے حلقے میں منہ چھپا لیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلتا گیا اور اسے کوئی ہوش نہ رہا۔ تاریکیاں چھٹیں تو اگلا دن چڑھ چکا تھا۔ ایک ملازمہ اسے ہوش میں لائی تھی۔ شہزاد کا کہیں کچھ پتا نہ تھا۔ ہارے ہوئے دل کے ساتھ اس نے اپنا سامان جمع کیا، چیک بک پرس میں ڈالی اور ٹیکسی منگوا کر اس گھر کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ کر ایک انجانی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

چند دن سیماب نے وائی ایم سی اے ہوسٹل میں گزارے۔ پھر ایک متوسط علاقے میں چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ دنیا میں اب کسی سے بھی ملنے کی خواہش نہیں رہی تھی۔ وہ کسی کو منہ دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے آپ سے بھی شرمندہ تھی۔ اپنے دل میں ہولناک سناٹے لیے، اپنے سینے میں اپنی انا کی توہین کا گہرا گھاؤ چھپائے اس نے زندگی کا شیرازہ از سر نو سمیٹنا شروع کیا۔

اس کے اکاؤنٹ میں معقول رقم جمع تھی۔ اس نے ریڈی میڈ گارمنٹس کا کام شروع کیا۔ اس میں اس کی آدھی سے زیادہ پونجی ڈوب گئی اور تین کارکن لڑکیوں نے لیبر کورٹ میں اس پر مقدمہ کر دیا۔ جسے بھگتتے ہوئے اس نے ڈرتے ڈرتے، بہت دیکھ بھال کر چھوٹے پیمانے پر کاسمیٹکس کے چند ایک آئٹم تیار کرنے والی چھوٹی سی فرم میں حصہ ڈالا۔ اس مرتبہ بچی کھچی پونجی بھی گنوا دی اور اسے یقین آ گیا کہ وہ ہرگز کوئی بزنس وومن نہیں ہے۔ کاروبار اس کے بس کی بات نہیں۔

دل کچھ اور بجھ گیا اور اس نے ایک چھوٹے سے اسکول میں نوکری کر لی۔ بچوں کو پڑھانے میں اس کا جی بہلنے لگا تاہم اندر کا سناٹا بدستور بڑھتا رہا۔ وقت تھا کہ سرکش پنچھی کی طرح ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ تین برس گزر چکے تھے، تین برس بظاہر کوئی لمبی مدت نہیں لیکن سیماب کو یہ تین صدیوں سے زیادہ طویل محسوس ہوئے تھے۔ اس کے چہرے کی سرخی غائب ہو چکی تھی۔ صرف سپیدی باقی رہ گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہی نمودار ہو چکی تھی۔ بے رس ہونٹ، خشک پٹ سن جیسے بال، اجڑے اجڑے رخسار اور سونی سونی آنکھیں۔ سینے میں دل کی جگہ جو ایک ہولناک سا خلا رہ گیا تھا وہ گویا حسرتوں کے خون سے بھر گیا تھا۔ روح کی تھکن کچھ اور بڑھ گئی۔

اس روز اس کے اسکول میں بہت بڑی تقریب تھی۔ اسکول کے مالکان اور پرنسپل نے اس تقریب کو یادگار بنانے کے لیے دن رات ایک کر دیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر مہمان خصوصی تھے۔ صبح اسکول کے گراؤنڈ میں ڈی سی صاحب کا استقبال کرنے کے لیے اسٹاف کے دیگر ارکان کے ساتھ سیماب بھی موجود تھی۔ مقررہ وقت پر، یعنی ٹھیک گیارہ بجے سرکاری جیپ اسکول کے گیٹ میں داخل ہوئی اور وہ سب لپک کر اس کی طرف بڑھے۔ سیماب بھی سرد مہری سے ان کے ساتھ چل رہی تھی۔ اسے دنیاداری کے کسی بھی ہنگامے سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ وہ تو بس بے دلی سے زندگی کا قرض چکا رہی تھی۔

جیپ سے جو دراز قد شخص مسکراتے ہوئے اترا، اسے دیکھ کر سیماب بت بن گئی۔ وہ نفیس تراش کا آسمانی رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے اور آنکھوں پر نظر کی عینک لگی ہوئی تھی۔ یہ دانش تھا، وہی دانش..... ٹوٹا پھوٹا سا، جسے سیماب زندگی کی راہ پر بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

اس کی روح شاید آسمان اور زمین کے درمیان کہیں معلق ہو کر رہ گئی تھی کیونکہ جب اسٹاف سے باری باری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

متعارف کراتے ہوئے دانش نے اس کی طرف دیکھا تو سیماب ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ دانش کے ہونٹوں سے بھی رسمی سی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

''سیماب! تم.....؟'' اس کے لہجے میں برسوں کی حیرت، تحیر اور تاسف سمٹ آیا تھا۔ ''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

اس سوال کا جواب سیماب نے اس وقت دیا جب فنکشن کے اختتام پر سہ پہر کو اس کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر اس کے گھر جا رہی تھی۔ اس کی زندگی کی کہانی پر دانش نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اسے بتانے لگا۔

''تم نے جب میرا ہاتھ جھٹکا تو اصولی طور پر مجھے شکستہ دل ہو جانا چاہیے تھا اور میں ہو بھی گیا تھا..... مگر بہت تھوڑے عرصے کے لیے۔ پھر جیسے میری روح میرے لیے ایک حیات نو کا پیغام لے کر اٹھی۔ میں نے بہت محنت کی۔ یونیورسٹی میں گولڈ میڈل لیا، اسکالرشپ پر باہر گیا اور واپس آ کر مقابلے کے امتحان میں بیٹھا۔ ایک سال پہلے ہی میری یہاں پوسٹنگ ہوئی ہے۔ میں نے اس ایک سال میں تمہیں بہت ڈھونڈا..... تمہیں یہ دکھانے کے لیے نہیں کہ میں تمہاری پیش گوئی کے برعکس شہر میں زندگی گزار رہا ہوں، میرے پاس سرکاری بنگلا، نوکر چاکر، گاڑی، تھوڑا بہت پیسا اور زندگی کی ساری آسائشیں موجود ہیں۔ نہیں... میں اس کمینے انسان کی طرح تمہیں شرمندہ کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ میں نے تو صرف اس لیے تمہیں ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی کہ مجھے علم ہو گیا تھا کہ شہزاد نے تمہیں طلاق دے دی ہے..... اور..... اور.....''

دانش ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ ایک ذرا سے توقف کے بعد وہ دھیمے سے لہجے میں مزید بولا۔ ''اور میں تمہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ نہ جانے کس موہوم اُمید کے سہارے میں نے ماں باپ کے تمام تر اصرار کے باوجود شادی نہیں کی ..... میرے دل اور گھر کے دروازے تمہارے لیے آج بھی کھلے ہیں سیماب! کیا تم مجھے اپنی رفاقت کا شرف نہیں بخشو گی؟''

اس نے گردن گھما کر سیماب کی طرف دیکھا۔ اس کی ذہین آنکھوں میں ایک معصوم سی امید کا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ وہ اپنی توہین، اپنی شکست سب کچھ بھول چکا تھا۔ اسے واقعی سیماب سے محبت تھی جو آج بھی کاسۂ دل اس کے سامنے پھیلائے کھڑا تھا۔

سیماب خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ڈرائیور پر ایک نظر ڈالی جو بت کی طرح ساکت بیٹھا ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ سیماب جیپ کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ جس میں شیشے کی جگہ دھندلی سی پلاسٹک شیٹ لگی ہوئی تھی۔

''نہیں دانش!'' اس کے ہونٹوں سے جیسے کسی اور کی آواز نکلی۔ ''میں زندگی کے سفر میں تمہاری رفیق نہیں بن سکتی..... میری جگہ اس وقت کوئی اور عورت ہوتی تو شاید بہت خوش ہوتی..... مگر میں خود غرض نہیں ہوں دانش! مجھے یاد ہے جب تم کمزور تھے، ٹوٹے ہوئے بکھرے ہوئے تھے تو میں نے تمہیں ٹھکرا دیا تھا۔ آج میں شکست خوردہ ہوں لیکن میں تمہارا ہاتھ نہیں تھام سکتی..... تمہارے لازوال خلوص کا سہارا نہیں لے سکتی۔''

''مگر کیوں..... آخر کیوں؟'' متحمل مزاج دانش تقریباً چلّا اٹھا۔

''اس لیے کہ میں اپنے آپ کو وہ سزا دینا چاہتی ہوں جس کی میں مستحق ہوں۔'' سیماب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں پہلے ہی بہت خود غرض بن چکی ہوں، اب مزید خود غرض نہیں بننا چاہتی۔ میں منصف بن کر سوچتی ہوں تو اپنے آپ کو سزا کا مستحق پاتی ہوں، مجھے یہ سزا جھیلنے دو، جھلتے صحرا میں میرے سر پر سائبان نہ پھیلاؤ۔ میرے دامن شکستہ میں محبت، رحم، ہمدردی یا خلوص، کسی بھی جذبے کی بھیک نہ ڈالو..... میرا انتظار مت کرو۔ اپنا گھر آباد کر لو دانش! ہو سکے تو میرے لیے صرف اتنا کرنا کہ مجھے معاف کر دینا..... ڈرائیور! اگلے موڑ پر گاڑی روک دینا، میرا گھر آ گیا ہے۔''

ڈرائیور نے چونک کر موڑ سے پہلے ہی گاڑی روک دی۔

''سیماب! میری بات تو سنو.....'' دانش چلایا اور اس کا بازو تھامنے کے لیے گاڑی سے اترا مگر اس وقت تک سیماب نے فٹ پاتھ پر دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ دانش شاید اس کے تعاقب میں دوڑتا مگر پھر شاید اس احساس کے تحت رک گیا کہ راہ گیر ایک سرکاری گاڑی سے ایک عورت کو اتر کر بھاگتے اور پھر بظاہر ایک اچھے بھلے اور بارعب شخص کو اس کا تعاقب کرتے دیکھ کر نہ جانے کیا سمجھیں؟ وہ جلدی سے دوبارہ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

موڑ عبور کر کے سیماب نے مڑ کر دیکھا۔ جیپ ابھی تک موڑ سے پیچھے ہی تھی۔ اس نے تیزی سے اس عمارت کی سیڑھیاں پھلانگنا شروع کیں جس میں دوسری منزل پر اس کا فلیٹ تھا۔

چند لمحے بعد وہ اپنے بیڈ پر تکیے میں منہ چھپائے بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اتنی شدت سے وہ زندگی میں کبھی نہیں روئی تھی۔

حضرت حزقیل علیہ السلام

رضوانہ ساجد

دنیا کی سب سے سرکش قوم بنی اسرائیل نے ہر موڑ پر بغاوت کی اور قدم قدم پر ٹھوکر بھی کھائی مگر صد افسوس کہ راہِ حق پر چلنا اسے پھر بھی نہ آیا۔ یکے بعد دیگر انبیا آتے رہے اور بت پرستی کا اندھیرا چھانٹتے رہے۔ اسی سلسلے کی ایک اور کڑی حضرت حزقیل علیہ السلام کی ہدایات بھی ہیں... حسب روایت آپ علیہ السلام کو بھی رد کیے جانے کا دکھ... سفر کی صعوبت... کبھی محبت اور کبھی نفرت سہنے جیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر انبیا کا یہ شعار ہے کہ وہ کبھی کسی آزمائش سے منہ نہیں موڑتے۔ انہی آزمائشوں سے گزرنا ہی دراصل انبیا کی تربیت ہے اور ان میں کامیابی پانا ہی نبوت کی معراج ہے اور اللہ اپنے برگزیدہ بندوں کا امتحان ایسے ہی لیتا ہے۔

حضرت یرمیاہؑ کے پیغام کو بڑھانے والے ایک اور نبی کا احوال

حضرت حزقیل علیہ السلام کو اللہ نے شام و فلسطین میں بسنے والی تمام قوموں پر مبعوث کیا تھا۔ کنعان جسے بعد میں فلسطین کہا گیا یہیں یروشلم واقع تھا۔ یہ بنی اسرائیل کی خاص سرزمین تھی اور یہیں قرب و جوار میں ادومی، عمونی، موآبی قومیں آباد تھیں چنانچہ انہیں خدا نے رشد و ہدایت کے لیے جو علاقہ تفویض کیا تھا اس میں بنی اسرائیلی، بنی عمونی، موآبی اور شعیر کے قبائل تھے۔ یہ بنی یہوداہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ سارے علاقے اور ان میں آباد قومیں حضرت حزقیل علیہ السلام کی اصلاح اور ہدایت کا میدان تھیں، لیکن وہ اپنی اسیری کی وجہ سے دور دراز کے علاقوں میں نہیں جا سکتے تھے۔ شاہراہ پر کھڑے ہو جاتے اور تاجروں کے قافلوں کا انتظار کرتے۔ جونہی کوئی قافلہ نظر آتا۔ آپؑ اس قافلے کے معزز لوگوں کو جمع کرتے اور انہیں اس کلام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خداوندی سے آگاہ کرتے جو وقتاً فوقتاً آپؑ پر نازل ہوتا رہتا تھا۔ یہ تاجر جب اپنے اپنے علاقوں میں پہنچتے تو آپؑ کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے لیکن یہ لوگ اتنے سرکش ہو چکے تھے کہ ان کے دلوں پر کچھ اثر نہ ہوتا بلکہ الٹا مذاق اڑاتے۔

''ہم اللہ کی چہیتی قوم ہیں۔ وہ بھلا ہمیں کیوں تباہ کرنے لگا تھا۔ یروشلم کی تباہی اس نبی کی ذہنی اختراع ہے ورنہ یروشلم کیوں تباہ ہونے لگا تھا؟''

وہ قومیں جو فتوحات پر کمربستہ تھیں اور خوش حالی کے دن بسر کر رہی تھیں، وہ تو یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھیں کہ بت پرستی انہیں کسی مصیبت میں مبتلا کرے گی بلکہ وہ تو یہ سمجھتے تھے کہ دیوتاؤں کی پرستش ہی کی وجہ سے وہ خوش حال ہیں۔ اگر انہوں نے بتوں کو چھوڑ دیا تو وہ نقصان اٹھائیں گے۔

یروشلم کے بادشاہ صدقیاہ تک بھی آپؑ کا پیغام پہنچ رہا تھا لیکن وہ یرمیاہ علیہ السلام کی باتوں پر ہی عمل نہیں کر رہا تھا اور اپنے مشیروں کے کہنے پر حضرت یرمیاہ علیہ السلام کو اذیت پہنچا رہا تھا۔ اس پر بھلا ان پیغامات کا کیا اثر ہوتا۔

وہ جلاوطن بنی اسرائیل جو اسیری کے دن گزار رہے تھے، وہ بھی تل ابیب پہنچنے کے بعد ایک مرتبہ پھر بت پرستی کی لعنت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ان پر بھی حضرت حزقیل علیہ السلام کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

دور دراز کے علاقوں کے لوگوں کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کی قوم پر کوئی نبی مبعوث ہوا ہے لیکن وہ ان کی بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت حزقیل علیہ السلام سے فرما دیا تھا کہ تیرا کام پیغام پہنچانا ہے، وہ اسے مانتے ہیں یا نہیں یہ ان کی ذمے داری ہے۔ حضرت حزقیل علیہ السلام اپنا فرض پوری طرح ادا کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ انہیں وہ مناظر دکھا رہا تھا جو مستقبل میں پیش آنے والے تھے تاکہ وہ ان کی روشنی میں اپنی قوم کو ہدایات دے سکیں۔

حضرت حزقیل علیہ السلام اپنے مکان میں تشریف فرما تھے اور یہوداہ کے چند بزرگ آپؑ کے سامنے بیٹھے تھے کہ وہ آثار ظاہر ہوئے جو وحی کے وقت ہوتے تھے۔ ایک شبیہہ آگ کے مانند نظر آئی۔ اس کے کمر سے نیچے تک آگ اور اس کی کمر سے اوپر تک جلوۂ نور ظاہر ہوا جس کا رنگ صیقل کیے ہوئے پیتل کا سا تھا اور اس نے ایک ہاتھ کی شبیہہ سی بڑھا کر آپ کے سر کو بالوں سے پکڑا اور روح نے انہیں آسمان اور زمین کے درمیان بلند کیا اور حضرت حزقیل علیہ السلام عالمِ خواب میں یروشلم میں شمال کی طرف اندرونی پھاٹک پر پہنچ گئے جو غیرت کی مورت کا مسکن تھا۔ یہاں انہوں نے اسرائیل کے خدا کا جلال دیکھا۔ حکم ہوا اے آدم زاد! اپنی آنکھیں شمال کی طرف اٹھا۔ یہاں انہوں نے دیکھا کہ دیوار میں ایک چھید ہے۔ حکم ہوا، اے آدم زاد! دیوار کھود۔ جب خواب میں حضرت حزقیل علیہ السلام نے دیوار کھودی تو ایک دروازہ نظر آیا۔

''اندر جا اور جو نفرتی کام وہ یہاں کرتے ہیں دیکھ۔'' آواز آئی۔

حضرت حزقیل علیہ السلام اندر گئے تو دیکھا ہر نوع کے سب رینگنے والے کیڑے اور مکروہ جانوروں کی صورتیں اور بنی اسرائیل کے بت گرداگرد دیوار پر منقش ہیں اور بنی اسرائیل کے بزرگوں میں سے ستر شخص ان کے آگے کھڑے ہیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں بخوردان ہے اور ہر بخور سے خوشبو کا بادل اٹھ رہا ہے۔

''اے آدم زاد! کیا تو نے دیکھا کہ بنی اسرائیل کے سب بزرگ تاریکی میں یعنی اپنے منقش کاشانوں میں کیا کرتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں خداوند ہم کو نہیں دیکھتا۔ خداوند نے ملک چھوڑ دیا ہے۔''

اس کے بعد حضرت حزقیل علیہ السلام کو خداوند کے گھر کے شمالی پھاٹک پر لایا گیا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہاں عورتیں بیٹھی تموز پر نوحہ کر رہی ہیں۔ پھر وہ اندرونی صحن میں آئے اور دیکھا کہ ہیکل کے دروازے پر آستانے اور مذبح کے درمیان کچھ لوگ بیٹھے ہیں جن کی پیٹھ خداوند کے ہیکل کی طرف ہے اور ان کے منہ مشرق کی طرف ہیں اور وہ آفتاب کو سجدہ کر رہے ہیں۔

''یہ وہ لوگ ہیں جو اس شہر میں بدکرداری کی تدبیر اور بری مشورت کرتے ہیں۔ اس لیے تو ان کے خلاف نبوت کر۔ اے آدم زاد نبوت کر۔''

حضرت حزقیل علیہ السلام خواب میں یہ تمام مشاہدات کر رہے تھے، اپنے شہر اور شہر کے لوگوں پر افسوس کر رہے تھے جن کی ہلاکت نزدیک تھی۔

یہ مشاہدات جب مکمل ہو گئے تو فرشتوں نے اپنے بازو بلند کیے۔ خدا کا جلال ان کے اوپر جلوہ گر تھا۔ یہ جلال شہر میں سے اٹھا اور شہر کی مشرقی طرف پہاڑ پر جا ٹھہرا۔ حضرت حزقیل علیہ السلام نے محسوس کیا کہ وہ پھر کسدیوں کے ملک میں اسیروں کے پاس ہیں اور واقعی ایسا تھا کیونکہ یہوداہ کے بزرگ اسی طرح ان کے سامنے بیٹھے تھے۔

''آپؑ کہاں کھو گئے تھے۔ کچھ دیر کے لیے ہم نے دیکھا کہ آپ خاموش ہیں اور کچھ سوچ رہے ہیں۔ ہم نے بھی مناسب نہیں سمجھا کہ آپؑ سے کچھ پوچھتے۔''

''میں صرف اتنی ہی دیر خاموش رہا ہوں جتنی دیر تم کہہ رہے ہو؟''

''ہاں بس اتنی دیر۔''

''کمال ہے! میں تو یہاں سے بہت دور تھا۔ مجھے یروشلم لے جایا گیا تھا۔ میں نے وہاں نہ صرف یروشلم کی حالت دیکھی بلکہ مستقبل قریب میں اس پر آنے والی تباہی بھی مجھے دکھائی گئی۔''

اس کے بعد حضرت حزقیل علیہ السلام نے اپنے مشاہدات کی تفصیل سے اپنے سامعین کو آگاہ کیا۔

''میں خواب میں دیکھ رہا تھا کہ اسرائیل کے نفرتی کاموں کی بدولت خدا کا جلال بھڑک اٹھا۔ اس نے اس مرد کو جو کتانی لباس پہنے ہوئے تھا اور جس کے پاس لکھنے کی دوات تھی پکارا اور اسے حکم دیا کہ یروشلم کے بیچ سے گزر اور ان لوگوں کی پیشانی پر جو ان سب نفرتی کاموں کے سبب آہیں مارتے اور روتے ہیں (یعنی نیک ہیں) نشان کر دے اور اپنے فرشتوں سے کہا، اس کے پیچھے پیچھے شہر میں سے گزرو اور مارو۔ تمہاری آنکھیں رعایت نہ کریں اور تم رحم نہ کرو۔ تم بوڑھوں اور جوانوں اور لڑکیوں اور ننھے بچوں اور عورتوں کو بالکل مارو لیکن جن کی پیشانی پر نشان ہے ان میں سے کسی کے پاس نہ جاؤ۔

میں نے دیکھا کہ انہوں نے اس قتل عام کا آغاز ہیکل سے کیا۔ مقتولوں سے صحن بھر گیا۔ اس کے بعد وہ شہر میں نکلے اور قتل کرنے لگے۔

میں عالمِ رویا میں چیخا تھا کہ اے خداوند کیا تو اپنا قہر شدید یروشلم پر نازل کر کے اسرائیل کے سب باقی لوگوں کو ہلاک کرے گا؟ تب اس نے مجھے فرمایا، اسرائیل اور یہوداہ کے خاندان کی بدکرداری نہایت عظیم ہے۔ ملک خونریزی سے پُر ہے اور شہر بے انصافی سے بھرا ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں خداوند نے ملک کو چھوڑ دیا ہے اور وہ نہیں دیکھتا۔ میں ان کی روش کا بدلہ ان کے سر لاؤں گا۔''

حضرت حزقیل علیہ السلام یہ واقعات سنا رہے تھے کہ انہوں نے اپنے سامعین میں سے بہت سوں کی سسکیوں کی آواز سنی۔ وہ اپنے ملک کے دل گرفتہ حالات سن کر سخت فکرمند تھے۔

''ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ خدا اپنے لوگوں کو تباہ نہیں کرے گا اور نہ وہ ہیکل کو گزند پہنچنے دے گا۔ ہم تو اپنے وطن جانے کے لیے بے چین ہیں لیکن تم تو ہمیں یوں مایوس کر رہے ہو کہ ہم اب کبھی نہ جا سکیں گے۔''

''میں نے یہ سوال کیا تھا۔ میرے لوگو تمہارے لیے اچھی خبر ہے۔ تمہاری یہ جدائی عارضی ہے۔ تم اپنے ملک میں ضرور جاؤ گے۔''

''یہ تم کہہ رہے ہو یا خداوند نے بھی یہی کہا ہے؟''

''جب میں یہ سوال کر رہا تھا، خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ ہر چند میں نے ان کو دوسری قوموں کے درمیان ہانک دیا ہے اور غیر ملکوں میں پراگندہ کیا ہے لیکن میں ان کو تھوڑی دیر تک ان ملکوں میں جہاں جہاں رہ گئے ہیں رکھوں گا پھر اسرائیل کا گھرانا ان کو دوں گا اور وہ وہاں آئیں گے اور اس کی تمام نفرتی اور مکروہ چیزیں اس سے دور کر دیں گے اور میں ان کو نیا دل دوں گا اور نئی روح ان کے باطن میں ڈالوں گا اور سنگین دل ان کے جسم سے خارج کر دوں گا تاکہ وہ میرے آئین پر چلیں اور میرے احکام پر عمل کریں اور ان پر کاربند ہوں۔ وہ میرے لوگ ہوں گے اور میں ان کا خدا ہوں گا لیکن جن کا دل اپنی نفرتی اور مکروہ چیزوں کا طالب ہو کر ان کی پیروی میں ہے میں ان کی روش کو انہی کے سر پر لاؤں گا۔''

سب لوگ آپ کی باتیں سن کر آپ کے پاس سے اٹھ گئے لیکن ان کے دلوں میں شکوک تھے۔ وہ ہرگز یہ ماننے کو تیار نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے کہ یروشلم کے بارے میں جو باتیں حضرت حزقیل علیہ السلام نے ان سے کی ہیں وہ اسی طرح ہیں۔ وہ اب بھی یہی کہتے پھر رہے تھے کہ ہیکل کو گزند پہنچنا ممکن ہی نہیں۔ خدا اپنے لوگوں کو تباہ کیسے کرسکتا ہے؟ حضرت حزقیل علیہ السلام اپنی باتیں منوانے کے لیے ہمیں ڈرا رہے ہیں۔ یروشلم کو بچانے کے لیے ہمارا بادشاہ وہاں موجود ہے۔ حزقیلؑ کہتے ہیں مستقبل میں ایسا ہوگا اور ویسا ہوگا۔ مستقبل کس نے دیکھا ہے۔ ان کا دیکھا ہوا خواب ابھی تک تو پورا ہوا نہیں۔

یہ باتیں حضرت حزقیل علیہ السلام تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ وہ ان لوگوں کی عقلوں پر افسوس کررہے تھے جو ان کی باتیں تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے حالانکہ یہ جلاوطن اس تباہی کا ایک نمونہ دیکھ چکے تھے۔ اسی تباہی کی بدولت وہ وطن سے دور ہوئے تھے۔ جس بادشاہ پر وہ اترا رہے تھے وہ باج گزار تھا اور ایک ناکام بادشاہ تھا جس پر نادان مشیر اور جھوٹے نبی حکومت کررہے تھے۔

حضرت حزقیل علیہ السلام خدا سے دعا کرتے رہتے تھے کہ جو مجھ سے قریب ہیں وہی دور ہیں۔ میری بات سننے کو تیار نہیں۔ ہر مرتبہ یہی جواب ملتا تھا کہ اے آدم زاد! تو ایک باغی گھرانے کے درمیان رہتا ہے جن کی آنکھیں ہیں کہ دیکھیں لیکن وہ نہیں دیکھتے اور ان کے کان ہیں کہ سنیں پر وہ نہیں سنتے۔

خدا ہر طرح سے ان لوگوں پر حجت قائم کرنا چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح وہ قائل ہوجائیں۔ یروشلم میں باقی رہ جانے والے افراد کو جو حالات پیش آنے والے تھے انہیں ظاہر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک علامتی تجربہ کرنے کا حکم دیا۔

''اے آدم زاد (حضرت حزقیل علیہ السلام) سفر کا سامان تیار کر اور دن کے وقت ان لوگوں کے دیکھتے ہوئے اپنے مکان سے روانہ ہو۔ تو ان کے سامنے اپنے مکان سے دوسرے مکان کو جا۔ ممکن ہے کہ وہ سوچیں اگرچہ وہ باغی خاندان ہیں۔''

حضرت حزقیل علیہ السلام نے دن کی روشنی میں دیوار میں اتنا بڑا سوراخ کیا جس میں سے سامان نکل سکے۔ انہیں دیوار میں سوراخ کرتے دیکھ کر بہت سے لوگ جمع ہوئے تھے لیکن کسی نے یہ نہ پوچھا کہ وہ کیا کررہے ہیں؟ پھر انہوں نے اپنا ضروری سامان اس سوراخ سے باہر نکالا اور جب رات ہوئی تو اسی سوراخ سے خود بھی باہر نکل آئے جیسے حملہ آور کے خوف سے کوئی چھپ کر، گھر بار چھوڑ کر باہر نکلتا ہے۔

یہ بتانا مقصود تھا کہ یروشلم میں جو حاکم ہے اسی طرح آخری دفعہ یہوداہ کے دارالسلطنت سے نکلے گا۔ آپؑ سے کہہ دیا گیا تھا کہ صرف اسی وقت بولیں گے جب خدا کا حکم ہوگا، اس لیے آپؑ اپنے عمل سے اپنی قوم کو بہت کچھ سمجھانا چاہ رہے تھے۔ یہ بے حس لوگ سب کچھ دیکھ رہے تھے لیکن کچھ سمجھنے کو تیار نہیں تھے۔

اس عملی تجربے کی رات گزری اور صبح ہوئی تو کلام الٰہی نازل ہوا۔

''اے آدم زاد! کیا بنی اسرائیل نے جو باغی خاندان ہیں تجھ سے نہیں پوچھا کہ تو کیا کرتا ہے؟''

''وہ مجھ سے کیا پوچھتے۔ وہ تو بس مجھے دیکھتے رہے۔ سمجھ رہے ہوں گے کہ شاید میرا دماغ چل گیا ہے جو میں ایسی حرکت کررہا ہوں۔''

''تو اپنی زبان کھول اور وہ بتا جو میں تجھے بتاؤں۔''

وحی کے ذریعے آپؑ کو تمام باتیں بتادی گئیں اور آپؑ نے خدا کے حکم کے مطابق جلاوطنوں کو اپنے پاس طلب کیا اور ان سے مخاطب ہوئے۔

''کل جو میں سامان لے کر نکلا تھا، تم سمجھے یہ کیا تھا؟''

''آپؑ کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔ ہم کب تک سوچتے رہیں آپؑ کیا کررہے ہیں۔''

''خدا یوں فرماتا ہے کہ یروشلم کے حاکم اور تمام بنی اسرائیل کے لیے جو اس میں ہیں یہ بارِ نبوت ہے۔ میں تمہارے لیے نشان ہوں جیسا میں نے کیا ویسا ہی ان سے سلوک کیا جائے گا۔ وہ جلاوطن ہوں گے اور اسیری میں جائیں گے اور جو ان میں حاکم ہے وہ شام کو اندھیرے میں اٹھ کر اپنے کاندھے پر سامان اٹھائے ہوئے نکل جائے گا۔ میں اسے کسدیوں کے ملک بابل میں پہنچادوں گا لیکن وہ اسے نہ دیکھے گا اگرچہ وہیں مرے گا۔''

''ابھی تک تو صدقیاہ ہی حکومت کررہا ہے۔ جو آپؑ کہہ رہے ہیں وہ کب ہوگا کسے خبر۔ ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ خداوند بھلا یروشلم کو کیسے تباہ کرے گا؟''

''خدا ہر کام اپنے وقت پر مکمل کرتا ہے۔''

''وہ وقت کب آئے گا۔ آج تک تو کسی ''رویا'' کا ہم نے انجام دیکھا نہیں۔''

''وقت آگیا ہے کہ ہر رویا کا انجام قریب ہے۔ خداوند فرماتا ہے میں تمہارے دنوں میں کلام کرکے اسے پورا کروں گا۔''

حضرت حزقیل علیہ السلام پر پھر وحی نازل ہوئی۔ ''اے آدم زاد دیکھ! بنی اسرائیل کہتے ہیں کہ جو رویا اس نے دیکھی ہے بہت مدت میں ظاہر ہوگی اور وہ ان ایام کی خبر دیتا ہے جو بہت دور ہیں۔ اسی لیے ان سے کہہ خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ آگے میری کسی بات کی تکمیل میں تاخیر نہ ہوگی بلکہ خداوند فرماتا رہے کہ جو بات میں کہوں گا وہ پوری ہوگی۔''

جب حضرت حزقیل علیہ السلام نے اپنی سرگرمیاں تیز کردیں اور ان کی باتوں کا اثر ہونے لگا اور ان کی قوم میں سے بعض تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے روٹی کھانے لگے تو جھوٹے نبی بھی بڑی تیزی سے حرکت میں آنے لگے۔ وہ پیش گوئیاں کررہے تھے کہ امن وامان برقرار رہے گا۔ یروشلم میں کوئی تباہی نہیں آئے گی۔ جلاوطن عنقریب اپنے وطن کو لوٹیں گے۔ یروشلم میں وہ یرمیاہ نبی کی مخالفت پر کمربستہ تھے، تل ابیب میں حضرت حزقیل علیہ السلام کی مخالفت پر آمادہ ہوگئے اور کمال بات یہ کہ دل سے باتیں گھڑتے تھے اور خدا کے نام سے بیان کرتے تھے۔ وہ لوگ کم نہیں تھے جو ان کے بہکاوے میں آرہے تھے۔ حضرت حزقیل علیہ السلام منتظر تھے کہ خدا ان سے کلام کرے تو وہ ان کی باتوں کا جواب دیں۔ آخر کار وقت آگیا۔ خدا کا کلام نازل ہوا۔

''اے آدم زاد! اسرائیل کے نبی جو نبوت کرتے ہیں ان کے خلاف نبوت کر اور جو اپنے دل سے بات بنا کر نبوت کرتے ہیں ان سے کہہ خداوند کا کلام سنو۔''

''خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ احمق نبیوں پر افسوس جو اپنی ہی روح کی پیروی کرتے ہیں۔''

حضرت حزقیل علیہ السلام نے بھی ان جھوٹے نبیوں کے خلاف زبان کھولی اور بنی اسرائیل سے مخاطب ہوکر خدا کا کلام پہنچانا شروع کردیا۔

''اسرائیل تیرے نبی ان لومڑیوں کے مانند ہیں جو ویرانوں میں رہتی ہیں۔ انہوں نے باطل اور جھوٹا شگون دیکھا ہے جو کہتے ہیں کہ خدا فرماتا ہے، اگرچہ خداوند نے ان کو نہیں بھیجا اور لوگوں کو امید دلاتے ہیں کہ ان کی بات پوری ہوجائے گی۔ تم جھوٹے غیب داں ہو۔

''خداوند خدا فرماتا ہے کہ چونکہ تم نے جھوٹ کہا اور بطلان دیکھا اس لیے خداوند خدا فرماتا ہے کہ میں تمہارا مخالف ہوں اور میرا ہاتھ ان نبیوں پر جو بطلان دیکھتے ہیں اور جھوٹی غیب دانی کرتے ہیں چلے گا۔ نہ وہ میرے لوگوں میں شامل ہوں گے اور نہ اسرائیل کے دفتر میں لکھے جائیں گے اور نہ وہ اسرائیل کے ملک میں داخل ہوں گے اور تم جان لوگے کہ میں خداوند خدا ہوں۔''

حضرت حزقیل علیہ السلام کی باتیں جھوٹے نبیوں تک پہنچ رہی تھیں۔ انہوں نے اور زیادہ سرگرمی سے حضرت حزقیل علیہ السلام کی مخالفت شروع کردی نہ صرف یہ بلکہ اپنے لوگوں کا ایک گروہ بنا کر حضرت حزقیل علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے۔

''جناب! آپ جو اسرائیلیوں کی تباہی کی باتیں کرتے رہتے ہیں، یہ باتیں آپ کو کون بتاتا رہتا ہے؟''

''میں وہی کہتا ہوں جو خدا مجھ سے کہلواتا ہے۔''

''بہت خوب! پھر یہ بتایئے کہ جو کچھ آپ نے بتایا وہ آج تک تو پورا ہوا نہیں۔''

''میرا کام صرف پیغام پہنچادینا ہے۔ کوئی خبر کس وقت پوری ہوتی ہے، یہ خدا جانتا ہے۔''

''پھر تم دوسرے نبیوں کو جھوٹا کیوں کہتے ہو، وہ بھی تو خبریں دیتے ہیں۔ اس کے پابند نہیں کہ کون سی خبر کب پوری ہوتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔''

''انہیں بھی میں جھوٹا نہیں کہتا۔ ان کی بابت بھی خدا ہی مجھ سے کلام کرتا ہے اور کہتا ہے، یہ وہ کہتے ہیں جو میں ان سے نہیں کہتا۔''

''یہ ہم کیسے مان لیں کہ ان سے خدا نہیں کہتا اور تم سے کہتا ہے؟''

''تم بالکل مان لیتے اگر تم نے اپنے بتوں کو اپنے دل میں نصب نہ کیا ہوتا۔ تم نے اپنی ٹھوکر کھلانے والی بدکرداری کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ تم حق اور باطل میں فرق کر ہی نہیں سکتے۔ تم سب اپنے بتوں کے سبب سے خدا سے دور ہو گئے ہو۔ اس لیے توبہ کرو، اپنے بتوں سے منہ موڑو اور تمام مکروہات سے باز آ جاؤ۔''

''اچھا جی، ذرا ہم بھی سنیں وہ کون سی مکروہات ہیں جنہیں ہم آج سے چھوڑ دیں۔''

''بتوں کی قربانی میں سے کچھ مت کھاؤ۔ بتوں کی طرف اپنی آنکھیں مت اٹھاؤ اور اپنے ہمسائے کی بیوی کو ناپاک مت کرو اور کسی پرستم کے لیے ہاتھ مت اٹھاؤ۔ قرض دار کا گرو واپس کرو اور ظلم سے کچھ چھین مت لو۔ بھوکوں کو روٹی کھلاؤ اور ننگوں کو کپڑا پہناؤ۔ سود پر لین دین سے باز رہو۔ بدکرداری سے باز ہو اور لوگوں میں سچا انصاف کرو۔ تم ایسا کرو گے تو کیوں مرو گے۔''

ان لوگوں نے یہ باتیں غور سے سنیں۔ عمل کا وعدہ بھی کیا لیکن یہ اصرار بھی کیا کہ ہم خدا کی چہیتی قوم ہیں۔ وہ ہم پر ایسا سخت سلوک نہیں کرے گا جس کی بشارت آپؑ دیتے ہیں۔

خدا کا کلام پھر نازل ہوا۔ ''جب کوئی ملک سخت خطا کر کے میرا گناہ گار ہو اور میں اپنا ہاتھ اس پر چلاؤں اور اس کی روٹی کا عصا توڑ ڈالوں اور اس میں قحط بھیجوں اور اس کے انسان اور حیوان کو ہلاک کروں تو اگرچہ یہ تین شخص نوح، دانیال اور ایوب اس میں موجود ہوں تو بھی وہ اپنی صداقت سے فقط اپنی ہی جان بچائیں گے۔ یہ تین شخص بھی نہ بیٹوں کو بچا سکیں گے نہ بیٹیوں کو۔ فقط وہ خود ہی بچیں گے اور ملک ویران ہو جائے گا۔''

''ہمارے باپ دادا نے اگر کوئی گناہ کیا تھا تو اس کی سزا ہمیں کیوں ملے گی؟''

''بے شک نہیں ملے گی لیکن اگر کسی باپ کے ہاں ایسا بیٹا پیدا ہو جو اپنے باپ کے نفرتی کاموں کو دیکھے اور خوف نہ کھائے اسے ضرور سزا ملے گی اور تم وہی بیٹے ہو۔''

جب اسرائیل نوزائیدہ بچے کی طرح بے بس تھا، اس وقت خدا نے اسے جنا اور بڑے ناز و نعم سے اس کی پرورش کی اور برگزیدہ بنایا۔ ایسی کثیر برکات سے فیض یاب ہو کر بھی اسرائیل اپنی برگشتہ حالت میں ایسا بے حیا ہے جیسے فاحشہ اپنی بدکاری میں ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو خدا کے لیے وقف کرنے اور اس کا جاں نثار بننے کے بجائے اسرائیل نے ساری مادّی برکتوں کو غلط انداز میں استعمال کیا۔ یہاں تک کہ والدین نے اپنے بچوں کو بتوں کے لیے قربان کیا۔ تم بھی اگر باپ دادا کی طرح یہی کرتے رہے تو تم اپنے اعمال کی سزا بھگتو گے۔''

''یہ جلاوطنی باپ دادا کے گناہوں کی سزا نہیں تو کیا ہے۔''

''بے شک جلاوطنی اجتماعی مصیبت اٹھانے کی جگہ ہے مگر فی الحال سب کو دکھ اٹھانا ضرور ہے مگر آخرکار جو امتیاز ہو گا وہ زندگی اور موت کا معاملہ ہو گا۔ ناراست فنا ہو جائیں گے، راست باز جیتے رہیں گے۔ جب بیٹے نے وہی کیا جو جائز ہے تو وہ یقیناً زندہ رہے گا۔ جو جان گناہ کرتی ہے وہی مرے گی۔ بیٹا باپ کے گناہ کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور نہ باپ بیٹے کے گناہ کا بوجھ۔ صادق کی صداقت اسی کے لیے ہو گی اور شریر کی شرارت شریر کے لیے۔''

☆☆☆

دو سال سے حضرت حزقیل علیہ السلام قوم کو خبردار کرتے آ رہے ہیں۔ بزرگوں کا ایک وفد ایک دفعہ پھر ان کے سامنے بیٹھا ہے تاکہ خداوند سے دریافت کرے۔ صدقیاہ ابھی تک یروشلم کے تخت پر موجود ہے۔

حضرت حزقیل علیہ السلام ایک مرتبہ پھر ان بزرگوں کے سامنے اسرائیل کی تاریخ کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

''خداوند یوں فرماتا ہے کہ جس دن میں نے اسرائیل کو برگزیدہ کہا اور بنی یعقوب سے قسم کھائی اور ملک مصر میں اپنے آپ کو ان پر ظاہر کیا، میں نے ان سے قسم کھا کر کہا میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔ جس دن میں نے ان سے قسم کھائی تاکہ ان کو ملک مصر سے اس ملک میں لاؤں، جو میں نے ان کے لیے دیکھ رکھا تھا۔ جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے اور جو تمام ممالک کی شوکت ہے لیکن وہ مجھ سے باغی ہوئے۔ ان میں سے کسی نے مصر کے بتوں کو نہ چھوڑا۔ تب میں نے کہا کہ میں اپنا قہر ان پر انڈیل دوں گا لیکن میں اپنے نام کی خاطر انہیں ملک مصر سے نکال لایا۔ انہیں کنعان میں لایا۔ میں نے اپنے آئین ان کو دیے اور اپنے احکام ان کو سکھائے لیکن بنی اسرائیل بیابان میں مجھ سے باغی ہوئے۔ تب میں نے کہا کہ میں بیابان میں اپنا قہر نازل کر کے ان کو فنا کروں گا تو بھی میری آنکھوں نے ان کی رعایت کی اور میں نے ان کو ہلاک نہ کیا۔ میں نے بیابان میں ان کے فرزندوں سے کہا تم اپنے باپ دادا کے آئین و احکام پر نہ چلو اور ان کے بتوں سے اپنے آپ کو ناپاک نہ کرو۔ فرزندوں نے بھی مجھ سے بغاوت کی۔ تب میں نے کہا میں اپنا قہر ان پر نازل کروں گا تو بھی میں نے اپنا ہاتھ کھینچا۔ پھر میں نے ان سے قسم کھائی کہ میں قوموں میں ان کو آوارہ اور ممالک میں پراگندہ کروں گا۔ کیا تم بھی اپنے باپ دادا کی طرح ناپاک ہوتے ہو اور ان کے نفرت انگیز کاموں کی طرح تم بھی بدکاری کرتے ہو؟''

وقت آگے بڑھتا رہا خداوند کا کلام پھر نازل ہوا، ''اے آدم زاد! یروشلم کا رخ کر اور مقدس مکانوں سے مخاطب ہو کر ملک اسرائیل کے خلاف نبوت کر اور اس سے کہہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ دیکھ میں تیرا مخالف ہوں اور اپنی تلوار میان سے نکال لوں گا اور تیرے صادقوں اور تیرے شریروں کو تیرے درمیان سے کاٹ ڈالوں گا۔ میری تلوار اپنے میان سے نکل کر جنوب سے شمال تک تمام بشر پر چلے گی۔ پس اے آدم زاد، کمر کی شکستگی سے آہیں مار اور تلخ کامی سے ان کی آنکھوں کے سامنے ٹھنڈی سانس بھر اور جب وہ پوچھیں کہ تو کیوں ہائے ہائے کرتا ہے تو یوں جواب دے کہ اس کی آمد کی افواہ کے سبب سے اور ہر ایک دل پگھل جائے گا اور سب ہاتھ ڈھیلے ہو جائیں گے اور ہر ایک جی ڈوب جائے گا اور سب گھٹنے پانی کے مانند کمزور ہو جائیں گے۔''

ایک روز حضرت حزقیل علیہ السلام اپنے مکان میں بہت اداس بیٹھے تھے کہ کلام خداوند نے انہیں یاد کیا۔ ''اے آدم زاد تو دو راستے تھینچ جن سے شاہ بابل کی تلوار آئے۔ ایک ہی ملک سے وہ دونوں راستے نکال اور ایک ہاتھ نشان کے لیے شہر کی راہ کے سرے پر بنا۔ ایک راہ نکال جس سے تلوار بنی عمون کی ربلہ پر اور پھر ایک اور جس سے یہوداہ کے محصور شہر یروشلم پر آئے کیونکہ شاہ بابل دونوں راہوں کے نقطۂ اتصال پر فال گیری کے لیے کھڑا ہو گا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں یروشلم کا قرعہ پڑے گا کہ منجنیق لگائے اور کشت وخون کے لیے منہ کھولے۔ للکار کی آواز بلند کرے اور پھاٹکوں پر منجنیق لگائے اور دمدمہ باندھے اور برج بنائے اور تو اے مجروح شریر، شاہ اسرائیل جس کا زمانہ بدکرداری کے انجام کو پہنچنے پر آیا ہے۔ خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ کلاہ دور کر اور تاج اتار۔ یہ ایسا نہیں رہے گا۔ پست کو بلند کر اور اسے جو بلند ہے پست کر۔ میں ہی اسے اُلٹ اُلٹ دوں گا۔ پر یوں بھی نہیں رہے گا اور وہ آئے گا جس کا حق ہے اور میں اسے دوں گا۔''

حضرت حزقیل علیہ السلام کو یقین آ گیا کہ جس دن کا عہد تھا وہ آ چکا۔ اب وہ سب کچھ ضرور ہو گا جو کلام الٰہی سے سنایا جا رہا تھا۔ وہ اسیری کی وجہ سے یروشلم جا نہیں سکتے تھے لیکن وہاں کے حالات جاننے کے لیے بے قرار تھے۔ خدا نے عالم خواب میں سب کچھ دکھا دیا تھا لیکن انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے جیسے لوگوں سے سننا چاہتا ہے۔ وہ گھر سے نکل کر ایک بلند ٹیلے پر کھڑے ہو گئے اور ایرانی تاجروں کے کسی قافلے کا انتظار کرنے لگے جو اکثر ادھر سے گزرتے تھے۔ دھوپ میں کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد انہیں واپس آنا پڑا۔ مسلسل تین روز تک جاتے رہے۔ کسی قافلے کی جھلک تک نظر نہ آئی۔ اب انہیں مزید یقین آنے لگا کہ یروشلم کسی اُفتاد سے ضرور گزر رہا ہے۔ بالآخر چوتھے دن انہیں ایک آدمی دکھائی دیا جو یروشلم کی طرف سے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ حضرت حزقیل علیہ السلام نے آگے بڑھ کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

''تم حزقیل پیغمبر تو نہیں ہو؟'' اس آدمی نے پوچھا۔

''ہاں میں وہی ہوں جسے اپنی قوم سے جدا کر دیا گیا ہے۔ میں ان بھیڑوں کا نگراں ہوں جو میرے قابو میں نہیں مگر تم نے مجھے کیسے پہچانا؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میں جب یروشلم میں تھا تو میں نے تاجروں کے ذریعے تمہارا تذکرہ سنا تھا اور اب یروشلم کے لیے آپ کی بے چینی دیکھ کر مجھے یقین آ گیا کہ آپؑ وہی ہوں گے۔''

''میری بے قراری کو قرار میں تبدیل کرنے کے لیے تمہارے پاس کیا خبر ہے؟''

''وہ سب کچھ ہونے کو ہے جس کی خبر آپؑ اور یرمیاہ نبیؑ دیتے رہے ہیں۔ بداعمالیوں کی سزا قریب پہنچ گئی ہے۔ یروشلم میں سخت کال ہے۔ لوگ مٹکے اٹھائے میلوں چلتے رہتے ہیں اور پانی نہیں ملتا۔ صدقیاہ بادشاہ نے مصر سے دوستی کر لی ہے اور شاہ بابل کو ناراض کر دیا ہے۔ بس اب کچھ ہی دن جاتے ہیں کہ اسے بابل کی تلوار کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کچھ بھوک سے مریں گے کچھ تلوار سے۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا کر نکلا ہوں کیونکہ صدقیاہ بادشاہ نہیں چاہتا کہ شہر کی آبادی اسے چھوڑ کر چلی جائے اور وہ اکیلا رہ جائے۔ شہر پناہ کی دیوار پر سپاہی بیٹھے ہیں جو کسی کو باہر نہیں جانے دیتے۔ بادشاہ اپنے نادان مشیروں کے کہنے پر چل رہا ہے۔ یہ اس کی سخت غلطی ہے۔''

وہ شخص اپنی راہ ہو لیا اور حضرت حزقیل علیہ السلام اپنے مکان پر تشریف لے آئے۔ یروشلم کے حالات نے آپؑ کو بے چین کر دیا تھا۔ سب کچھ حکمِ الٰہی کے مطابق ہو رہا تھا لیکن وطن کی محبت اپنی جگہ تھی۔ بے اختیار آپ کی زبان پر یہ نوحہ جاری ہو گیا۔

تیری ماں کون تھی؟
ایک شیرنی جو شیروں کے درمیان لیٹی تھی اور
جوان شیروں کے درمیان اس نے اپنے بچوں کو پالا
اور اس نے اپنے بچوں میں سے ایک کو پالا تو وہ
جوان شیر ہوا اور شکار کرنا سیکھ گیا
اور آدمیوں کو نگلنے لگا
اور قوموں کے درمیان اس کا چرچا ہوا تو وہ ان
کے گڑھے میں پکڑا گیا
اور وہ اسے زنجیروں سے جکڑ کر زمین مصر میں لائے
اور جب شیرنی نے دیکھا کہ اس نے بے فائدہ
انتظار کیا اور اس کی امید جاتی رہی
تو اس نے اپنے بچوں میں سے دوسرے کو لیا
اور اسے پال کر جوان شیر کیا
اور وہ شیروں کے درمیان سیر کرتا پھرا اور جوان شیر ہوا
اور شکار کرنا سیکھ گیا اور آدمیوں کو نگلنے لگا
اور اس نے ان کے قصروں کو برباد کیا اور ان کے
شہروں کو ویران کیا
اس کی گرج سے ملک اجڑ گیا اور اس کی آبادی نہ رہی
تب بہت سی قومیں تمام ممالک سے اس کی
گھات میں بیٹھیں
اور انہوں نے اس پر اپنا جال پھیلایا۔ وہ ان کے گڑھے میں پکڑا گیا
اور انہوں نے اسے زنجیروں سے جکڑ کر پنجرے
میں ڈالا اور شاہ بابل کے پاس لے آئے

انہوں نے اسے قلعہ میں بند کیا
تا کہ اس کی آواز اسرائیل کے پہاڑوں پر
سنی نہ جائے۔

☆☆☆

نہر کیبار کے کنارے ایک آواز پھر بلند ہوئی۔

''ایک بلا یعنی بلائے عظیم۔ دیکھ وہ آتی ہے۔ خاتمہ آیا۔ خاتمہ آ گیا۔ وہ تجھ پر آ پہنچا۔ دیکھ وہ آ پہنچا۔ اے زمین پر بسنے والے تیری شامت آئی۔ وقت آ پہنچا، ہنگامے کا دن قریب ہوا۔ یہ پہاڑوں پر خوشی کی للکار کا دن نہیں۔

اب میں اپنا قہر تجھ پر انڈیلنے کو ہوں اور اپنا غضب تجھ پر پورا کروں گا اور تیری روش کے مطابق تیری عدالت کروں گا تیرے سب گھناؤنے کاموں کی سزا تجھ پر لاؤں گا۔ میری آنکھ رعایت نہ کرے گی اور میں ہرگز رحم نہ کروں گا۔ میں تجھے تیری روش کے مطابق سزا دوں گا اور تیرے گھناؤنے کاموں کے انجام تیرے درمیان ہوں گے اور تم جانو گے کہ میں خداوند سزا دینے والا ہوں۔

دیکھ وہ دن۔ دیکھ وہ آ پہنچا ہے۔ تیری شامت آ گئی۔ عصا میں کلیاں نکلیں۔ غرور میں غنچے نکلے۔ ستم گری نکلی کہ شرارت کے لیے چھڑی ہو۔ کوئی ان میں سے نہیں بچے گا۔ نہ ان کے انبوہ میں سے کوئی اور نہ ان کے مال میں سے کچھ اور ان پر ماتم نہ ہوگا۔

وقت آ گیا۔ دن قریب ہے، نہ خریدنے والا خوش ہو، نہ بیچنے والا اداس کیونکہ ان کے تمام انبوہ پر غضب نازل ہونے کو ہے کیونکہ بیچنے والا بکی ہوئی چیز تک پھر نہ پہنچے گا اگرچہ ہنوز وہ زندوں کے درمیان ہوں کیونکہ یہ رویا ان کے تمام انبوہ کے لیے ہے۔ ایک بھی نہ لوٹے گا اور نہ کوئی بدکرداری سے اپنی جان کو قائم رکھے گا۔ نرسنگا پھونکا گیا اور سب کچھ تیار ہے لیکن کوئی جنگ کو نہیں نکلتا کیونکہ میرا غضب ان کے تمام انبوہ پر ہے۔ باہر تلوار ہے اور اندر وبا اور قحط ہیں۔ جو کھیت میں ہے تلوار سے قتل ہوگا اور جو شہر میں ہے قحط اور وبا اسے نگل جائیں گے لیکن جو ان سے بچ نکلیں گے اور وادیوں کے کبوتروں کے مانند پہاڑوں پر رہیں گے اور سب کے سب نالہ کریں گے۔ ہر ایک اپنی بدکرداری سے۔ سب ہاتھ ڈھیلے ہوں گے اور سب گھٹنے پانی کی طرح کمزور ہو جائیں گے۔ وہ ٹاٹ سے کمر کسیں گے اور ہول ان پر چھا جائے گا اور سب کے منہ پر شرم ہوگی اور ان سب کے سروں پر خوف آئے گا۔ وہ اپنی چاندی سڑکوں پر پھینک دیں گے اور ان کا سونا پاک چیز کے مانند ہوگا۔ خداوند کے غضب کے دن میں ان کا سونا چاندی ان کو نہ بچا سکے گا۔ ان کی جانیں آسودہ نہ ہوں گی اور ان کے پیٹ نہ بھریں گے کیونکہ انہوں نے اسی سے ٹھوکر کھا کر بدکرداری کی تھی اور ان کے خوبصورت زیور شوکت کے لیے تھے پر انہوں نے ان سے اپنی نفرتی مورتیں اور مکروہ چیزیں بنائیں۔ اس لیے میں نے ان کے لیے ان کو ناپاک چیز کے مانند کر دیا اور میں ان کو غنیمت کے لیے پردیسیوں کے ہاتھ میں اور لوٹ کے لیے زمین کے شریروں کے ہاتھ میں سونپ دوں گا اور وہ ان کو ناپاک کریں گے اور میں ان سے منہ پھیر لوں گا اور وہ میرے خلوت خانے کو ناپاک کریں گے۔ اس میں غارت گر آئیں گے اور اسے ناپاک کریں گے۔

میں غیر قوموں میں سے بدترین کو لاؤں گا اور وہ ان کے گھروں کے مالک ہوں گے اور میں زبردستوں کا گھمنڈ مٹاؤں گا اور ان کے مقدس مقام ناپاک کیے جائیں گے۔ وہ سلامتی کو ڈھونڈیں گے اور نہ پائیں گے۔ بلا پر بلا آئے گی اور افواہ پر افواہ

اہم انتباہ

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ مشتہرین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضایع کر دی جاتی ہے، قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست مشتہرین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمے داری نہیں ہوگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آئے گی۔ تب وہ نبی سے رویا کی تلاش کریں گے لیکن شریعت کاہن سے اور مصلحت بزرگوں سے جاتی رہے گی۔ بادشا
کرے گا اور حاکم پر حیرت چھا جائے گی اور رعیّت کے ہاتھ کانپیں گے۔ میں ان کی روش کے مطابق ان سے سلوک کروں گ
ان کے اعمال کے مطابق ان پر فتویٰ دوں گا تاکہ وہ جانیں کہ میں خدا ہوں۔''

☆☆☆

صدقیاہ پر مسلسل دباؤ تھا کہ بابل کے خلاف بغاوت میں مصر کا ساتھ دے۔ فرعون مصر نکوہ کی جگہ دوسرا بادشاہ متعین ہو
تھا۔ اس نے ایک متحدہ محاذ بنا کر بابل کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ بابل پر حملہ کرنے کے لیے نئے فرعون کو یروشلم سے
داری کی اجازت لینا پڑتی تھی۔ اس سہولت کے لیے فرعونِ مصر نے صدقیاہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ حضرت یرمیاہ ع
السلام نے کلامِ خداوندی کی روشنی میں اس کی مخالفت کی۔ وہ ہیکل کے صحن میں کھڑا ہو گئے اور منادی کی۔

''خداوند فرماتا ہے جو قوم شاہ بابل کے سامنے اپنی گردن نہ جھکائے گی اس قوم کو میں تلوار، کال اور وبا سے سزا دوں گ
یہاں تک کہ میں اس کے ہاتھ سے اسی کو نابود کر ڈالوں گا۔ پس تم اپنے نبیوں اور غیب دانوں کی نہ سنو جو تم سے کہتے ہیں کہ تم
بابل کی خدمت گزاری نہ کرو کیونکہ وہ تم سے جھوٹی نبوت کرتے ہیں۔''

جھوٹے نبی لوگوں کو بغاوت پر اکسانے لگے تو حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی مخالفت میں اضافہ ہو گیا۔ جھوٹے نبی اسیرو
کو بھی یہ کہہ کر الجھن میں ڈالنے لگے کہ ہیکل کے خزانے جلد ہی واپس کر دیے جائیں گے۔ حضرت حزقیل علیہ السلام کے برعک
وہ جلاوطنوں کو یہ یقین دلاتے تھے کہ تم جلد اپنے وطن میں بحال کیے جاؤ گے۔

اس وقت مصر کے نئے فرعون نے ایشیا کے خلاف ایک زبردست مہم منظم کی۔ عمون اور یہوداہ نے بغاوت کر دی تو بخت
نصر نے خود کو جلدی سے ارام میں ربلہ کے مقام پر مستحکم کر لیا اور اس کی فوج نے یروشلم کا محاصرہ کر لیا کیونکہ صدقیاہ نے خرا
دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مصر اور یروشلم کے درمیان یہ معاہدہ ہو گیا تھا کہ اگر کبھی بخت نصر، یروشلم پر حملہ آور ہوا تو مصر کا فرعو
اس کی مدد کرے گا۔ صدقیاہ یہ معاہدہ کرتے وقت یہ بھول گیا تھا کہ بابل کی چھاؤنیاں شام میں جگہ جگہ قائم ہیں۔ ان چھاؤنیو
کی مدد سے بخت نصر مصری فوجوں کی آمد روک سکتا تھا۔

یہ سامنے کی بات تھی۔ اسے سوچنا چاہیے تھا لیکن خدا کی منشا کو پورا ہونا تھا۔ حالات اسی طرف جا رہے تھے جن کا اظہا
حضرت حزقیل علیہ السلام کرتے رہے تھے لیکن صدقیاہ کی آنکھوں پر غفلت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے درمیان چلتے پھر
حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی بات سننے اور اس پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھا تو دور بیٹھے حضرت حزقیل علیہ السلام کے پیغامات اس
کیا اثر انداز ہوتے۔

حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے اس مرتبہ بھی صدقیاہ کو مشورہ دیا کہ وہ ہتھیار ڈال دے مگر صدقیاہ اس پر آمادہ نہیں تھا۔
یہ بحث چل ہی رہی تھی کہ معلوم ہوا بخت نصر کی فوجوں نے محاصرہ اٹھا لیا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ مصر کی فوجیں یہوداہ کی مد
کے لیے نکلی تھیں۔ بابل کی فوجیں مصر کی طرف متوجہ ہو گئیں اور محاصرہ اٹھ گیا۔ جھوٹے نبیوں کو بغلیں بجانے کا موقع مل گیا۔
حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے خبردار کیا۔

''اس وقتی حادثے پر خوش نہ ہو جاؤ۔ بابل بہت جلد محاصرہ کر لے گا۔''

حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی بات سننے کو کوئی تیار نہیں تھا۔ اب صدقیاہ پوری طرح اپنے مشیروں کے حصار میں تھا۔ بادشا
کے امیروں نے حضرت یرمیاہ علیہ السلام کو گرفتار کر لیا۔ ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ بابل کے ساتھ مل گیا ہے۔ معاملہ غداری کا
تھا۔ اس کی سزا قتل ہونا چاہیے تھی لیکن امیروں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے قید خانے میں ڈال دیا جائے تاکہ وہ بادشاہ کو
بہکانے سے معذور رہے۔

(جاری ہے)

ماخذات

توریت - عہدِ تحقیق کا تاریخی سفر - قصص الانبیاء - قصص القرآن - انبیاء قرآن

"بڑی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ انسان ہمیشہ بڑے مقصد کو ذہن میں رکھے" اکثر بہروپیے اسی مقولے پر عمل کرتے ہوئے پوری زندگی گزار دیتے ہیں۔ کیونکہ آوارہ گرد لوگوں میں کوئی خوبی ہو یا نہ ہو مگر ایک خوبی گویا ان پر ختم ہے، اور وہ ہے ... چرب زبانی ... میٹھے میٹھے بول بچّن دیتے دیتے وہ کمال کے ایکٹر بن جاتے ہیں اور ان ہی فنکارانہ صلاحیتوں نے اس کی آوارہ گردی کو بھی ایک ایسی خوبی ثابت کر ڈالا ..."محبت اور دولت" دونوں نے ہی اس کے پیروں میں ڈیرے ڈال دیے۔

چلتے چلتے لوگوں کو چلانے والے ایک گروہ کی آوارگی کا احوال

آوارہ گرد

تنویر ریاض

لوگوں کی نظر میں آوارہ گردی ایک قابلِ اعتراض عمل ہے لیکن میرا تجربہ اس سے مختلف ہے۔ مجھے ہمیشہ سے ہی گھومنے پھرنے کا شوق ہے اور میں کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کبھی نو سے پانچ والی ملازمت نہیں کی اور ہمیشہ گھوم پھر کر ہی چار پیسے کمائے۔ میں اس کہانی کا آغاز ایک چھوٹے سے واقعے سے کرتی ہوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ میں نے جو تمہید باندھی ہے۔ اس کی بنیاد کیا ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اور پٹی نوجوانی کی حدود میں داخل ہو رہے تھے۔ ہم اپنی گزر اوقات اور تعلیمی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اخراجات پورے کرنے کے لیے مختلف نوعیت کے کام کیا کرتے تھے۔ کوئی مستقل روزگار نہ ہونے کی وجہ سے آوارہ گردی ہمارا مقدر بن چکی تھی۔ ان دنوں ہم نے مچھلی بیچنے کا کام شروع کیا تھا۔ ہم مضافاتی علاقوں کنٹربری، آکسفورڈ، کیمبرج، چیسٹر اور ہیروگیٹ کے ریستورانوں میں مچھلی سپلائی کرتے اور اس کام کے عوض معقول کمیشن مل جاتا۔ ہمارے پاس سفید رنگ کی فورڈ وین تھی جس پر سنہری حروف سے لکھا ہوا تھا۔ ''اسمتھ اینڈ سنز تازہ مچھلی فراہم کرنے والے۔''

اس روز چار بجے کا وقت ہوگا۔ ہم جیسے ہی مرکزی چوک میں پہنچے تو گاڑی ایک جھٹکے سے بند ہوگئی اور کئی بار کی کوشش کے باوجود اسٹارٹ نہ ہوسکی۔ ہم دونوں کو صرف گاڑی چلانا آتی تھی لیکن بونٹ کے نیچے کیا ہے، اس بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہ تھا۔ ویسے بھی 1969ء کا زمانہ تھا جب عورتوں کے بارے میں عام خیال یہی تھا کہ وہ ان چیزوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ اس کے باوجود میں نے بونٹ اٹھا کر اندر جھانکا۔ پیٹی نے ایک دو تاروں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ بھی کی لیکن کچھ نہ ہوا۔

خوش قسمتی سے وہیں ایک پبلک ٹیلی فون بھی تھا۔ پیٹی دوڑی دوڑی گئی۔ اس نے پہلے مددگار ٹیم اور پھر مسٹر اسمتھ کو فون کر کے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ جب واپس آئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے، اس نے مجھے مسٹر اسمتھ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا تو میں بھی رونے لگی۔ ایسا کئی بار ہو چکا تھا اس لیے مجھے اور پیٹی کو اپنے جذبات کے اظہار میں مشکل پیش نہیں آئی۔

کئی بار ایسا ہوا کہ اس چھوٹے سے ڈرامے کی بدولت خواتین اپنے گھروں سے باہر آجاتیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ لوگ اس صورت حال پر توجہ نہ دیتے تو ہمیں گھروں کے دروازے کھٹکھٹا کر انہیں اپنی داستان غم سنانا پڑتی اور اس کے نتیجے میں ہم ان کی ہمدردیاں سمیٹنے میں کامیاب ہوجاتے لیکن یہ چوراہا ایسی جگہ پر تھا جہاں لوگ ہماری طرف ضرور متوجہ ہوتے۔ ویسے بھی میں نے گاڑی اس طرح کھڑی کی تھی کہ دوسرے ڈرائیوروں کی نظر اس پر ضرور جاتی۔

''کیا کوئی پریشانی ہے؟'' کسی ہمدرد خاتونِ خانہ نے پوچھا۔

''ہماری گاڑی خراب ہوگئی ہے اور ریسکیو ٹیم تین گھنٹے سے پہلے نہیں آئے گی۔ اس طرح تو یہ مچھلی خراب ہوجائے گی۔'' میں نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''مسٹر اسمتھ ہماری کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دوسری گاڑی کا انتظام کر کے مچھلی گاہکوں تک پہنچائی جائے ورنہ یہ نقصان ہمیں پورا کرنا ہوگا۔'' پیٹی نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

اس زمانے میں سرد خانہ والی گاڑیوں کا رواج عام نہیں تھا۔ اس لیے وہ خواتین فوراً ہی ہماری بات پر یقین کر لیتیں۔

''یہ تو بہت بری بات ہے۔'' کسی عورت نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''اس کی ہمت کیسے ہوئی یہ بات کہنے کی؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ دوسری گاڑی کا ملنا کتنا دشوار ہوتا ہے۔''

''اس میں تمہاری تو کوئی غلطی نہیں ہے۔'' تیسری عورت نے ہمارا دل رکھنے کے لیے کہا۔

''یہ بات وہ بھی جانتا ہے لیکن اپنا نقصان کون برداشت کرسکتا ہے۔'' میں نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

وہ سب عورتیں ہاتھ پھیلا پھیلا کر ہمارے مالک کو مختلف القابات سے نوازنے لگتیں لیکن اس طرح ہمارا نقصان پورا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس دوران میں ہم انہیں رو رو کر اپنی داستان سنا چکے ہوتے کہ ہماری جیب خالی ہے۔ ہمارے پاس کوئی روزگار نہیں اور ہم اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے یہ کام کرنے پر مجبور ہیں۔

''تمہارا تو بہت نقصان ہوجائے گا۔'' ایک عورت نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

ہماری وین پر لکھا ہوا تھا۔ اعلیٰ معیار کی سی فوڈ۔ اسے ثابت کرنے کے لیے پیٹی نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر سامنے رکھے ہوئے نصف درجن ڈبوں کا ڈھکنا اٹھا دیا اور بولی۔ ''ہم یہ خوراک اعلیٰ درجے کے ریستورانوں کو سپلائی کرتے ہیں لیکن آج ان کے گاہک بھی اس سے محروم رہ جائیں گے۔''

''مجھے ایک ڈبا خریدنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔'' ایک عورت نے پیشکش کی۔

''مجھے بھی۔'' دوسری عورت نے فراخ دلانہ انداز میں کہا۔

میں اور پیٹی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور دل ہی دل میں حساب لگایا کہ اس سڑی ہوئی مچھلی کے کیا دام وصول کیے جائیں پھر پیٹی نے روایتی آواز میں کہا۔

''کم از کم اس طرح ہمارے نقصان کا کچھ ازالہ ہوجائے گا۔''

''تم جانتی ہو کہ یہ اعلیٰ قسم کی مچھلی ہے اور ریستوران کو

ں قیمت پر فراہم کی جاتی ہے۔'' یہ کہہ کر میری نظر ایک بے پر گئی جس پر اس کی قیمت پانچ پاؤنڈ لکھی ہوئی تھی۔

''میں تمہیں اس کا ایک پاؤنڈ دے سکتی ہوں۔'' کسی رت نے کہا۔

''تین پاؤنڈز۔'' پیٹی نے بہ آواز بلند کہا۔

میں سوچ رہی تھی کہ پانچ بج چکے ہیں اور اب یہ ممکن ہیں رہا کہ یہ عورتیں ڈنر کے لیے یہ مچھلی پکا سکیں لہٰذا میں نے پیشکش کی۔ ''صبح تک اس مچھلی کو محفوظ رکھنے کے لیے تمہیں زید برف کی ضرورت ہوگی۔''

ان عورتوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں وین کے ندر گئی اور بالٹی میں سے برف نکال کر ایک ٹرے میں رکھی ور اس میں باکس رکھ کر اسے ڈھک دیا۔ تھوڑی دیر میں مارے پاس سو پاؤنڈز جمع ہو چکے تھے۔ ان عورتوں کے جانے کے بعد ہماری گاڑی بھی حیرت انگیز طور پر ٹھیک ہوگئی ور ہم وہاں سے کھسک لیے۔ راستے بھر میں یہی سوچتی رہی کہ گھر جا کر جب انہوں نے وہ ڈبے کھولے ہوں گے تو سڑی ہوئی مچھلی کی ناگوار بو محسوس کر کے وہ ہمارے بارے میں کیا سوچ رہی ہوں گی؟

آہ، وہ بھی کیا دن تھے۔

☆☆☆

پیٹی سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں ڈیرک کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ پیٹی اور ڈیرک کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔ اس وقت پیٹی کی عمر صرف انیس برس تھی۔ میں یہ کبھی نہ جان سکی کہ اسے اس چھوٹی سی عمر میں شادی کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ میں اپنے ایک ساتھی روب کے ساتھ کافی بے تکلف ہوچکی تھی۔ اس میں کئی خوبیاں تھیں۔ ایک ماہر پتے باز ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مختلف لہجے اختیار کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ ان دنوں ہمارا گروپ مختلف مقامات پر مجمع لگا کر سیاحوں کے لیے مختلف کھیل تماشے کیا کرتا تھا۔

ڈیرک ہمارے گروپ کا سربراہ تھا اور شعبدہ بازی میں اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ کسی پرہجوم جگہ کا انتخاب کر کے اپنی سیاہ چھتری زمین میں گاڑ دیتا اور جیب سے تین بوتلوں کے ڈھکنے اور ایک مٹر کا دانہ نکال کر زمین پر رکھ دیتا اور نعرہ لگاتا۔

''آیئے خواتین وحضرات! اپنی قسمت آزمایئے۔''

اس کی بھاری، گرج دار آواز لوگوں کو فوراً ہی متوجہ کر لیتی اور وہ اس کے گرد جمع ہونا شروع ہوجاتے۔

''پہلے کون آئے گا۔ تم؟'' وہ کسی ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا۔

لوگ زور زور سے قہقہے لگانے لگتے۔ یہ کھیل تماشے ان کے لیے نہیں تھے لیکن وہ محض وقت گزاری کے لیے وہاں کھڑے ہوجاتے پھر روب، سوئیڈش سیاح کے روپ میں آگے بڑھ کر شرط لگاتا اور جیت جاتا۔ اس کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی آگے بڑھتے اور ہار جیت کا سلسلہ شروع ہوجاتا۔ شرطیں لگتی رہتیں اور ڈیرک نوٹ سمیٹتا رہتا۔ میرے ساتھ کھڑا ہوا شخص تین مرتبہ ہار چکا تھا۔ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی اور کہا۔ ''اب میں شرط لگاتی ہوں اور جیت میری ہوگی۔''

یہ کہہ کر میں آگے بڑھی اور زور سے بولی۔ ''دس پاؤنڈز۔''

ڈیرک نے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ ''میں صرف ایک مرتبہ مٹر کا دانہ دیکھنا چاہتی ہوں۔''

اس نے مجھے بوتل کا ڈھکنا اٹھانے کی اجازت دے دی اور میں نے سب کی نظر بچا کر اس ڈھکنے پر لپ اسٹک کا نشان لگا دیا جس کے بارے میں وہ مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا۔ جب کھیل شروع ہوا تو میں نے اسی ڈھکنے کی طرف اشارہ کر دیا اور شرط جیت گئی، میری جیت سے مجمع کا جوش وخروش بڑھ گیا اور وہ بڑھ چڑھ کر شرطیں لگانے لگے۔ اچانک ہی ڈیرک کی نظر لپ اسٹک کے نشان پر گئی اور وہ ایک عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ حرکت تم نے کی ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے غصہ سے کہا اور میری طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے اسے مجھ پر شک ہو رہا ہو۔

''ٹھیک ہے۔'' ڈیرک نے اپنا سامان سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''اس بے ایمانی کے ہوتے ہوئے میں یہ کھیل جاری نہیں رکھ سکتا۔'' پھر اس نے میری جانب غصے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ہاتھوں سے شعبدہ بازی کرتا ہوں لیکن بے ایمان نہیں ہوں۔ تمہیں ایسا کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔'' یہ کہہ کر وہ بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد بھی میرے کانوں میں اس کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا کہ کوئی ایسی گھٹیا حرکت بھی کرسکتا ہے۔ اگر تمہاری جگہ کوئی مرد ہوتا تو میں ایک ہی گھونسا مار کر اس کی ناک توڑ دیتا۔''

میں نے وہاں موجود لوگوں سے معذرت کی جو آہستہ آہستہ منتشر ہو رہے تھے۔ اس دوران میں کسی کو یاد نہ رہا کہ وہ ڈیرک سے اپنے پیسوں کی واپسی کا مطالبہ کرتا جو کھیل مکمل کیے بغیر ہی وہاں سے رفو چکر ہوگیا تھا۔ اس طرح آدھے گھنٹے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے اندر ہی ہم کسی دفتر میں کام کرنے والے شخص کی ایک ہفتے کی تنخواہ کے برابر پیسے اکٹھے کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ آپ ہی بتایئے کہ اس سے اچھا کوئی اور کام ہو سکتا ہے؟

گرمیوں کا سیزن ہمارے لیے بہت نفع بخش ثابت ہوا۔ ہم سب مختلف سوانگ بھرتے۔ فٹ پاتھ اور سڑکوں پر لوگوں کو جمع کر کے ان کا دل بہلاتے اور اپنی جیبیں بھر لیتے۔ ہم کسی کو دھوکا نہیں دے رہے تھے، کسی جیب نہیں کاٹ رہے تھے اور نہ چوری یا ڈاکا زنی میں ملوث تھے۔ ہم لوگوں کی تفریح طبع کے لیے نامور اداکاروں کا روپ دھارتے۔ انہیں لطیفے اور گانے سناتے اور ان سے داد کے ساتھ ساتھ انعام بھی وصول کرتے۔ یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب کرسچین برنارڈ نے دنیا میں تبدیلی قلب کا پہلا آپریشن کیا تھا اور بیٹلز نے اپنی موسیقی سے دھوم مچا دی تھی پھر ایک واقعہ ایسا پیش آ گیا جس کے بارے میں ہم نے سوچا بھی نہ تھا۔

ڈیرک اپنے والدین سے ملنے کے لیے پیٹی کے ہمراہ کار میں سفر کر رہا تھا کہ ویلس کے علاقے میں اس کی گاڑی بے قابو ہو کر گہرے کھڈ میں جا گری۔ ایسے علاقوں میں ڈرائیونگ کرنا ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے۔ آپ سورج کی روشنی میں سیدھی سڑک پر چلے جا رہے ہیں کہ اچانک ہی چڑھائی شروع ہو جاتی ہے اور آپ کو پیچ در پیچ تنگ سڑک پر سفر کرنا پڑ جاتا ہے۔ پھر اچانک ہی بادل چھا جاتے ہیں اور آپ کے لیے گاڑی کے بونٹ سے آگے دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ڈیرک کو گہری دھند کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے پیٹی گاڑی سے اتری اور پیدل چل کر اس کی راہنمائی کرنے لگی۔ وہ اتنی آہستگی سے گاڑی چلا رہا تھا جس کی وجہ سے غالباً کار کا انجن بند ہو گیا۔ ڈیرک نے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی جس کے دوران میں اس کا دباؤ ایکسی ایکسی لریٹر پر کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا اور گاڑی بے قابو ہو کر نیچے جا گری۔ پیٹی اس منظر کی تاب نہ لا سکی اور بے ہوش ہو گئی۔ ڈیرک چھبیس سال کی عمر میں اسے تنہا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

☆☆☆

ایک سال اور گزر گیا۔ اس دوران میں کئی اہم واقعات پیش آئے۔ روب کو اندازہ ہو گیا کہ جرمن اور ڈچ لڑکیوں کے لہجے کی نقل اتارنے کے بجائے ان سے دوستی کرنے میں زیادہ مزہ ہے۔ لہٰذا وہ مجھ سے دور ہوتا گیا۔ میں بھی بچی نہیں رہی تھی اور جوانی مجھ پر ٹوٹ کر آئی تھی۔ البتہ گزرے ہوئے دن اور پرانی باتیں مجھے بہت یاد آتی تھیں، میں جب دس سال کی تھی تو ڈیڈی نے کہا تھا۔ ''کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ انسان ہمیشہ بڑے مقصد کو ذہن میں رکھے۔''

یہ واحد مشورہ تھا جسے میں کبھی نہیں بھول پائی۔ تین ہفتے بعد انہوں نے میری ماں کو آخری بار مارا۔ اپنا سامان سمیٹا اور ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کے بعد میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا اور یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ زندہ ہیں یا مر گئے۔

پیٹی کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ بہتر زندگی گزارنے کے لیے کون سا راستہ اختیار کیا جائے؟ ڈیرک اور روب کے بعد ہمارا گروپ ختم ہو گیا تھا اور پیسوں کے بغیر ہمارے لیے ایک ایک دن گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ پیٹی کو ڈیرک کی بیمہ پالیسی کے عوض کچھ رقم ملی تھی۔ اس سے ہم نے ایک پرانی وین سال بھر کے لیے کرائے پر حاصل کی۔ اس پر سنہرے حروف میں اے۔ اے۔ اسمتھ اینڈ کمپنی کا نام لکھوایا اور مچھلی بیچنے کا کام شروع کر دیا۔ ہم اپنے کاروبار کے سلسلے میں مختلف شہروں اور قصبوں کا انتخاب کرتے اور ہماری کوشش یہی ہوتی کہ ایک دفعہ جس سڑک یا گلی سے گزریں تو دوبارہ وہاں کا رخ نہ کیا جائے۔ یہ تجربہ بے حد کامیاب رہا۔ مفت کی سیر ہو رہی تھی اور ٹھیک ٹھاک پیسے ہاتھ میں آ رہے تھے۔

وہ جو کہتے ہیں کہ ہر اچھے کام کو ایک نہ ایک دن ختم ہو ہی ہوتا ہے۔ یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔ میں بہت جلد اس کام سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگی۔ ایک تو اس میں منافع بہت کم تھا اور دوسرے ہر وقت پکڑے جانے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ ہم ایک معروف کمپنی کا نام استعمال کر کے مچھلیاں بیچ رہے تھے اور کسی وقت بھی گرفت میں آ سکتے تھے۔

آپ نے فلائٹ ڈیک کا نام تو سنا ہو گا۔ ایک زمانے میں اس بینڈ کے گانوں نے دھوم مچا رکھی تھی، ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سو بہترین گانوں کی فہرست میں ان کا ایک گانا اڑتیسویں اور دوسرا چوبیسویں نمبر پر آیا۔ مائیک اس بینڈ کے ساتھ ڈرم بجاتا تھا۔ میں بالکل اتفاقیہ طور پر اس سے ایک نائٹ کلب میں ملی اور ہم ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے۔ اس کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور تین سال تک میرے قدم زمین سے اوپر ہی رہے۔ ڈیڈی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ آدمی کو ہمیشہ اپنے ذہن میں بڑا مقصد رکھنا چاہیے۔ گو کہ فلائٹ ڈیک نے کبھی بڑے شہروں یا امریکا میں اپنے فن کا مظاہرہ نہیں کیا لیکن ہم برطانیہ، جرمنی، اٹلی اور ہالینڈ وغیرہ کا دورہ کرتے رہے اور جہاں بھی گئے ہمیں پذیرائی ملی۔

ہم سب جانتے تھے کہ یہ سلسلہ زیادہ عرصہ نہیں چلے گا لیکن اس کے باوجود حال میں مست تھے، کل کی کسی کو پروا

نہیں تھی اور آج بھی جب میں فن لینڈ، ناروے، سوئیڈن اور مختلف شہروں میں ہونے والے کنسرٹ کی تصاویر دیکھتی ہوں تو میرے حلق میں ایک گولہ سا اٹکنے لگتا ہے۔ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ہمارے بینڈ پر بھی زوال آنے لگا۔ ہمارے گروپ کے نغمہ نگار اور شاعر کو اچانک ہی مذہب سے رغبت ہو گئی اور اس کی شاعری میں دھوم دھڑکے کے بجائے نیند کی گولی کا تاثر ملنے لگا جسے سن کر لوگ جمائیاں لینے لگے۔ اس صورت حال سے مایوس ہو کر گٹار بجانے والے موڈی نے انجینئرنگ کالج میں داخلہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسرا گٹارسٹ ڈیوی سوئمنگ پول میں چھلانگ لگاتے ہوئے اس دنیا سے چلا گیا۔

بینڈ کے ٹوٹ جانے کے بعد مائیک کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ ڈرم بجانے کے شوق کو خیرباد کہہ کر دوبارہ آبائی پیشے کی جانب لوٹ جائے کیونکہ کسی دوسرے بینڈ میں کام ملنا بہت مشکل تھا۔ اچھے اچھے ڈرم بجانے والے سڑکوں پر مارے مارے پھر رہے تھے اور جو نئے بینڈ سامنے آ رہے تھے، انہیں نئے چہروں کی ضرورت تھی جن کا نام وہ اپنی پبلسٹی میں شامل کر سکیں۔

وہ ایک اچھا پلمبر تھا اور مجھے اس پر کوئی شرمندگی نہیں تھی کہ وہ ایک بار پھر اپنا پرانا پیشہ اختیار کر رہا تھا لیکن میں اپنی آوارہ گرد فطرت کے تحت اس کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ مجھے آزادی اور اچھی زندگی گزارنے کا چسکا لگ گیا تھا اس لیے میں کسی دفتر میں نو سے پانچ کی ملازمت نہیں کر سکتی تھی۔ میرے ذہن میں بار بار گزرے وقت کی یادیں جھلملاتی رہتی تھیں جبکہ مائیک اپنی نئی زندگی میں مگن تھا لہٰذا میں خاموشی سے اس کی زندگی سے چلی آئی تاکہ دنیا کے بازار میں اپنے وقت کی قیمت وصول کر سکوں۔

میں شہروں شہروں، ملکوں ملکوں گھومتی۔ فلوریڈا، میجوریکا، کینری آئس لینڈ، قبرص ہر جگہ میرے چاہنے والے موجود تھے۔ پھر ایک دن پیٹی دوبارہ میرے راستے میں آ گئی۔ اسے دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوئی۔ ہم دونوں نے جی بھر کر باتیں کیں۔ ایک دوسرے کو اپنی کہانیاں سنائیں۔ قہقہے لگائے، کبھی کبھی آنسو بھی آئے اور آخر میں اس پر متفق ہو گئے کہ ہم دونوں تیس سال کی ہو جانے کے باوجود بہت سی عورتوں سے زیادہ خوب صورت ہیں۔

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے اسٹیوی!'' بالآخر پیٹی بول پڑی۔ ''تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں جس سے میں یہ بات کہہ سکوں۔''

''دفع کرو پیٹی'' میں نے شمپین کی دوسری بوتل کھولتے ہوئے کہا۔ ''ہم ویت نام اور فاک لینڈ جیسی جگہوں پر جا چکے ہیں۔ اب تم کہاں جانا چاہتی ہو؟''

''میں کہیں جانے کے لیے نہیں کہہ رہی۔'' پیٹی اپنا گلاس میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں ڈین کی بات کر رہی ہوں۔ وہ میرا شوہر ہے اور میرا خیال ہے کہ ان دنوں کسی دوسری عورت سے مل رہا ہے۔''

مجھے یہ جان کر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی کہ پیٹی نے دوسری شادی کر لی تھی۔ بے شک اسے ڈیرک سے بہت محبت تھی لیکن وہ اسے چھوڑ کر ایسی جگہ چلا گیا تھا جہاں سے واپسی ممکن نہیں، اسے ڈیرک کا صدمہ بھلانے میں دیر تو لگی ہو گی لیکن اس کے بعد اس نے دوسری شادی کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ میرے چہرے کے تاثرات بھانپتے ہوئے بولی۔

''میں تنہا رہ گئی تھی اسٹیوی۔ پہلے ڈیرک کا انتقال ہوا پھر تم بھی مجھے چھوڑ کر مائیک کے ساتھ چلی گئیں پھر جب نارمن نے مجھے پرپوز کیا تو میں انکار نہ کر سکی لیکن یہ تعلق دو سال بھی قائم نہ رہ سکا اور میں ایک بار پھر تنہا ہو گئی۔''

''تم ڈین کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں۔'' میں نے اسے یاد دلایا ''کیا وہ اس سے مختلف نہیں ہے؟''

اس کا چہرہ تمتما اٹھا اور وہ پرجوش لہجے میں بولی۔ ''ڈیرک کے بعد پہلی بار مجھے سچی خوشی ملی ہے، اس بار میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔''

اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک تصویر نکالی اور مجھے تھماتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو! کتنا اسمارٹ ہے۔''

میں نے تصویر کو غور سے دیکھا۔ وہ پال نیومن یا ٹام بیرنگر کی طرح ہینڈسم اور اسمارٹ تو نہیں البتہ قبول صورت ضرور تھا۔ ماتھے پر سامنے کی طرف سے اس کے بال اڑ چکے تھے۔ اس کے باوجود خوب صورت مسکراہٹ اور آنکھوں کی ذہانت نے اس کی شخصیت کو باوقار بنا دیا تھا۔ وہ کسی صورت بھی احمق نظر نہیں آ رہا تھا اور یہی بات میں نے پیٹی کو بھی بتا دی۔

''میں جانتی ہوں اسٹیوی!'' وہ جلدی سے بولی۔ ''لیکن وہ بہت امیر کبیر ہے۔ لاکھوں کروڑوں میں کھیلتا ہے اور اس طرح کے لوگ معاملات کو مختلف انداز سے دیکھتے ہیں۔'' اس نے اپنے لیے ایک اور گلاس بھرا اور اسے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولی۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ اسے اپنی تند مزاجی اور تلخ کلامی کا کوئی احساس ہوتا ہو گا۔ اس نے مجھے قسمیں کھا کر اپنی محبت کا یقین دلایا تھا اور کہا تھا کہ ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے لیکن ایک دن.....''

''کیا تم ان چھوٹی موٹی باتوں کو نظرانداز نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرسکتیں؟'' میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ پھٹ پڑی اور چلاتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم یہ برداشت کرلوگی کہ تمہارا شوہر کسی دوسری عورت کے ساتھ رات گزارے؟''

ظاہر ہے کہ میرا جواب نفی میں تھا۔ میں کیا دنیا کی کوئی بھی عورت یہ برداشت نہیں کرسکتی چنانچہ یہی بات میں نے اسے بھی بتادی۔

''میں کسی پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کرنا نہیں چاہتی۔''

''میں اس سلسلے میں کیا کرسکتی ہوں؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

پیٹی کو پوری طرح یقین نہیں تھا کہ وہ اسے بے وقوف بنارہا ہے۔ وہ بولی۔ ''اس کا کہنا ہے کہ وہ دوستوں کے ساتھ پوکر کھیلتا ہے۔ اسی لیے بعض اوقات اسے گھر آنے میں دیر ہوجاتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی بات میں سچائی ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم اس پر نظر رکھ سکو۔ وہ تمہیں نہیں جانتا اس لیے اسے بالکل بھی شبہ نہیں ہوگا۔ اس طرح میرے دماغ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سکون مل جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''تم بتادینا۔ وہ مجھے کب اور کہاں مل سکتا ہے؟''

☆☆☆

سچی بات تو یہ ہے کہ وہ مجھے ہزاروں مردوں سے بہتر نظر آیا۔ شاید دولت کی فراوانی نے اس کی شخصیت میں نکھار پیدا کردیا ہو۔ وہ ٹریبل۔ ڈی۔ ہولڈنگ کمپنی کا ایم ڈی تھا جو پراپرٹی کا کاروبار کرتی تھی گوکہ آج کی طرح 1983ء میں اس کاروبار نے اتنی وسعت اختیار نہیں کی تھی لیکن اس کے باوجود یہ ایک منافع بخش کاروبار تھا۔ اس روز خوش قسمتی سے لندن کا ٹریفک معمول سے کم تھا۔ میں اس کا تعاقب کرتے ہوئے یارک لین میں واقع ڈور چیسٹر تک پہنچ گئی۔ اس نے گاڑی کی چابیاں پارکنگ میں متعین اسٹاف کے حوالے کیں اور آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے بار کی جانب بڑھ گیا۔

گویا پیٹی کا شبہ درست تھا۔ ڈین اپنے دوستوں کے ساتھ پوکر کھیلنے نہیں بلکہ کسی سے ملنے کے لیے یہاں آیا تھا۔ اس لحاظ سے پیٹی نے بروقت اور درست قدم اٹھایا تھا۔ آج کے دور میں وہی لوگ کامیاب ہیں جو لوگوں اور صورتِ حال کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اگر حالات اور واقعات پر کڑی نظر رکھی جائے تو کسی بھی مسئلے کو شروع ہونے سے پہلے ہی دیکھا جاسکتا ہے۔

میں ایک ایسے کیبن میں بیٹھ گئی جہاں سے اس پر نظر رکھ سکوں لیکن وہ اپنی جگہ سے مڑے بغیر مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ویٹر کو مشروب کا آرڈر دیا اور میز پر پڑا ہوا اخبار دیکھنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد میں نے دیکھا کہ سفید اسکرٹ میں ملبوس ایک لڑکی بار میں داخل ہوئی اور پیٹی کے شوہر کی برابر والی نشست پر بیٹھ گئی۔ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں جبکہ میں اسے ڈین کی سیکریٹری کی حیثیت سے پہچان چکی تھی۔ وہ دونوں باری باری نظریں گھما کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے جیسے پکڑے جانے کا خطرہ ہو۔ ڈین نے اسے ڈرنک کی پیشکش کی لیکن اس نے سر ہلا کر انکار کردیا پھر وہ تھوڑا سا آگے کی جانب جھکی اور سرگوشی کے انداز میں کچھ کہنے لگی۔ ایک منٹ بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ڈین نے اپنا گلاس خالی کیا اور وہ بھی وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ لفٹ کی جانب بڑھا اور ساتویں منزل کا بٹن دبادیا۔

☆☆☆

پیٹی تک یہ خبر پہنچانا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن وہ اس طرح کے صدمات سہنے کی عادی ہوچکی تھی۔ اس نے ڈین کو برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ جب وہ اپنی بھڑاس نکال چکی تو میں نے اسے کسی وکیل کی خدمات حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ پھر میں نے خود ہی اپنی جاننے والی ایک خاتون وکیل کو فون کرکے اسے پوری بات سمجھادی۔ پیٹی بار بار میرا شکریہ ادا کررہی تھی اور اس کا کہنا تھا کہ میں ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کی بہترین دوست ہوں۔ اس نے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے کہا۔

''ایک دفعہ طلاق کی کارروائی مکمل ہوجائے۔ اس کے بعد میری زندگی میں کوئی مرد نہیں آئے گا۔'' وہ پختہ لہجہ میں بولی۔ ''ممکن ہے کہ ہم دونوں کو ایک بار پھر سڑکوں کی خاک چھاننا پڑے۔''

''تم جانتی ہو کہ میں گھوم پھر کر اور اپنا وقت بیچ کر پیسے کماتی ہوں۔ ابھی مجھے اسی سلسلے میں رہوڈز اور مالٹا جانا ہے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد ہی تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں۔''

رہوڈز اور مالٹا کے بعد میں اسپین چلی گئی۔ جہاں زندگی کی رنگینیاں سارا سال عروج پر رہتی ہیں۔ میلے ٹھیلے، کھیل، ثقافتی شو اور انواع واقسام کے کھانوں سے بھرے ہوئے ریستوران دنیا بھر کے سیاحوں کے لیے کشش کا باعث ہیں۔ میں نے بھی اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کیا اور مستقبل کے لیے پس انداز کرتی رہی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سال گزر گئے پھر مجھے گھر کی یاد ستانے لگی اور میں واپس برطانیہ آ گئی۔

میرے پاس پیٹی کا نمبر نہیں تھا لہٰذا میں ایک موہوم امید کے سہارے اس سے ملنے رچمنڈ مل چلی گئی۔ اگر پیٹی کو طلاق ہوگئی ہوگی تب بھی مجھے وہاں سے اس کا پتا مل سکتا تھا۔ میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ دروازہ صفائی کرنے والی ملازمہ نے کھولا۔ میں نے اس سے پیٹی کے بارے میں پوچھا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''مسز ڈینئل تو عرصہ ہوا یہاں سے جا چکی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے تدفین کے بعد ہی یہ جگہ بیچ دی تھی۔''

''تدفین..... کس کی تدفین؟'' میں چونکتے ہوئے بولی۔

''میں مسز ڈین ڈینئل کی بات کر رہی ہوں، لگتا ہے وہ بے چارہ اپنی سادگی میں مارا گیا۔ وہ ایک خالی پلاٹ کا معائنہ کرنے گیا تھا۔ شاید وہ اسے خریدنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ کسی نے اس کے سینے میں تین گولیاں اتار دیں۔ اس کی گھڑی اور بٹوا بھی غائب تھا۔''

''تمہارے پاس اس کا پتا یا فون نمبر تو ہوگا۔''

''ایک منٹ ٹھہرو۔ میں دیکھتی ہوں۔''

واپس آنے کے بعد میں پیٹی کے بارے میں سوچتی رہی۔ واقعات کی کڑیاں ایک ایک کر کے ملتی گئیں اور پھر سب کچھ واضح ہوگیا۔ اس کہانی کا آغاز 67ء میں ہوا تھا اور مجھے اسی وقت اس کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے تھا۔ ڈیرک کے پاس انشورنس پالیسی تھی۔ اس نے چھبیس سال کی عمر میں ہی مستقبل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ پیٹی کار سے کیوں اتری اور اس نے ڈیرک کی غلط سمت میں رہنمائی کیوں کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کہر اور دھند کی وجہ سے ڈیرک کو ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ وہ پیٹی کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہا تھا جو بالآخر اسے موت کے منہ میں لے گیا اور اس کے انشورنس کی رقم پیٹی کو مل گئی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ پیسے زیادہ عرصہ اس کا ساتھ نہ دے سکیں گے چنانچہ اس نے ایک سال کا کرایہ ادا کر کے وہ وین حاصل کر لی جس پر ہم مچھلیاں بیچا کرتے تھے۔

پھر اس کی زندگی میں نارمن آیا۔ وہ بہت دولت مند نہیں تھا لیکن اس کی آمدنی معقول تھی اور وہ ایک اچھی زندگی گزار رہا تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ خودکشی کر لے گا۔ اس کی موت پر پیٹی نے بہت واویلا مچایا اور برملا شکوہ کیا کہ نارمن نے اسے اپنی پریشانیوں کے بارے میں کبھی نہیں بتایا لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم تھی کہ وہ اس سے پہلے ہی بہت کچھ سمیٹ چکی تھی۔ البتہ اسے انشورنس کی رقم نہ مل سکی کیونکہ بیمہ کمپنیاں خودکشی کی صورت میں اس کی ادائیگی نہیں کرتیں۔

چارلی اس کا محبوب نہیں تھا لیکن کچھ عرصہ ان دونوں میں قربت رہی لیکن ایک دن وہ بھی خاموشی سے موت کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ میں نے ان چاروں کی فائلوں کا بغور مطالعہ کیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ پیٹی بہت سوچ سمجھ کر اپنے لیے مردوں کا انتخاب کیا کرتی تھی۔ ان کے خاندان میں کوئی ایسا قریبی رشتے دار موجود نہ تھا جو تعلق کی ابتدا یا اختتام پر سوال جواب کر سکتا لہٰذا میڈیا نے جو کہانی بیان کی، لوگوں نے اسی پر یقین کر لیا۔

''تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔'' میں نے فون پر غصے کے عالم میں کہا۔ ''ڈیرک، چارلی، نارمن اور اب ڈین..... یہ سب کیا ہے؟''

''سب جھوٹ نہیں تھا۔'' وہ نادم ہوئے بغیر بولی۔ ''تمہارے جانے کے بعد میں ایک مرتبہ پھر تنہا ہوگئی تھی حالانکہ مجھے اعتراف ہے کہ ڈین اتنا امیر نہیں تھا جتنا کہ میں سمجھ رہی تھی۔''

میں یہ بات جانتی تھی۔ اس کی سیکریٹری اب بھی اسی کمپنی میں کام کر رہی تھی۔ میری اس سے ایک طویل ملاقات ہوئی جس میں اس نے مجھے بتایا کہ ڈین اپنی بیوی کو شادی کی سالگرہ پر حیران کرنا چاہتا تھا۔ پیٹی شدت سے اس خواہش کا اظہار کر چکی تھی کہ وہ لندن کے پوشیٹ ہوٹل میں ویک اینڈ گزارنا چاہتی ہے چنانچہ اس نے اپنی سیکریٹری کو ہدایت کی کہ وہ کمرے میں شیمپین اور گلاب کے پھولوں کا انتظام کر دے۔ کچھ عجب نہیں کہ وہ انہی انتظامات کو دیکھنے کے لیے اس کے ساتھ ہوٹل گیا ہو۔

جس رات اس کا انتقال ہوا۔ پیٹی اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس گراؤنڈ تک پہنچی جسے خرید کر وہ قابل استعمال بنانا چاہ رہا تھا۔ اس کے بیگ میں بھرا ہوا پستول تھا، وہ جوش رقابت میں بھول گئی کہ کیا کرنے جا رہی ہے اور اس طرح ڈین بھی دوسری دنیا کو سدھار گیا۔

''میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔'' میں نے پیٹی سے کہا۔

''کیا پھر آوارہ گردی کا پروگرام ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔ اب تک جو کچھ ہم نے کیا ہے، یہ ان سب سے اچھا ہوگا۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوگا کیونکہ مجھے پیسوں کی سخت

ضرورت ہے۔'' پیٹی فون پر ہی ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم سوچ سکتی ہو کہ ڈین کے پاس جو کچھ تھا وہ سب قرضوں کی ادائیگی میں چلا گیا اور اب شاید ہی اس کے کاؤنٹ میں کچھ بچا ہو۔''

''سمجھ لو کہ تمہاری پریشانیاں ختم ہونے والی ہیں۔'' میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

☆☆☆

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ اور ہے۔ میں اور پیٹی اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے کہ بالکل اچانک ہی وہ حادثہ پیش آ گیا۔ اس روز ہم دونوں ایک ٹیلے پر کھڑے اسی بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ اچانک پیٹی کا پیر پھسلا اور وہ کئی فٹ نیچے جا گری۔ میں نے فوراً ہی پولیس، ایمبولینس اور فائر بریگیڈ کو فون کیا اور چلا چلا کر لوگوں کو مدد کے لیے پکارنے لگی۔ کچھ بھی ہو وہ میری بہترین دوست تھی۔

شاید پیٹی کی قسمت میں یہی لکھا ہوا تھا گو کہ میں کبھی نارمن یا چارلی سے نہیں ملی لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ شریف انسان تھے۔ یہی بات ڈین کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک با اخلاق اور بامروت شخص تھا۔ پہلے ڈیرک اور پھر ڈین کی موت کے بعد پیٹی مظلوم بن گئی اور اس نے پیسے کمانے کے لیے مجھے استعمال کیا تاکہ میں مظلوم سمجھ کر اس کی مدد کرتی رہوں۔ پیٹی نے یہ سب کچھ کیوں کیا۔ شاید اس لیے کہ ڈیرک میرا دوست تھا اور جب پیٹی کا سر پہلی بار چٹان سے ٹکرایا تو ڈیرک کی روح کو سکون مل گیا ہوگا۔ اب پیٹی کسی کے ساتھ کوئی کھیل نہیں کھیل سکے گی۔

اس واقعے کو دو مہینے گزر گئے۔ میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ پیٹی کے ساتھ بنایا ہوا پلان تو اس کی موت کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ اب مجھے نئے سرے سے کچھ سوچنا تھا۔ ایک دن بے دھیانی میں چلتے چلتے اس مکان کے آگے سے گزر رہی تھی جس میں مائیک کے ساتھ میں نے کچھ دن گزارے تھے۔ اس کے دروازے کے باہر ایک وین کھڑی ہوئی تھی جس پر لکھا ہوا تھا مائیک رابنسن پلمبر اینڈ سینٹرل ہیٹنگ انجینئر۔ گویا اب وہ معمولی پلمبر نہیں بلکہ بڑا آدمی بن چکا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ وہ یقیناً اس وقت گھر پر ہی ہوگا اور اپنے تین بچوں اور بیوی کے ساتھ فرصت کے لمحات سے لطف اندوز ہو رہا ہوگا۔ اس سے ملنے کے خواہش شدت سے ابھری تو میں نے گیٹ پر لگی ہوئی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ آخر میں کب تک اپنے تکیہ کے نیچے اس کا فوٹو رکھ کر سو سکتی تھی۔

دروازہ اس نے ہی کھولا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے حلق سے حیرت بھری چیخ برآمد ہوئی۔ ''اسٹیوی!''

پھر لمحوں میں ہی جدائی کے دس برس پانی کے بلبلے کی مانند ہوا میں تحلیل ہوگئے۔ اس نے شادی نہیں کی تھی اور نہ ہی اس کا کوئی بچہ تھا۔ اس کے کسی عورت کے ساتھ تعلقات نہیں تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ابھی تک سیٹل نہ ہو سکا تھا۔ ہم دونوں دیر تک فٹ پاتھ پر ٹہلتے رہے۔ ڈنر کیا اور دیر تک اپنے پسندیدہ مشروب سے دل بہلاتے رہے۔ صبح آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو اس کے بستر میں پایا۔

''میرا خیال ہے کہ اب تمہیں اس بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔'' اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

''شاید تمہیں یاد ہو کہ ہمارے درمیان ابھی تک طلاق نہیں ہوئی ہے۔''

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ مجھے فوری طور پر ایک سہارے کی ضرورت تھی لہٰذا اس کی پناہ میں آ گئی۔ اس کے باوجود ہم دونوں کی مصروفیات جدا جدا رہیں۔ وہ اپنے پروفیشن میں مگن تھا اور میں نے ایک بار پھر آوارہ گردی شروع کر دی لیکن مجھے ڈیرک کی بات یاد تھی۔ ہم اپنا فن دکھاتے ہیں، کسی سے بے ایمانی نہیں کرتے اور میں ہمیشہ اس پر کاربند رہی۔ میں جو کچھ کماتی وہ مائیک کی آمدنی کے مقابلے میں کسی بچے کے جیب خرچ کے برابر تھا۔ میرے آنے کے بعد اس کے اندر کا فنکار بھی بیدار ہوگیا اور اس نے شام کے اوقات میں کلب اور ہوٹلوں میں ڈرم بجانا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی وہ شوقیہ گانے بھی گا لیتا تو سننے والے جھوم جھوم اٹھتے اور بعض اوقات اسے ایک رات میں اتنی ٹپ مل جاتی جو اس کے پورے مہینے کی کمائی سے بھی زیادہ ہوتی۔

اب ہم جنوبی اسپین میں رہتے ہیں۔ ہمارے پاس ایک شاندار گھر ہے جس میں بہت بڑا سوئمنگ پول بھی ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ ساٹھ برس کی ہو چکی ہوں۔ دیکھنے میں اب بھی پینتالیس سے زیادہ کی نہیں لگتی۔ ایک بات تو بتانا بھول گئی، اب میں تصویریں بھی بنانے لگی ہوں اور مار بیلا میں میری اپنی گیلری بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پیٹی کو میری یہ پرسکون زندگی پسند نہیں آتی ہوگی اور آسمانوں پر بھی اسے مجھ سے حسد اور جلن محسوس ہو رہی ہوگی لیکن جب بھی یہ خیال آتا ہے تو سوچتی ہوں کہ خدا میرے ساتھ ہے اور وہ جو کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے ورنہ پیٹی سے جان چھڑانے کا آئیڈیا کبھی میرے دماغ میں نہ آتا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جنّت

ناصر ملک

جنّت اور جہنم کا تصور انسان کی پیدائش سے زیادہ قدیم ہے... جہنم کا احساس جتنا خوفناک... جنت کا اتنا ہی حسین مگر... اس کے حسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے انسان کو جانے کتنے ہی طوفانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جب قدم قدم پر آزمائش کے بھنور پیروں سے لپٹیں... جب خواب آنکھوں کو بصارت سے محروم کر دیں... جب خواہشات دل میں زخم بن جائیں تو انسان کا بچپن اچانک ہی بڑھاپے کی دہلیز کو چُھوتا محسوس ہوتا ہے... اور جوانی درمیان میں ہی گم ہو جاتی ہے۔

"وہ ابھی اُڑتا اور مگر... پھر زخمی ہو گئے پر" کے مانند اچانک آسمان کی بلندیوں سے یوں گرا کہ پیروں تلے بچھی پستی بھی اسے اپنے قد سے اونچی دکھائی دینے لگی... ایسے میں اگر بے چین لہریں ساحل سے ٹکرائیں، یا دریا میں سیلاب آجائے... یا کوئی پانی کی سطح پر ہی بسیرا کر لے تو عجب کیا۔

دنیا سے بے زار اور کچھ الگ سا کر گزرنے کی دھن میں مگن عجیب انسانوں کی عجیب داستان

عقل اپنا مطلب نکالنا بہ خوبی جانتی ہے۔ اگرچہ حسن عقل پر دبیز پردہ ڈال کر عقل کی جمع پونجی سمیٹتا ہے اور جُل دے کر نکل جاتا ہے۔ تبھی کہا جاتا ہے کہ دُنیا میں کامیاب ہونے کے لیے عقل اور حسن دونوں میں سے کسی ایک شے کا ہونا بہت ضروری ہے ورنہ قدم قدم پر حسرت انگیز ناکامیاں ملتی ہیں۔

اُس پر قدرت کچھ زیادہ ہی مہربان تھی۔ وہ ذہین اور عقل مند ہونے کے ساتھ ساتھ غیر معمولی حسن کی مالک بھی تھی۔ بولتی تو لاجواب کر دیتی اور اپنا آپ دکھا کر دھڑکتے دلوں کو دھڑکن سمیت مٹھی میں جکڑ لیتی تھی۔ وہ اکلوتی بیٹی ہونے کے ناتے نہایت لاڈلی اور خودسر واقع ہوئی تھی۔ ایک بھائی بڑا تھا، دوسرا چھوٹا۔ ایک طرف سے پیار وصول کرتی، دوسری طرف بچا کھچا پیار نچھاور کر دیتی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے باپ سلطان علی نے کئی سال پیشتر شہر میں ایک پرائیویٹ اسکول کی بنیاد رکھی تھی۔ اوائل میں اِس اسکول میں محنت کے مقابلے میں آمدنی نہایت کم ہوتی تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ محنت کم ہوتی گئی اور آمدنی کی شرح آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل ہوگئی۔ پیسے نے پیسے والوں کی ادائیں سکھانے میں دیر نہیں کی۔ سلطان علی، جس کا خاندان لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے کا روادار نہیں تھا، اس نے دونوں بیٹوں کے ساتھ ساتھ بیٹی کو بھی اعلیٰ تعلیم کے حصول کا بھرپور موقع دیا تھا۔

بڑا بھائی عمران علی میڈیکل کے شعبے میں جانا چاہتا تھا۔ ایف ایس سی میں وہ اتنے نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ اُسے ملک کے کسی بھی میڈیکل کالج میں بہ آسانی داخلہ مل سکتا تھا مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا اور وہ انٹری ٹیسٹ میں اپنی کامیابیوں کے سلسلے کو برقرار نہ رکھ سکا اور داخلے سے محروم ہوگیا۔ وہ دلبرداشتہ سا ہوگیا تھا۔ ایسے ہی وقت میں جب وہ دوبارہ انٹری ٹیسٹ کی تیاری میں مشغول تھا، ایک ایجنٹ نے اُسے چین میں داخلہ لے کر پڑھنے کی ترغیب دی۔ اُس نے باپ سے تذکرہ کیا تو باپ اُسے سیلف فنانس سکیم کے تحت چین بھیجنے پر آمادہ ہوگیا۔ یوں چار سال پیشتر وہ مسیحا بننے کے لیے چین چلا گیا جہاں اسے ایجنٹ کی معاونت سے وین ژو میڈیکل کالج میں بہ آسانی داخلہ مل گیا۔

اُس نے اپنی تصاویر کا البم بھیجا تھا جس میں سے ایک تصویر مصباح کو بہت پسند تھی۔ وہ اکثر تنہائی میں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہتی تھی۔ اس تصویر میں عمران محیط کی شکل میں بنی ہوئی خوبصورت کیاریوں میں ایک سفید رنگ کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ عقب میں کالج کی سفید اور براؤن رنگ کی فلک بوس عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ تصویر کے بائیں کونے میں کمان کی شکل کا شیشے کا بنا ہوا مرکزی دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ عمارت کے پیچھے گہرے آسمانی رنگ کی جھالر کسی پہاڑی کی نشاندہی کررہی تھی۔ کالج کی دو بلند کنوپیوں والی وسیع وعریض عمارت دیکھ کر دل پر دبدبہ سا طاری ہونے لگتا تھا۔

وہ بھی ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ ایف ایس سی میں نمبروں کا مطلوبہ ہدف حاصل کرلینے کے بعد نہ جانے اُسے کیا ہوا کہ اچانک ہی اُس نے میڈیکل کالج میں داخلہ لینے سے انکار کردیا۔ معاملہ یہاں تک ہی موقوف نہیں رہا بلکہ وہ سائنس پڑھنے سے بھی باغی ہوگئی۔ اُس نے مقامی کالج میں انگلش لٹریچر کی کلاس میں داخلہ لیتے ہوئے گھر کے سبھی افراد کو انگشت بدنداں کردیا۔ باپ نے سمجھایا کہ تم اپنے بہترین مستقبل کو ٹھکرانے چلی ہو مگر وہ مسکرا کر بولی، ''پاپا! آپ بھی ضد کرتے ہیں۔ کیا ڈاکٹر بنے بغیر میں اچھی زندگی نہیں گزار سکتی؟''

چھوٹے بھائی وجدان علی نے سمجھایا، ''باجی! تم غلطی کررہی ہو۔''

ماں نے منہ بنا کر کہا ''اللہ کی شان ہے۔ خاندان کی لڑکیاں میٹرک کرنے کو ترستی ہیں، یہ خان زادی نخرے دکھاتی ہے۔''

وہ ہنستے ہوئے ماں کے گلے کا ہار بن گئی۔ لاڈ سے بولی، ''ماما! میں تم سے دور نہیں رہنا چاہتی۔ جانتی ہو، رافعہ ایم بی بی ایس کررہی ہے، سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہے..... وہ تو یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اُس نے اپنی زندگی کا سب سے غلط فیصلہ میڈیکل کالج جوائن کرنے کا ہی کیا تھا۔'' اُس نے دونوں کانوں کی لوؤں کو چھو کر مضحکہ خیز انداز میں کہا ''ناں بابا ناں..... میں ڈاکٹرنی بننے سے رہی۔ پاپا کے اسکول کو سنبھال لوں گی، کہیں لیکچرر شپ لے لوں گی مگر میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں نہیں جاؤں گی۔''

اُسے سمجھانے والے ایک دلیل لاتے، وہ چار منہ پر مار کر منہ بند کردیتی۔ جب اُسے پورے خاندان میں سے ایک آدمی کی تائید حاصل ہوئی تو وہ کھلم کھلا بغاوت پر اُتر آئی۔ انجینئر افتخار بیگ نے اُس کی حمایت میں سب کے سامنے کہہ دیا تھا کہ ڈاکٹر بننے سے کہیں بہتر بیمار بننا ہے۔ اُس نے شکرمندی کے جذبات سے مغلوب ہوکر اپنے پھوپی زاد کے سامنے سر جھکا دیا۔ بولی، ''بھائی! تم کتنے اچھے ہو۔''

وہ اچھا تھا مگر اُس حسینۂ عالم کا بھائی بننے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اُس کی چوٹی کو پیار سے کھینچ کر بولا۔ ''کیا تمہارے ہاں بھائیوں کی کمی ہے جو ہر ایک کو بھائی کا خطاب دینے لگتی ہو؟''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ شرارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی، ''پھوپی کا بیٹا بھی تو بھائی ہوتا ہے ناں!''

''پھوپی کا ہر بیٹا بھائی نہیں ہوتا بے وقوف لڑکی!'' افتخار نے چڑ کر کہا۔

''پھوپی تو یہی سمجھاتی رہتی ہیں مجھے۔''

''تمہارے باپ کو بھی مسلسل تین برسوں سے کچھ سمجھاتی چلی آرہی ہیں، کیا اس طرف تمہارا دھیان نہیں جاتا؟''

وہ مصنوعی معصومیت سے نفی میں سر ہلانے لگی۔ وہ پہلے بھی دِل میں جاگزیں تھی، ایسے میں چاہنے والے کے دِل میں کچھ اور گہرائی تک کھب گئی۔ پیار سے بولا۔ ''منگنی سے پہلے کزن بھائی ہوتا ہے، بعد میں کچھ اور ہوجاتا ہے۔ لڑکیوں کی زندگی میں یہ تبدیلی بڑی خوش آئند ہوتی ہے۔''

وہ جواباً آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ''منگنی کے حد نہیں، شادی کے بعد۔ سمجھے؟..... تم بڑوں کے اقوال کو توڑ پھوڑ کر اپنا مطلب نکالنے کی کوشش مت کیا کرو۔''

''تو کیا منگنی سے شادی تک کے عرصے میں بھی مجھے بھائی ہی کہو گی؟'' وہ تعجب سے چیخ پڑا۔

اُس نے ایک ادا سے سر جھٹکا۔ بالوں کی ایک لٹ دوپٹے سے جھانک کر بائی بائی کہتے ہوئے نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ بھی بھاگ کر چاہنے والے کی تشنگی کو ہوا دیتے ہوئے چھپ گئی۔ یوں سامنے آنے اور چھپ کر چھپ جانے میں ایک الگ ہی لطف ہوتا ہے۔

جوانی میں ایک دِن عافیت سے گزارنا مشکل ہوجاتا ہے، اُس نے نہ جانے کیسے ایک سال جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح کسی ارتعاش کے بغیر گزار دیا۔ عین ممکن ہے کہ جھیل کی گہرائی میں پڑے ہوئے افتخار بیگ کی صدق آمیز محبت کے پیاسے پتھر نے جوانی کے پانی کے کھولاؤ کو مسلسل منجمد کیے رکھا ہو۔ تھرڈ ائر میں تھی جب جھیل کے ٹھہراؤ نے ایک ننھے سے پتھر کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ پتھر ضلع ناظم سردار ارباب خان کے بیٹے شہاب خان کے ہاتھوں سے نکلا تھا۔

شجرکاری مہم میں حصہ لینے کے لیے وہ اپنی دو ساتھیوں کے ہمراہ کالج سے نکل کر پبلک نرسری تک گئی۔ تینوں نے اپنی اپنی پسند کے پودے خریدے۔ اُس نے سنگ مرمر کا نقش ونگار والا خوبصورت گملا خریدا۔ اُس میں پتھر چاٹ کا پودا لگا ہوا تھا۔ وہ نرسری والے سے مخاطب ہوئی۔ ''بھائی! یہ گملا خوبصورت ہے، پودا بدصورت ہے۔ اِسے یہاں سے نکال دو اور رات کی رانی لگا دو۔''

کام قدرے مشکل تھا۔ کچھ دیر لگ گئی۔ ایسے میں اُس کی ایک سہیلی نے اُس کے کان سے منہ لگا کر سرگوشی کی۔ ''کوئی دِن کا راجا آکر تمہارا گملا بدل ڈالے گا۔ سچ! کتنا مزہ آئے گا جب سہاگ رات کی رانی پتی پتی ہوکر سیج پر بکھر جائے گی اور راجا .....''

اُس نے گھور کر سہیلی کو دیکھا۔ وہ شوخی سے ہنس کر چپ ہوگئی۔ جو کہنا چاہتی تھی، کہہ چکی تھی۔ تینوں اپنے اپنے گملے اُٹھائے نرسری سے باہر آئیں۔ فاصلہ کم ہونے کی وجہ سے پیدل ہی کالج کی طرف چل پڑیں۔ مین روڈ کراس کرتے ہوئے ایک تیز رفتاری سے آتی ہوئی کار نے خوف زدہ کردیا۔ اُس کی سہیلیاں جلدی سے آگے بڑھ گئیں۔ وہ کچھ زیادہ ڈر گئی تھی۔ وہیں ٹھہر گئی۔ کار کا ڈرائیور اُس سے زیادہ ڈر گیا۔ بریک لگائے مگر کار رُکتے رُکتے اُس سے ٹکرا گئی۔ اُس کے ہاتھ سے گملا چھوٹ گیا اور کار کی ہیڈ لائٹ سے ٹکرا گیا۔ ہیڈ لائٹ دھماکے کے ساتھ ٹوٹ گئی۔ کرچیاں دور تک پھیل گئیں۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ گری اور ناپختہ روڈ سائڈ پر لڑھکتی چلی گئی۔ جسم پر کوئی زخم تو نہیں آیا مگر کئی چوٹوں نے خوف طاری کردیا۔ گرتے ہی بے ہوش ہوگئی۔ دونوں سہیلیاں چیختے چلاتے ہوئے اُس سے لپٹ گئیں۔

ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں زخمی ہوکر گرنے والی کی طرف کئی ہاتھ لپکے۔ ایسے میں لڑکی کو بچا کر احسان کے پھندے میں پھانس لیا جاتا ہے۔ وہ اگر موت کی دہلیز پر کھڑی ہو تو تاسف سے سوچا جاتا ہے، ''مرنا ہی تھا تو مجھ پر مرمٹی ہوتیں۔''

اُس کی مدد کے لیے بھی کئی جوان ہاتھ آن کی آن میں جھپٹنے کو مچل گئے۔ ایسے میں نئی نویلی کار کا پچھلا دروازہ کھول کر شہاب خان باہر نکلا۔ برق رفتاری سے سیاہ چادر میں لپٹی خوف سے بے ہوش ہرنی تک آیا۔ جلدی سے اُسے اُٹھانے لگا۔ کار کی عقبی نشست پر ڈالتے ہوئے اُس کی ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ''جلدی سے اُس کے دائیں بائیں بیٹھ جائیں۔ ڈاکٹر احسان اللہ کا اسپتال قریب ہے، ہم وہیں جارہے ہیں۔''

لوگ جمع ہونے لگے تھے۔ معاملہ فہمی سے قبل ہی کار ہوا ہوگئی۔ ڈاکٹر احسان اللہ یہ خوبی جانتا تھا کہ شہاب خان ضلع ناظم کا بیٹا ہے۔ ضلع ناظم کا بیٹا بھی ناظم ہی ہوتا ہے۔ اُس نے فوری طور پر اپنے اسپتال میں ایمرجنسی نافذ کردی۔ چند ہی منٹوں میں مصباح ہوش میں آگئی۔ ہوش میں آنے کے بعد کے استعجاب خیز مرحلے سے نکلی تو انتہائی وجیہہ اور پرکشش شہاب خان کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگی جو بڑی محبت سے کہہ رہا تھا۔ ''اللہ کا شکر ہے کہ تمہیں کوئی چوٹ نہیں آئی۔ مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کی دعوے دار لڑکیوں کو اتنا بھی بُزدل نہیں ہونا چاہیے کہ معمولی سے ایکسیڈنٹ میں خوف سے بے ہوش ہوجائیں۔''

وہ کراہی۔ کچھ کہنا، کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر جھجک گئی۔ وہ جتنا بھی مہربان دکھائی دے رہا تھا، اجنبی تھا۔ لڑکیاں کھلنے میں کچھ وقت لیتی ہیں۔

بیس منٹ بعد ڈاکٹر نے چند پین کلر گولیاں تھما کر اُسے فارغ کردیا۔ وہ شہاب خان اور اپنی سہیلیوں کے ہمراہ اسپتال سے باہر آئی۔ شہاب خان کا ڈرائیور گاڑی کی ہیڈ لائٹ کا معائنہ کررہا تھا۔ شہاب خان نے مسکرا کر کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ لائٹ نئی خرید کر فٹ کی جاسکتی ہے خدانخواستہ اِس کا گھٹنا ٹوٹ جاتا تو کہیں سے نہ ملتا۔''

اُس نے شہاب کے شوخ لہجے پر کوئی توجہ نہ دی بلکہ چونک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر اپنے گھٹنے کو دیکھنے لگی۔ اچانک پریشان ہوا ٹھی۔ شلوار گھٹنے پر "L" کی شکل میں پھٹی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنی چادر کو گھٹنے پر پھیلا کر عریاں جلد کو چھپانے کی کوشش کی۔ چادر نیچے کی تو سر سے ڈھلکنے لگی۔ عجیب مخمصے میں گرفتار ہوگئی۔ کچھ سجھائی نہ دیا۔ ایسے میں شہاب خان اپنی گاڑی تک گیا۔ ڈیش بورڈ پر پڑے ہوئے کسی سیلولر فون کمپنی کے اشتہاری اسٹیکر اُٹھا لایا۔ بولا۔ ''اسے کپڑے کے اندر کی طرف سے چپکا دو۔ گزارا ہوجائے گا۔''

ترکیب اچھی تھی۔ دل کو لگی۔ اسٹیکر تھا ماا ور کورنگ پیپر اتار دیا۔ پائنچے میں ہاتھ ڈال کر پھٹی ہوئی جگہ تک اسٹیکر کو پہنچانے کی کوشش کی۔ پائنچہ تنگ تھا۔ ہاتھ نہیں پہنچا۔ اِس کوشش میں اسٹیکر دہرا ہوکر چپٹ گیا۔ وہ بے بسی سے اپنی سہیلیوں کو دیکھنے لگی۔ دوسرے اسٹیکر پر اُنہوں نے تجربہ کیا۔ ناکامی پر جھنجلا سی گئیں۔ ایسے میں شہاب خان نے گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر اپنی جانب بلایا۔ اُسے سیٹ پر بٹھا کر بائیں ٹانگ کو باہر نکالنے کا اشارہ کیا۔ خود زمین پر بیٹھ گیا۔ کسی کو چھونے کی اجازت نہ دینے والی دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی۔

یکبارگی اُس نے ٹانگ کھینچ لی۔ کوئی اور کھینچے تو آدمی دھڑام سے منہ کے بل زمین پر آن گرتا ہے۔ اُس نے اپنی ٹانگ خود کھینچی تھی۔ گرنے سے محفوظ رہی مگر پاؤں گیٹ اور پائدان کے بیچ میں اٹک گیا۔ تکلیف کے مارے حلق سے سسکی نکل گئی۔ شہاب خان نے مسکرا کر کہا، ''پلیز! مجھے اسٹیکر چپکانے دو۔ شرم آتی ہے تو اپنی آنکھیں بند کرلو یا میں آنکھیں بند کرلیتا ہوں۔''

وہ عجیب سی کیفیت میں ڈوب گئی۔ شہاب خان نے گداز پنڈلی کو تھاما۔ انگلیوں کی مدد سے کھلے اسٹیکر کو بڑی احتیاط سے پھٹی ہوئی جگہ سے گزار کر اندر پہنچایا۔ کپڑے کے لٹکتے ہوئے ٹکڑے کو اپنی جگہ پر فٹ کیا اور ہاتھ سے تھپتھپا کر اسٹیکر پر چپکا دیا۔ مصباح حیرانی سے شہاب خان کی رفوگری دیکھ رہی تھی۔ اُس نے اتنی مہارت سے ٹکڑے کو اپنی جگہ پر فٹ کیا تھا کہ ایک نظر میں جوڑ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

وہ اگلی نشست پر سے اُٹھ کر نیچے اُتر آئی۔ شہاب خان نے تینوں کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک لڑکی کو یاد آیا کہ گملے ایکسیڈنٹ والی جگہ پر ہی رہ گئے ہیں۔ کار اُسی جگہ پر جا کر رُک گئی۔ گملے دکھائی نہیں دیے۔ ایک دکاندار نے ہاتھ کے اشارے سے اُنہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ گملے اُس کی دکان کے باہر سیڑھیوں پر رکھے تھے۔ ڈرائیور نے اُتر کر گملے ڈکی میں رکھے اور شہاب خان نے پیچھے مُڑ کر استفہامیہ نظروں سے تینوں کی طرف باری باری دیکھا۔ ایک بولی۔ ''ہم گرلز کالج کی طرف جارہے تھے۔''

ڈرائیور نے کالج کے گیٹ پر گاڑی روکی۔ تینوں اُتریں۔ مصباح نے چند قدم چل کر پلٹ کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھے شہاب خان کو دیکھا اور ہاتھ لہرا کر بولی۔ ''میرا گملا بچ گیا، تمہاری لائٹ ٹوٹ گئی۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''میں شہاب خان ہوں اور تم؟''

''مصباح!''

''کیا مجھے رابطہ کرنے کی اجازت دوگی؟''

وہ ٹھٹکی۔ چند لمحے سوچتی رہی پھر مسکرا کر بولی۔ ''اجازت ہے۔''

پلٹ کر گملا جھلاتی کالج کے گیٹ میں داخل ہوگئی۔ ایک سہیلی نے کچوکا دیا۔ ''اجازت ہے۔ کیا شاہانہ مزاج پایا ہے ملکہ عالیہ نے!''

وہ آنکھیں نچاتے ہوئے ہنسی۔ ''وہ مجھے جانتا نہیں، میرا فون نمبر اُس کے پاس موجود نہیں ہے..... کیسے رابطہ کرے گا؟''

دونوں اُس کی بات کا مطلب سمجھ کر ہنسنے لگیں۔

آگے کی طرف ست روی سے کھسکتی ہوئی گاڑی میں بیٹھے شہاب خان نے مسکرا کر زیرِ لب کہا۔ ''ہائے! تم کیا ہو؟ جوانی آنکھیں اور لب دکھا کر لوٹتی ہے، تم نے دو انچ کی روزن سے اپنی پنڈلی دکھا کر لوٹ لیا ہے۔ تمہارا کیا جاتا جو گملے اور لائٹ پر تبصرہ کرنے کے بجائے کہہ دیتیں کہ بدن تو چوٹوں سے بچ گیا، دل نہیں بچا۔

❖❖❖

بارہا سنا ہے کہ آنکھیں مہنگے داموں بکتی ہیں، خریدی جاتی ہیں مگر یہ آج تک سننے دیکھنے میں نہیں آیا کہ کوئی اپنے منتخب خواب کو خریدنے کے لیے کمر بستہ ہوکر منڈی میں نکلا ہو۔ خواب دُنیا کے کسی بازار میں بکنے کے لیے نہیں رکھے جاتے کیونکہ دیکھنے والی آنکھیں تول کر خریدے ہوئے خواب نہیں دیکھا کرتیں۔ ہمیشہ کھلی مگر بے بصارت آنکھیں ہی دماغ کو من چاہے مناظر دکھاتی ہیں۔ کہیں بھی خواب دیکھنے پر آمادہ دماغ نہیں بکتا اور نہ ہی بے بصارت آنکھوں کا کوئی طلبگار سامنے آتا ہے۔ سیانے اِس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ قسمت بھی انسانی خوابوں کو اہمیت نہیں دیتی مگر پروفیسر وسیم بزدار نے اندھا دھند دولت لٹانے کے ساتھ ساتھ بے انتہا مشقت کا مسلسل عذاب جھیلنے کے بعد اپنے خواب کو تکمیل کی حتمی شکل دے ہی لی۔ گزشتہ تین سالوں میں اُس نے اپنے عجیب اور ناقابلِ عمل خواب کو جیتا جاگتا منظر بنا کر دریائے

سندھ کے گہرے پانی کی سطح پر یوں سجا دیا کہ دُنیا بے یقین نظروں کو یقین دینے کے لیے جوق در جوق وہاں پہنچنے لگی۔

نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں قلقاریاں مارتے ہوئے عارضی اور غیر مستعمل پتن پر آتیں، دوربینوں کی مدد سے پروفیسر وسیم بزدار کی بنائی ہوئی 'جنت' کا نظارہ کرتیں اور آنکھوں میں پُرستائش، بے یقینی بھر کر کہتیں، ''ہائے! دُنیا میں کوئی تو ایسا شخص دکھائی دیا جس نے جو چاہا، بنالیا۔ سچ کہتے ہیں انسانی محنت اور لگن کے مقابلے میں خواب تو خواب رہے، ماورایت بھی ٹھہر نہیں سکتی۔''

ڈھلتے سورج کی تھکی ماندی کرنوں تلے چمکتے پانی پر تیرتی ہوئی پروفیسر وسیم بزدار کی ''جنت'' پر نظریں جمائے پانچ سات نوجوانوں کی ٹولی گنگ کھڑی تھی۔ ایسے میں ایک تعجب آمیز آواز اُبھری۔ ''آج تک اِن آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا۔ آج دیکھ رہا ہوں تو یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی ٹرانس پیرنسی ہے جو دھیرے دھیرے مجھے میری سائیکالوجی سمیت اپنے حصار میں لیتی جاتی ہے..... دوستو! جو میں دیکھ رہا ہوں، کیا تم بھی وہی دیکھ رہے ہو؟''

کوئی جواب سنائی نہیں دیا۔ ایسے میں آفتاب نے گہرا سانس حلق میں اُتار کر تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ ''دماغ صرف آنکھوں کے دیکھے پر تکیہ کیے بیٹھا ہے۔ زبان ہے، نہیں ہے..... اُسے کوئی پروا نہیں۔ ہم وہی آبی جنت دیکھ رہے ہیں جو تمہیں دکھائی دے رہی ہے مگر افسوس! ہم پروفیسر کی بنائی ہوئی 'جنت' میں قدم نہیں رکھ سکتے۔''

فرسٹ ڈے فول کی سیڑھی پر قدم رکھنے والے نوآموز شکاریوں سے لے کر پرنسپل تک ہر کوئی اُسے سنکی اور فاتر العقل قرار دینے پر تلا ہوا تھا۔ وہ سب سے بے نیاز اپنی من چاہی دُنیا کی تعمیر میں مگن رہا..... اُس کا تین سالہ انہماک آج ایک واضح اور نظریاتی لباس پہن کر کالج کے نوجوانوں کے تنفس کو تہس نہس کررہا تھا۔ ہر کوئی خود کو اِس لباس میں فٹ کرکے دیکھ رہا تھا..... کوئی اکیلا..... کوئی اپنی محبوبہ کے ساتھ تو کوئی نوٹوں کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا۔ ادھیڑ عمری نے خوابوں کی عمر کو ہلچل دینے کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندوں کے کاز کو بھی للکار کر دم بخود کردیا تھا۔

آفتاب کے کندھے سے کندھا ملا کر وجدان پانی میں چند قدم اندر تک بڑھے ہوئے خشکی کے ٹکڑے پر کھڑا تھا۔ وہ سائنس کا طالب علم تھا۔ زندگی کے ہر پہلو کو سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا عادی ہوچلا تھا۔ دوربین میں پورے انہماک سے دیکھتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ ''بہت حیران کن! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ صرف چونتیس لاکھ روپے میں انجینئرنگ کا اتنا بڑا شاہکار تیار ہوسکتا ہے۔ دیکھو آفتاب! پروفیسر نیکر پہنے کتنے مزے سے ایزی چیئر پر بیٹھا ہے۔ اُس کے خال وخد دکھائی نہیں دیتے مگر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اِس سے وہ دُنیا کی بھی خوشی سے ہم کنار ہورہا ہے۔ اُس نے اپنی مرضی کی دُنیا تخلیق کرلی ہے۔ ویری ایکسی لینٹ!''

آفتاب نے ایک طائرانہ نظر ڈالی پھر دوربین کے بغیر دریا کے وسط میں کھڑے بڑے سے خود ساختہ آبی بیڑے کے دھندلے سے عکس کو دیکھا اور کہا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو وجدان! پروفیسر دُنیا کے شور اور ہیجان سے تنگ آچکا تھا۔ وہ انسانی دُنیا سے کامل فرار چاہتا تھا، بہترین طریقہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہوچکا ہے۔ وہ زمین پر رہتے ہوئے بھی زمین کا نہیں، پانی کا حصہ بن گیا ہے۔ پانی نقش بناتا نہیں، مٹاتا ہے۔ پروفیسر نے اِسی لیے بہتے پانی پر مکان تعمیر کیا ہے..... کوئی دخل نہ دے..... کوئی اپنا وجود ثابت کرتے ہوئے اُس کے وجود کو جھٹلانے کی جرأت نہ کرسکے۔ واقعی پروفیسر بہت عظیم انسان ہے۔''

لیٹے ہوئے باقی تینوں دوست خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ اُنہیں آفتاب اور وجدان کی حیرت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ کیونکہ وہ استعجاب کا یہ مرحلہ چند منٹوں میں ہی عبور کرکے لاتعلق ہوچکے تھے۔

وجدان کہہ رہا تھا، ''دیکھو آفتاب! وہ اُردو کا لیکچرر ہونے کے ساتھ ساتھ کتنا بڑا سائنس دان ثابت ہوا ہے۔ سیلولر رابطہ، بجلی، انٹرنیٹ اور ڈش ریسیور سمیت دُنیا کی ہر قابلِ ذکر ایجاد اُس کے پاس ہے اور اُسے یوٹیلٹی بلوں کی ادائیگی کی بھی کوئی فکر نہیں ہے۔ کتنا خوش نصیب ہے۔ جنگل میں منگل سنتے آئے ہیں، دریا میں منگل کی تابنا کی پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔''

آفتاب نے پوچھا، ''پروفیسر نے بجلی کہاں سے حاصل کی ہے؟''

وجدان مسکرانے لگا۔ ''دوربین لگاؤ، میں تمہیں بجلی کا سورس دکھاتا ہوں۔''

آفتاب نے گلے میں لٹکتی ہوئی دوربین آنکھوں سے لگائی۔ وجدان نے کہا۔ ''بیڑے کے اگلے دائیں کونے کو غور سے دیکھو۔ تمہیں پانی میں نصف ڈوبے ہوئے بڑے بڑے فولادی پر دکھائی دیں گے۔ اِن پروں کے ساتھ جدید ترین الیکٹرک جنریٹر منسلک ہے۔ اِسی کونے میں اوپر کی طرف دیکھو۔ بڑا سا پول دکھائی دیتا ہے۔ وہ کنکریٹ کا بنا ہوا ہے اور زمین میں چالیس پینتالیس فٹ کی گہرائی تک گڑا ہوا ہے۔ یہ نہ صرف بیڑے کو یہاں مستقل قیام دیتا ہے بلکہ جنریٹر کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تنصیب میں بھی بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اِس ستون کے اوپر تمہیں کچھ چیزیں دکھائی دے رہی ہیں مگر شناخت میں نہیں آرہیں۔ یہاں ایک واٹر پمپ نصب ہے جو ستون کے اندر ہی اندر زیر زمین تک جانے والے پائپ کے ذریعے صاف پانی کھینچ کر بیڑے کو سپلائی کرتا ہے۔ پمپ کے ساتھ ہی تین بیٹریاں پڑی ہیں جو نہ صرف برقی رو کو ہموار کرتی ہیں بلکہ جنریٹر میں اچانک پیدا ہونے والی کسی خرابی کی صورت میں آٹھ سے دس گھنٹوں تک بجلی کی سپلائی بحال رکھتی ہیں......''

''کنکریٹ کا اتنا لمبا پول دریا کے وسط میں کیسے نصب کیا گیا؟''

''پروفیسر کا ایک شاگرد دریاؤں پر پل بنانے والی ایک معروف کنسٹرکشن کمپنی میں اہم پوسٹ پر کام کررہا ہے۔ اُس کی ذاتی درخواست پر کمپنی کے انجینئرز نے اِس پول کو دریا میں نصب کیا ہے۔ یہ بہت مضبوط ہے۔ کسی بھی درجے کے سیلاب میں اُس کے ٹوٹنے یا زمین سے باہر نکل آنے کا اندیشہ نہیں ہے۔'' وجدان نے تفصیل سے بتایا۔

''یہ طلسماتی بیڑہ کس نے تیار کیا ہے؟'' آفتاب نے پوچھا۔

''دریا کے اطراف کی بستیوں میں کئی کاریگر موجود ہیں جو کشتیاں اور بیڑیاں بنا کر روٹی روزی کرتے ہیں۔ یہ دِنوں کی بات نہیں، سالوں کی اَن تھک محنت کا قصہ ہے۔''

''پروفیسر کے بیڑے کے بارے میں تم اتنا کیسے جانتے ہو؟'' آفتاب کی حیرت بجا تھی۔

وجدان نے وضاحت کی۔ ''میرا فرسٹ کزن افتخار بیگ پروفیسر سے بہت محبت کرتا ہے۔ اُس نے بیڑے کی تیاری میں بھرپور معاونت کی ہے۔ بلکہ یوں سمجھو کہ پروفیسر کی آئیڈیالوجی کو عملی شکل دینے میں بنیادی کردار اُسی نے ادا کیا ہے۔ وہ انجینئر ہے۔ اُس نے بجلی کے کام سے نابلد ہونے کے سبب ایک الیکٹریکل انجینئر دوست کی خدمات بھی حاصل کررکھی تھیں۔ وہی مجھے گاہے بگاہے تفصیلات سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ مجھے پروفیسر کے اِس منصوبے کو مکمل ہوتا دیکھنے کا بہت زیادہ اشتیاق تھا۔ یوں میں اِس شاہکار کو بنتے دیکھتا رہا، کام کرتا دیکھنے کی حسرت دل میں لیے کڑھتا رہتا ہوں۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کالج کے پرنسپل سمیت تمام کولیگز نے پروفیسر کا شاہکار دیکھنے کا اصرار کیا تھا مگر پروفیسر نے سب لوگوں کو نہایت بے رخی سے پتن پر سے ہی ناکام لوٹا دیا تھا۔ اُس نے موبائل فون پر سختی سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''دنیا پہاڑوں، دریاؤں اور شہروں کا نام نہیں، زمین کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے انسانوں کے تحرک اور موجودگی کا نام ہے۔ میں اِس سے نفرت کرتا ہوں۔ اپنی غیر معمولی نفرت کے سبب میں نے تم لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کی ہے۔ مجھے ملنے اور میری 'جنت' کو دیکھنے کے لیے مت آیا کرو، تمہارے پلید اور ناپاک قدموں سے میری 'جنت' کا قالین خراب ہوتا ہے اور میں یہ برداشت نہیں کرسکتا......''

آفتاب کی حیرانی نیا رُخ اختیار کرگئی۔ بولا۔ ''یار وجدان! پروفیسر نے اتنی بڑی کشتی کو دریا میں لانچ کیسے کیا ہوگا؟''

وجدان ہنسنے لگا۔ ''ارے بے وقوف انسان! 'جنت' کی فاؤنڈیشن دریا کے باہر تیار کی گئی تھی جو تین بڑے بڑے پارٹس کی شکل میں تھی۔ اُسے دریا کے پانی میں اُتار کر جوڑا گیا اور پھر اُس پر بقیہ تعمیر کا کام مکمل کیا گیا۔''

''سیلاب کے دنوں میں اِس کے ڈوب جانے یا بہہ جانے کا خطرہ تو بہرحال ہوگا ہی......''

''جنت، کنکریٹ کے پول کے ساتھ ایک اسٹیل روپ اور فولڈنگ کلپ کے ذریعے بندھی ہوئی ہے۔ پانی کی کمی بیشی پر 'جنت' اوپر نیچے ہوجاتی ہے، ڈوبتی نہیں ہے۔ فاؤنڈیشن کی لکڑی پر کوئی خاص کیمیکل لگایا گیا ہے جو لکڑی کو دھوپ اور پانی کے مضمرات سے بچائے رکھتا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ یہ کبھی ڈوبے گی۔ اس پر کبھی اضافی وزن نہیں لادا جائے گا اور نہ ہی کبھی دریائی طغیانی میں سفر کرے گی۔ اتنی بہترین حفاظتی تدابیر کی موجودگی میں اِس کے ڈوبنے یا تباہ ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔'' وجدان نے بتایا۔

''اوہ...... ہوں!'' آفتاب کے منہ سے استعجاب آمیز آواز برآمد ہوئی اور وہ خاموش ہوگیا۔

سہ پہر کو ایک کانٹے میں کوئی ایک ڈیڑھ کلوگرام کی مچھلی پھنسی۔ اُسے چھیل بنا کر نمک لگا کر رکھ دیا گیا۔ دریا کا گمنام پتن آباد ہوگیا۔ لڑکوں نے جھٹ پٹ میں سالن تیار کیا۔ اِس دوران نذیر قریبی گاؤں کے ایک تنور سے روٹیاں لگوا لایا۔ دستر خوان بچھنے تک ماحول بالکل سیاہ ہوچکا تھا۔ موم بتی کی ناکافی روشنی میں وہ کھانا کھانے کے دوران بار بار ''جنت'' کی طرف دیکھتے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ کب پروفیسر وسیم بزدار اپنے بیڑے کو روشن کرتا ہے۔ فلموں میں دیکھتے آئے تھے کہ سطح سمندر پر پھسلتا چلتا بحری جہاز رات کو روشن شہر کی طرح دکھائی دیتا ہے مگر شاید پروفیسر ابھی تک جنریٹر کے بڑے بڑے آہنی بازوؤں سے چند فٹ کے فاصلے پر عجیب ساخت کی بنی ہوئی سیڑھی کے زینے پر براجمان تھا۔ یہاں بیٹھنے پر دریا کا پانی پروفیسر کے گھٹنوں تک چڑھ جاتا تھا۔

نذیر اپنے سفری بیگ سے کوک کی بوتل نکال لایا۔ باری باری نوش کررہے تھے کہ اچانک جیسے دریا جاگ پڑا ہو۔ پروفیسر کی 'جنت' میں رات کا پرنور استقبال ہورہا تھا۔ صحن نما عرشے پر سفید انرجی سیور جل اُٹھے۔ عرشے کے پیچھے بنے دونوں چوبی کمروں کی کھڑکیوں سے سرخ اور نیلی روشنی جھانکنے لگی۔ عقبی سمت میں بھی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ آفتاب کے منہ سے کلمۂ تحیر نکلا ''واؤ...... کتنا خوبصورت منظر ہے۔ رواں پانی پر اوپر نیچے ہوتی 'جنت' اور پانی میں مرتعش روشنیوں کے عکس...... دیکھو وجدان دیکھو...... زندہ باد پروفیسر......''

❖❖❖

دریا کی خاموش اور نم فضا میں ٹہلتے ہوئے پروفیسر وسیم بزدار اچانک تھم گیا۔ یوں جیسے غریب کے گھر میں کڑا وقت تھم جاتا ہے۔ بڑبڑایا۔ ''ظالموں نے سندھ کے پرانے باسی ملاح موربھانوں سے اتنی نفرت کی ہے کہ وہ اپنی شناخت بدلنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ جب قوم کے لوگ اپنی شناخت اور عنوان بدلنا شروع کردیں، قوم مٹنے لگتی ہے......''

کچھ دیر بہکے بہکے انداز میں بڑبڑاتا رہا، پھر سر جھٹک کر اپنی 'جنت' کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اپنے غم و غصہ کے اظہار کے لیے اُس کے پاس ابھی بہت وقت باقی تھا۔ چاروں اطراف میں لگی ہوئی آہنی پائپ کی خوب صورت ریلنگ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اُس نے فاخرانہ انداز میں 'جنت' کے گرد چکر کاٹا۔

اُس کا دماغ خاصا صحت مند واقع ہوا تھا۔ اُس نے ''جنت'' میں ضرورت کی ہر چیز اِس ترتیب سے رکھی تھی کہ بارش یا آندھی وغیرہ جیسی ہنگامی حالت میں اُسے کوئی شے بھی سنبھالنی نہ پڑے۔ چھت کے اطراف میں ایلومنیم کی ریلنگ لگی ہوئی تھی۔ وہ ایک گوشے میں پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ دریا کے پانی سے ٹکرا کر اوپر اُٹھنے والی نم اور ٹھنڈی ہوا جسم میں فرحت اور نیاپن بھر رہی تھی۔

اُس نے اطراف میں نظر دوڑائی۔ جہاں تک 'جنت' کی روشنیوں کا عمل دخل واقع ہورہا تھا وہاں تک پانی کی سطح چمک رہی تھی۔ اُس سے آگے گھپ اندھیرا طاری تھا۔ ایسی ہی زندگی وہ گزار کر یہاں پہنچا تھا۔ اُس کے ماضی میں بھی فقط وہیں تک اجالا تھا جہاں تک 'جنت' کی روشنی پہنچ رہی تھی۔ اُس سے آگے بالکل ایسا ہی گھپ اندھیرا ہر جذبے، ہر واقعے اور ہر رشتے کو نگل چکا تھا۔ وہ سوچنے لگا، ''آدم کو جنت سے نکال کر دُنیا میں پھینک دیا گیا تھا۔ مجھے دُنیا نے اپنے رویوں سے دلبرداشتہ کرکے میری بنائی ہوئی جنت میں ڈال دیا ہے۔ آج اگر دُنیا کے جہنم میں رہنے والے یہاں آکر دیکھیں تو تاسف سے اپنا سر پیٹ لیں۔ اُنہیں دکھا دوں کہ جنت کیا ہوتی ہے تو وہ کبھی گھروں کو نہ لوٹ سکیں مگر میں اُن سے سخت نفرت کرتا ہوں......''

اچانک اُس کی نیکر کے بیلٹ سے بندھے چرمی بٹوے میں رکھے ہوئے موبائل فون کا بزر بج اُٹھا۔ اُس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔ کروٹ بدل کر کنکریٹ کے پول پر لگے دو رنگے انرجی سیور کو دیکھنے لگا۔ پیٹھ کرلینے سے فون خاموش نہیں ہوا۔ بے جان تھا۔ جاندار ہوتا تو بے رُخی پر روٹھ کر خاموش ہوجاتا۔ کافی دیر تک بیل بجتی رہی۔ اُس نے فون نکالا۔ اسکرین پر وجدان کا نمبر دیکھ کر وہ مزید کوفت زدہ ہوگیا۔

بادلِ ناخواستہ فون آن کرکے بولا۔ ''وجدان! میں افتخار بیگ سے بات کروں گا۔ اُسے بتاؤں گا کہ تم نے مجھے تنگ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ پہلے بھی کہا تھا، اَب بھی کہتا ہوں، تم اور تمہارے دوست حتیٰ کہ تمہاری دُنیا میں رہنے والے سبھی لوگ مجھ سے شدید نفرت کرتے ہیں، میں بھی نفرت کرتا ہوں۔ پلیز! پکنک پر آئے ہو، موج مستی کرو اور واپس چلے جاؤ۔ اور اگر میری جنت کا نظارہ کرنے کے لیے آئے ہو تو خاموشی سے دیکھو اور حسرت بھری آہیں سینے میں اُتار کر دفعان ہوجاؤ ورنہ...... مجھے اپنی تنہائی اور 'جنت' کی حفاظت کرنا آتی ہے۔''

وجدان نے اُس کی بلاتوقف گفتگو کے بیچ میں اُسے مؤدبانہ انداز میں ٹوکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ بات ختم ہونے پر ملتجیانہ انداز میں بولا۔ ''سر! آپ غلط سمجھے ہیں۔ آپ ہمیشہ ہمارے آئیڈیل رہے ہیں اور آپ کی جنت کا ماحول بھی آپ کی طرح ہمارا آئیڈیل ہے۔ پلیز! ہمیں ایک مرتبہ، صرف ایک بار چند منٹوں کے لیے 'جنت' میں آنے کی اجازت دیجیے۔ پلیز سر!''

پروفیسر کے چہرے پر عجیب سی طمانیت پھیل گئی۔ اوپر والے ہونٹ کو دانتوں کے بیچ میں سے باہر کھینچتے ہوئے اُس نے جواب دیے بغیر فون بند کردیا۔ جانتا تھا کہ اُس کی خاموشی کو انکار سمجھ لیا گیا ہے۔ وجدان کو دوبارہ فون پر رابطہ کرنے کی ہمت نہیں ہوگی۔

سنتے آئے ہیں کہ جنت کی چار دیواری نہیں ہوتی، دروازے بند کرنے اور کھولنے کا عذاب بھگتنا نہیں پڑتا......

جب جی چاہے سو جاؤ، جب جی چاہے جاگو اور جو چاہے کرتے پھرو۔ سنے ہوئے میں کچھ مبالغہ بھی شامل کرلیا جائے تب بھی تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ پروفیسر وسیم بزدار واقعی ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انسان پر مشتمل جنت تعمیر کر چکا تھا۔ ہر کوئی بلند و بالا کوٹھیاں اور دہشت ناک محل تیار کرنے میں معروف ہے۔

شب کے پچھلے پہر میں ہوا نے غیر معمولی خنکی پکڑ لی تھی جس کے باعث پروفیسر کی آنکھ کھل گئی۔ 'جنت' میں آنے سے پہلے اگر کبھی رات کو آنکھ کھل جاتی تو بقیہ رات واہموں اور اندیشوں میں کروٹیں بدلتے گزرتی۔ وہ عمومی طور پر رات کی تنہائی میں ڈرتا تھا۔ مگر آج خوف تنہائی کے برعکس اُس کے دِل میں طمانیت سی بھرتی جارہی تھی۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو، اُس کی سرشت میں فطری تضادات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ اُس نے دونوں بانہیں فضا میں پوری وسعت میں کھول دیں۔ حلق پھاڑ کر قہقہہ لگایا۔ پھر بلند آواز میں پکارا، ''او..... اے..... اے سندھ ساگر..... تو میرے قدموں تلے بے بس لیٹا ہوا ہے اور میں تیرے سینے پر مونگ دلتے ہوئے قہقہے لگا رہا ہوں۔ مگر تم کیا سمجھو گے۔ تم صرف نگلنا جانتے ہو۔ دِل تمہارے پاس بھی دھڑکتا تو تم اپنے کناروں سے اپنی جولانی بھری مستی کو باہر نہ دھکیلتے، کسی غریب کی جھونپڑی کو نہ نگلتے۔ تم کیا ہو؟ میں جانتا ہوں..... تم نے ہی تو میرے اَن پڑھ باپ اور سادہ لوح ماں کی میتوں کو نگلا تھا۔ میرے دکھوں نے ایک ہی عافیت بھری پناہ ڈھونڈ رکھی تھی، تم نے وہ بھی اُجاڑ دی۔ آج میرے پیروں تلے مُردوں کی طرح لمبے لیٹے ہوئے ہو، اپنے بچاؤ کے لیے کوئی فریاد نہیں کر سکتے۔''

دریا کبھی جواب نہیں دیتا۔ اونٹ کی طرح مناسب وقت کا انتظار کرتا ہے۔ پتن پر خیمہ زن نوجوانوں میں سے کسی نے دریا کی ترجمانی کا بیڑا اُٹھا لیا۔ نہایت یاس بھری آواز سناٹے کا جگر چیر کر پروفیسر کی سماعت میں اُتری۔ اُسے شبہ ہوا کہ وجدان گا رہا ہے۔

''پتن اُتے بیڑی، بیڑی وچ ہِک پھل رَتا جیا..... آ بُوہ میرے سامنے، ایہو پئی منگاں دُعا.....''

پروفیسر نے بارہا سرائیکی زبان میں گیت اپنی پوری معنویت سمیت سماعت میں اُتارا تھا۔ یہاں کا مشہور لوک گیت تھا۔ اُس کے قہقہے تھم گئے۔ پھر بڑبڑاتے ہوئے زینے اُتر کر عرشے پر آ گیا۔ بیڈ روم میں اپنے آرام دہ بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ کھلی چھت کے برعکس یہاں کافی سکون انگیز حدت تھی جس نے چند ہی منٹوں میں سماعت میں اُتر کر اپنی جگہ بناتی ہوئی مترنم آواز سے غافل کر دیا۔

صبح دم اُٹھا۔ کیکر کی مسواک دانتوں پر پھیرتے ہوئے اپنی جنت کا احاطہ کرنے کے بعد دریا میں اُترنے والی چوبی سیڑھیوں پر آ بیٹھا۔ نچلی سیڑھی پر پاؤں رکھ کر بیٹھنے سے وہ کمر تک سرد پانی میں بھیگ گیا۔ برش والا سرا تھام کر مسواک کو پانی پر مارتے ہوئے سوچنے لگا، ''زمین اور آسمان کے بصری اتصال سے پھوٹنے والے سورج کا نظارہ کتنا پرکیف ہوتا ہے مگر وجدان اور اُس کے احمق ساتھیوں کی وجہ سے میں اتنے خوبصورت نظارے کو آنکھوں میں اُتارنے سے محروم ہو رہا ہوں.....'' نظر اُٹھا کر سامنے دیکھا۔ یہاں دھرتی پانی سے بلند نہیں تھی۔

پُرخطر بیلا دریا کے ساتھ ساتھ آٹھ نو کلومیٹر تک پھیلا ہوا تھا۔ مور، کیہل اور فہانوں کے علاوہ کسی بھی انسان کا یہاں گزر نہیں تھا۔ وہ بھی اپنی خود اختیار کردہ نقل مکانی کے موقع پر اپنی کشتیوں میں اِدھر اُدھر جاتے دکھائی دیتے تھے۔ پروفیسر کو بہ خوبی علم تھا کہ طول و عرض پھیلا ہوا بیلا جرائم پیشہ لوگوں اور اشتہاریوں کی محفوظ پناہ گاہ بن چکا ہے۔ پروفیسر کو یہ توقع بھی رہی تھی کہ آنے والے وقت میں کبھی وہ اُس کے مقابل سینہ تان کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اُن درندوں کو مار بھگانے کے لیے اُس نے اپنی جنت میں نہایت معقول انتظام کر رکھا تھا۔

اُس نے مسواک رکھ کر پانی میں چھلانگ لگا دی۔ دو تین ڈبکیاں لگائیں۔ شرٹ پہن کر بیڈ روم سے ملحقہ اسٹڈی روم میں آ کر نماز ادا کی۔ وہ عمومی طور پر نماز پڑھنے کے بعد خالی الذہنی کی کیفیت میں جائے نماز پر ہتھیلیاں پھیلا کر بیٹھ جاتا تھا۔ بند آنکھوں سے آنسوؤں کا ریلا بہہ نکلتا۔ آج بھی کافی دیر تک ہونٹ کپکپاتے رہے۔ پھر لفظوں نے معنویت اختیار کر لی۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ ''اے مجھے پیدا کرنے والے! اے پیدا کر کے گناہ آلود چیتھڑے کی طرح دُنیا کی بے ثباتیوں کے حوالے کرنے والے! مجھ پر رحم کر، نہ کر، تمہاری مرضی مگر تمہیں اپنی تخلیق کا واسطہ، اپنی ربوبیت کا واسطہ! میری ماں کو اپنی بنائی ہوئی جنت میں ڈال دے۔ میرے باپ کو آگ کے عذاب سے محفوظ کر دے۔ میں دُنیا کے دوزخ میں جل چکا ہوں، میرے ماں باپ کو اِس عذاب آگیں لفظ سے روشناس نہ کرانا.....'' جائے نماز سے اُٹھا اور آنسو پونچھتے ہوئے صحن میں آ گیا۔ آنسو بہانے کے بعد قدرے پُرسکون ہو گیا تھا۔ ابھی ناشتا تیار کرنے کے بارے میں ارادہ کر ہی رہا تھا کہ بیڈ روم میں پڑے موبائل فون کا بزر بجنے لگا۔ اُس نے مسکرا کر فون اٹینڈ کیا۔ کہا ''سناؤ انجینئر! کیسے ہو؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس آپ کی یاد آ رہی تھی۔ 'جنت' کا کوئی سسٹم گڑبڑ تو نہیں کر رہا؟'' افتخار بیگ کی شوخ سی آواز سنائی دی۔

''انٹرنیٹ گڑبڑ کر رہا ہے۔'' پروفیسر نے بتایا۔

''بعض اوقات ہوسٹنگ سرور اپنا کام ٹھیک طرح سرانجام نہیں دے رہا ہوتا ہے۔ شاید ایسا ہی کچھ ہو۔'' افتخار بیگ نے کہا۔

''انجینئر اپنے کزن کو فون کر کے کہہ دو کہ میں کسی بھی وجود کو اپنی 'جنت' میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

افتخار ہنس پڑا۔ بولا ''میں اُسے سمجھا دوں گا۔''

❖❖❖

بڑھتی ہوئی گرمی کے ساتھ ساتھ دریا میں پانی بھی بڑھ رہا تھا۔ پروفیسر نے اپنے بچپن میں سندھ ساگر کی تباہ کاریاں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ کبھی جب پانی بدمست شرابی کی طرح لہراتا تو اُس کا دِل خوف زدہ ہو جاتا۔ جب پانی کی بلند ہوتی سطح کے ساتھ ساتھ جنت بھی اوپر اُٹھ جاتی تو طمانیت کا احساس ہوتا۔ وہ تاراج کر دینے والے پانی کے قلب میں کانٹا چبھو کر بیٹھا تھا۔

ایسے میں کسی سے کہا جائے کہ پروفیسر وسیم بزدار نے چونتیس لاکھ میں ایک سکون بھری زندگی خریدی تھی تو وہ فی الفور رائے زنی کر دے گا کہ سودا بہت مہنگا ہے۔ پروفیسر سوچتا تھا کہ اُسے یہ سب کچھ مفت میسر آ گیا تھا۔ نوکری کے ابتدائی عرصے میں اُس نے شہر کے مضافات میں ایک ایکڑ رقبہ خریدا تھا جو اُسے کوڑیوں کے دام ملا تھا۔ شہر کے ایک بازار میں ایک دکان بھی ایسے ہی ہاتھ لگ گئی تھی۔ تب دونوں ملکیتوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔

زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ جب پراپرٹی کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں تو وہ اپنے خوابوں کی تکمیل میں کوشاں ہو گیا۔ اسّی ہزار میں ملنے والا ایک ایکڑ چالیس لاکھ میں بکا تو اُس کی آنکھیں وفورِ مسرت سے پھٹنے کو آ گئیں۔ اتنی بڑی رقم اُسے اپنی خواہشوں کو تکمیل کی صورت دینے میں بھرپور معاونت کر سکتی تھی۔

''جنت'' کی تعمیر کاری پر بے دریغ رقم خرچ کرنے کے باوجود اُس کے پاس اب بھی کافی رقم بچی ہوئی تھی۔ پندرہ سالہ نوکری کی بچت بھی بینک اکاؤنٹ میں جمع تھی۔ قسمت نے ساتھ دیا، دُکان چار ہزار ماہانہ کرایہ دینے لگ گئی تو عملی طور پر روپے پیسے کی اہمیت اُس کی نظر میں ثانوی ہو کر رہ گئی۔ لاکھوں روپے کے بینک بیلنس کے ساتھ ہر ماہ ملنے والی لگی بندھی رقم نے اُسے انسانوں کا ساتھ چھوڑ کر سندھ ساگر میں جنت بنانے کی مکمل تحریک دی تھی۔

جون میں پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق وہ مہینا پورا ہونے پر شہر روانہ ہو رہا تھا۔ ایک ماہ میں اُسے اپنی ضروریات اور چیزوں کی مقدار کا تعین ہو گیا تھا۔

جرمن ساختہ بوٹ ایک سو تیس کلوگرام وزن اُٹھا کر بڑی تیز رفتاری سے پانی کی سطح پر پھسل کر پتن تک آ جا سکتی تھی۔ کچھ دیر بعد زمینی کٹاؤ والی ایک کھوہ میں بوٹ کھڑی کی۔ نائیلون کی رسی زمین پر پھینکی اور اچھل کر بوٹ سے باہر آ گیا۔ شیشم کے ایک نہایت قریبی درخت کے تنے کے گرد تین چار بل دے کر اُس نے ہُک اڑس دی۔ بوٹ کی چابی جیب میں ڈال کر سیٹی بجاتے ہوئے دریا کے متوازی فاصلے پر بچھی ہوئی پختہ سڑک کی طرف پیدل چل پڑا۔ یہ علاقہ اُس کا اپنا تھا۔ جانتا تھا کہ نصف کلومیٹر کے فاصلے پر واقع سڑک پر پہنچ کر اُسے ڈالا (ویگن) مل جائے گا جو اُسے شہر تک لے جائے گا۔ شام ڈھلنے سے پیشتر اُسے واپس اپنی جنت میں لوٹنا تھا۔

وہ شہر پہنچا اور دکان سے کرایہ وصول کرنے کے بعد وہ لائبریری پر گیا۔ کتابیں منتخب کر کے بیگ میں ڈالیں اور خریداری کی غرض سے نکل کھڑا ہوا۔ دوپہر ڈھلنے کو تھی جب اُس نے ایک عام سے ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا اور کچھ دیر ستانے کے بعد پھر بازار میں نکل کھڑا ہوا۔ ڈھلتی سہ پہر میں اُس کی ترتیب دی ہوئی فہرست سیاہ لکیروں میں بدل گئی۔ اُس نے تمام ممکنہ ضرورت کی اشیا خرید لی تھیں۔

نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ سامان اُس کی سوچ سے کہیں زیادہ تھا۔ اُس نے ٹیکسی اسٹینڈ سے کار حاصل کی۔ سامان کو ڈکی میں رکھا اور اپنی جنت کی طرف عازمِ سفر ہو گیا۔

پروفیسر نے پتن پر پہنچ کر اپنا سامان اُتارا۔ آدھا بوٹ میں لادا اور جنت میں چھوڑ آیا۔ بقیہ سامان کو دوسرے چکر میں لے گیا۔

وہ آٹھ بجے تک مصروف رہا۔ تھک گیا۔ کوک کی ٹھنڈی بوتل فریج میں سے نکال کر چھت پر آ گیا۔ چھوٹے چھوٹے سپ لیتا ہوا ریلنگ کے ساتھ ٹہلتے ہوئے چھت کا احاطہ کرتا رہا۔ جی ہی جی میں اپنی کامیاب کوشش کو سراہتا رہا۔ صبح شہر جاتے ہوئے اُس نے جنت کو مقفل نہیں کیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ کوئی بھی اتنے گہرے پانی کو عبور کر کے جنت میں داخل ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ افتخار بیگ نے چند ماہر مُہانوں کی مدد سے دریا کی خاصی چھان بین کرنے کے بعد یہاں پول نصب کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اِس جگہ پر دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں بھی پانی خاصی مقدار میں رہتا تھا۔ پہاڑوں پر برف پگھلنے کی رُت میں یہ جگہ دریا کا قلب بن جاتی تھی۔

سندھ ساگر اِس علاقے میں اپنی چار گزرگاہیں بنائے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رکھتا تھا۔ عام دِنوں میں بیس کلومیٹر کی چوڑائی میں چار ٹکڑوں میں بٹ کر پرسکون بہنے والا یہ مہا ساگر جو بن پاتے ہی ایک سمندر کا نقشہ کھینچنے لگتا تھا۔

پروفیسر ایک ہاتھ میں بوتل تھامے جھک کر جنت کی فاؤنڈیشن سے سر ٹکراتے ہوئے پانی کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ بوتل خالی ہونے پر پانی میں اُچھال کر پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔ اچانک وہ چیخ کر بولا، ''اے کمزوروں کے سائیں، سندھو! تو بھی جہنم کا کاردار بن کر سانسیں لے رہا ہے۔ سمجھتا ہے کہ تو بڑا دلیر اور طاقتور ہے۔ اُن! تو بُزدل اور منافق ہے۔ سیر شکم فرعونیت کی ہوس زدہ آگ کو بجھاتا ہے۔ غریب کیہل اور مُہانوں کے برہنہ جسموں کے لیے تمہارا ٹھنڈا پانی لاوہ بن جاتا ہے۔ جو صدیوں سے تمہاری وفا میں اپنی نسلیں جھونکتے چلے آرہے ہیں، اُنہیں تو کیا دیتا ہے؟..... طغیانیاں، بیماریاں اور سنہرے بالوں تلے سیاہ فام جوانیاں..... جن کی زندگی بھیگے ہوئے کاغذ کے مانند بے جان ہوجاتی ہے..... میرا باپ..... سیاہ فام مُہانہ فقیرو..... تم سے محبت کرتا تھا۔ چاہتا تو اِس جہنم سے نکل کر امیروں کی جنت میں چلا جاتا اور محنت مزدوری کر کے اپنا اور بیوی بچے کا پیٹ بھر لیتا مگر وہ سادہ لوحی میں باپ دادا کے عشق کو نبھاتا رہا مگر تو نے اُس کا انجام کیا کیا؟''

پروفیسر کی آنکھوں میں نمکین پانی نے دھند طاری کردی۔ وہ ہاتھ کی پشت سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا تو یوں محسوس ہوا جیسے گلا رُندھ گیا ہو۔ ''ہاہ! تو بھی کیا عجیب واقع ہوا ہے، جن لوگوں کے بچے، جن بچوں کے ماں باپ کو سمندر میں لے جا کر پھینکتا ہے وہ تجھے سندھو سائیں کہتے ہیں۔ مہا ساگر کہہ کر تیری پرستش کرتے ہیں۔ مگر تو اِن کے لیے کچھ نہیں کرتا۔ تو ظالم ہے، مُردوں کو مارنے والا شاہ مدار ہے۔''

رات کے سکوت کو اُس کی پاٹ دار آواز چیر رہی تھی۔ کسی بڑی ڈبھرا مچھلی نے ہوا میں جست لگائی۔ ''ڈب'' کی آواز سے پھر پانی میں گری۔

ایسے ہی وقت اچانک ٹوں ٹوں کی آواز کنٹرول روم سے اُبھری۔ پروفیسر زیرِ لب مسکرایا۔ ''دیکھا؟ تمہیں مُردہ سمجھنے والوں کو کتنی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ جنت میں نصب شدہ بہتے پانی کی رفتار ماپنے والے آلے نے تمہاری قلبی کیفیت مجھ پر آشکار کردی ہے۔ میرے طعنوں نے تمہارے جوش میں تیزی بھر دی ہے۔''

بزر کی آواز ایک منٹ تک سنائی دینے کے بعد معدوم ہوگئی۔ پروفیسر کی خود کلامیاں نہیں رُکیں۔ چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ نکال کر سلگائی۔ گہرا کش لے کر بولا۔ ''اے دو ہزار میل لمبے ساگر! تم بھی کتنے بھولے ہو۔ میں بھی کتنا سادہ لوح ہوں۔ چار جماعتیں پڑھ کر تمہیں چھوڑ جانے والوں کے لیے تم وجودِ سخا بن جاتے ہو۔ سچ کہتے ہیں، دور رہنے والا بیٹا اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے۔ پاس بیٹھا ہوا جھڑکیاں کھانے اور جوتے سیدھے کرنے کے سوا کسی کام کا نہیں ہوتا۔ تو دور گئے ہوؤں کے لیے مچلتا رہتا ہے۔''

بے دھیانی میں اپنی نصف عریاں ران پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ دیکھنے لگا۔ وہ ماں کے بطن سے سیاہ رنگ چُرا کر لایا تھا۔ بچپن میں نصف دِن پانی اور دھوپ میں گزارنے کی بدولت اُس کے بالوں کا رنگ شوخ اور چمکدار سنہرا ہوگیا تھا۔ ماں کے بالوں کا رنگ بھی ایسا ہی تھا۔ دوسرے مُہانوں کے بچوں اور عورتوں کے بالوں کا رنگ بھی شوخ سنہرا تھا۔

ماں اُس کے استفسار پر بتایا کرتی تھی کہ سندھو سائیں جس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھ دیتا ہے، اُس کے بالوں کا رنگ بدل جاتا ہے۔ باپ نے بتایا۔ ''دریاؤں کا شہنشاہ خضر ہر فجر میں بچوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرنے کے لیے آتا ہے، جگانے کی کوشش کرتا ہے، کوئی جاگ جاتا ہے اور کوئی اپنے بھاگوں کی طرح سویا رہتا ہے۔ پلٹتے ہوئے اپنی آمد کی نشانی چھوڑ جاتا ہے۔''

بہت بعد میں اُسے پتا چلا کہ ہر روز مچھلی کھانے کی وجہ سے یہ تبدیلی رونما ہوتی تھی۔ چونکہ اُن کے ہاں معمول کی غذا میں بالوں کی سیاہی کو برقرار رکھنے والے جزو کیروٹین کی معمولی سی مقدار بھی شامل نہیں ہوتی تھی اِس لیے اُن کی زندگی سیاہ رہتی تھی، بال سیاہ نہیں رہتے تھے۔

سیاہ فام سیمو نے یہاں سے بھاگ کر شہر میں پناہ لینے کے فوراً بعد نہ صرف اپنا نام اور ذات بدل ڈالی تھی بلکہ خون میں شامل سندھو سائیں کی محبت پر بھی پردہ ڈال دیا تھا۔ تبھی تو وہ اخبار بانٹتے بانٹتے سرکاری پرائمری اسکول میں ٹیچر بھرتی ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ پڑھانے کے ساتھ ساتھ پڑھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ بعد میں وہ ضلعی ہیڈ کوارٹر کے گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر بھرتی ہوا تو اُس وقت وہ سیاہ فام نہیں رہا تھا بلکہ پرکشش سانولی رنگت اختیار کر چکا تھا۔ خال وخد قدرے جاذبِ نگاہ تھے تبھی محبت کرنے والوں کی نظریں اُسے پرکشش پرسنالٹی قرار دیتی تھیں۔

اچانک فضا میں پھٹ پھٹ کی ایک مخصوص آواز گونجنے لگی۔ اُس نے گردن موڑ کر پانی کے بہاؤ کا رخ دیکھا مگر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ یہ مخصوص آواز پیٹرا انجن کی تھی جو عمومی طور پر

دیسی ساختہ لانچوں پر نصب کیا جاتا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی آواز سے اندازہ لگانا آسان تھا کہ لانچ شمالی جانب سے پانی کے بہاؤ کے رخ پر سفر کرتی چلی آرہی ہے۔ اُس کی چھٹی حس نے اُسے خبردار کیا۔ ڈھکی رات میں کسی لانچ کا اس طرف آنا معمول کی بات نہیں تھی۔

وہ جلدی سے کنٹرول روم میں پہنچا۔ جنت کی تمام بتیاں بشمول ایمرجنسی لائٹس، آن کر کے اسٹور میں گیا۔ سیمی آٹو میٹک گن، گولیوں کا ڈبا، تیز روشنی والی سرچ لائٹ اور پستول اُٹھا کر بھاگتا ہوا کنکریٹ کے پلر پر چڑھا۔ ساڑھے چار فٹ قطر والے اِس ستون پر واٹر پمپ کے پاس ہی مخصوص طرز کا بنکر بنا ہوا تھا۔ لانچ خاصی قریب آگئی تھی۔ اندھیرے میں وہ تیزی سے جنت کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔ لانچ کے قریب پہنچنے تک پروفیسر اپنے مورچے میں پوری طرح محفوظ ہو چکا تھا۔

لانچ کا انجن بند ہوگیا۔ دیسی ساخت ہونے کی وجہ سے لانچ بہتے پانی پر لنگر انداز نہیں ہوسکتی تھی۔ جونہی جنت کی تیز روشنیوں کی زد میں آئی، پروفیسر کو لانچ کے تکونی عرشے پر چار آدمی گنیں اُٹھائے کھڑے دکھائی دیے۔ عقبی حصے میں دو مُہانے پوری مہارت سے لانچ کو کنٹرول کرنے میں مصروف تھے۔ پروفیسر کا اندازہ ٹھیک تھا۔ آنے والے اچھی نیت سے نہیں آئے تھے۔

کئی لمحے گزر گئے۔ لانچ کا انجن بند تھا مگر وہ پانی کی رفتار سے بہتی ہوئی جنت کے کافی قریب آگئی۔ ایسے میں ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ''کوئی ہے تو سامنے آئے..... ہے!''

بولنے والا اسرائیکی زبان کے مقامی لہجے میں بول رہا تھا۔ پروفیسر نے گن کے لیے بنے ہوئے سوراخ پر منہ رکھا۔ چیخ کر بولا، ''تم کون ہو اور یہاں کیا لینے آئے ہو؟''

سطحِ آب پر دھیرے دھیرے پھسلتی ہوئی لانچ میں سے دوسری چنگھاڑتی ہوئی آواز گونجی۔ ''گدھے کے بچے! سامنے آ کر بات کرو، تمہیں بتائیں کہ ہم کون ہیں؟''

گالی سُن کر پروفیسر کا سر گھوم گیا۔ فطری اشتعال نے اُسے سلگا کر رکھ دیا۔ اُس نے سوراخ سے منہ ہٹایا۔ گن کی نالی سوراخ میں ڈال کر فی الفور لانچ پر فائر کر دیا۔ ٹھائیں کی تیز آواز نے پرسکون دریائی ماحول کو تہس نہس کر دیا۔ گولی عرشے کی بڑھی ہوئی نگر پر لگی۔ پروفیسر نے اوپر والے سوراخ میں سے جھانکا۔ چاروں عرشے پر سے چھلانگیں لگا کر لانچ کی چوکی پر کود گئے اور ہنگامی حالت میں مورچہ بندی کی کوشش کرنے لگے۔ اُن کی اِس غیر شعوری حرکات کی بدولت لانچ بُری طرح ڈولنے لگی اور مُہانے چیخ چیخ کر اُنہیں شانت رہنے کی ہدایات دینے لگے۔

پروفیسر نے دبنگ لہجے میں کہا۔ ''انسانوں کی طرح بات کرو ورنہ تمہارے سمیت تمہاری لانچ کو راکٹ لانچر مار کر تباہ کردوں گا۔ سمجھے تم؟''

دھمکی اثر کر گئی کیونکہ دھمکانے والا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جو نظر نہیں آتا، اُس کا دبدبہ دل کو دہلانے لگتا ہے۔

چاروں نے دیدے پھاڑ پھاڑ کر جنت کے ہر حصے کو دیکھا۔ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ سمجھ آنے لگا کہ اندھا دھند فائرنگ کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ اجنبی پردہ نشیں کے نشانے کی زد میں ہیں۔ چھپا ہوا دشمن جوابی فائر پر برانگیختہ ہوجائے گا اور گولی مار کر بھیجا اُڑا دے گا۔

پروفیسر کو گالی دینے والے نے کہا۔ ''ہم تمہیں نقصان پہنچانے نہیں آئے بلکہ یہ دیکھنے کے لیے آئے ہیں کہ ہمارے علاقے میں تم یہ ڈراما بازی کس مقصد کے حصول کے لیے کر رہے ہو؟''

''یہ علاقہ کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ یہ سندھ ساگر کی سلطنت ہے۔ تاریخ کہتی ہے کہ اس کے سینے پر دندنانے والوں میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچا۔ تم بھی نہیں بچو گے۔''

پروفیسر نے مورچے سے سر نکال کر چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں سائیں کا بیٹا ہوں۔ اِس کا رکھوالا بھی ہوں۔''

گن بردار نے کہا ''کیا تم کسی سرکاری ایجنسی کے آدمی ہو؟''

''میں تمہارا جوابدہ نہیں ہوں۔ تمہیں جو کہہ رہا ہوں، اُسے سمجھنے کی کوشش کرو۔'' پروفیسر کا لہجہ غیر معمولی حد تک سرد ہوگیا۔

ایک اور آواز سنائی دی، ''تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو جوان!''

''غلطی؟ ہا ہا ہا'' پروفیسر نے اشتعال آمیز استہزائیہ لہجے میں قہقہہ لگایا۔ ''یہ دن کے اجالے میں آنے والوں کے لیے جنت ہے، رات کو چوروں کی طرح نقب لگانے والوں کے لیے دوزخ کا کھلا دروازہ۔''

''تم اتنا پراسرار بننے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟''

پروفیسر نے جواب دینے کے بجائے جنت کے عقبی کونے سے پیچھے کی طرف نکلتی ہوئی لانچ پر فائر داغ دیا۔ گولی پانی میں لگی۔

اپنی رَو میں، اپنی طاقت کی سرشاری میں منہ اُٹھا کر بھاگے چلے آنے والوں کے دماغ میں بات بیٹھ گئی۔ لانچ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں دکھائی دینے والے ہیولوں میں ہل چل مچی۔ موت کے خوف نے مُہانوں کے سیاہ جسموں میں غیر معمولی مستعدی بھر دی۔ انجن اسٹارٹ کر دیا گیا۔ چونکہ لانچ مقامی سطح پر تیار کی گئی تھی، اِس لیے لمبا چکر کاٹ کر پلٹی اور نسبتاً سست روی سے شمال کی جانب بڑھنے لگی۔

❖❖❖

وہ رات کی رانی کا پودا کالج میں چھوڑ آئی۔ شہاب کی انگلیوں کا لرزتا ہوا لمس بائیں پنڈلی پر لیے گھر آ گئی۔ پہلی ملاقات ذہن پر عذاب بن کر اُترنے لگی تھی۔ اَبھی اُسے یہ علم نہیں تھا کہ اُسے وارفتہ نگاہوں سے دیکھ کر دل کی دُنیا میں ہل چل مچانے والا کوئی عام مرد نہیں تھا، ضلع ناظم کا اعلیٰ تعلیم یافتہ بیٹا تھا۔ نئے سیاسی نظام اور انتظامی ڈھانچے نے اُس کے ہاتھ بہت لمبے کر دیے تھے۔ اَبھی محض یہی پتا تھا کہ اُس بانکے کے سینے میں بڑا ہمدرد دل دھڑکتا ہے۔

کالج سے واپسی پر لباس تبدیل کرنے کی عادی تھی۔ وارڈروب کے سامنے کھڑی ہوئی تو یکبارگی نظر گھٹنے پر پڑ گئی۔ ٹھہر گئی۔ سوچنے لگی۔ ''عجیب شخص نکلا، ڈیڑھ دو گھنٹے کی ہمراہی میں اُس نے میرا چہرہ دیکھنے کی خواہش تک کا اظہار نہیں کیا۔ کیا میرے بدن میں اتنی بھی کشش نہیں ہے کہ دیکھنے والا قطعے کی تفصیل دیکھ کر ہی لوٹ جائے۔''

ایسے میں دِل سوچنے بیٹھ جاتا ہے۔ بولا۔ ''پگلی! کبھی تم نے اپنے ننگے پیروں کو اُس نظر سے دیکھا ہے جس نظر سے آج شہاب نے دیکھا۔ تاڑنے والے مرکزی دروازے اور بنیادوں کو دیکھ کر قطعے کے اندر کی دُنیا کا احوال جان لیتے ہیں۔ فاتح مہلت دے کر پلٹا ہے، کہہ گیا ہے کہ اپنی سلطنت کو بچا سکتی ہو تو بچا لو ورنہ میں تو دروازے سے گزر کر قطعے کے قلب تک پہنچنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

اُسے دل کی بات کا یقین نہیں آیا۔ بیڈ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ بے دھیانی میں اپنے پیروں کو دیکھنے لگی۔ پیروں میں سرسراہٹ سی ہونے لگی۔ سوچنے لگی۔ ''شاید پگلا دِل ٹھیک ہی کہتا ہے۔''

شہاب کی انگلیوں کا لمس یاد آ گیا تو سرشاری کی کیفیت نے گھیر لیا۔ پھٹ کر اسٹیکر سے رفو ہوئی شلوار کو چٹکی میں پکڑ کر اوپر کھینچ لیا۔ بہ دقت اسٹیکر کو کھینچ کر باہر نکالا۔ کپڑے کے پھٹے ہوئے ٹکڑے کو اوپر اُٹھایا۔ گھٹنے سے کچھ نیچے کی سفید چمکدار جلد دکھائی دی۔ اپنے آپ پر فریفتہ ہوتے ہوئے شہاب کی والہانہ نگاہوں کے بارے میں سوچ سوچ کر شرمانے لگی۔ سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں سوراخ میں داخل کیں۔ لمس کو محسوس کیا تو بے گداز جلد مچل اُٹھی۔ یوں لگا جیسے شہاب کی لرزتی ہوئی انگلیاں بڑی نرمی سے اپنے ہونے کا احساس دلا رہی ہوں۔

دل کی دُنیا عجیب ہوتی ہے۔ افتخار بیگ جیسی جاذبِ نظر شخصیت سے برسوں میں متاثر نہیں ہوئی تھی، ایک اجنبی نے اپنا آپ دکھا کر آن کی آن میں اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ جس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی، اُسی کو سوچتے ہوئے رات کی رانی دِن کے اُجالے میں بے طرح سے بکھر رہی تھی.....

''اُس سے ملتے وقت دل گھبرا رہا تھا، دور ہو کر بے چینی رَگ رَگ میں اُترتی جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کوئی بتائے تو..... کوئی سمجھائے تو.....''

سمجھانے والا دل کے دروازے پر دستک دینے کے لیے آ گیا۔ موبائل فون میں ایک چنچل گیت کی بنی رنگ ٹون بجی۔ اُس نے چونک کر اسکرین پر جھانکا۔ نمبر اجنبی تھا۔ کون ہو سکتا ہے؟ سوچ میں پڑ گئی۔ دل نے ٹہوکا دے کر سمجھایا کہ جب تک فون آن نہیں کرو گی، پکارنے والے کی شناخت نہیں ہو سکے گی۔ فون آن کیا تو شہاب کی آواز کانوں میں پڑی۔

''ہیلو..... ہیلو!''

اتنی جلدی شہاب کی آواز کو پہچان لینے پر اُسے خود پر حیرانی ہوئی۔ کچھ بولنا چاہتی تھی کہ گڑبڑا سی گئی۔ بہ دقت تمام کہہ پائی، ''جج..... جی!''

''تم یقیناً مصباح ہو۔ کیسی ہو؟''

''جی..... میں ٹھیک ہوں۔'' وہ تذبذب آمیز لہجے میں بولی۔ اچانک پریشان ہو گئی۔ شہاب کو اُس کا فون نمبر کہاں سے ملا تھا؟

زیادہ سوچ نہ پائی۔ شہاب کہہ رہا تھا۔ ''میں اجازت لے کر رابطہ کر رہا ہوں۔ لگتا ہے کہ تم میرے فون کرنے پر پریشان ہو گئی ہو، کیا ایسا ہی ہے؟''

وہ جلدی سے بولی۔ ''نہیں مگر میرا فون نمبر تمہارے پاس.....''

''ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسان خوش فہمیوں میں بہت آگے نکل جاتا ہے۔ اسپتال میں تمہارا نام آؤٹ ڈور رجسٹر پر درج کرواتے ہوئے میں نے تمہاری دوست سے نمبر پوچھا تھا۔ اُس نے بتایا، سچ کہتا ہوں، آج تک کوئی بھی نمبر فقط ایک بار سن لینے پر مجھے یاد نہیں رہا، آج رہ گیا۔''

وہ حیرت بھری آواز میں بولی۔ ''جب تمہیں میرے نام کا علم ہو چکا تھا تو پھر مجھ سے نام پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''وہ تو میں نے اپنا نام بتانے کے لیے پوچھا تھا۔'' وہ شوخی سے بولا۔

''تم کیا کرتے ہو؟'' وہ نروس سی ہو گئی۔

''پہلے کچھ نہیں کرتا تھا، آج کرنے لگا ہوں۔''

''کیا؟'' وہ متعجب ہوئی۔

''عشق!''

''کس سے؟'' اُس کا دل بے اعتدال ہو گیا۔

''تم سے!'' شہاب نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''کسی فلاسفر نے کہا ہے کہ عشق بذاتِ خود ایک کام ہے، کچھ اور کرنے کی فرصت نہیں دیتا۔''

مصباح کی تیز زبان چلتے چلتے رُک گئی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا کہ یوں بے دھڑک انداز میں تو آج تک افتخار نے بھی اُس پر حقِ ملکیت نہیں جتلایا تھا۔

''کیا سوچنے لگی ہو؟''

''تمہارے بارے میں سوچ رہی ہوں۔'' اُس نے سوچ سمجھ کر جھوٹ بول دیا حالانکہ وہ سوچ رہی تھی۔ ''یہ کیسا دعویٰ ہے۔ یہ کیسا اندھا لفظ ہے جس کی ایک بار کی ادائیگی سننے والے آزاد انسان کو اپنا آپ گروی رکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یوں کہ بندہ اپنے تخلیق کاروں تک سے پوچھنا گوارا نہیں کرتا۔''

وہ خوشی سے بولا۔ ''سوچتی رہو۔ سوچنے سے دل میں محبت پیدا ہوتی ہے۔''

اُس کا لہجہ دِل کے تاروں کو چھیڑ کر نغمے کی لے اُٹھانے لگا تھا۔ مصباح نے گھبرا کر جلدی سے فون بند کر دیا۔ تنفس غیر معمولی حد تک مشتعل ہو گیا۔ ایسے میں پھر شہاب کا نمبر اسکرین پر جگمگانے لگا۔ گھنٹی بجتی رہی، وہ پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتی رہی۔ کال اٹینڈ کرنے کی جرأت نہ کر پائی۔ بیڈ پر لیٹ گئی اور بانہوں میں منہ چھپا کر مسکرانے لگی۔ کم بخت بدن کا اَنگ اَنگ بولنے لگا تھا۔ جو کبھی نہیں بولا تھا، آج زبان بن کر چھیڑنے لگا تھا۔

شہاب بار بار ٹرائی کر رہا تھا۔ وہ فون کی طرف دیکھنے سے ہچکچا رہی تھی۔ کافی دیر گزر گئی، شاید گھنٹا گزر گیا تھا جب وجدان کمرے میں داخل ہوا۔ بیڈ کے پاس کھڑا ہو کر بولا۔ ''عمران بھائی بار بار ٹرائی کر رہے ہیں مگر تم فون ہی اٹینڈ نہیں کرتی ہو، کیا بات ہے؟ کوئی ناراضی ہے کیا؟''

وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ جھپٹ کر فون اُٹھایا۔ سمجھ آیا کہ فون پر شہاب نہیں، اُس کا بھائی عمران اُسے پکار رہا تھا۔ جلدی سے فون آن کر کے بولی۔ ''بھائی! میں سمجھی تھی کہ میری سہیلی روزینہ کا فون ہے۔ کیسے ہو؟''

''تم نے تو مجھے پریشان کر کے رکھ دیا مصباح!'' عمران نے طویل سانس حلق میں اُتارتے ہوئے کہا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آج کل اسٹڈی میں الجھا ہوا ہوں، تم کہو، تعلیم کیسی جا رہی ہے؟''

وہ بتانے لگی۔ پھر اُس سے اُس کے کالج کے بارے میں پوچھنے لگی۔ اُسے وہاں کے ماحول کے بارے میں بڑا تجسس لاحق رہتا تھا۔ پھر اچانک بولی۔

''اچھا چھوڑو اپنے وین ژوسٹی کو..... اپنی پستہ قامت گرل فرینڈ کے بارے میں بتاؤ۔''

وہ قدرے جھینپ کر بولا۔ ''کیا بہنوں سے ایسی باتیں کی جاتی ہیں؟''

''تو کیا پاپا سے ایسی باتیں کرو گے؟''

''تمہیں شرم نہیں آئے گی مُن کر؟''

''بھائی! کچھ سوچ کر بولا کرو۔ تمہیں لڑکیوں سے دوستی کرتے ہوئے شرم نہیں آتی، مجھے اُن کی خیریت دریافت کرتے ہوئے شرم کیوں آئے گی؟'' وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

''ایکی اپنے وطن تائی پی (تائیوان) چلی گئی ہے۔ کبھی نہ لوٹنے کے لیے۔ مجھے اُس کے جانے کا صدمہ ہوا مگر انداوان نے اُس کی کمی پوری کر دی ہے۔'' اُس نے بتایا۔

''یہ انداوان کیا شے ہے؟'' مصباح نے دلچسپی لی۔

''بڑی بے تاب ہو رہی ہو، ذرا دَم تو لینے دو۔'' وہ ہنسا۔ ''چوبیس سالہ انداوان ہوبائی (شنگھائی) سے یہاں اپنے دفتری کام کے سلسلے میں دو ماہ کے لیے آئی ہوئی ہے۔ بیٹے کے لحاظ سے مترجم ہے۔ بڑی روانی سے انگلش بولتی ہے۔ انگلس میں ہی جب حالِ دل عیاں کرتی ہے تو کیا بتاؤں مصباح! بس دل چاہتا ہے کہ وہ بولتی رہے، عمران سنتا رہے.....''

مصباح کریدکرید کر انداوان کے بارے میں پوچھتی رہی۔ پھر جب تعریفیں مُن مُن کر اکتا گئی تو حسبِ عادت پیچ کر بولی۔ ''اَب بس بھی کرو بھائی! پہلے کھلتے نہیں ہو، جب کھلتے ہو تو منہ بند کرنے کا نام ہی نہیں لیتے ہو۔ مجھے نیند آ رہی ہے، پلیز فون بند کر دو۔''

فون کے اسپیکر میں عمران کا جاندار قہقہہ گونجا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

وہ سمجھ چکی تھی کہ اس کا بھائی دل و جان سے اس چینی لڑکی پر فریفتہ ہو چکا ہے۔

❖❖❖

پروفیسر چھری کی مدد سے بریڈ پر مکھن اور شہد لگا رہا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب اس کے فون کا بزر بجا۔ اُس نے چولھے پر رکھی کیتلی میں جھانکا۔ اُبھی دودھ کو جوش نہیں آیا تھا۔ کچن سے نکل کر فون اُٹھانے کے لیے بیڈروم کی طرف بڑھا۔ ایسے میں اُسے بیلے والے پتن پر سرس کے درخت کے نیچے کھڑا بلند قامت آدمی دکھائی دیا۔ پروفیسر کے لبوں پر زہرخندی مسکراہٹ تیر گئی۔ ڈاکوؤں کا سردار اُس کے ٹانکے ہوئے پلے کارڈ پر سے فون نمبر پڑھ کر رابطہ کر رہا تھا۔

وہ اپنا فون اُٹھا کر کچن میں آ گیا۔ آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''تم کون ہو اور کیوں میرا سکون غارت کر رہے ہو؟''

فون کرنے والے شخص کا لہجہ اُس سے بھی کہیں زیادہ دبنگ اور تلخ تھا۔ بولا ''گزشتہ رات تم نے میرے بندوں پر فائرنگ کی تھی۔ تمہاری قسمت اچھی تھی کہ میں نے اُنہیں مزہ چکھانے کے لیے نہیں صرف پوچھ گچھ کے لیے بھیجا تھا۔''

''تو کیا تم مجھے مزہ چکھانے کے لیے آئے ہو؟'' پروفیسر نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

''نہیں!'' اجنبی نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''میں ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا مگر تم مجبور کرو گے تو میں انتہائی قدم اُٹھانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔''

پروفیسر اُس سے ٹکراؤ کی فضا پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ محض اُسے اور اُس کے ہرکاروں کو خود سے دور رکھنے کا خواہاں تھا۔ بولا۔ ''کیا تم بیلے والوں کے سردار ہو؟''

''ہاں!''

''پڑھے لکھے لگتے ہو۔''

''میں نے گریجویشن کیا ہے۔''

''پھر اِس لائن میں کیسے آ گئے؟''

''یہ لمبی کہانی ہے۔ میں اپنے ساتھیوں کی طرح خود سے اِس فیلڈ میں نہیں آیا بلکہ مجھے اُمن کے داعیوں نے دھکیلا ہے۔ تم کون ہو؟'' اجنبی قدرے بے تکلف ہونے لگا تھا۔

وہ بولا ''میں جو کوئی بھی ہوں، تمہارا دُشمن نہیں ہوں اور نہ ہی میں کسی ایجنسی کا کارندہ ہوں۔ شاید تم لوگوں نے مجھے کوئی پراسرار شخصیت سمجھ لیا ہے، ایسا نہیں ہے۔ میں سکون اور تنہائی کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔''

''کب تک رہو گے؟''

''مرتے دم تک.....'' پروفیسر نے بریڈ کا ٹکڑا کاٹ کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں زمین میں دفن ہونا بھی پسند نہیں کروں گا، سندھ ساگر کے ٹھنڈے اور رازدار پانی میں عضو عضو ہو کر بکھر جاؤں گا۔''

''کیا تم پاگل ہو؟'' ڈاکوؤں کے سردار کے لہجے میں دُنیا جہان کی حیرت سمٹ آئی۔ ''تم نے لاکھوں روپے صرف سندھوسئیں میں رہنے کے لیے برباد کر دیے، یہاں تمہیں ایسا کیا مل رہا ہے؟''

پروفیسر کے حلق سے قہقہہ برآمد ہوا۔ سنبھل کر بولا۔ ''کیا تم اکیلے آئے ہو؟''

''نہیں..... میری حفاظت کے لیے اَن گنت سورمے گھات لگائے موجود ہیں جو خطرہ بھانپتے ہی تمہارے اِس قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔''

''احمق آدمی! میں مٹی سے اپنا ناتا توڑنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔ کیسے ممکن ہے کہ میری جنت میں مٹی کی اینٹ استعمال ہوئی ہو، ہاں! یہ جذبوں کے بیج اور آنسوؤں کی آبیاری سے نمو پانے والی لکڑی کی بلیوں سے تیار شدہ خواب گاہ ہے، زمین سے نفرت کرنے والے کی تنہائی سے آراستہ قلعہ ہے۔ یہ تم جیسے فرعونوں کے شر سے بچا تا ہے۔ تم دھمکیاں مت دو، جو کر سکتے ہو کرو، شکست کا احساس سینے میں بھر کر میری جنت میں چلے آنا۔ بیٹھ کر مزے کی باتیں کریں گے۔''

کھلے پتن پر چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ پھر فون میں سردار کی آواز اُبھری۔ ''میں نے تو سن رکھا ہے کہ تم اپنی کشتی میں کسی کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔''

''تم نے ٹھیک سنا ہے۔'' پروفیسر نے تیز پتی والی چائے کپ میں اُنڈیلی اور گھونٹ بھر کر کہا۔ ''تمہیں ایک بار یہاں بلاؤں گا، اگر تم میرے مطلب کے آدمی ثابت ہوئے تو اپنی جنت میں بلاتا رہوں گا ورنہ اِسی کھلے پتن پر کھڑے ہو کر حسرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھتے رہو گے۔''

ڈاکو نے قہقہہ لگایا۔ پاٹ دار آواز میں بولا۔ ''شاید تم خود پر زیادہ ہی اعتماد کرنے کے عادی ہو گئے ہو۔ بہرحال! مجھے تمہاری جنت میں داخل ہونے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟''

پروفیسر نے نسبتاً بڑا گھونٹ حلق میں اُتارا۔ سوچا، اُسے جنت میں آنے دے، نہ آنے دے یا کیا کرے..... شروع دِن سے وہ اُس کی آمد کا منتظر تھا۔ سمجھتا تھا کہ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر رکھنا سودمند ثابت نہیں ہوتا۔ مگرمچھ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں ہاتھ کے چبائے جانے کا بھی اندیشہ تھا۔ محتاط انداز میں بولا۔ ''تم دوست بن کر آنا چاہتے ہو یا دُشمن؟''

ڈاکو کے حلق سے بہ مشکل تھمنے والا قہقہہ پھر اُبل پڑا۔

پروفیسر نے تلملا کر کہا۔ ''میرے ساتھ سنجیدگی سے بات کرو۔''

''عجیب آدمی ہو، خود احمقانہ سوال کرتے ہو اور مجھے

احمق کہتے ہو۔ دُشمن بن کر آنے والا دروازے پر دستک نہیں دیتا۔ کیا تم اِتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے ہو؟''

پروفیسر نے سر کھجایا۔ بولا۔ ''ہتھیار اپنے ساتھیوں کے حوالے کر دو۔ میں بوٹ بھیج رہا ہوں، اُس میں صرف تمہیں بیٹھنے کی اجازت ہوگی۔ کسی اور کو بیٹھاؤ گے تو اپنے ساتھ ساتھ اُسے بھی لے ڈوبو گے۔''

ڈاکو نے ہامی بھر لی۔ پروفیسر مستعدی سے کچن سے باہر آیا۔ اسٹور میں سے ریوالور اُٹھایا۔ چیمبر کھول کر گولیاں چیک کرتے ہوئے کنٹرول روم میں آیا۔ ریموٹ کنٹرولر تھاما اور بوٹ کے گیراج میں آ گیا۔ اُسے اسٹارٹ کیا، گیراج کو غیر مقفل کر کے بوٹ کو باہر نکالا اور ریموٹ کنٹرولر کے ذریعے جنت کے عقبی حصے کے پیچھے سے نکال کر کھلے پتن کی طرف بھیجنے لگا۔ افتخار بیگ نے بڑی مہارت سے بوٹ میں ریموٹ کنٹرول سسٹم نصب کیا تھا مگر اِس کے مکینزم میں ایک خامی رہ گئی تھی۔ بوٹ کی اسپیڈ کم یا زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ پروفیسر ریکنگ سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور ایک مکعب فٹ کے ڈبے پر لگی ہوئی ناب اور ہینڈلنگ لیور کے ذریعے بوٹ کو مہارت سے آپریٹ کرنے لگا۔

پتن سے پندرہ فٹ کے فاصلے پر بوٹ رُک گئی۔ پروفیسر نے فون کی میموری میں ریسیوڈ کال کا نمبر نکالا، رابطہ کر کے بولا۔ ''تم نے اُبھی تک ہتھیار نہیں پھینکے؟''

''میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔ ایک خنجر میری پنڈلی کے ساتھ بندھا ہوا ہے، ڈرتے ہو تو اُسے بھی نکال پھینکتا ہوں۔'' ڈاکو نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

پروفیسر کوئی بھی خطرہ مول لینے پر آمادہ نہیں تھا۔ اُس کے اصرار پر جنت میں داخل ہونے کے مشتاق نے خنجر نکال کر اپنے دائیں ہاتھ پر واقع درختوں کے جھنڈ کی طرف اچھال دیا — عین کنارے پر کھڑا ہو کر ہاتھ لہرانے لگا۔ پروفیسر نے فون بند کیا۔ آپریٹنگ سسٹم پر توجہ دی۔ لیور کھینچ کر بوٹ کو پانی کے بہاؤ کی سمت چلاتے ہوئے درختوں کے جھنڈ کے پاس بوٹ کی مخصوص جگہ پر لے گیا۔ بوٹ کے ساتھ ساتھ خشکی پر ڈاکو چلتا آیا۔

اُس کے بیٹھنے پر بوٹ پھر چل پڑی۔ چکر کاٹ کر جنت کی طرف بڑھنے لگی۔ بوٹ کے قریب پہنچنے پر وہ بھاگ کر بوٹ گیراج میں آ گیا۔ چند لمحوں بعد ڈاکو سیڑھیاں چڑھ کر اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ پروفیسر نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں فرطِ استعجاب سے پھٹنے کو تھیں۔ جنت کا طائرانہ انداز میں جائزہ لینے کے بعد بولا۔ ''بہت حیران کن! قطعی طور پر ناقابلِ یقین! یوں لگتا ہے جیسے دِن کے اُجالے میں کھلی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا ہوں۔''

پروفیسر بطور احتیاط اُسے نشانے پر رکھتے ہوئے بالکونی کی طرز پر باہر کو نکلے ہوئے حصے میں لے آیا۔ یہاں پلاسٹک کی دو ضرب ساڑھے تین فٹ کی میز کے گرد چار کرسیاں نصب شدہ تھیں۔ ایک کرسی میں بٹھا کر خود مقابل کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں میں ہی اُس کی گہری اور تیز نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ آنے والے کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ وہ پینتیس چھتیس برس کا کڑیل جوان تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں اور دہشت پھیلانے والی آنکھیں اُسے پیشہ وارانہ معاملات میں خاصی مدد دیتی تھیں۔ ڈھیلا ڈھالا مقامی لباس اور کندھے پر لمبا صافہ دیکھ کر اُس کے گریجویٹ تو درکنار، معمولی خواندہ ہونے کا یقین بھی جاتا رہتا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے جوان؟'' پروفیسر نے چند لمحوں کے توقف کے بعد تحیر آمیز آنکھوں سے اردگرد دیکھتے ہوئے ڈاکو سے پوچھا۔

''میرا نام شیر محمد ہے۔ دَمان کا رہنے والا ہوں اور نہایت وضع دار گرمانی بلوچ خاندان کی نجابت کا جنازہ کندھوں پر اُٹھائے کئی برسوں سے بیلے کی ویرانی میں چھپا بیٹھا ہوں۔ دُنیا مجھے شیرا گرمانی کے نام سے جانتی ہے اور اپنے بچوں کو اِسی نام سے ڈراؤ بکا کر سلاتی ہے۔''

پروفیسر کو حیرانی ہوئی۔ اس کے باوجود کہ وہ اصلاً سرائیکی تھا، بڑی روانی اور شستگی سے اُردو بول رہا تھا۔

''تم کس کے لیے کام کرتے ہو؟''

''علاقے میں جتنے بھی خان یا سردار ہیں، بڑی اور چھوٹی اسمبلیوں کے رُکن ہیں، وہ ضرورت پڑنے پر ہماری خدمات حاصل کرتے ہیں۔ ہمارے منہ میں راتب ڈالتے ہیں، ہم اُن کے دُشمن لوگوں کے منہ سے زبان اور دانت کھینچ کر اُن کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں۔'' شیرا گرمانی زہرخند لہجے میں بتانے لگا۔

دو گھنٹے کے دورانیے پر مشتمل ملاقات فریقین کے لیے یادگار ثابت ہوئی۔ دونوں کے بیچ ایک خاموش معاہدہ طے پا گیا۔ پڑھے لکھے ڈاکو نے اجڈ اور جاہل ہونے کا ثبوت نہیں دیا تھا بلکہ تسلیم کر لیا تھا کہ اُنہیں پروفیسر کی ذات سے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ اُس نے چائے پینے کے بعد اُٹھ کر وفورِ عقیدت سے پروفیسر کے ہاتھ چومے، آنکھوں سے لگائے اور مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''آپ کو جب بھی میری یا میرے گروہ کی ضرورت محسوس ہو، بلاتکلف فون کر کے بلوا لیجیے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں، شیر اگرمانی اور میرا گروہ، آپ پر اپنی جان نثار کرنے کے لیے ہر وقت تیار ملے گا۔''

پروفیسر نے مسکراتے ہوئے اُس کے جذبات کا خیر مقدم کیا اور اُسے بوٹ میں سوار ہونے میں مدد دی۔ اُسے کھلے پتن پر اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچانے کے بعد ریموٹ کنٹرول بوٹ واپس اپنی گیرج میں آ کر مقفل ہوگئی۔

پروفیسر نے ہاتھ ہلا کر اُنہیں رخصت کیا۔ حبس انگیز ہوا میں دونوں بانہیں پھیلا کر ایڑیوں کے بل گھومنے لگا۔ پروفیسر کا اَنگ اَنگ سرشاری میں ٹوٹنے لگا۔ اُس کی تعمیر کی ہوئی جنت اپنے مناظر کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ شیر اگرمانی ہتھیار ڈال چکا تھا اور یہ امر پروفیسر کے لیے طمانیت بخش تھا۔

❖❖❖

مصباح کی موجودگی میں وجدان اپنے پھوپی زاد افتخار بیگ سے جھگڑ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ''بھائی! تم نے ایک ایسے فضول انسان کے لیے اپنے شب و روز تج دیے جو تمہارے کہنے پر مجھے اپنا دریائی بیڑا دکھانے پر تیار نہیں ہے۔ یا تو تم اُسے سنجیدگی سے کہتے ہی نہیں ہو، یا وہ تمہاری بات کو اہمیت ہی نہیں دیتا۔ ہاہ! پروفیسر صاحب بہت اچھے انسان ہیں۔''

اُس نے منہ بنا کر افتخار کی نقل اُتاری۔

افتخار بجائے چڑنے کے، مسکرانے لگا۔ بولا۔ ''تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ اگر اُسے یوں خود اور اپنی بنائی ہوئی جنت کو نگارخانہ ہی بنانا ہوتا تو وہ انسانوں کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کیوں کہتا؟ پلیز وجدان! میں پروفیسر کا دل سے احترام کرتا ہوں، میں نہیں چاہتا کہ وہ میرے احسانات پر بلیک میل ہو جائے اور مجبوراً تمہیں جنت میں آنے کا پرمٹ دے۔''

مصباح نے اُن کی لڑائی میں دَخل دیتے ہوئے افتخار کو مخاطب کیا ''بھائی! کیا وہ بیڑا واقعی جنت کو مدنظر رکھ کر بنایا گیا ہے؟''

وجدان نے غصے میں کہا۔ ''جنت کو نہیں، جہنم کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اُس میں سوائے عیاشی کے سامان کے، کچھ بھی نہیں ہے۔''

''تم شاید بھول رہے ہو وجدان!'' افتخار بیگ نے کہا۔ ''اُس میں سب کچھ ہے مگر عیاشی کا سامان نہیں ہے۔''

اُس نے مصباح کی موجودگی کے باعث مکمل کر بات نہیں کی تھی مگر وجدان سمجھ گیا اور بُرے بُرے منہ بنا کر خاموش ہوگیا۔

وہ بارہا وجدان اور افتخار بیگ کی نوک جھوک دیکھ چکی تھی۔ پروفیسر وسیم بزدار کی بنائی ہوئی غیر روایتی جنت کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوگیا تھا مگر جب یہ دیکھتی کہ افتخار کی سفارش کے باوجود وجدان کو جنت دیکھنے کی اجازت نہیں ملی تو منہ بسور کر بیٹھ جاتی۔ وجدان کے موبائل پر کسی دوست کا فون آیا۔ فون سن کر وجدان نے دونوں سے معذرت چاہی اور اُٹھ گیا۔ غالباً اُس کے دوست نے اُسے اپنے پاس بلایا تھا۔

اُس کے جانے کے بعد افتخار نے تاسف سے کہا۔ ''میں بھی چاہتا ہوں کہ اور کسی کو نہیں تو کم از کم وجدان اور تمہیں وہاں لے کر جاؤں اور اپنی انجینئرنگ کا کمال دکھاؤں مگر پروفیسر صاحب نہیں مانتے۔ میں نے ایک بار کہا تھا کہ مجھے وڈیو بنانے کی اجازت دے دیں، کہنے لگے کہ اگر اپنے احسانات کی قیمت مانگتے ہو تو جو جی میں آئے کر گزرو، وگرنہ میری جنت کی تشہیر مت کرو۔''

وہ بولی۔ ''کیا واقعی وہ غیر معمولی کارنامہ ہے؟''

وہ مسکرایا۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا پسند نہیں کرتا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ اپنے کارنامے کو بڑھا چڑھا کر اپنی محبوبہ کے سامنے عیاں کرے۔ اُس کے چہرے پر ایک دھڑکن تھامنے والی ادا کی صورت میں ٹھہر جانے والے تحیر کو ملاحظہ کرے۔ تذبذب آمیز لہجے میں بولا۔ ''مصباح! پروفیسر کی جنت کے بارے میں فقط اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میرے دل کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ میں تمہیں لے کر وہاں جاؤں اور پورا ایک مہینا وہاں رہ کر ہنی مون مناؤں۔''

حیا کا ایک رنگ مصباح کے چہرے پر لہرا گیا۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔ سرخی نے شرم کے ساتھ ساتھ برہمی کو تھام لیا۔ خفا ہو کر بولی۔ ''اپنی بہن کے ساتھ؟''

وہ سن ہوگیا۔ بات بنانے کو بولا۔ ''تم میری بہن نہیں، کزن ہو۔''

اُس نے تاویل کو قبول نہیں کیا۔ منہ بنا کر بولی۔ ''بھائی! تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟ کیا میں تمہیں ایسی دکھائی دیتی ہوں جو تمہاری تہذیب سے گری ہوئی باتوں کو بھی پسند کروں گی؟''

افتخار بیگ کا سر ندامت سے جھک گیا۔ تھکی تھکی آواز میں بولا۔ ''ویری سوری مصباح! نہ جانے کیوں میں ایسا ہو جاتا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ آئندہ اپنی محبت کو خود تک محدود رکھوں۔ اگر کبھی اختیار نہ بھی رہا تو تمہارے پاس سے اُٹھ جاؤں گا۔''

مصباح کو اُس کے ردعمل پر دُکھ سا ہوا۔ سوچنے لگی کہ اُسے اتنی بے رخی سے اپنے کزن کو نہیں جھٹکنا چاہیے تھا۔ ہر محبت کرنے والا زود حس ہوتا ہے۔ سر جھکائے ناخنوں سے کھیلتی رہی۔ افتخار کو وہاں بیٹھے رہنا مشکل دکھائی دے رہا

تھا۔ اجازت لے کر اُٹھ گیا۔ دروازے کے قریب پہنچا تھا کہ عقب سے مصباح نے پکار کر روک لیا۔ بولی۔ ''بھائی! مجھے معافی دے دو۔ نہ جانے کیوں میں ہر وہ بات تمہارے ساتھ کر لیتی ہوں، جو دُنیا میں کسی کے ساتھ نہیں کر سکتی۔''

وہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔ پلٹے بغیر دل ہی دل میں تعین کرنے لگا کہ وہ اظہارِ محبت کر رہی ہے یا اپنے مخصوص انداز میں کچھ سوچے سمجھے بغیر محض معافی مانگ کر بہلا رہی ہے۔ دونوں صورتوں میں ہی دل سے تضحیک کا بار اترتا دکھائی دیا تو وہ گردن موڑ کر بے دِلی سے مسکرایا۔ بولا۔ ''تھینک یو مائی کزن!''

جانے والا چلا گیا۔ آنے والا تصور کے پردے پر براجمان ہوگیا۔ شہاب کی وجاہت سے متاثر ہوئی تھی، اُس کی شائستگی پر مطمئن تھی، تبھی اُس کے بارے میں اپنی تنہائی میں سوچتی رہتی۔ بے دھیانی میں افتخار اور شہاب کا موازنہ کرتی رہتی۔ اگر خونی رشتے کی اضافت کو خارج کر دیا جاتا تو بلاشبہ شہاب کی شخصیت افتخار پر بھاری پڑتی دکھائی دیتی تھی۔

شام کو اُس کی دوست روزینہ ملنے کے لیے آئی۔ اُس کا چہرہ دیکھ کر ہی پتا چلتا تھا کہ اُس کے پاس کوئی خاص خبر ہے جسے بتانے کے لیے بہت بے چین ہے۔

مصباح نے پوچھا۔ ''ڈارلنگ! ایسا کیا ہے جس نے تمہارے چہرے پر سات رنگ بکھیر دیے ہیں؟''

اُس نے مسکرا کر آنکھ سے اشارہ کیا کہ تنہائی میں سنائی جانے والی خبر ہے۔ دونوں بیڈروم میں آئیں۔ روزینہ نے گلے میں بانہیں ڈال کر پیار کیا، چھیڑتے ہوئے بولی۔ ''میری جان! تم بڑی خوش قسمت ہو۔ یہی وہ خبر ہے جسے تمہارے گوش گزار کرنے کے لیے میں اِس وقت دوڑی چلی آئی ہوں۔''

وہ مصنوعی خفگی سے بولی، ''کیا تم نے کسی نجومی سے پوچھا ہے؟''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ خوشی جوانی کے اَنگ اَنگ سے اُمڈ رہی تھی۔ مصباح نے بے چینی سے پوچھا۔ ''تو بتاتی کیوں نہیں؟ کیا بھری دُنیا میں کسی نے تمہیں پسند کرنے کی حماقت کر لی ہے جو یوں باؤلی ہو رہی ہو؟''

روزینہ نے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دَبایا۔ یوں کہ جیسے مسکراہٹ کو دَبا کر چھپانا چاہتی ہو۔ سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی کو مصباح کے رُخسار پر پھیرا۔ انگلی گالوں میں ہنستے وقت پڑنے والے گڑھوں میں سے ایک مقام پر آ کر رُک گئی۔ روزینہ بولی۔ ''ہائے مصباح! تم ہنستے ہوئے کتنی اچھی لگتی ہو۔ دُنیا اپنی خوشیاں قربان کرنے کے لیے تمہاری مسکراہٹ کا انتظار کرتی رہتی ہے۔''

حسن کے قمقمے روشن ہوگئے۔ انگلی کی اگلی پور نے ننھے سے گڑھے کی تمام تر لطافت کو جذب کر کے روزینہ کے من میں اُتار دیا۔ وارفتہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مصباح! سچ بتاؤ، کیا تم جانتی ہو کہ شہاب کون ہے؟''

وہ چونک گئی۔ پیشانی کو شکن آلود کرتے ہوئے بولی۔ ''وہی تو ہے جو اُس دن ہمیں اسپتال میں لے کر گیا تھا..... کار والا!''

''افوہ بھئی! کس بے وقوف سے پالا پڑ گیا ہے۔ یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔ میں پوچھ رہی ہوں کہ وہ کون ہے، کیا کرتا ہے، کہاں رہتا ہے؟''

''تم اور فرح تمام وقت میرے ساتھ موجود رہی تھیں۔ کیا اُس نے مجھے بتایا تھا؟''

''اُس وقت تو نہیں بتایا تھا۔''

''پھر کیا اُس نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے خط کے ذریعے اپنی سی وی بھیجے گا؟'' اُس کا مصنوعی غصہ پورے عروج پر تھا۔

''نہیں تو.....'' روزینہ بھی مزہ لینے بیٹھ گئی۔

''کیا ای میل کے ذریعے مجھے بتاتا؟''

''اتنی معصوم مت بنو مصباح!'' روزینہ نے اچانک اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ پیار سے پوچھنے لگی۔ ''کیا اُس نے تمہیں فون نہیں کیا؟''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ انکار کرنے میں اندیشہ تھا کہ کہیں شہاب نے اُسے مل کر بتا نہ دیا ہو۔ اقرار کرنے کی صورت میں جھوٹ کے پکڑے جانے پر ندامت ہوتی۔ چکر دے گئی۔ ''کیا یہ طے تھا؟''

''بڑی بے ایمان ہو!'' روزینہ نے ہنس کر کہا۔

''کیا وہ تمہاری نظروں میں اتنا اہم واقع ہوا ہے کہ ہم اپنی ملاقات کو اُس کے تذکرے پر ضائع کر دیں؟'' مصباح نے موضوع کو بدلنے کی اپنی سی کوشش کی۔

''ہاں! وہ کافی پرکشش انسان ہے۔''

''تم کہتی ہو تو ہوگا مگر مجھے کیا؟'' مصباح نے جان چھڑانا چاہی۔

''بہرحال! میرے پاس شہاب کے بارے میں بہت سی کارآمد معلومات ہیں۔ تمہیں جب اُس سے کوئی غرض ہی نہیں تو بتانے کا کیا فائدہ..... وہ بھی اُن بیسیوں لڑکوں میں سے ایک ہے جو تمہیں دیکھ کر مچلتے ہیں، ایک بار مل کر مسکراتے ہیں پھر واپسی کی راہ پر سر جھکائے چلے جاتے ہیں۔''

مصباح نے بے بسی سے سر کھجایا۔ بات بناتے ہوئے بولی۔ ''مگر یہ اُن لڑکوں سے تھوڑا مختلف ثابت ہوا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''وہ کیسے؟''

''اُس نے فون پر محبت کا اظہار کرنے کی جرأت کر لی ہے۔''

''پھر؟''

''پھر کیا؟ میں نے فون بند کر دیا۔''

''کیوں؟''

''تو اور کیا کہتی اُس کی فضول باتوں کے جواب میں؟''

''ایسے بندے سے جان چھڑانے کے لیے ایک آسان اور نہایت گھسا پٹا جملہ محبت کی لغت میں موجود ہے۔''

''کون سا؟''

''آئی لو یو!'' روزینہ نے آنکھیں نچا کر کہا۔

مصباح نے اُسے دھکا دے کر بیڈ پر گرا دیا اور گلا دباتے ہوئے چیخی۔ ''میں تمہارا خون پی جاؤں گی بدتمیز!''

''مجھے چھوڑو، اُس کا جا کر خون پیو یا دل جلاؤ جو تمہیں فون کرتا ہے۔ جو تمہارے لیے کالج کے گیٹ پر دھوپ سینکنے کے لیے تین چار دنوں سے متواتر آ رہا ہے۔'' روزینہ نے مسکراتے ہوئے واویلا مچایا۔

''تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ میرے لیے وہاں آتا ہے؟''

''سچ کہوں؟''

''کہو!''

''پچھلے سال امتحان میں کامیابی کی مبارکباد دیتے ہوئے میں نے تمہارے گال کو چوما تھا۔ میری بدقسمتی کہ عین اُسی جگہ پر چند دن بعد ایک پمپل نکل آیا۔ ہائے! قربان جاؤں اُس بوسے پر کہ کبھی بھولتا ہی نہیں۔ ہائے! اُف ہو اُس پابندی پر جو تم نے مجھ پر ہمیشہ کے لیے عائد کر دی۔ میں کہ ایک عورت، آج تک اُس لمس کو بھول نہیں پائی۔ وہ کہ ایک جوان مرد، تمہارے لمس کو زندگی بھر کیسے بھلا پائے گا؟'' روزینہ نے کہا۔

وہ اُسے مارنے کے لیے جھپٹی۔ روزینہ بڑی عجیب نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُٹھا ہوا ہاتھ رُک گیا۔ شرما کر گلنار ہو گئی اور اُس سے لپٹ کر بیڈ پر گر گئی۔ روزینہ اُس کی کاکلوں سے کھیلتے ہوئے بتانے لگی۔ ''فرسٹ ائر میں ایک لڑکی پڑھتی ہے، شمسہ۔ اُس کی شکل میں شہاب سے غیر معمولی مشابہت دیکھ کر میں نے اُس سے پوچھ ہی لیا کہ وہ شہاب کی کیا لگتی ہے۔ پتا چلا کہ وہ شہاب کے سگے چچا کی بیٹی ہے، شہاب کے گھر میں ہی رہتی ہے کیونکہ اُس کا اپنا گھر گاؤں میں ہے جو یہاں سے تیس چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ وہاں سے روزانہ آنے جانے میں خاصا وقت ضائع ہوتا ہے۔''

منہ چھپائے اپنی دھڑکن پر قابو پاتی مصباح نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''رُک کیوں گئی ہو؟ بولتی رہو، اچھا لگ رہا ہے۔''

''اپنا ڈسٹرکٹ ناظم ہے ناں، سردار ارباب خان! جانتی ہو ناں؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''نہیں تو.....''

''نام تو سنا ہی ہوگا ناں؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

روزینہ بولی، ''شہاب اُسی کا بیٹا ہے۔''

مصباح ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھ بیٹھی۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ حیرت سے بولی۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''کیا مطلب؟ کیا ملکی قوانین کی رُو سے کوئی ضلعی ناظم پیدا نہیں کر سکتا؟''

وہ شرمسار سی ہو گئی، بولی۔ ''نہیں نہیں..... میرا کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا۔ دیکھنے میں تو وہ.....''

روزینہ نے بات کاٹ دی۔ اُس کے گال پر پیار سے چٹکی کاٹ کر بولی۔ ''دیکھنے میں تو تم بھی کسی ملک کی شہزادی لگتی ہو۔ بعض اوقات آنکھیں بھی جھوٹ بولنے لگتی ہیں۔ اَب ڈراما بازی بند کرو اور دھیان سے اپنے شہاب کے بارے میں سنو۔''

بظاہر بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے مصباح روزینہ کی ایک ایک حرف دِل میں اُتار رہی تھی۔

❖❖❖

سلور گرے کلر کی نسان سنی کار پتن پر رُکی۔ پروفیسر نے ناگوار نظروں سے دیکھا۔ پینٹ شرٹس میں ملبوس دو آدمی باہر نکلے۔ پروفیسر کی آنکھیں پہچان نہ سکیں۔ دوربین نکال کر آنکھوں سے لگائی۔ دیکھا تو ناگواری کے جذبات پر اَوس پڑنے لگی۔ دل خوش ہو گیا۔ افتخار بیگ اپنے الیکٹریکل انجینئر دوست مظہر عباس کے ساتھ ڈوبتے سورج کی طرف منہ کر کے کھڑا تھا۔ دونوں پروفیسر کو دیکھ کر ہاتھ لہرانے لگے۔

اُس نے بھی جواباً پرجوش انداز میں ہاتھ لہرایا۔ بوٹ کو پتن کی طرف بھیج دیا۔ افتخار نے بوٹ میں بیٹھتے ہی کنٹرولر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پروفیسر کو ہاتھ سے ریموٹ کنٹرولر بند کرنے کا اشارہ دیا۔ پروفیسر نے مسکراتے ہوئے سرخ بٹن پش کر دیا۔ ریموٹ کنٹرولر جب تک آن رہتا تھا، بوٹ کو اپنی مرضی سے حرکت نہیں دی جا سکتی تھی۔

دونوں جوانوں کا پرتپاک استقبال کرنے کے بعد پروفیسر اُنہیں لے کر بالکونی نما گیلری پر آ گیا۔ افتخار بیگ نے دریافت کیا، ''کہیے سر! کیا آپ کا شوق پورا ہو گیا یا کہیں کچھ رہ گیا؟''

پروفیسر نے پُرستائش نظروں سے دونوں کو باری باری دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ ''آئی لو یو مائی سنز..... تمہاری جوانی نے میرے بڑھاپے کو خواب کی بھرپور تکمیل دے کر جوان بنا دیا ہے۔''

مظہر عباس نے کہا۔ ''مجھے اپنے کام کی انفرادی ستائش ہو رہی ہے سر!''

پروفیسر نے جاندار قہقہہ لگایا اور پلٹ کر کچن کی طرف چل دیا۔ دونوں اُس کی اجازت سے جنت کا معائنہ کرنے لگے۔ اپنے نصب شدہ مکینزم کو آلات کے ذریعے چیک کرنے لگے۔

چائے پینے کے دوران خاموشی طاری رہی۔ پھر تینوں نے ڈھلتی شام کے اُداس منظر کو اپنی تشنہ آنکھوں میں سموتے ہوئے ڈھیر ساری باتیں کیں۔ تینوں نے مل کر کھانا تیار کیا۔ چونکہ دونوں جنت میں رات گزارنے کے ارادے سے آئے تھے، اِس لیے وہ کسی بھی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے۔ افتخار بیگ اپنی نئی گاڑی کی طرف سے متفکر تھا۔ پروفیسر نے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''دیکھا افتخار! دُنیا کتنی بے رحمن اور منتشر المزاج ہے۔ جو گاڑی تمہیں سفر کی راحت دینے، تمہیں دھوپ، گرمی اور سردی سے بچانے کے لیے بنائی گئی ہے اُس کی حفاظت تمہاری جان کو ہلکان کیے رکھتی ہے۔ میں نے اِسی لیے چوروں ڈاکوؤں کی سرزمین کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا ہے۔''

مظہر عباس نے گفتگو میں حصہ لیا۔ ''تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمیں بھی تارکِ الدُنیا ہو جانا چاہیے؟''

پروفیسر نے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھا۔ سوچا۔ جو کہنا چاہتا تھا اُسے ذہن میں دُہرایا پھر بولا۔ ''مائی سن! اگر میں چاہوں کہ سبھی لوگ میری طرح اپنی اپنی جنتیں بنانے کے لیے نکل کھڑے ہوں تو پھر دریاؤں، پہاڑوں اور سمندروں میں وہی کیفیت دیکھنے میں آئے گی جو خشکی پر اِس وقت دیکھنے کو ملتی ہے۔''

مظہر نے اچنبھے سے اُسے دیکھا۔ اِس وقت وہ بہت خود غرض دکھائی دیا۔ افتخار نے ہنس کر کہا ''دوست! غم نہ کرو۔ پروفیسر صاحب کو سمجھنا ذرا مشکل ہے۔''

پروفیسر نے فوری طور پر موضوعِ گفتگو بدلتے ہوئے شیر محمد گرمانی عرف شیرا گرمانی کا قصہ چھیڑ دیا۔ مزے لے لے کر بتانے لگا۔ افتخار حیران ہوا۔ بولا۔ ''یقین نہیں آتا کہ درس و تدریس میں زندگی گزارنے والا انتہائی ذہین معلم اتنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دلیر اور مضبوط ثابت ہوسکتا ہے..... آئی ڈونٹ بلیو اِٹ!''

پروفیسر نے مسکرا کر کہا۔ ''جب مجھے یقین ہوگیا تھا کہ میں چاہے جانے کے قابل ہرگز نہیں ہوں تو اُس وقت میری پہلی سوچ یہی تھی کہ خودسوزی کرلوں۔ اپنے آپ کو، اپنے محبت آمیز خیالات سمیت زمین بردکردوں مگر اچانک..... یونہی بیٹھے بیٹھائے یہ اچھوتا خیال سوجھ پڑا۔ تمہاری معاونت سے مجھے نئی زندگی مل گئی۔ یہ جنت انسان کو ہر جہت، ہر فکر حتیٰ کہ زندہ رہنے کی خواہش تک سے آزاد کردیتی ہے۔ تم نے سوچا کبھی؟..... دلیری ہمیشہ بے وقوف انسان کے دماغ میں پرورش پاتی ہے۔ کبھی فہم وفراست سے میل نہیں رکھتی۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے لیے دماغ کو سلانا پڑتا ہے۔ میرا دماغ سانسیں لیتا ہے، جاگتا ہے مگر جانوروں کی طرح فقط اپنی بقا کے بارے میں ہی سوچتا ہے۔''

''پھر بھی.....''

''نو مائی سن.....'' پروفیسر نے ہاتھ اُٹھا کر افتخار کی بات کاٹ دی۔ ''یہاں قانون موجود نہیں۔ شیر اگر مانی یا اُس کے ساتھی اونچ نیچ کرتے تو میں بے دریغ گولی مار دیتا۔ پانی قتل کے ثبوت، نعشیں، سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر کہیں دور لے جاتا اور اُن اشتہاریوں کے وجود کو ملیامیٹ کردیتا۔''

تینوں جنت کے ستون کے قریب بالخصوص بیٹھنے کے لیے بنی ہوئی سیڑھیوں پر براجمان ہوگئے۔ ننگی پنڈلیوں سے دریا کا گندمی رنگت والا پانی ٹکرا کر پلٹتا، پھر آن لپٹتا..... آج ہوا میں خنکی کا امتزاج نسبتاً زیادہ تھا۔ مظہر عباس نے ایک گہرا سانس حلق میں اُتارتے ہوئے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''زندگی کا یہ قدرتی حسن ہم شہر والوں کی نظروں سے ہمیشہ کے لیے چھپ گیا ہے۔''

افتخار نے تائید کی۔ ''ہم دونوں بھی پروفیسر صاحب کی بدولت اِس نیچر کو قریب سے دیکھ پائے ہیں۔''

افتخار لپک کر گیا اور ریڈیو آن کرکے کوک کا ڈیڑھ لٹر پیک اور تین گلاس اُٹھا لایا۔ دونوں کو پیش کرنے کے بعد اپنا گلاس تھام کر نچلی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ کمر کے نچلے حصے تک پانی میں ڈوب گیا مگر اُسے لباس کے بھیگنے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ جانتا تھا کہ چند منٹوں میں سرمست چلنے والی ہوا سکھا دے گی۔

ریڈیو اسٹیشن سے لوک گیتوں کا کوئی پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ سناٹے میں موسیقی اور مترنم آواز طلسم آگیں کیفیت طاری کررہی تھی۔ اُن کی توجہ اپنی باتوں پر مرکوز تھی مگر جونہی پروگرام کے ہوسٹ نے ڈاکٹر اشولال فقیر کا نام لیا، وہ چونک کر ریڈیو کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُشولال کا لکھا ہوا عارفانہ کلام کوئی گلوکار اپنی خوبصورت آواز میں گا رہا تھا۔

تینوں نے پورے انہماک سے سنا۔ ستائشی انداز میں تبصرہ کیا پھر اُشولال کی باتوں میں مشغول ہوگئے۔ مظہر عباس نے شکوہ کیا ''یار افتخار! اتنا عظیم انسان تم لوگوں کے بیچ میں رہتا ہے اور تم نے آج تک مجھے ملوانے کی زحمت نہیں کی۔''

''کیا کروگے اُس سے مل کر؟'' پروفیسر نے گھورا۔

''یہ تو مجھے پتا نہیں ہے سر!'' مظہر، پروفیسر کے رو سے مترشح ہونے والے غیر معمولی تغیر پر گڑبڑا سا گیا۔ ''دریائے سندھ کی عظمت کو متعدد بار دیکھا ہے، دِل کرتا ہے کہ اِس کے دیوانے کو بھی دیکھوں۔''

پروفیسر خاموش ہوگیا۔ یکبارگی اُس کا جی چاہا کہ وہ کھڑا ہو کر پوری قوت سے چیخ چیخ کر اعلان کرے کہ ''سندھو ساگر میں ایک ہی دیوانہ ہے اور وہ ہے پروفیسر وسیم بزدار.....''

❖❖❖

شہر میں ستاروں والا کوئی بھی ہوٹل نہیں تھا۔ البتہ اعلیٰ معیار کا ایک ریستوران موجود تھا جس کے فرسٹ فلور پر فیملی ہال کے ایک پرسکون اور قدرے الگ گوشے میں مصباح اور شہاب آمنے سامنے موجود تھے۔ مصباح بار بار کے بلانے پر بھی شاید نہ آتی اگر وہ خود پر قابو پانے میں کامیاب ہوجاتی۔ خوداعتمادی کے زینے پر مضبوطی سے چڑھتے ہوئے یہاں تک آ تو گئی تھی مگر اَب بیٹھی جی ہی جی میں پچھتا رہی تھی۔ کسی کے بلانے پر آجانے والی لڑکیوں کے بارے میں اُس کے ریمارکس آج تک کچھ اچھے نہیں رہے تھے۔ اَب بیٹھی سوچ رہی تھی کہ وہ کیا مختلف ثابت ہوئی؟ بیشتر لڑکیوں جیسی کھوکھلی، بے مہار اور اپنی طے کردہ راہ سے یکسر بھٹکی ہوئی۔

بیٹھے بیٹھے کھوسی گئی تو شہاب نے پوچھا۔ ''پہلی مرتبہ یہاں آنے پر نروس ہو رہی ہو؟''

''نہیں۔ میں پہلی مرتبہ یہاں نہیں آئی، بارہا آچکی ہوں مگر بھائی یا ماما کے ساتھ، اکیلی نہیں یا کسی اور کے ساتھ نہیں۔'' اُسے خود اپنی آواز کا کھوکھلا پن چبھنے لگا تو خاموش ہوگئی۔

''کیا مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے آنکھوں سے آگے کی دُنیا بھی دکھا سکتی ہو؟'' شہاب خان کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

وہ گڑبڑا سی گئی۔ حسن آئینے کے سامنے مکمل دکھائی دیتا ہے۔ چاہنے والے کے سامنے احساسِ کمتری کی لپیٹ میں آکر نامکمل ہوجاتا ہے۔ اُسے تذبذب کا شکار دیکھ کر شہاب مسکرایا۔ ''دیکھو مصباح! اَبھی ویٹر ہمارا آرڈر سرو کرجائے اور تمہیں نقاب اُلٹنا پڑ جائے گا۔ تب شاید میں چاند کی حقیقی تعریف نہیں کرپاؤں گا۔''

وہ چاند قرار پا رہی تھی۔ شرما گئی، ہچکچا گئی۔ آنکھوں میں عجیب سا خوف سمٹ آیا۔ شہاب نے دلاسہ دیا۔ ''چاند کو چاند تب ہی قرار دیا جاتا ہے کہ وہ ہر رات بے نقاب پوری دُنیا پر اُتر آتا ہے۔ تم بھی چاند ہو، چاند کا حقیقی چہرہ ہو، پلیز! اپنے دیوانے پر کھل جاؤ۔''

وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ شہاب بھی کچھ نہ سمجھتے ہوئے گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ جلدی سے بولا۔ ''پلیز مصباح! اگر تم مائنڈ کررہی ہو تو میں اپنا اصرار واپس لیتا ہوں۔ مجھے تمہاری موجودگی کی طلب ہے ناں کہ تمہارے نہ کھلنے کی پروا۔ بیٹھ جاؤ، جی مانے تو کچھ کھا پی لینا، نہ مانے تو چند باتیں کرکے واپس چلی جانا۔''

وہ اپنے دیوانے کو نامراد چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ بس ایسے ہی دل گھبرانے لگا تھا۔ نفی میں سر ہلا کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بڑی گلاس والی ونڈو میں آن کھڑی ہوئی۔ کھڑکی سے باہر جھانکا۔ نیچے موجود سڑک پر بے ہنگام ٹریفک رواں دواں تھا۔ اُس کی نگاہ سامنے گلی سے نکل کر سڑک پر آتی ہوئی عورت پر پڑ گئی۔ وہ بے نقاب تھی۔ کالی چادر میں دھندلے نقوش والا گورا چہرہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ سوچنے لگی۔ ''وہ میری طرح کی ہی عورت ہے جو بے نقاب چلی آرہی ہے۔ اُسے کوئی روکتا نہیں، کوئی ٹوکتا نہیں، پھر میں کیوں ایک شخص پر کھلنے سے ہچکچا رہی ہوں۔ شخص بھی وہ جو بھرے پرے شہر کی جوانیوں کو چھوڑ کر ایک ایسی عورت کے پیچھے لپک رہا ہے جس کے چہرے کی ایک جھلک بھی دیکھ نہیں پایا۔''

عقب میں قدموں کی چاپ نہیں اُبھری۔ اُس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ شہاب اُس کے پیچھے نہیں آیا تھا بلکہ کرسی میں بیٹھا رہ کر توجہ سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے رُخ پھیر لیا اور سڑک پر بلاجواز دیکھنے لگی۔

دائیں ہاتھ کو غیر محسوس انداز میں حرکت میں لاتے ہوئے نقاب اُتار دیا۔ چاہنے والے بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ ایک شخص سے چھپنے والی پورے زمانے پر کھل گئی تھی۔

چند لمحے کئی منٹوں پر محیط ہوگئے۔ سوچتی رہی کہ پلٹ کر دیوانے کی نگاہوں میں چاند کی ندرت اُتارے، یا پلٹے بغیر یہیں کھڑی رہے۔ شہاب خان کو خاموش پا کر بولی۔ ''محبت تو دو رُوحوں کے مابین ہونے والی خاموش گفتگو کا عنوان ہے، تم کیوں میرا چہرہ دیکھنے پر بضد ہو؟''

وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔ ''زبان سے ادا ہونے والے الفاظ غلط فہمیوں کے لیے سازگار زمین فراہم کرتے ہیں جبکہ آنکھیں اور چہرے کے تاثرات وہ سب کچھ کہہ سناتے ہیں جنہیں کہنا عمومی طور پر انسان کی دسترس میں نہیں ہوتا۔''

''کیا میرا یہ کہہ دینا کہ میں تمہاری محبت کو قبول کرتی ہوں، کافی نہیں ہے؟'' اُس کی آواز میں واضح طور پر ارتعاش موجود تھا۔

''میں پچاس مرتبہ اپنی چاہت کا اظہار کروں، فقط ایک مرتبہ لبوں کی موہوم سی مسکراہٹ میں جواب ملے تو بھی اُس خاموش جواب کا دُنیا میں کوئی جواب نہیں ہوگا۔''

شہاب آنکھوں میں جھانکتے رہنے کا عادی تھا۔ تبھی وہ باتیں کرتے ہوئے مسلسل گھبراتی رہتی تھی۔ پیٹھ موڑے بڑے آرام سے سوال جواب کررہی تھی۔ ''میں نے پوچھا تھا کہ تم کیا کام کرتے ہو، تم نے جواب نہیں دیا بلکہ صفائی سے ٹال دیا۔ اَب پوچھتی ہوں کہ تم کتنا پڑھے ہو، کیا کرتے ہو؟''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''میں نے زرعی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا۔ ماسٹر ڈگری کے لیے انگلینڈ چلا گیا جہاں تین سال گزارنے کے بعد دو ماہ قبل یہاں پہنچا ہوں۔ پہنچتے ہی پتا چلا کہ جس خیرہ کرنے والے وجود کی تلاش میں، میں اَپر پنجاب اور کئی یورپین ممالک میں پھرتا رہا، وہ اپنے ہی شہر میں موجود تھا۔''

''نوکری کرتے ہو؟'' وہ جھینپ کر بولی۔

''نہیں۔ مگر کہو گی تو کرلوں گا۔''

''میرے کہنے پر ہی کیوں؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''کیونکہ تمہیں دیکھنے کے بعد میں، میں نہیں رہا، تم ہوگیا ہوں۔''

''جھوٹ بولتے ہو، تم نے اَبھی تک مجھے دیکھا ہی نہیں۔'' مصباح کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ تیر گئی۔

عقب میں برتنوں کے کھنکنے کی آوازیں اُبھریں۔ اُسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ویٹر ٹیبل پر کھانا چن رہا تھا۔ اُس کے جانے کے بعد شہاب نے کہا۔ ''اگر مناسب سمجھو تو آکر کھانے میں شریک ہوجاؤ۔''

وہ بولی، ''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''تم نہیں کھاؤ گی تو میں کیسے کھا سکوں گا؟'' شہاب نے کہا، ''چلو ایسا کرتے ہیں کہ تم نقاب اُتارے بغیر میرے سامنے بیٹھ جاؤ، میں یہ سمجھ کر کھاتا رہوں گا کہ تم میرے ساتھ شریک طعام ہو۔''

''ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔'' وہ خوش ہوگئی۔

مسلسل کھڑے رہنے کی بدولت تھک گئی تھی۔ نقاب میں چہرہ چھپا کر پلٹنے لگی تو ناگاہ نظر دائیں ہاتھ پر کھڑکی کے اُدھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھلے شیشے پر پڑ گئی۔ اچانک پورا بدن سن ہو گیا۔ بے داغ شیشہ اپنی گہری رنگت کے باعث آئینہ بنا ہوا تھا۔ آئینے میں شہاب کا مسکراتا ہوا چہرا دکھائی دیا تو دماغ نے فوراً خطرے کی گھنٹی بجا کر سمجھا دیا کہ جیسے تم اُسے دیکھ رہی ہو، ایسے ہی وہ تمہیں کافی دیر سے بیٹھا دیکھ رہا ہے۔

گھبرا کر شہاب خان کو دیکھا۔ اُس کی معنی خیز انداز میں مسکراتی ہوئی آنکھوں نے اپنی چوری کا اعتراف کر لیا۔ وہ کرسی چھوڑ کر اُس کے بہت قریب چلا آیا۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم دُنیا کے جس مکمل حسن کو سیاہ چادر میں لپیٹ کر میری نظروں سے چھپاتی رہی ہو، اُسے شیشے نے تمہاری بے خبری میں مجھ پر عیاں کر دیا ہے۔ دیکھنے سے پہلے دل پر صبر کی سل رکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا، اَب نہیں۔''

اُس نے بڑے پیار سے اُس کی چادر کا پلو تھاما اور آہستگی سے چہرہ ننگا کر دیا۔ وہ کسی مجرم کی طرح نظریں جھکائے کھڑی کانپتی رہی۔ شہاب خان نے نرمی سے چہرے کو چھوا۔ اوپر اُٹھایا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وفورِ عقیدت سے بولا۔ ''یقیناً تمہیں میرے لیے بنایا گیا ہے مگر یہ کیا کہ میرا دل تمہیں چھونے پر بھی ڈرنے لگا ہے کہ چمکدار آئینے پر سانسیں بھی دھندلاہٹ بکھیر دیتی ہیں۔ میری بے خودی میں کہیں اُجلا کاغذ میلا نہ ہو جائے، کہیں پھول پر بوسیدگی طاری نہ ہو جائے، کہیں ماہِ تاباں پر داغ نہ پڑ جائے.....''

اُس کا حسن ہمیشہ سے تعریف کی زد میں رہا تھا۔ سہلیاں اُس پر شاعری جھاڑتی رہتی تھیں مگر شہاب خان کے ہونٹوں سے نکلنے والا حرف حرف اپنی معنویت سمیت اُس کی ذات کی گہرائیوں میں اُترتا چلا جا رہا تھا۔ آسودگی سے مسکرائی تو گالوں میں پڑنے والے گڑھے چند ثانیوں کے لیے نمایاں ہوئے۔ یہ چند لمحے چاہنے والے پر برق گرا کر خاکستر کر گئے۔ وہ بہ دقت تمام الٹے قدموں کرسی تک آیا۔ بے دم ہو کر ڈھے سا گیا۔ عجیب وحشت زدہ سی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''بہت دور تک تمہارے ساتھ چلنے کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں مگر شاید تمہاری مسکراہٹ میرے اَندر اتنی گھٹن بھر دے گی کہ میں زیادہ دیر تک سانس نہیں لے پاؤں گا۔''

وہ دم بخود رہ گئی۔ ایسا کہیں سنا نہیں تھا، کہیں پڑھا نہیں تھا مگر آنکھیں دکھلا رہی تھیں کہ ہنسنے مسکرانے والا شہاب خان ہرگز نارمل نہیں رہا تھا۔ اُس کا تنفس بری طرح غیر معتدل ہو گیا تھا۔ جھکے ہوئے چہرے پر پھیلی ہوئی وحشت آمیز زردی بالکل حقیقی ردِعمل کا پرتو بنی ہوئی تھی۔ ایک عجیب سا تفاخر اور دُنیا میں یکتا ہونے کا احساس مصباح کے رگ و پے میں اُتر گیا۔ اُس کی متزلزل خود اعتمادی لوٹ آئی۔ آنکھیں جھپکائے بغیر دیکھتے ہوئے شرارت سے بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ مجھے یہ سمجھ کر کھانا ہوگا کہ تم میرے ساتھ شریکِ طعام ہو۔''

وہ خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ کھانے کے دوران واضح طور پر نظریں چرا رہا تھا۔ اُس کے اِس غیر فطری رویے پر مصباح کا دم گھٹنے لگا۔ بے عنوان حبس ختم کرنے کے لیے پوچھنے لگی۔ ''کیا تم اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں نہیں بتاؤ گے؟''

وہ جھٹ سے بولا۔ ''کیا میں نے تمہارا پس منظر جاننے کی کوشش کی ہے؟''

وہ سٹپٹا کر بولی۔ ''نہیں مگر جاننے کا اشتیاق تو ہوگا۔''

وہ بات کاٹ کر بولا۔ ''نہیں۔''

''کیوں؟'' اُسے اچنبھا ہوا۔

''اِس لیے کہ میرے نزدیک صرف اِس بات کی اہمیت ہے کہ تم میری ہو۔''

''ابھی یہ فیصلہ تو نہیں ہوا۔'' وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

''نہیں ہوا تو ایک نہ ایک دن ہو جائے گا۔ مجھے پروا نہیں۔''

''اچھا.....'' وہ جز بز ہو کر بولی۔ ''اگر مناسب سمجھو تو اپنے بارے میں کچھ بتا دو۔ نہ بتانا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''کیا تم مجھے جانتی ہو؟''

''ہاں۔ مگر صرف اتنا، جتنا تم نے اپنے بارے میں بتایا ہے۔''

''ہوں!'' اُس نے یوں ہنکارا بھرا جیسے اُس کے سر سے کوئی بوجھ اُتر گیا ہو۔ کولڈ ڈرنک کا چھوٹا سا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ ''میرا خاندانی پس منظر ایسا ہی ہے جیسا اِس شہر کے سیکڑوں بے روزگار لڑکوں کا ہے۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ پریکٹیکل لائف میں قدم رکھوں گا، سنہرے مستقبل کے پیچھے بھاگوں گا، تب میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے کچھ موجود ہوگا۔ اَبھی کیا بتاؤں نہیں؟''

مصباح نے چونک کر اُسے دیکھا۔ کتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بول رہا تھا۔ بولی۔ ''تمہارے پاپا کیا کرتے ہیں؟''

''دریائے سندھ کے رحم و کرم پر ایک زرعی فارم بنا رکھا ہے اُنہوں نے۔ اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ گزر بسر اچھی ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی بس دریا کا پیٹ ہی بہ مشکل بھرتا ہے۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔

''ان کا نام کیا ہے؟'' وہ بات کو بڑھا رہی تھی۔

''ارباب خان۔'' شہاب کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

وہ اُس پر نظریں جما کر بولی، ''ہمارے ضلعی ناظم کا نام بھی ارباب خان ہی ہے۔''

وہ چونکا مگر فوراً ہی خود پر قابو پا کر بے نیازی سے بولا ''ہاں۔ اِس شہر میں ایسے بھی کئی آدمی موجود ہیں جن کا نام صدام حسین ہے۔ میرے ایک دوست کا نام ضیا الحق ہے۔ کئی ایسے عمران خان یہاں موجود ہیں جنہیں کرکٹ کا بلا پکڑنا بھی نہیں آتا ہوگا۔''

مصباح نے لاجواب ہو کر پوچھا۔ ''بہن بھائی کتنے ہیں؟''

وہ مسکرایا اور ایک انگلی دکھا کر بولا۔ ''ایک۔ میں ہی اپنا بھائی ہوں، میں ہی بہن.....''

''اکلوتے بیٹے کی نفسیات کافی پیچیدہ ہوتی ہیں۔''

''ہوتی ہوں گی مگر میں جیسا بھی ہوں، تمہارے سامنے ہوں۔'' وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''اپنے کردار کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ دُنیا کے کسی آدمی کو بھی مجھ سے شکایت نہیں ہے۔''

وہ ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ اُس نے دریافت کیا۔ ''کیا سوچ رہی ہو؟''

''تمہارا فیملی بیک گراؤنڈ بھی کچھ زیادہ مضبوط نہیں، تم کوئی نوکری بھی نہیں کرتے ہو، ایسے میں میرے والدین کیسے تمہاری ذات سے مطمئن ہوں گے؟'' وہ کامل سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

''کیا میری تعلیم اور شخصیت کوائفی نمبر نہیں ملیں گے؟''

اچانک مصباح کی نگاہوں میں افتخار بیگ کا چہرہ لہرا گیا۔ وہ اتنا وجیہہ نہیں تھا مگر اُسے بہت سی ہمدردیوں کے ساتھ ساتھ پلس پوائنٹ بھی حاصل تھے۔ مصباح کے والدین کو اُس کی جاب بہت پسند تھی۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''تعلیم شعور دیتی ہے، شخصیت دبدبہ طاری کرتی ہے مگر پیٹ بھرنے کے لیے کوئی اچھا بزنس یا ملازمت ضروری ہوتی ہے۔ میرے والدین بڑے پریکٹیکل انداز میں سوچنے کے عادی ہیں۔ اُنہیں نظریات، تخیلات اور آئیڈیالوجی پر کچھ زیادہ بھروسا نہیں ہے۔''

''بہر حال! جو کچھ میرے پاس ہے، تم پر پورے صدق سے ظاہر کر چکا ہوں۔'' اُس نے کندھے اُچکا کر نیم مایوسی کی کیفیت میں کہا۔

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا مستقبل محض تقدیر پر انحصار کرتا ہے؟'' مصباح نے قدرے ہچکچا کر دریافت کیا۔

شہاب نے چونک کر اُسے دیکھا۔ جسے اُس نے چاہا تھا، وہ ہر لحاظ سے منفرد تھی۔ سینہ فرطِ تفاخر سے پھیل گیا۔ نفی میں سر ہلا کر غیر معمولی سنجیدگی سے گویا ہوا ''مصباح! اگر تقدیر کو ہمارا ملن گوارا نہ ہوا تو میں تقدیر کی شام تھیوری کو جھٹلا دوں گا۔ منکر اور کافر کسی بھی انداز میں دریافت کر سکتا ہے کہ بتا! تم نے ہمیں ملایا ہی کیوں تھا؟ میں باپ دادا کے نام اور اعمال کی بیساکھی پر چل کر اپنے عشق کی تعبیر پانا قبول نہیں کروں گا۔ میں دولت کے بَل پر اپنی محبوبہ کو خریدنے کی گستاخی نہیں کروں گا۔ کسی اختیار کو بروئے کار لاتے ہوئے تمہارے والدین کو بلیک میل نہیں کروں گا۔ ہاں! پیچھے بھی نہیں ہٹوں گا۔ تمہیں میرا بننا ہوگا۔ نہیں بنو گی تو یہ یقین کر لو کہ میں کسی گود میں تمہاری سہاگ رات کو ہمکنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ تم رہو گی تو فقط میری وگرنہ نہیں رہو گی۔ میں رہوں گا تو محض تمہارے سہارے پر وگرنہ نہیں رہوں گا۔''

''مگر.....''

''کوئی اگر مگر نہیں، جو کہہ دیا، وہی مدعائے آخر ہے۔'' شہاب کے حتمی اور اٹل لہجے نے مصباح کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ چند دنوں میں اتنا آگے نکل جائے گا، اُس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ شاید مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ کافی دیر تک سر جھکائے بیٹھی سوچتی رہی، پھر سر اُٹھا کر بولی۔ ''مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''تمہیں میرا انتظار کرنا ہوگا۔''

''ہمارا معاشرہ اَبھی اتنا بولڈ نہیں ہوا کہ کوئی لڑکی کسی کے انتظار میں غیر معینہ وقت تک گھر میں بیٹھی رہے۔'' اُس نے بڑی دانش مندی کی بات کی۔

وہ بولا۔ ''میں جان چکا ہوں کہ تمہارے والدین افتخار بیگ کو مجھ پر ترجیح دیں گے۔ تم بھی شاید اپنے کزن کی محبت سے مغلوب ہو کر مجھے چھوڑنے کی کوشش کرو۔ کچھ ایسا ہی ماحول میرے گھر میں بھی پیدا ہوتا دکھائی دیتا ہے۔''

چند لمحوں کے لیے رُکا، سانس لے کر بولا۔ ''میرا چچا بہت بڑا زمیندار ہے۔ میرے باپ کی نظریں اُس کی جائداد پر گڑی ہوئی ہیں۔ لالچ کی پٹی تلے مسلسل ایک رُخ کو دیکھتی ہوئی آنکھیں بیٹے کے جذبات کی طرف متوجہ نہیں ہوں گی مگر میں مرد ہوں، ڈٹ سکتا ہوں، لڑ سکتا ہوں۔ بغاوت کر کے باپ کا گھر چھوڑ سکتا ہوں۔ تم عورت ہونے کے ناتے شاید یہ سب کچھ نہ کر سکو مگر میری محبت تمہیں ہر اُس کٹھن راستے سے گزارے گی جس کا تم نے سرِدست سوچا تک نہیں۔''

وہ گھبرا کر بولی۔ ''میں اپنے والدین کو کوئی تکلیف نہیں دوں گی۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''محبت کے جس مقام پر میں پہنچ چکا ہوں، اُس مقام پر پہنچ کر تمہارے ارادوں میں غیر معمولی تغیر پیدا ہو جائے گا۔ میں سوچ کی اُس تبدیلی کا انتظار کروں گا۔'' شہاب نے کہا۔

رسٹ واچ پر نگاہ پڑی تو وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ بہت دیر ہو گئی تھی۔ شہاب نے بھی ساتھ دیا۔ زینے اُترتے ہوئے شہاب نے کہا۔ ''مصباح! میں ناکارہ انسان ہوں، محبت کے علاوہ کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں کرسکتا۔ تم اپنی محبت کی سکت سے مجھ سے ہر کام کروا سکتی ہو، کامیاب انسان بنا سکتی ہو۔ پیار سے چھوؤ گی تو سونا بن جاؤں گا، بے رُخی سے چھوڑ دو گی تو مجھے مُردہ کردو گی۔ یہ طے ہے، اِس دعوے کی صحت پر شبہ کرنا نہایت بچگانا ہوگا۔''

وہ زینوں کے وسط میں رُک گئی۔ نظریں اُٹھا کر اپنے دیوانے کو دیکھا پھر گھبرا کر ریلنگ پر جھک گئی۔ بڑبڑانے لگی۔ شہاب کو اُس کے منہ سے نکلنے والے بے ربط الفاظ کی سمجھ نہیں آ رہی تھی مگر ایسی باتیں سمجھنے کے لیے تو نہیں ہوتیں۔

❖❖❖

سیاہ بادلوں نے دوپہر کو شام بنا دیا تھا۔ پروفیسر کنکریٹ کے ستون پر کھڑا تھا۔ چہرے پر ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے عجیب سی طمانیت بکھیر رہے تھے۔ قریب ہی کہیں بارش ہو رہی تھی تبھی ہوا میں نمی اور خنکی قدرے زیادہ تھی۔ محکمۂ موسمیات نے خبردار کیا تھا کہ آنے والے چند دنوں میں دریائے سندھ میں نچلے درجے کی طغیانی آئے گی۔ فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے مشرق کی جانب منہ کرکے بلند آواز میں چیخ کر کہا۔

''اے سرکاری دانش ورو! تم نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ لاہور، اسلام آباد اور کراچی والوں کو دریائے سندھ میں گھٹتے بڑھتے پانی سے کوئی غرض نہیں۔ جن لوگوں کو پانی کا چڑھاؤ آن کی آن میں نگل لیتا ہے، جن لوگوں کے مویشیوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے اُن کے پاس ٹیلی وژن کی سہولت موجود نہیں ہے۔ اُنہیں تمہاری ان اطلاعات کا کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ یہ لوگ بہاؤ کے مزاج اور ہوا میں پھیلی مٹی کی خوشبو کو سونگھ کر اندازہ کرتے ہیں کہ سیلاب آنے والا ہے۔ شمال کی جانب منہ کرکے نتھنے کھینچتے ہوئے یہ مور، یہ گھاڑو، یہ کیہل، یہ کنگر نہانے تبھی تمہاری نظر میں کتے قرار پاتے ہیں...... ایسی ناکارہ خبریں دینے والو! کبھی تم نے سوچا کہ اِن لوگوں کو سیلاب کی قبل از وقت اطلاع دینے کے لیے تم نے آج تک کوئی مناسب بندوبست نہیں کیا؟''

نہ جانے کیوں اُس کی آواز نے آج بازگشت پیدا نہیں کی تھی۔ بارش نے چند آزمائشی قطرے دریا کے پیلے پانی پر ٹپکا دیے۔ عجیب سی موسیقی فضا میں پھیل گئی۔ پانی پر گرتا ہوا پانی، انسانی ذہن پر نشہ سوار کردیتا ہے۔ وہ ایڑیوں کے بل گھوم گیا۔ تاحدِ نگاہ سکون تھا۔ اُس نے دونوں بانہیں سوئے آسمان پھیلا دیں تو چند بوندیں چہرے پر گریں۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے کبھی آسمان کی جانب، کبھی مچلتے ٹپکتے پانی کی طرف والہانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا، کتنا کیف آگیں ماحول بن گیا تھا۔ شہر یاد آ گیا۔ نفرت سے ہونٹ بھنچ گئے۔ شہر کا وہ محلہ نگاہوں میں گھومنے لگا جس پر بارش رحمت کے بجائے زحمت کی صورت اُترتی تھی اور گلیوں میں بارش اور نالیوں کا پانی بھر جاتا۔ بارش رُکنے سے قبل گٹروں کے دہانے بھی اُبل پڑتے۔ بچے پانی میں کھیلتے، لت پت ہو کر کلکاریاں مارتے۔ ایسے میں والدین کے دل اندیشوں اور واہموں سے لرزنے لگتے۔ شام تک آدھے بچوں کو گندے پانی میں بھیگنے کے باعث بخار آن لیتا۔ آدھے مختلف نوعیت کی جلدی بیماریوں میں مبتلا ہو کر والدین کے لیے مصیبت بن جاتے ہیں۔ یہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ اوپر سے اترتی ہوئی پانی کی شفاف چادر، جیسے زندگی پہاڑوں سے نکل کر سمندروں تک خاموش سفر کرتے چلی ہو......

اُس نے اپنی دھاری دار شرٹ اور ٹراؤزر اُتار کر عرشے پر پھینک دیا۔ تن پر صرف ایک گہرے رنگ کا کچھا (انڈر ویئر) رہ گیا۔ چند ہی لمحوں میں پورا بدن بھیگ گیا۔ بھیگے بدن پر ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑوں نے خوش گواریت لپیٹ دی۔ وہ بے خود ہو کر پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔ شہر میں اگر یوں مچلتا تو چہار جانب سے اَن گنت پتھر اُس پر برسنے لگتے۔ یہاں پتھر پھینکنے والا کوئی ہاتھ نہ تھا...... اچانک جنت کے قریب ہی چند مچھلیاں پانی سے باہر اچھل اچھل کر احساس دلانے لگیں۔ منظر دیکھ کر نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہا اور وہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔

فون کی بیل سن کر چونک پڑا۔ اُس کا موبائل فون ٹراؤزر کی ہِپ پاکٹ میں تھا۔ وہ ستون سے اُتر کر عرشے پر آیا۔ موبائل نکال کر آن کیا اور کانوں سے لگا کر فورِ مسرت سے بولا۔ ''مرشد! میں، قسمت اور اتفاقات پر یقین نہ کرنے والا پروفیسر وسیم بزدار، حیرت زدہ ہوں کہ آسمان نے شراب پلا دی، قسمت نے تمہاری ملاقات بخش دی۔ خوش نصیبی کہوں یا اتفاق، کسی ایک کو ماننا پڑ رہا ہے۔''

ڈاکٹر اَشولال کی آواز کانوں میں رَس گھولنے لگی ''کبھی کبھی میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ تم نے انسانوں کو

وڑ کر فطرت سے یارانہ گانٹھ کر بہت اچھا کیا ہے۔ دیکھو ں! ہم کپڑے بھیگنے کے ڈر سے کمروں میں بند ہو کر بیٹھے ں جبکہ تم پوری آزادی سے کمرے سے نکل کر بھری بارش ے بیچ کھڑے ہو گے۔''

''تم بھی باہر نکل آؤ مرشد!'' اُس نے مشورہ دیا تمہارا گھر اسپتال کی ملحقہ سرکاری کالونی میں واقع ہے ہاں کھلی فضا موجود ہے اور گندے پانی کا ٹھاٹیں مارتا مندر بھی نہیں ہے، چاہو تو حظ اُٹھا سکتے ہو۔''

''ارے کہاں سئیں!'' اَشو نے حسرت سے کہا۔ ''میں نے باہر نکلنا چاہا تو تمہاری بھابی نے فوراً دوسرے کپڑے ساری سے نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ موڈ ہی غارت وگیا۔''

وہ ہنسنے لگا۔ کہنا چاہتا تھا کہ ''عورت کبھی سکھ نہیں دیتی۔ ں کے وجود سے چوبیں گھنٹے جواز، اصول اور بہانے ھوٹتے رہتے ہیں۔'' مگر کہہ نہ پایا۔ خاموش پا کر اَشولال نے کہا، ''کیا تمہیں اتنے خوبصورت موسم میں کوئی یاد آ رہا ہے؟''

اچانک درد کی ایک کٹیلی لہر پروفیسر کے بھیگے بدن میں پھر گئی۔ وہ ہکلا سا گیا۔ ''کک...... کیا کہنا چاہتے ہو مُرشد؟''

''جو کہنا چاہتا ہوں، اُسے تم سمجھ کر ہی ٹوٹنے بکھرنے لگے ہو۔''

''تم شاعر ہو، نامور لکھاری ہو، بات کا بتنگڑ بنانا جانتے ہو۔ مجھے کوئی بھی یاد نہیں آ رہا۔'' پروفیسر کے لہجے میں خفگی کا مہین سا احساس شامل ہو گیا۔

''کیا رُباب بھی یاد نہیں آ رہی؟''

''کیا تم نے مجھے ذلیل کرنے کے لیے فون کیا ہے؟''

''لاحول ولاقوۃ...... نہ جانے تم ہمیشہ اپنی کھوپڑی گرم کیوں رکھتے ہو۔'' اَشولال نے جلدی سے کہا۔ ''انسان چند گھنٹے کے سفر کے دوران ملنے والے اجنبی کو یاد کر لیتا ہے، تم تین سالوں کی ہمراہی کو یاد نہیں کرتے۔ کیا یہ غیر انسانی اور غیر فطری رویہ نہیں ہے؟''

''پلیز مُرشد! اِس تذکرے پر مٹی ڈالو۔ کوئی نئی بات کرو۔'' پروفیسر خود پر قابو پانے کی کوشش میں کراہا۔

''بالکل ٹھیک سئیں! میں پہلو بدل کر وار کرنے لگا ہوں۔ کیا مریم کا وجود بھی فراموشی کی گرد میں پوری طرح اَٹ چکا ہے؟''

پروفیسر پر اَشولال کا جملہ قیامت بن کر ٹوٹ پڑا۔ وہ دانت پیس کر غرایا۔ ہاتھ میں تھامے ہوئے موبائل فون پر گرفت غیر معمولی حد تک سخت ہو گئی۔ اُسے دھیان ہی نہیں رہا اور کال منقطع کرنے والا بٹن پش ہو گیا۔ ٹوں ٹوں کی آواز کانوں میں پڑی تو حلق پھاڑ کر چیخا۔ ''او...... ہائے...... میرا دُنیا میں کوئی نہیں۔ میری کوئی رباب نہیں، میری کوئی مریم نہیں، میں تنہا تھا اور ہمیشہ تنہا ہی رہوں گا۔ اوئے ڈاکٹر! اوئے اَشو! کیوں گڑے مُردے اُکھاڑنے لگے ہو۔ کہہ دیا کہ سب مر گئے، کوئی باقی نہیں بچا۔ کسی کی یاد بھی زندہ نہیں رہی...... کیوں مجھے قبروں کے کتبے پڑھنے کا حکم دیتے ہو......''

فون کا بزر پھر بجا۔ اُس نے اسکرین پر نظر دوڑائی۔ انگریزی کے حروف میں لکھا ہوا اُردو کا لفظ ''مرشد'' جگمگا رہا تھا۔ اُس نے دانت پیس کر کال اٹینڈ کرنے کے بجائے کینسل کردی اور فون کو ٹراؤزر پر اُچھال دیا۔ تیز قدموں سے چلتے ہوئے کچن میں آیا۔ فریج سے ٹھنڈا پانی نکال کر غٹا غٹ پینے لگا۔

اَشولال نے جو آگ لفظوں سے لگائی تھی، وہ ٹھنڈے پانی کے بس سے کہیں باہر تھی۔ وہ بے بسی سے کچن کے دروازے میں بیٹھ گیا۔ اُس کی حالت بہتر نہیں رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اُس کی رگوں سے دو تین بلڈ بیگ نکال لیے ہوں۔ لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''مجھے اَشو سے رابطہ ہی نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ وہ مجھے دُنیا کی طرف کھینچتا ہے، میں دُنیا سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ ایسے آدمی کی دوستی مجھے کسی دِن بھٹکا دے گی۔ میں اِدھر کا رہوں گا، نہ اُدھر کا......''

ذہنی رو بھٹک کر دور تک چلی گئی۔ مریم کا خوبصورت چہرہ آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا۔ وہی مریم جس نے تین ازدواجی مہینے گزار کر ایک شام میں جذبات سے بوجھل آواز میں کہا تھا۔ ''وسیم! تم قریب آتے ہو تو تمہارے بدن سے پھوٹنے والی مہک بے خود کرنے لگتی ہے۔ کام کے وقت میرے قریب نہ آیا کرو، کام میں حرج ہوتا ہے۔''

ہاں...... اُسی مریم کا اَشولال نے نام لیا تھا جس نے جدا ہوتے ہوئے بڑے زہر بار لہجے میں کہا تھا۔ ''مجھے اپنے وجود سے بھی گھن آنے لگتی ہے جب میں سوچتی ہوں کہ تم نے دو سال تک مجھے نوچا کھسوٹا ہے۔ تمہارے بدن سے اُٹھنے والی باسی مچھلیوں کی بساند ایسی بدبو جانے کتنا عرصہ میرے نتھنوں میں گھسی رہے گی......''

وہ ایلومینئم کے اینگل کی بنی ہوئی دہلیز کو تھام کر بدقت تمام کھڑا ہوا۔ اچانک بڑھاپا اُتر آیا تھا۔ بدن کو گھسیٹتے ہوئے پانی میں اُترتی ہوئی سیڑھیوں تک آیا۔ رُکتی بارش کی آخری بوندوں کو جھٹک کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر پہلے سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ اَب کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اُس نے ایک طویل سانس لی اور آنکھیں موند لیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچانک شکست کا احساس دماغ میں جاگزیں ہوگیا۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ محبت اپنا وجود نہیں رکھتی۔ جھوٹا جذبہ ہے۔ جواب میں ڈاکٹر اشولال کی کہی ہوئی سلگتی باتیں ذہن میں گونجنے لگیں ''یاد کرو۔ اپنے والدین کی زندگی کی وہ تصویر دیکھو جو تم نے گھر سے بھاگتے ہوئے اپنی چشم تصور میں بسائی تھی۔ اپنے باپ کو سوچو۔ کیا چاچے فقیرو کے تن پر پورا لباس ہوتا تھا؟ کیا اُسے کوئی 'فقیر صاحب' یا 'سر' کہہ کر پکارتا تھا؟ تم نے ہی بتایا تھا کہ اُس کا پیٹ پچک کر کمر سے لگا رہتا تھا۔ اپنی ماں کو سوچو۔ کیا فضاں مائی تمہیں اپنی ڈھاک پر بٹھا کر بیلے میں لکڑیاں چننے کے لیے نہیں جاتی تھی؟ تم نے بتایا تھا کہ ڈھاک پر بیٹھنے سے ماں کی پسلیاں اور کولھے کی ہڈیاں تمہیں چبھتی رہتی تھیں..... کہو! کیا بغل میں دبے ڈیڑھ دو سال کے بچے اور کالر میں جڑے گلاب کے پھول میں کوئی فرق نہیں ہوتا؟ کیا وہ دونوں مسام مسام سے پسینا نکال کر کمایا گیا بھوجن پہلے تمہارے منہ میں نہیں ڈالتے تھے .....؟ کبھی سوچا کہ ایسا کیوں تھا؟''

وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

ڈاکٹر اشو لال کی آواز جوش سے بھرانے لگی تھی۔

''غربت سے بڑی کوئی بیماری نہیں۔ یہ جان لیوا بیماری بھی محبت کے سرخ خلیوں کو نگل نہیں سکتی۔ تمہارے علاوہ اُن کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی، پھر بھی دونوں تمام عمر اکٹھے رہے۔ کیوں؟ انسان ایک جوتے کو تمام عمر پہن نہیں سکتا۔ ایک لباس کو مسلسل پہن کر سال بھر میں ہی اکتا جاتا ہے۔ پھر وہ کیا احساس ہے کہ انسان پچاس سال تک ایک ہی عورت یا ایک ہی مرد کے لمس پر گزارا دیتا ہے اور اکتاتا نہیں، بھلے حقیقت سے آنکھیں چراؤ مگر تمہیں ماننا پڑے گا کہ محبت ہی انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے۔ اسی جذبے کی پرورش کو مختلف عبادات کی شکل میں حکم بنا کر اُتارا گیا ہے۔''

وہ اس لاحاصل گفتگو سے اکتایا بیٹھا تھا۔ بولا۔ ''مُرشد! یہ روزِ اول سے غلطیوں پر غلطیاں کرنے والا جانور ہے، نہ کبھی سدھرا ہے، نہ سدھرے گا۔ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے اِس ماحول سے نکلنے کا موقع مل رہا ہے۔ تم اگر ان بے وفاؤں میں رہنا چاہتے ہو تو بھلے رہو، مجھے نہ روکو۔''

''ٹھیک ہے سکھی! میں تجھے کیسے روک سکتا ہوں۔ جاؤ، شوق سے دُنیا کو ٹھکراؤ مگر یہ دھیان رکھنا کہ تم محض دو عورتوں کی بے وفائی پر اِس محبت بھری دُنیا کو مورد الزام ٹھہرا رہے ہو۔ وہ اپنی سیماب فطرت سمیت تمہارے اندر تک گھسی ہوئی ہیں۔ جیسے مریم کا دُکھ رُباب نے غلط کیا تھا، ایسے ہی کوئی تیسری عورت تمہیں سہارا دے گی۔ قدرت کے اِس حقیقی حسن سے آنکھیں چراؤ گے تو یہ درد کا احساس بن کر تمہارے ذہن میں نقش ہو جائے گا۔ جتنا جھٹکو گے، اتنا ہی قریب آ کر سلگانے لگے گا۔ جاؤ میرے دوست! جاؤ میرے یار! بے اصول دُنیا کو جھٹلانے والا با اصول پروفیسر اتنا باظرف ضرور ثابت ہوگا کہ جب بھی میرے دعوؤں کے سامنے ہار جائے گا، اعتراف کرنے کے لیے چلا آئے گا۔''

بارش رُکنے کے بعد ہوا میں خنکی کا تناسب زیادہ ہوگیا۔ اُس پر ہلکی سی کپکپی طاری ہونے لگی۔ سورج نے کسی طرف سے کنی نکالی تھی۔ کہیں چھاؤں، کہیں دھوپ..... یہ امتزاج عام دِنوں میں اُسے بھلا لگتا تھا مگر آج غیر اہم ہوگیا تھا۔ کچن میں آ کر چائے بنانے لگا۔ ایسے میں رُباب یاد آ گئی۔ چائے والا ڈبا ہاتھ میں تھامے کا تھا مارہ گیا۔ بے دھیانی میں اُس نے چمچ واپس ڈبے میں رکھ دیا۔

رُباب چائے بناتے وقت چائے کی پتی پہلے ہتھیلی پر ڈالتی تھی۔ اسے بہ غور دیکھتے ہوئے ہونٹ سکیڑ کر بڑبڑایا کرتی تھی۔ ''ہر شے میں ملاوٹ، ہر شے ناخالص..... شاید زہر پینے والا بچ نکلنے پر یہی کہنے پر مجبور ہوگا۔''

پھر اِسی انداز میں چینی کو ہتھیلی پر انڈیلتی، کچھ دیکھ کر، کچھ چُن کر کیتلی میں ڈال دیتی۔ کبھی کبھی ہتھیلی گیلی ہوتی تو چینی کے ذرات چپک کر کیتلی میں گرنے سے بچ جاتے۔ اس باقی ماندہ چینی کو بڑی تیزی سے زبان سے چاٹ کر نگل جاتی۔ ایسے میں پروفیسر اُسے ڈانٹ دیتا۔ ''رَبو! یہ کیا بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگتی ہو؟''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ چھیڑنے کے لیے کہتی۔ ''آپ قدم قدم پر اتنے پیار سے ڈانٹتے ہیں، سمجھاتے ہیں کہ جی کرتا ہے کہ میں تمام عمر اسی طرح بچی ہی بنی رہوں۔''

پھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جاتے ہوئے چیخی تھی۔ ''تم نے زندگی میں سوائے مجھے نفرت سے ڈانٹنے اور جھڑکنے کے دیا ہی کیا ہے؟''

اُس نے بے دھیانی میں چائے کی پتی ہتھیلی پر انڈیل دی۔ پہلی مرتبہ پتا چلا کہ رُباب کی گداز اور سپید ہتھیلی پر پتی نظروں کو کتنی بھلی لگتی تھی۔ یہ بھی یاد آیا کہ پتی کو ہر مرتبہ بہ غور دیکھنے والی نے کبھی اُس میں سے کچھ نکال کر باہر نہیں پھینکا تھا۔ وہ عادتاً ایسا کرتی تھی، ضرورتاً نہیں۔ اُس نے بالکل اُسی کے انداز میں کیتلی میں پتی پھینک دی۔

چائے پی لینے تک رُباب کے بارے میں سوچتا رہا۔ سر جھٹک کر اسٹڈی روم میں آ گیا۔ کمپیوٹر آن کیا۔ ایسے میں

خیال سوجھا کہ کوئی نئی فلم ہی اُسے موجودہ کیفیت سے نکال سکے گی۔ آرٹ فلمیں دیکھنے کا دلدادہ تھا۔ پہلی سی ڈی لگا کر بیٹھ گیا۔ اُس کی توقع کے مطابق چند ہی منٹوں میں اُسے اُشولال کے طعنے بھول گئے، مریم اور رُباب کے چہرے محو ہوگئے اور وہ پرسکون ہوگیا۔

پہلی سی ڈی ختم ہونے سے پہلے ہی وہ گہری نیند سو گیا۔ شام تک سویا رہا۔ جاگا تو سر بھاری بھاری محسوس ہوا۔ باتھ روم جا کر کافی دیر تک شاور لیتا رہا۔ نکلا تو بالکل فریش تھا۔ کنٹرول روم میں آ کر جنت کو روشن کرنا چاہتا تھا کہ اچانک خیال آیا۔ بارش کے باعث اطراف کی زمین سے نکلنے والے پروانے وہاں جمع ہو جائیں گے۔ پروانوں کا اجتماع اُسے شروع سے ہی کوفت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ عقبی بالکونی میں آ کر کرسی میں بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگا کر گہرے گہرے کش لینے لگا۔

تمام عمر ایک لگے بندھے معمول میں بغیر خواہش کے کولہو کے بیل کی طرح جتا رہا تھا۔ آزادی کا پہلی مرتبہ احساس پا کر اترانے لگا تھا۔ ماضی میں منہ اندھیرے جنرل بس اسٹینڈ پر جاتا۔ وہاں کچھ دیر انتظار کرتا۔ ایک معروف ٹرانسپورٹ کمپنی کا پکا ٹائم اُس کی روزی کا سامان لے کر آیا کرتا تھا۔ کچھ منٹ اوپر نیچے چھ بجے وہ بس کی چھت پر سے اخبارات کا بنڈل اتارتا۔ سائیکل پر لاد کر متعلقہ نیوز ایجنسی پر جاتا۔ جہاں سے سائیکل کے اگلے کیریئر میں اخبار رکھتا اور شہر میں بانٹنے کے لیے نکل کھڑا ہوتا۔ ایک گھنٹے میں وہ اتنی جان ماری کر لیتا تھا کہ شام تک گھٹنے اور کمر دکھتی رہتی تھی۔ آخری اخبار اپنے کالج کے اسٹاف روم میں رکھتا اور سائیکل اسٹینڈ میں کھڑی کر کے کلاس روم میں چلا جاتا جہاں دن بھر اپنے ہم عمروں کے مذاق کا نشانہ بنتا مگر اپنے ہر استاد کی نظر میں ترجیح کا اہل ٹھہرتا۔

کالج سے تین بجے فارغ ہوتا اور سیدھا ایک پبلک کال آفس پر پہنچ جاتا جہاں اُس کی ڈیوٹی رات گئے تک جاری رہتی۔

اُسے دیپک چند یاد آیا۔ دل میں دکھ کی کسک جاگ اٹھی۔ جب سندھ ساگر کے کنارے سرکنڈوں کے بنے ہوئے بڑے سے جھونپڑے کو خیر باد کہہ کر شہر میں بھٹکنے کے لیے پہنچا تو سب سے پہلے ملنے والا دیپک چند ہی تھا جو صدر بازار میں کریانہ کی چھوٹی سی دکان چلا کر اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالا کرتا تھا۔ پھٹے پرانے چولے میں ملبوس سیمو کو دیکھ کر اُس نے اپنے پاس بلا لیا۔ پوچھا۔ ''تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو؟''

وہ تمام دِن بھوکا پیاسا رہا تھا۔ اس کے سوال کے جواب میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بتانے لگا، جو کچھ جانتا تھا۔ وہ تو محض اُس آگ کو جانتا تھا جو انتڑیوں اور معدے میں جل اُٹھی تھی۔ دیپک چند نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ سمجھ گیا کہ وہ بھکاری نہیں، گھر سے بھاگا ہوا ہے اور اُسے کسی نے بھی کام پر نہیں رکھا۔ دیپک چند کی دکان پر اُسے شہر میں پہلا نوالہ ملا۔ یہ نوالہ میٹرک پاس کرنے تک اُس کے حلق میں اُترتا رہا۔ دیپک چند نے اُسے اپنی دکان پر رکھ لیا۔ رات کو اپنے ساتھ گھر لے جاتا۔ جانے کیسے اُس کے دل میں جذبہ ہمدردی بھر گیا اور اُس نے سیمو کو وسیم کا نام دے کر اسکول میں داخل کرا دیا۔ اسکول کے پہلے استاد نے اُس سے پوچھا۔ ''تم مسلمان ہو یا ہندو؟''

اُس نے گھبرا کر دیپک چند کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا۔

دیپک چند نے گلا کھنکار کر کہا۔ ''ماسٹر جی! یہ نہیں جانتا، میں بھی نہیں جانتا۔ بس ایک نشانی دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ کسی مسلمان گھر کا بالک ہے۔''

اُس نے نشانی بتائی۔ ماسٹر جی نے سر ہلا کر داخلہ رجسٹر میں اُس کا نام محمد وسیم لکھ دیا۔ قوم پوچھنے پر بھی وہ کچھ بتا نہ پایا۔ ماسٹر بلوچوں کے قبیلہ بزدار سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس نے ذات کے خانے میں بزدار لکھ دیا۔ یوں وہ مہانوں کا لباس اُتار کر بلوچوں کی پگڑی پہن کر جون بدلنے میں کامیاب ہوگیا۔ اگر اُس دن اُسے مہانہ لکھ دیا جاتا تو تمام عمر لوگوں کی تضحیک آمیز نگاہوں کا نشانہ بنتا رہتا۔

دیپک چند اُسے پڑھاتا رہا، گھر اور دکان پر کام لیتا رہا۔ اُس نے امیر نہ ہونے کے باوجود اپنا حق ادا کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ وہ فطرتاً عظیم انسان تھا۔ چاہتا تو بڑی آسانی سے وسیم کو اپنے مذہب کی چھتری تلے بٹھا دیتا مگر وہ وسیم کو ہر صبح مسجد میں قرآن کا سبق لینے کے لیے بھیج دیتا تھا۔ پھر اپنے ہم جماعتوں اور محلے دار لڑکوں کی غیر معمولی اور مسلسل تضحیک کے زخم ناپختہ بدن پر جمع کرتے ہوئے جب اُس نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تب دیپک چند نے اُسے سمجھایا۔ ''کالج کی پڑھائی کا خرچہ شاید مجھ سے اُٹھایا نہیں جا سکے گا۔ تم ایسا کرو کہ کالج سے واپس آنے سے پہلے سائیکل پر اخبارات پھینکا کرو۔ کچھ نہ کچھ رقم وہاں سے حاصل ہو جائے گی۔ یوں تمہارا گزارا چلتا رہے گا۔''

اُس نے فوری طور پر نیوز ایجنٹ کی ڈیوٹی سنبھال لی۔ شاید ایسے ہی سب کچھ ٹھیک ٹھاک انداز میں چلتا رہتا مگر اُس کے اندر کروٹیں بدلنے والا انسان انگڑائی لے کر بیدار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگیا۔ دیپک چند کی بیٹی سموں نے ٹھہرے ہوئے پانی میں پیار کا پہلا پتھر پھینک کر اُسے بھنکا دیا۔ سانولی سلونی سی سموں کا لڑکپن خاموش رہا تھا، جوانی بولنے کا ہنر سیکھ کر کچھ زیادہ ہی خطرناک ہوگئی۔

دو کمروں والے چھوٹے سے پرانی طرز کے مکان میں دو جوانیاں ٹکرائیں تو چوری چھپے دیکھنے سے بات بڑھتے ہوئے وصل کی چوریوں پر کمر بستہ ہوگئی۔ دونوں ناسمجھ عاشق ثابت ہوئے۔ عشق کے پہلے مہینے میں ہی اپنا راز فاش کر بیٹھے۔ دیپک چند کو پتا چلا تو اُس نے سموں اور وسیم کو جی بھر کر پیٹا۔ سموں کی پڑھائی روک دی۔

وہ زندگی کی پہلی جذباتی شکست وریخت کا شکار ہوکر اپنے محسن کے قدموں میں گر گیا اور تڑپ تڑپ کر فریاد کی۔ بڑے خشوع سے اپنا آپ پیش کرتے ہوئے سموں کا ہاتھ مانگا۔ اُس نے تو یہ تک کہہ دیا تھا کہ سموں اپنے مذہب پر کاربند رہے گی، وہ اپنے مذہب پر قائم رہے گا مگر دیپک چند کو اُس سے جتنی محبت تھی، اُتنی ہی نفرت ہوگئی تھی۔

ندامت سے سر جھکائے کھڑے وسیم کو اُس نے کہا۔ ''میرا بیٹا نہیں تھا، بھگوان کی کرپا رہی کہ اُس نے دیا ہی نہیں۔ اگر دیتا اور وہ تم جیسا پاپی نکلتا تو میں جیتے جی مر جاتا۔ تمہارے لیے بس یہی بہتر ہوگا کہ آئندہ مجھے اپنی منحوس شکل نہ دکھانا۔''

اُسے اپنا ادا کیا ہوا ایک ایک حرف یاد تھا جو اُس نے گھر سے نکلتے ہوئے دہلیز پر کہا تھا۔ ''اے باپ بن کر پالنے والے! سُن..... میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ لوگوں نے ناروا رویے سے میرے تن بدن میں تضحیک اور نفرت دی، تم نے محبت کا یوں عملی درس دیا کہ میری رگ رگ میں محبت بھر گئی ہے۔ تمہاری محبت نے تو مجھے زندگی بھر اپنی اصل کی جانب پلٹنے کی مہلت بھی نہیں دی۔ جب تک بچہ تھا، سموں کو بھائی بن کر پیار کرتا رہا۔ جب لڑکپن میں آیا تو پل پل حیا اُس کے کچے پکے وجود میں بھرتا رہا۔ جوانی نے قدم بہکا دیے۔ سمجھا دیا کہ دُنیا کی سب سے سچی محبت یہ ہے، میں اُس کے بہلاوے میں آ گیا۔ کیا یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ پیروں میں گر کر معافی مانگنے اور رو رو کر توبہ کرنے سے بھی نہیں دُھلتا؟ اگر ایسا ہے تو مجھے نمک حرامی کے طعنے دینے کے بجائے اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اُتار دے۔ میرا تمہارے سوا کوئی بھی نہیں جو میرے قتل کا حساب مانگنے کے لیے تمہارے پاس آئے گا۔''

دیپک چند کا غصہ فرو نہ ہوا۔ وہ اُس سچے اور بے لوث ہمدرد کے گھر سے یوں نکلا جیسے کسی حرماں نصیب کے گھر سے جنازہ اُٹھنا ہے۔ اُس نے کالج کو خیر باد کہنے کا ارادہ کیا مگر اُس کی خوش قسمتی کہ انہی دنوں پی ٹی سی کی کلاسز میں داخلہ شروع تھا۔ اُس نے اخبارات کی ترسیل اور پی سی او کی ملازمت جاری رکھتے ہوئے ایلیمنٹری کالج میں داخلہ لے لیا۔ انہی دنوں اُسے پتا چلا کہ سموں کو اپنی جاتی کے ایک اٹھائیس سالہ تنومند جوان سے بیاہ دیا گیا۔ وہ روتی سسکتی گھر، محلہ اور شہر چھوڑ کر دوسرے ضلعے میں چلی گئی۔

کورس کرنے کے چھ ماہ بعد اُسے شہر کے ایک مضافاتی گاؤں میں پرائمری اسکول میں ٹیچر کی سرکاری نوکری میسر آ گئی۔ وہ مٹھائی کا ڈبا لے کر دیپک چند کی دکان پر گیا۔ وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ دیپک چند دکان اور مکان بیچ کر اپنی اکلوتی بیٹی سموں کے شہر میں ہمیشہ کے لیے جا چکا تھا۔

تنگ اور پُرہجوم صدر بازار کے بیچوں بیچ مٹھائی والا ڈبا ہاتھوں میں تھامے عجیب سی کیفیت میں کھڑا تھا۔ دیپک چند چلا گیا، کس شخص کو اپنی خوشی میں شریک کرے۔ ایسے میں پہلی مرتبہ ماں اور باپ کی یاد آئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ قدم اُٹھ گئے، سر جھک گیا۔ لاری اڈے پر آیا۔ ماں، فضاں مائی کے پاس لے جانے والی کھٹارا سی بس پر بیٹھ گیا۔ بس نے اُسے ماں کے جھونپڑے سے ایک میل کے فاصلے پر اتار دیا۔ وہ ڈبا دونوں ہاتھوں میں تھامے پیدل ناک کی سیدھ میں چل پڑا۔

اتنے سالوں کے بعد بھی اُسے یہ راستہ دیکھا بھالا لگ رہا تھا۔ اِسی راستے کی اخیر پر دریا کی کندھی پر کسی ناتواں بوڑھے کی طرح کندھے جھکائے ایستادہ جھونپڑا دکھائی دے رہا تھا جہاں اُس کی ماں موجود تھی۔ دھڑکتے دِل کے ساتھ جب قریب پہنچا تو ایک بوڑھی عورت کو سرکنڈوں سے نکلتے دیکھا۔ رُک گیا۔ سیاہ فام بڑھیا قریب آ کر آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر دیکھتے ہوئے سرائیکی زبان میں دریافت کرنے لگی کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کس سے ملنا چاہتا ہے؟

اُس نے غور سے بڑھیا کو دیکھا۔ وہ یقیناً اُس کی ماں نہیں تھی۔ ماں ہوتی تو پوچھے بنا ہی پہچان جاتی یا اُسے دیکھ کر دل بے قابو ہونے لگتا۔ کچھ بھی نہیں ہوا تو وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں محمد وسیم..... اوہ! نہیں، سیمو ہوں۔ فقیرے مُہانے کا پتر!''

بڈھی اور نزدیک آ گئی۔ بڑے غور سے دیکھتے ہوئے چیخی، ''اڑے! ارے! تجھے مرے ہوئے مدت گزر گئی ہے۔ بدبخت! تو اَب کہاں سے نکل آیا ہے؟''

وہ جواب دینے کے بجائے سسک پڑا۔ بڈھی نے سینے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے لگا لیا۔ وہ بھی ہچکیاں لیتے ہوئے رونے لگی۔ روتے ہوئے بتانے لگی۔ ''تو جہاں سے آیا ہے، وہیں لوٹ جا۔ یہاں تیرا کوئی بھی والی وارث زندہ نہیں رہا۔''

اُس کے استفسار پر بڈھی نے بتایا کہ تین سال پہلے یہاں گردن توڑ بخار کی وبا پھوٹ پڑی تھی جس نے فقیر وٹھانے اور فضاں مائی سمیت بیسیوں سندھ واسیوں کو نگل لیا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ فضاں آخری سانس تک ''سیمو، سیمو'' کا راگ الاپتی رہی تھی۔ وہ اُس کی معیت میں جھونپڑے کے اندر آیا۔ جہاں اُس کی ماں کا سرکنڈوں کا بنا ہوا بستر بچھا ہوتا تھا، وہاں اَب برابر میں دو قبریں بنی ہوئی تھیں۔

بڈھی جس نے اپنا نام حیاتاں بتایا تھا، نے میلی چادر سے اپنے بوڑھے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میڈا پتر! تمہارے ماں باپ اِنہی قبروں میں دفن ہیں۔ کون کس قبر میں ہے، میں نہیں جانتی، رَب ہی جانتا ہے کہ حقیقت کیا ہے؟''

وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح دونوں قبروں کے بیچ تھوڑی سی خالی جگہ پر اوندھے منہ گر گیا۔ مٹھائی کا ڈبا پچک گیا۔ رَس گلوں کا شیرہ غمزدہ بیٹے کے آنسوؤں کی طرح بہنے لگا۔ جانے کتنی دیر گزر گئی، کبھی ایک قبر پر روتا، کبھی دوسری پر۔ اُسے شام گزرنے کا، رات ڈھلنے کا کچھ پتا نہیں تھا۔ بڈھی کے دم توڑتے دلاسوں نے بھی کوئی پُرسہ نہیں دیا۔ رات کے جانے کس پہر بڈھی کا جواں سال سیاہ فام بیٹا کمر پر مچھلیاں پکڑنے والا جال لادے جھونپڑے میں آیا۔ بڈھی حیاتاں نے اُسے بتایا کہ لاوارث قبروں کو سنبھالنے والا آن پہنچا ہے۔

اُس نے وسیم کو سنبھالا دیا۔ سمجھایا کہ جانے والے چلے گئے ہیں، رہ جانے والوں نے بھی ایک دِن چلے جانا ہے۔ ایسے میں غم کیسا؟

وہ دونوں قبروں کے بیچ میں کھڑا ہو گیا۔ سرسوں کے تیل کے بھرے پیالے والی بتی کی لرزتی ہوئی روشنی میں اُس کا چہرہ غم واندوہ کی اَن مٹ تصویر بنا ہوا تھا۔ ہونٹوں کے دونوں گوشوں سے رال بہہ کر گردن بھگو رہی تھی۔ چونکہ آنسوؤں نے پورا چہرہ تَر کر دیا تھا، اِس لیے منہ کے بل اوندھا لیٹنے سے چکنی مٹی چہرے پر جا بہ جا چمٹی ہوئی تھی۔ بال خاک آلود تھے۔ گلوگیر آواز میں بولا۔ ''اماں! ہائے میری اماں! تو نے کیوں مجھے گھر سے نکال کر شہر بھیجا تھا۔ کیوں مجھے کہا تھا کہ یہاں رہے گا تو تمام عمر کشتیاں کھینے میں گزر جائے گی۔ یہاں رہے گا تو مچھلیوں کی مہک خون میں رَچ بس جائے گی۔ یہاں رہے گا تو کچے کے بلوچوں کی جھڑکیاں مقدر کا حصہ بن جائیں گی۔''

بڈھی کے بیٹے نے تسلی دینے کے لیے اُسے گلے سے لگا کر زور سے بھینچا۔ چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ سیاہ فام کے بدن سے وہی مخصوص بو پھوٹ رہی تھی جو اُس کے باپ اور ماں کے بدنوں میں رَچی بسی تھی۔ وہ اچانک بلند آواز میں چیخ پڑا ''دیکھ ماں! اِس کے بدن سے بھی وہی مہک پھوٹ رہی ہے مگر کیا اِس نے اپنی ماتا کو اِس پر قربان کرنے کا جرم کیا ہے؟ نہیں۔ یہ دُنیا کا خوش قسمت انسان ہے کیوں کہ اِس کی ماں اِس کو دکھائی دیتی رہتی ہے۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں مہمان نہیں رہا، میں مہمانوں کی نظر میں بڑا آدمی بن گیا ہوں مگر مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی ہے۔ ایسی گھن جس سے مچھلیوں کی بو بھلی تھی۔''

اُس نے یکبارگی بڈھی کے بیٹے کو دھکا دیا۔ وہ پشت کے بل پیچھے گر گیا۔ خوف اور ترحم کے ملے جلے تاثرات اُس کے چہرے پر ثبت ہو گئے۔ وسیم لہرا کر پھر قبروں کے بیچ میں گر گیا۔ ایک ہاتھ ایک قبر پر، دوسرا ہاتھ دوسری قبر پر..... ہچکیاں لے کر روتے ہوئے بلند آواز میں بڑبڑانے لگا۔ ''ہائے میری اماں! میں نہیں جانتا کہ تم کس طرف لیٹی ہوئی ہو، دائیں یا بائیں؟ مگر تم جہاں بھی ہو، سن لو کہ میں تمہیں خوش خبری سنانے کے لیے آیا ہوں کہ میں اُستاد بن گیا ہوں۔ جس کا باپ دو چار مچھلیوں کے وزن کا حساب نہیں کر سکتا تھا وہ قوم کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے پر مامور ہو گیا ہے۔ اماں! بڑی نصیبے والی نکلی ہو۔ تم نے جو چاہا تھا، وہ ہو گیا مگر میں نے جو چاہا تھا، وہ نہیں ہوا۔''

وہ بہت کچھ کہتا رہا۔ کچھ سمجھ آتا تھا، کچھ سمجھ نہیں آتا تھا۔ بڈھی نے پیار سے کھانا کھلایا، دلاسہ دیا اور سمجھایا کہ فضاں مائی کی روح کو اُس وقت سکون نصیب ہو گا جب تم بہت بڑے آدمی بن کر زمین کے سینے پر نخرے سے گھوما کرو گے۔ زمین کسی پیغام کو اپنے پاس نہیں رکھتی، متعلقین تک پہنچا دیتی ہے۔

وہ اگلے دِن لوٹ آیا۔ نوکری کا سلسلہ چل نکلا۔ اُن دِنوں ٹیوشن پڑھانے کا رواج نسبتاً کم تھا جس کی وجہ سے اُس نے اخبار تقسیم کرنے والی نوکری کو ترک نہیں کیا۔ کچھ ہی عرصے میں اُس کی معاشی حالت کافی بہتر ہو گئی۔ ہر ماہ سرکاری خزانے سے ملنے والی تنخواہ صاف بچ جایا کرتی تھی۔ اِنہیں دِنوں اُس کے ایک ساتھی ٹیچر نے شہر کے مضافات میں موجود اپنی زمین بیچنے کا ارادہ کیا۔ وسیم کو پتا چلا تو اُس نے اپنی پہنچ کے مطابق ایک ایکڑ زمین خرید لی۔ کچھ رقم ادا کر دی، کچھ قسطوں میں دینے کا وعدہ کر لیا۔ قسطیں چکتا ہونے پر اُس نے تمام ساتھی استادوں کو مٹھائی کھلائی۔ اِس خوشی میں

کہ وہ دُنیا کا حصہ دار بن گیا ہے۔

چند دِنوں کے بعد ایک اور ٹیچر نے اپنی دکان بیچنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یہ دکان شہر میں واقع تھی۔ وسیم کے پاس نقد رقم نہیں تھی مگر اُس نے رِسک لینے کا ارادہ کر لیا۔ جی پی فنڈ کی رقم نکلوائی، کچھ ساتھیوں سے اکٹھی کی اور یوں سودا کر لیا۔ آدھی رقم فروخت کنندہ کو مل چکی تھی، بقیہ نصف رقم بھی اُسے سال بھر میں مل گئی اور یوں اُس کی ماہانہ آمدنی میں دکان کا کرایہ بھی شامل ہونے لگا۔

بے حد مصروفیت کے باوجود اُس نے اپنی تعلیم کا سلسلہ بحال رکھا۔ پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے اُس نے چھ برسوں میں ماسٹر ڈگری حاصل کر لی۔ اُسے یہ اعتراف تھا کہ تعلیم کے اِس سلسلہ وار حصول میں جہاں اُس کی انتھک محنت کا مرکزی کردار تھا وہاں مریم کو حاصل کرنے کی لگن بھی تحریک بن کر ذہن میں رَچ بس گئی تھی۔

مریم کون تھی؟..... جان لیوا حسن کا شاہکار جو دل کی دھڑکن کو مہمیز کر کے سانس کے رستے میں تن کر بیٹھ گیا تھا۔

اچانک اس کے لبوں سے تھکن زدہ آواز نکلی، ''ہائے مرشد! جہاں بھی جاتا ہوں، تمہاری آواز میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔''

پروفیسر وسیم بزدار کی بدقسمتی یہاں سے شروع ہوتی تھی کہ وہ اُشو لال کو دل سے چاہنے اور مُرشد ماننے کے باوجود مانتا نہیں تھا۔

❖❖❖

محبت کی عجیب کسک ہوتی ہے۔ کبھی چبھتی ہے، کبھی شرمانے اور کبھی گدگدا کر بے سبب ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ تنہائی کی لمبی رات کے شکنجے میں اپنے ہی پیروں کے لمس کو محسوس کرتے ہوئے کبھی مسکرا رہی تھی، کبھی کروٹ کروٹ لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

گزشتہ شام میں روزینہ نے چھیڑتے ہوئے کہا تھا۔ ''مصباح! تم بہت چالاک ہو۔''

وہ دانت پیس کر بولی۔ ''یہ تمہیں کس نے بتا دیا؟''

''کسی دُشمن نے کہا ہے مگر کہا بالکل ٹھیک ہے کیونکہ تم بڑی معصومیت سے ایک تیر سے دو شکار کر رہی ہو۔''

''وہ کیسے؟'' وہ چونکی۔

''شہاب خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت امیر اور بااختیار باپ کا بیٹا ہے۔ وہ مستقبل کا ضلعی ناظم ہے۔ تم ایک آدمی کے دل پر قبضہ جما کر لاکھوں دماغوں پر راج کرو گی۔''

مصباح نے تنتنے سکیڑ کر لمبا سانس کھینچا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر سنجیدگی سے بولی۔ ''کچھ جلنے کی بو آ رہی ہے، کیا تم جل بھن رہی ہو؟''

''نہیں بلکہ مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ کوئی کام پڑا تو گردن پر انگوٹھا رکھ کر کروا لیا کروں گی۔'' روزینہ نے ہنس کر کہا۔

اَب ائرکنڈیشنر کی ٹھنڈک میں پسینے سے شرابور لیٹی سوچ رہی تھی کہ روزینہ نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ شہاب کو دیکھ لینے کے بعد کسی اور کو دیکھنے کی احتیاج نہیں رہی تھی۔ شہاب کے جھوٹ پر مسکرانے لگی۔ اُس نے کتنی ڈھٹائی سے کہا تھا کہ اُس کے باپ کا ایک زرعی فارم ہے جس سے اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ گزر بسر ممکن ہے۔ خود کو بے روزگار قرار دیتے ہوئے اُس کی خواہش پر نوکری کرنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے کتنا عجیب لگا تھا۔

وہ جھوٹ کیوں بول رہا تھا؟ لوگ سیر ہوتے ہیں، خود کو سوا سیر ظاہر کر کے مقابل پر رعب جماتے ہیں۔ وہ دو سیر تھا۔ سمجھ نہ آنے والی بات تھی۔ تھک گئی تو سر جھٹک کر دل میں بولی، ''وہ خود کو چھپا کر سامنے آتا ہے تو مجھے کیا؟ اچھا ہی ہے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ میں ناظم کے بیٹے سے پیار نہ کروں بلکہ اُس کی اپنی شخصیت سے متاثر ہو کر اُسے قبول کروں تو مجھے بھی یہی کہنا چاہیے کہ میں اصلیت جانے بغیر اُس سے... محبت کرتی ہوں۔''

وہ نہیں جانتا کہ محبت میں اپنا قد جتنا اونچا کرتا جاتا تھا، مصباح کی قامت بھی آپوں آپ اتنی ہی بلند ہوتی جا رہی تھی۔ وہ شہاب کے تصور سے کھیل رہی تھی کہ ناگاہ انداوان یاد آ گئی۔ اُس کے بے حد اصرار پر اُس کے بھائی نے انداوان کی بیس پچیس تصویریں بھیجی تھیں جن میں سے مصباح نے چند ایک چھانٹ کر علیحدہ کر لی تھیں۔

اُس نے بیڈ کے باکس سے سفید رنگ کا لفافہ نکالا۔ اِس میں عمران کا خط بھی تھا۔ خط میں لکھا تو بہت کچھ تھا مگر فقط ایک فقرہ ایسا تھا جسے پڑھ کر بار بار پڑھنے کو جی چاہتا تھا۔ عمران نے لکھا تھا، ''مصباح! وہ مترجم ہے، مشکل سے مشکل چینی تحریر کو منٹوں میں اتنا خوبصورت اور عام فہم کر دیتی ہے کہ میرا بھی جی چاہنے لگا ہے کہ میں کسی پیراگراف کی طرح اُس کی نظروں میں کھل جاؤں اور وہ مجھے خوبصورت کر دے، اتنا کہ ہر کوئی پڑھنے پر مجبور ہو جائے.....''

دِل نے بھنکا دیا۔ سوچنے لگی۔ دُنیا خوب سے خوب تر سے بھری پڑی ہے۔ ایسے میں اگر کوئی دُنیا کا چکر کاٹ کر اُس پر مرمٹا ہے تو وہ یقیناً الگ تر ہے۔ شہاب کی نظریں جھوٹی نہیں، اُس کی تعریف افسانوی نہیں بلکہ سچ سے زیادہ سچی اور پانی سے زیادہ گیلی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ بہ خوبی سمجھتی تھی کہ عمران نے اتنی بے تکلفی کا مظاہرہ کیوں کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مصباح اُس کے عشق کا مقدمہ گھر کی عدالت میں تندہی سے لڑے اور عمران کی کامیاب وکالت کرتے ہوئے انداوان سے شادی کا اجازت نامہ حاصل کرے۔ وہ کوئی غلط قدم نہیں اُٹھانا چاہتی تھی۔ تبھی اُس نے تصویروں کے بعد فون پر انداوان سے گفتگو کی شرط عائد کردی۔ عمران نے فون پر کہا تھا۔ ''وہ بڑی روانی سے انگلش بولتی ہے، تم پڑھی لکھی ہو مگر انگریزی بولنے اور سننے پر عبور نہیں رکھتی ہو۔ کہیں یہ نہ ہو کہ اُس کی سمجھ نہ آنے والی گفتگو تمہیں اُس سے بددل کردے؟''

مصباح نے ہنس کر کہا تھا۔ ''بھائی! بعض اوقات بچوں جیسی باتیں کرنے لگتے ہو۔ تم دس پندرہ دِنوں کے بعد فون پر انداوان سے میری بات کروانا۔ تب تک میں کوئی انگلش سپوکن کورس جوائن کرلیتی ہوں۔''

پھر اُس نے ایسا ہی کیا۔ کچھ زبان میں روانی آگئی تھی، کچھ آنے والی تھی۔ ایسے میں اُس نے شہاب کو اپنا مسئلہ بیان کردیا۔ شہاب مسکرا کر خاموش رہا مگر اُس نے چند ہی دِنوں میں اُسے بلا جھجک انگریزی بولنے پر تیار کرلیا۔ وہ دانستہ مگر غیر محسوس انداز میں اُس سے انگریزی میں بات چیت کرنے لگتا تھا۔ اُس کی غلطیوں کی اصلاح کرنے اور ٹوکنے کے بجائے بات کو آگے بڑھاتا رہتا، یوں مصباح کی جھجک چند دِنوں میں ہی جاتی رہی۔

اُسے مطلق خبر ہی نہیں ہوئی کہ انداوان کی انگریزی سمجھنے کے شوق میں خود سمجھی جاچکی تھی۔ وہ چند ہی دِنوں میں شہاب کے اتنا قریب آگئی تھی جتنی شاید برسوں میں بھی نہ آپاتی۔ پھر جب اُس نے عمران کو گرین سگنل دیا، اُس نے وقت ضائع کیے بغیر اُس کے کانوں میں انداوان کی آواز اُتار دی۔ بلاشبہ اُس کی آواز بھی اُس کے وجود کی طرح بہت خوبصورت تھی۔ وہ غیر معمولی روانی سے انگریزی بولتی تھی۔ لہٰذا اس نے زیادہ دیر نہیں کی اور پینتالیس منٹ گفتگو کی۔ رابطہ منقطع کرنے سے پہلے عمران نے دریافت کیا۔ ''کہو! کیسی لگی؟''

وہ خوشی سے بولی۔ ''بھائی! تم بڑے خوش قسمت ہو۔ دیکھنے اور سننے میں تو بلاشبہ مس یونیورس ہے۔''

عمران نے ہنس کر کہا ''مجھے یقین ہے کہ بھگتنے میں بھی دُنیا سے منفرد ثابت ہوگی۔''

فون خاموش ہوگیا۔ انداوان کی دل موہ لینے والی آواز نیند آنے تک سماعت میں شیرینیاں گھولتی رہی۔ صبح وہ کالج جانے کے بجائے ماں کے گھٹنے سے جُڑ کر بیٹھ گئی۔ ماں نے تیکھی نظروں سے گھورا، پوچھا۔ ''کیا بات ہے مصباح! اتنی چاپلوسی کیوں کررہی ہو؟''

وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔ ''کیا ماما سے پیار کو چاپلوسی کا نام دیا جاتا ہے؟''

ماما ہنس پڑی۔ لاڈلی کا منہ چوم کر بلائیں لینے لگی۔ ماما کو مہربان پاکر اُس نے عمران اور انداوان کا مقدمہ پیش کردیا۔ ماما پُراستعجاب نظروں سے اُسے گھورنے لگی۔ بولی۔ ''ہائیں! وہ تو بڑا گھنا نکلا۔ دیکھنے میں تو.....''

''ماما جانے بھی دو۔ آج کے لڑکے اتنے بھی دَبو نہیں ہوتے۔''

ماما نے فوری طور پر انکار کردیا۔ خاندان کی لڑکیوں کے نام گنوانے لگی۔ سمجھانے لگی کہ خاندان میں ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی بیٹھی ہے۔ امپورٹڈ بہو لاکر وہ تضحیک کا نشانہ نہیں بننا چاہتی تھی۔ مصباح نے انداوان کی شخصیت کو بڑے پُرزور انداز میں پیش کیا تھا مگر ماما نے نفی میں سر ہلا کر رَد کردیا۔ وہ اپنے کمرے میں آئی۔ تصویریں لے کر پھر ماما کے پاس پہنچ گئی۔ باری باری دکھاتی رہی۔ بریفنگ دیتی رہی۔ ماما نے تمام تصویریں بڑی توجہ سے دیکھیں اور اپنی تحویل میں لیتے ہوئے کہا، ''واقعی مصباح! میرے بیٹے کی پسند کا جواب نہیں مگر میرے پاس بھی سوائے انکار کے کوئی جواب نہیں ہے۔''

وہ بولی ''آپ پاپا سے بات تو کریں ناں!''

''فائدہ؟'' ماما نے ناک بھوں چڑھائی۔

''ہوسکتا ہے پاپا مان جائیں اور بھائی کا کام بن جائے۔''

''میں تمہارے پاپا سے بات کیوں کروں گی؟'' ماما نے غصے سے کہا۔ ''میرے بیٹے کی شادی پاکستانی لڑکی سے ہوگی، اُسے وہاں سے میم لانے کی اجازت نہیں دوں گی۔ واہ رانی واہ! بھائی کے لیے چاپلوسی کرنے چلی ہو، یہ نہیں سوچا کہ اُس کا نہ کوئی خاندان، نہ ولی وارث اور نہ ہی زبان اور مذہب۔''

پہلے قدم پر ملنے والی ناکامی نے اُسے مایوس نہیں کیا۔ وہ ماما کے پاس سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آئی۔ فون پر شہاب سے رابطہ کیا۔ اُسے مخصوص ہوٹل میں بلوایا اور خود جلدی جلدی تیار ہو کر کالج کے بہانے وہاں پہنچ گئی۔ دس پندرہ منٹ کے بعد شہاب اُس کے سامنے بیٹھا پوچھ رہا تھا۔ ''خیریت تو ہے ناں؟''

اُس نے مسکراہٹ میں اُس کے سوال کا جواب دیا۔ آئس کریم سے لطف اندوز ہونے کے بعد اُس نے انداوان اور عمران کے درمیان پیدا ہونے والے غیر معمولی لگاؤ کا تفصیل سے تذکرہ کیا۔ عمران کی خواہش کے بارے میں بتایا

اور موجودہ پریشانی سے آگاہ کیا۔ بولی۔ ''میں چاہتی ہوں کہ عمران کی خواہش پوری ہوجائے مگر مجھے نہیں لگتا کہ ماما اور پاپا بہ آسانی مان جائیں گے۔ تمہیں یہاں بلوانے کا مقصد یہ ہے کہ مجھے کوئی ترکیب بتاؤ جو کارگر ثابت ہو۔''

شہاب نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''بہتر یہی ہے کہ عمران کو اپنی جنگ خود لڑنے دو اور تم دخل اندازی مت کرو۔''

وہ سختی سے انکار کرتے ہوئے بولی۔ ''نہیں شہاب! میں جانتی ہوں کہ عمران اکیلا اِس محاذ پر ناکام ہوجائے گا۔''

''ہوتا ہے تو ہوتا رہے، تمہیں کیا؟'' شہاب کا لہجہ سپاٹ رہا۔

وہ سمجھانے کے سے انداز میں بولی۔ ''سمجھنے کی کوشش کرو شہاب! تمہاری اور میری شادی بھائی کی اجازت کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ ہمارے خاندان میں باہر شادی کرنے کا رواج نہیں ہے اور نہ ہی اَب تک کسی نے برادری سے باہر شادی کی ہے۔ عمران کی انداوان سے شادی ایک روایت بن جائے گی جس کا سہارا لے کر میں اپنے لیے کچھ کرسکوں گی۔''

شہاب مسکرا دیا۔ شوخی سے بولا۔ ''تو یوں کہو ناں! تم اُس پر احسان کررہی ہو تاکہ وہ کل تمہارے کام آئے۔''

وہ جھینپ کر بولی۔ ''تو اور کیا؟ اَب کوئی ترکیب اپنی شیطانی کھوپڑی سے برآمد کرو.....''

دونوں کافی دیر تک سر جوڑے بیٹھے رہے۔ سوچتے رہے۔ سردست یہی فیصلہ ہوا کہ مصباح کو فوری طور پر اپنے پاپا سے بات کرنی چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ ماما کے برعکس وہ بہ آسانی مان جائیں۔

شام کو وہ پاپا کی تنہائی میں عمران کے لیے بول رہی تھی۔ پاپا نے لڑکی کی تصویریں دیکھیں۔ غصے سے لال بھبوکا ہوتی بیوی کو دیکھا پھر کہا ''مصباح! تم عمران سے کہہ دو کہ وہ اپنی پوری توجہ پڑھائی پر مرکوز رکھے۔ ڈگری ملنے پر اُس کی شادی کے موضوع پر سوچا جائے گا۔ میری طرف سے اُسے تسلی دے دو کہ جیسا وہ چاہے گا، ویسا ہی ہوگا۔''

ماما نے جل بھن کر کہا۔ ''آپ عمران کو شہ دے رہے ہیں۔ میں اپنے گھر میں کسی ایرے غیرے کو داخل نہیں ہونے دوں گی۔''

پاپا نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔ ''تم سوچو اگر ہم فوری طور پر انکار کردیتے ہیں تو وہ کیا کرے گا؟ ہماری اجازت کے بغیر ہی اُس لڑکی سے شادی کرلے گا جس کا نہ تو خاندانی پس منظر ہے اور نہ ہی کوئی دولت جائداد۔ ہم کچھ بھی نہیں کرپائیں گے۔''

''حوصلہ افزائی کرنے کا مطلب بھی آپ بہ خوبی جانتے ہیں۔''

''ہاں جانتا ہوں مگر تم نہیں جانتی ہو۔ چینیوں کا رہن سہن اور عادات بہت مختلف ہیں۔ ایک سال کے عرصے میں تمہارا ہونہار بیٹا اس لڑکی کے بعد تین چار لڑکیوں سے شادی کا وعدہ کرچکا ہوگا اور اُن سے بدظن بھی ہوچکا ہوگا۔ جب یہاں آئے گا، تب سب کو بھول چکا ہوگا۔'' پاپا نے پورے یقین سے کہا۔

مصباح سمجھ گئی کہ وہ کبھی کسی چینی لڑکی سے شادی کی اجازت نہیں دیں گے۔ دوسرے دِن اُس نے وجدان سے بات کی۔ وجدان کچھ دیر کی بحث کے بعد اُس کا ہم خیال ہوگیا۔

کہتے ہیں کہ ایک اور ایک مل کر گیارہ بن جاتے ہیں۔ وہ گیارہ کیا بنے، ماما اور پاپا کے لیے وبالِ جان بن گئے۔ دونوں نے خاموش احتجاج اور عمران کی وکالت کا سلسلہ بڑی عقلمندی سے چھیڑ دیا۔ آئے روز نیا طریقہ، ہر دِن نئی واردات..... مجبوراً ایک دن پاپا نے دونوں کو بلا کر پوچھا۔ ''تم دونوں نے اپنے بھائی کے لیے سرد جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ تمہیں اُس لڑکی سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟ کیا عمران نے تمہیں ڈرایا دھمکایا ہے؟''

وجدان چھوٹا ہونے کے سبب ماما اور پاپا سے زیادہ فری تھا۔ اِس لیے بے دھڑک بولا۔ ''ہم تینوں کو یہ سمجھ نہیں آتی کہ آپ کو انداوان میں کیا برائی دکھائی دی ہے جو اُسے بلاسوچے سمجھے مسترد کررہے ہیں؟''

''برائیوں کا علم خدا کو ہے۔ مجھے تو صرف اُس شادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کا اندازہ ہے۔ کیا تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ ایک چینی لڑکی کس طرح اپنے آپ کو اِس ماحول میں ایڈجسٹ کرے گی؟ خدارا! عقل کو استعمال میں لاتے ہوئے اِس رخ کو بھی مدنظر رکھو کہ انداوان سے شادی کرلینے کے بعد عمران مستقلاً وہیں رہائش پذیر ہوجائے گا۔ ہم اپنے پانے پوسے بیٹے کو ایک حماقت میں ہمیشہ کے لیے گنوا بیٹھیں گے۔''

''پاپا! میری عمران بھائی سے اِس موضوع پر بات ہوئی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ شادی پاکستان میں ہی ہوگی اور ہم دونوں ہمیشہ پاکستان میں ہی رہیں گے۔ سچ پاپا! بھائی آپ سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ انداوان کو چاہتا ہے مگر ایسا نہیں ہے کہ آپ اور ہم لوگوں پر اُسے ترجیح دیتا ہو۔'' مصباح نے وجدان کا سہارا پاکر دلیری سے کہہ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد پاپا نے یکسر خاموشی اختیار کرلی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُن کی ہر بات پر ''ہوں'' اور ''ہاں'' کہتے رہے۔ عملی طور پر اُنہوں نے اپنے انکار کو اُن پر آشکار کر دیا تھا۔ مصباح نے وجدان سے کہا۔ ''چلو بھائی! جن والدین کو اپنے بچوں کی خوشی سے کوئی سروکار نہ ہو، اُن کے سامنے سر پھوڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔''

پاپا کے دل پر گھونسا لگا۔ بیٹی اور بیٹا سمجھا رہے تھے کہ اگر وہ نہیں بھی مانیں گے، تب بھی اُنہیں منوالیا جائے گا۔ مصباح وجدان کو لے کر اپنے کمرے میں آئی۔ غصے سے اُس کا چہرہ سرخ تھا۔ وجدان نے مسکرا کر کہا۔ ''اپنا خون جلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بھائی سے بات کرو۔ اُسے بتاؤ کہ ہم دونوں اُس کے ساتھ ہیں۔ پاپا اور ماما آج رات کو اُس سے بات کر کے اُسے سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ ڈرائیں دھمکائیں گے۔ اُسے کہہ دو کہ اُن کی باتوں میں ہرگز نہ آئے۔''

مصباح نے مس کال دی۔ کچھ دیر کے بعد عمران کی کال آ گئی۔ پوچھنے لگا۔ ''کیا بات ہے مصباح ڈیئر؟''

اُس نے ماما اور پاپا کے رویے کی تفصیلی رپورٹ دی۔ بولی۔ ''میں اور وجدان ایک طرف ہیں، ماما اور پاپا ایک طرف ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ تمہیں فون کریں اور انداوان سے کنارہ کش ہونے کا حکم دیں مگر تم نے ہرگز نہیں ماننا۔''

وہ بولا۔ ''وجدان کو فون دو۔''

اُس نے فون وجدان کو دیا۔ وجدان نے کان سے لگایا، بولا۔ ''بھائی! ہمارے خاندان نے طے کر رکھا ہے کہ دُنیا میں اُن کے علاوہ سب ناکارہ اور برے کردار کے مالک ہیں حالانکہ اَب وقت تبدیل ہو چکا ہے۔''

عمران نے کہا، ''یہ تو ٹھیک ہے مگر ماں باپ کو ناراض کر کے سچی خوشی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ مصباح نے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی ماما پاپا کے ساتھ؟''

''نہیں بھائی! ہم دونوں نے اُن کا احترام ملحوظ رکھ کر بات کی تھی مگر وہ لائن پر نہیں آئے۔''

''تمہارا کیا مشورہ ہے، مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' عمران نے قدرے غم زدہ لہجے میں دریافت کیا۔ ''مطلب یہ ہے کہ میں انداوان کے بغیر اپنی زندگی کو نامکمل اور ناکارہ سمجھنے لگا ہوں۔ شاید میں اُس کے علاوہ کسی اور لڑکی کے ساتھ مطمئن زندگی نہ بسر کرسکوں۔ پلیز کوئی ترکیب سوچو۔''

وجدان نے پوری بات سن کر کہا۔ ''ٹھیک ہے بھائی! ہم جو کریں گے، سوچ سمجھ کر کریں گے۔ دریافت کرنے پر تھوڑا سا جھوٹ بول دینا کہ انداوان بہت اونچے خاندان کی امیر کبیر لڑکی ہے۔ اُس کی اچھی خاصی جائداد ہے۔ پھر پاپا کا ایک اعتراض ختم ہو جائے گا۔ دوسرے اعتراض کے ساتھ ہم بہ آسانی نمٹ لیں گے۔''

فون بند ہوگیا۔ احتجاج بند ہونے کے بجائے تیز تر ہوگیا۔ چند دنوں میں ماما اور پاپا کو بہ خوبی احساس ہوگیا کہ اولاد نہ صرف جوان ہو چکی ہے بلکہ بچپن سے اَب تک آپس میں لڑنے اور جھگڑنے والے بچے جوانی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوگئے ہیں۔ پاپا نے اپنے مخصوص طریقے سے اُن میں پھوٹ ڈالنا چاہی مگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اُسے یہ علم نہیں تھا کہ وجدان نے سدرہ نامی اسکول ٹیچر اور مصباح نے شہاب کے حصول کے لیے جاری ہونے والی متوقع جنگ میں اپنے تیر و ترکش پر انداوان کا نام کندا کر دیا تھا۔ پاپا کے مضبوط ارادوں کی فصیل میں ایک دراڑ پڑ چکی تھی۔ دوسری اگلے دِن شام کو پڑ گئی جب وجدان نے اپنی ماما سے کہا کہ وہ اپنی خالہ زاد نورین سے شادی نہیں کرے گا بلکہ سدرہ کو اپنا شریک سفر بنائے گا۔

ماما نے بہت سمجھایا کہ اُس کی منگنی نورین سے ہو چکی ہے۔ انکار کرنے سے بہت بگاڑ پیدا ہوگا۔ اُس نے نہایت بے پروائی سے کہہ دیا۔ ''ماما! آپ کو میری شادی سے غرض ہے یا نورین کی؟ آپ کا رویہ دیکھ کر مجھے شبہ ہونے لگتا ہے کہ آپ اپنی اولاد پر دوسروں کی اولاد کو ترجیح دیتی ہیں۔ پاپا کا رویہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔''

ماما رونے بیٹھ گئیں۔ وجدان کا دل پسیجا، آنسو پونچھتے ہوئے سمجھانے لگا۔ ''ماما! آپ اپنی بہن اور بھانجی کی محبت میں گرفتار ہیں۔ میں سدرہ کی محبت میں گرفتار ہوں۔ آپ اگر اپنی دلچسپی سے دست بردار ہونے پر تیار نہیں تو میں کیسے سدرہ کو چھوڑ سکتا ہوں؟''

ماما نے دوپٹے سے آنسو پونچھ لیے۔ ماں سمجھ گئی کہ وہ بے دست و پا ہو چکی ہے۔ جو بیٹا چاہے گا، وہی کرنا پڑے گا۔ رات میں اپنے مجازی خدا کے سامنے سر جھکائے بیٹھی بیٹے کے اعلان کے بارے میں بتانے لگی۔ پاپا نے پوری توجہ اور ہمت سے سنا۔ برداشت نہ کرنے والی بات تھی مگر اِس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ وہ محض نام کا سلطان نہیں تھا، اِس گھر کا سلطان بھی تھا۔ حکم عدولی پر تلملا اُٹھا۔ بیوی سے مخاطب ہوا ''پہلے عمران نے چچا کے گھر منگنی کرنے پر انکار کر کے میری سبکی کرائی تھی۔ اَب انگوٹھی واپس کرتے ہوئے ہمارے سر شرم سے جھک جائیں گے۔ پورا خاندان ہم پر تھو تھو کرے گا۔ تم جانتی ہو کہ عائشہ باجی اپنے بیٹے افتخار کے لیے مصباح کا ہاتھ مانگتی رہتی ہیں، اُنہیں خبر ہوگی تو وہ

ہٹ جائیں گی۔ مصباح کے لیے افتخار سے بہتر لڑکا آسمان سے اترے گا کیا؟''

ماما آنسو بہانے لگیں۔ دل ہی دل میں کوسنے لگیں۔ کہیں تربیت میں کمی رہ گئی تھی؟ کیا خون سفید ہوگیا تھا؟ سلطان علی نے دلاسہ دیا کہ وہ سب کو سمجھا لے گا۔ وہ نفی میں سر ہلا کر بولیں۔ ''آپ کس کس کو سمجھائیں گے؟ عمران کے بعد وجدان نے بھی خاندان میں شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ رہ گئی مصباح، آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ دونوں بیٹوں سے زیادہ آپ کی سرچڑھی اور منہ پھٹ ہے۔ وہ تڑاخ سے انکار کر دے گی۔ رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔''

دوسری طرف وجدان اپنی بہن کے کمرے میں بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا ''میں کسی کا محتاج نہیں ہوں۔ اگر پاپا مان گئے تو ٹھیک ورنہ میں گھر چھوڑ دوں گا۔ میں بھائی کی طرح بزدل نہیں ہوں۔ اپنا اور سدرہ کا پیٹ پالنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔''

مصباح سمجھا رہی تھی۔ ''نہیں بھائی! وہ بزدل نہیں، تم بزدل ہو۔ گھر ہم تینوں کا بھی ہے۔ ہم معاملے کو ناکامی کے اِس موڑ تک پہنچنے نہیں دیں گے جہاں ہمیں گھر چھوڑنا پڑ جائے۔ دیکھتے ہیں کب تک ماما اور پاپا اپنی خاندان نوازی پر اَڑے رہتے ہیں۔''

دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

اگلی شام کو دونوں میاں بیوی مصباح کی موجودگی میں وجدان کو زمانے کی اونچ نیچ پر ناصحانہ لیکچر جھاڑ رہے تھے۔ وجدان سر جھکائے بیٹھا تھا۔ باپ سمجھ رہا تھا کہ وہ ندامت سے سر نہیں اُٹھا رہا۔ مصباح سمجھتی تھی کہ وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال رہا ہے۔ وجدان نے کن انکھیوں سے مصباح کو دیکھا، آنکھوں سے اشارہ کیا اور بغیر کچھ کہے بولے وہاں سے اُٹھ گیا۔

اس کے جانے کے بعد پاپا نے باوثوق لہجے میں کہا۔ ''لگتا ہے میرے بیٹے کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔''

ماما نے تائید کی۔ ''لگتا تو یہی ہے ورنہ وہ نچلا بیٹھنے والا نہیں ہے۔''

بہ مشکل دس منٹ گزرے تھے کہ مصباح کی خالہ اور خالو آن دھمکے۔ اُن کے چہروں پر برستی ہوئی وحشت اور برہمی خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی۔ پاپا نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے صدیق بھائی!''

ماما کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ''یا اللہ خیر!'' پھر اپنی بہن کا بازو تھام کر لرزتی ہوئی آواز میں پوچھنے لگیں ''آپ اور اِس وقت یہاں؟ خیریت تو ہے؟''

خالہ تڑخ کر بولیں۔ ''خیریت اپنے بیٹے سے پوچھیں جس نے دیدہ دلیری سے منگنی کی انگوٹھی ہمارے منہ پر کھینچ ماری ہے۔''

تعجب کے مارے ماما اور پاپا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ماما نے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ''کب؟''

''ابھی چند منٹ پہلے!'' خالو نے غصے سے کہا۔

خالہ نے باقاعدہ طور پر رونا شروع کر دیا۔ ''اگر بھری برادری میں تذلیل کرنا ہی مقصد تھا تو اپنے لوفر بیٹے کے ہاتھ انگوٹھی بھیجنے کے بجائے آپ خود آ جاتے۔ ہماری بے بسی کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور بدنامی کے اشتہار بانٹتے۔''

خالو نے ہونقوں کی طرح کھڑے سلطان علی کی نظروں کے سامنے کھلی انگلیوں والا ہاتھ لہرایا اور دانت پیس کر کہا۔ ''جب کوئی نہیں ملتی تھی تب آپ کہتے تھے کہ نورین مجھے اپنی مصباح سے بھی زیادہ پیاری ہے، اَب کوئی اور نظر آ گئی ہے تو فوراً ہی گرگٹ کی طرح آپ نے رنگ بدل لیا۔''

معاملہ بہت بگڑ گیا تھا۔ گفتگو میں لحہ بہ لحہ تندی شامل ہونے لگی۔ ماما اور پاپا کے چہروں پر شبہ لاچاری اور ندامت دیکھ کر مصباح زیادہ دیر تک وہاں بیٹھی نہ رہ سکی۔ آنکھوں میں آنسو لیے اُٹھ گئی۔ اپنے کمرے میں آئی۔ دیکھا، وجدان آنکھوں پر بازو رکھے بے حس و حرکت بیڈ پر دراز تھا۔ وہ صوفے پر نیم دراز ہوگئی۔ گراؤنڈ فلور سے اَبھی تک ملی جلی آوازیں ماحول کے غیر معمولی تناؤ کی خبر دے رہی تھیں۔

دونوں اپنی اپنی جگہ پر بے چینی محسوس کرتے رہے، خاموشی سے سوچتے رہے اور آتش فشاں کے پھٹنے کا انتظار کرتے رہے تاوقتیکہ نیند کی دیوی نے دونوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

ناشتے کی میز پر ہر آن دل دھڑکتا رہا مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔ پاپا نے ایک دُکھ بھری نگاہ وجدان پر ڈالی اور ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے ڈائننگ روم سے نکل گئے۔ وجدان نے عافیت کا سانس لیا۔ شام تک کے لیے خطرہ ٹل گیا تھا۔

ماما نے شکوہ کناں آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے پاپا تمام رات بیڈ روم میں ٹہلتے رہے ہیں، ایک پل بھی سو نہیں پائے۔''

مصباح نے کہا۔ ''کیا آپ بھی؟''

''ظاہر ہے۔ وہ جاگتے رہیں اور میں سو جاؤں، کیسے ممکن ہے؟''

وجدان نے کندھے اُچکا کر کہا، ''آپ ایک رات جاگے ہیں، آپ کی بات مان لینے کی صورت میں، مَیں تمام عمر جاگتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہوں گا۔''

''تم نے بہت بُرا کیا وجدان!'' ماما نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

''زندگی میں ایک ہی لمحہ ایسا آتا ہے جب انسان خود کو انگوٹھی بنا کر کسی کی انگلی میں پہنا دیتا ہے۔ اس میں بھی اپنی مرضی شامل نہ ہو تو پھر زندگی رائگاں چلی جاتی ہے۔'' مصباح نے دھیمے انداز میں کہا۔

''ہاں بیٹا! شاید ہم ہی سٹھیا گئے ہیں۔''

''نہیں ماما!'' وجدان نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''آپ ہمارے چناؤ پر اعتماد نہیں کرتیں، نہ ہی پاپا کرتے ہیں۔''

ماما برتن اُٹھا کر کھڑی ہوگئیں۔ ''تم ٹھیک ہی تو کہتے ہو۔ جب تم اپنی ننھی ننھی انگلیاں بجلی کے سوئچ بورڈ میں گھسانے کی کوشش کرتے تھے، جب چلتے ہوئے پنکھے کے پَروں کو پکڑنے لگتے تھے، جب گرم استری پر ہاتھ پھیرنا چاہتے تھے، جب ہیٹر کے سرخ اسپرنگ کو چھونے کے لیے مچل جاتے تھے تب بھی ہمیں تمہاری نظر اور صلاحیتوں پر اعتماد کرنا چاہیے تھا۔''

دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ماما آنسوؤں سے تر چہرہ لیے برتن اُٹھا کر کچن کی طرف چل پڑی تھیں۔ ندامت کا ایک گہرا احساس دِل میں جاگزیں ہوگیا۔ عجیب حالات سامنے آئے تھے۔ نظامِ قدرت ہے۔ ایک فضا میں پیدا ہوجانے والے خلا کو پُر کرنے کے لیے آندھی کسی اور علاقے کی ہوا کو گھسیٹ کر وہاں پہنچا دیتی ہے، پیچھے خلا پیدا کر دیتی ہے۔ محبت بھی ایسا ہی جذبہ ہے۔ مصباح ایسی جنت کی تعمیر کا تہیہ کیے بیٹھی تھی جس میں ہر طرف شہاب ہی شہاب دکھائی دیتا تھا اور اُس کے پہلو میں پُرشباب حور وہ خود ہی تھی، شہاب کے ہاتھ میں تھامے جاوداں مَے کے لبالب جام میں بھی اُسی کا عکس ٹھہرا ہوا تھا۔

❖❖❖

سندھ ساگر بپھر گیا تھا۔ شاید پھر کسی نے ''مویا ناگ'' (مردہ سانپ) کہہ کر اُسے ہڑبڑا کر اُٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو دِنوں میں ہی خاک آلود پانی کی سطح خاصی بلند ہوگئی۔ جنت کے ستون پر لگے پیمانے پر نگاہ پڑی تو پروفیسر وسیم بزدار کا دِل دھک سے رہ گیا۔ یقیناً سیلاب نچلے درجے کا نہیں تھا۔ ٹی وی آن کیا۔ موسمیات والے بتا رہے تھے کہ پانی کا بڑا ریلا میانوالی کے علاقے میں پہنچنے والا ہے۔ یہ اطلاع بھی دی جا رہی تھی کہ گزشتہ دس سالوں میں اتنا بڑا سیلاب نہیں آیا تھا۔

اُس نے بڑی احتیاط سے اپنی جنت کا دفاعی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا۔ اَبھی تک پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ شام تک دریا کے پانی میں درختوں کی بڑی بڑی شاخیں، مُردہ مویشی اور عام استعمال کی اشیا دکھائی دینے لگیں۔ سندھ ساگر کے پانی نے پہاڑوں سے نکل کر اپنا جوش اور غیظ دکھانا شروع کر دیا تھا۔

وہ خاصی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اپنی بے چینی کی وجہ بھانپنے میں بھی بری طرح ناکام ہو رہا تھا۔ مجبوراً اُس نے افتخار بیگ سے فون پر رابطہ کیا اور دریا کی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ افتخار نے کہا۔ ''بے فکر رہیں پروفیسر صاحب! جنت پانی کے پندرہ بیس فٹ کے ریلے کو اپنے نیچے سے گزارنے پر قدرت رکھتی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر نہ جانے کیوں دل گھبرا رہا ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو میرے گھر تشریف لے آئیں۔ چند دِن ماحول کی تبدیلی کا لطف اُٹھائیں، آبی ریلا گزرنے کے بعد واپس اپنی جنت میں چلے جائیں۔''

''نہیں۔ میں بے وفا نہیں ہوں۔''

''واٹر فلور میں لمبا سا بانس پڑا ہے۔ اُس کے ایک سرے پر چوب اور دوسرے پر کڑا نصب ہے۔ آپ بانس کو ستون پر لے جائیں۔ کڑے کو ستون کی ہُک میں پھنسا دیں۔ دھیان رکھیں کہ جب بھی کوئی بھاری شے بہتی ہوئی جنت کی طرف بڑھے، اُسے بانس کی مدد سے دھکیل کر پَرے کر دیں۔ کسی ٹوٹے ہوئے درخت یا کسی بھی بھاری بھرکم شے کو ستون یا جنت کے ساتھ اَٹکنا نہیں چاہیے ورنہ نقصان ہوسکتا ہے۔'' افتخار بیگ نے کہا۔

''موقعے پر یاد دلانے کا بے حد شکریہ!'' پروفیسر نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے دوسری احتیاطی تدبیر بھی یاد آ گئی ہے۔ میں نے اَبھی تک جنریٹر کو بند نہیں کیا۔ اَبھی بند کر دیتا ہوں۔''

''پانی میں اُترنے والی سیڑھیوں کے لیور کھینچ کر اُنہیں اوپر اُٹھا لیں۔ سیلاب کے دوران بہت زیادہ تعداد میں سانپ اور بچھو پانی میں بہہ کر آتے ہیں اور سُنا ہے کہ بہت زہریلے اور خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ جنت حوروں کے بجائے سانپوں سے بھر جائے۔'' افتخار نے ہنستے ہوئے کہا اور اجازت لے کر فون بند کر دیا۔

اندازہ تھا کہ بڑا ریلا اگلی صبح دس سے گیارہ بجے کے لگ بھگ جنت کے پاس سے گزرے گا مگر اُسے شب بھر نیند نہیں آئی۔ کبھی ستون پر کھڑا ہو کر بانس کی مدد سے بہتی ہوئی مختلف اشیا کو دھکیلتا، کبھی عرشے پر آ جاتا اور سست رَوی سے راہ داری کا چکر کاٹتا۔ جنت کی لائٹس آن تھیں۔ دریا بلفج نور بنا ہوا تھا۔

عجیب یہ تھا کہ اُسے ذرہ بھر تھکن یا بیزاری کا احساس نہیں تھا۔ وہ پانی کی بلند ہوتی سطح کے ساتھ ساتھ پرجوش ہوتا جا رہا تھا۔

سورج نکلا اور وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تاحدِ نگاہ پانی پھیلا ہوا تھا۔ غسل کیا، تازہ دم ہو کر چائے بنائی، ناشتا تیار کیا اور پیٹ پوجا کر کے دوبارہ دریا کی اٹھکیلیاں ملاحظہ کرنے لگا۔ پانی کی رفتار خاصی تیز ہوگئی تھی اور فضا میں عجیب سا شور گونجنے لگا تھا۔ دور کہیں انسانوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی ابھر رہی تھیں۔ وہ ریلنگ کو مضبوطی سے تھامے دریا میں بہتے ہوئے مویشی اور انسانوں کے استعمال کی اشیا کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا تھا، کیا ہوگیا؟ دریا ایسا ہی بے رحم واقع ہو رہا تھا کہ لوگوں کی برسوں کی جمع پونجی کو سمیٹ کر ان جانی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ اُسے کسی کی اجازت درکار نہیں تھی، کوئی خوف لاحق نہیں تھا اور نہ ہی اُس کے قلب میں کہیں جذبۂ ترحم موجود تھا۔

دس بجنے میں کچھ ہی وقت باقی تھا کہ اُسے دریا میں بہتی ہوئی پہلی انسانی لاش دکھائی دی۔ دور تھی تو کپڑوں کی گٹھڑی محسوس ہو رہی تھی، نزدیک آنے پر مردہ عورت کا رُوپ دھار گئی۔ وہ سیدھی ستون کی طرف آئی اور اَٹک گئی۔ پروفیسر لپک کر ستون پر چڑھا۔ بانس پر گرفت کانپ اُٹھی۔ بدقّت تمام اُس نے چوب لاش میں چبھوئی اور پوری قوت صرف کر کے اُسے مغرب کی جانب زور سے دھکیل دیا۔ لاش جنت کی فاؤنڈیشن سے رگڑ کھاتے ہوئے آگے نکل گئی۔ گزشتہ رات میں اُس نے کافی وزنی درخت اور گھریلو سامان دھکیلا تھا، کچھ نہیں ہوا تھا۔ ایک لاش نے اُسے پسینے میں شرابور کر دیا۔ سوچنے لگا۔ ''نہ جانے کون تھی بے چاری جو سندھو سیں کے غیظ و غضب کا شکار ہوگئی۔ ہاہ!''

آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر شمالی سمت میں بہت دور تک دیکھا۔ کوئی شے بہتی ہوئی دکھائی نہیں دی تو بانس پر سے گرفت ہٹا کر زور سے چیخا۔ ''اے سندھو سیں! آج تیری موج ہی موج ہے۔ اپنے دُشمنوں تک پہنچنے کی کوشش کر مگر ہائے! تو ایسا دلیر بھی واقع نہیں ہوا۔ تو اپنے ہی بچوں کو نگلنے والا سانپ ہے۔''

اچانک چونک پڑا۔ تقریباً دو میٹر لانبا مُشکی ناگ تیز رفتاری سے بل کھاتے ہوئے پانی کو چیر کر جنت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس نے برق رفتاری سے بانس تھاما۔ کڑا ہک سے نکالا اور عرشے پر کود گیا۔ جنت بُری طرح ڈول گئی۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے مستعدی سے ریلنگ تک آیا۔ سانپ اِس وقت جنت کی فاؤنڈیشن پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بار بار ناکام ہو رہا تھا۔ اُس نے پوری قوت سے بانس کی چوب ماری۔ وہ پلٹا کھا کر صاف بچ گیا۔ چھ سات وار خطا گئے تو پروفیسر نے ہانپتے ہوئے بانس اوپر اُٹھا لیا۔ انتظار کرنے لگا کہ وہ فاؤنڈیشن پر چڑھ کر ریلنگ تک آئے اور وہ بانس کی مدد سے اُسے کچل دے۔ سانپ بہ صد کوشش چڑھ نہ پایا تو جنت کے گرد پورا چکر کاٹ کر مختلف جگہوں پر سے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ بار بار کی ناکامی نے نہ صرف تھکا دیا بلکہ حوصلہ بھی توڑ دیا۔ ایسے میں پروفیسر کا وار چل گیا۔ چوب گردن سے کچھ نیچے یوں چبھی کہ پار ہوگئی۔ پانی کی سطح پر سرخی پھیل گئی۔ پروفیسر نے تڑپتے ہوئے سانپ سمیت بانس اوپر اٹھا لیا۔ خون کے چند قطرے اُس پر بھی گرے۔ کراہت کے مارے اُس نے فوراً ہی سانپ کو دریا میں پھینک دیا۔ سانپ کے جسم میں اَٹکی ہوئی چوب باہر نکلی تو وہ یکبارگی پوری قوت سے تڑپا۔ دو فٹ کی بلندی تک اُچھلا پھر بَل کھاتا لہراتا مغربی سمت میں تیرنے لگا۔ دس بیس گز کے فاصلے پر جا کر وہ بے ہوش ہوگیا۔

بانس کو ستون کے ہُک میں لٹکا کر اسٹور میں گیا۔ ہینڈی کیم میں کیسٹ فٹ کی۔ بیٹری لگائی اور کیمرا کندھے پر لٹکا کر ستون پر آ گیا۔ وہ پانی کے بلندر یلے کی یلغار کو نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا بلکہ اُسے ہمیشہ کے لیے محفوظ بھی کرنا چاہتا تھا۔ دور دور تک پانی کی سطح ہموار تھی۔

کیمرے کی ایل سی ڈی میں پانی کی موجیں دیکھتے ہوئے اچانک چونک پڑا۔ زوم اِن کیا۔ چونکنے کی وجہ جنت سے سو ڈیڑھ سو فٹ کے فاصلے پر سے گزرنے والا بڑا سا درخت تھا جس کی پھیلی ہوئی شاخوں پر عام استعمال کی چارپائی اَٹکی ہوئی تھی۔ پروفیسر کے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ عمومی طور پر سیلابی ریلے میں درخت الٹتے پلٹتے جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو اُن کی کروٹ بدلنے کی رفتار اتنی خطرناک ہوجاتی ہے کہ اُن کی لپیٹ میں آنے والے زیرِ آب چلے جاتے ہیں مگر عجیب ساخت کا یہ درخت کشتی کی طرح سطحِ آب پر ایک ہی رُخ سے تیر رہا تھا اور اُس میں اَٹکی ہوئی چارپائی پر بیٹھے ہوئے افراد محفوظ تھے۔ پروفیسر نے بہ غور دیکھا۔ سمجھ میں آیا کہ شیشم کے اُس درخت کی ہیئت ایسی تھی کہ پانی اُسے الٹ پلٹ نہیں سکتا تھا۔ اُس کے دونوں اطراف میں بازوؤں کی طرح شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایسے ہی وقت میں درخت گھوم گیا۔

درخت میں اَٹکی ہوئی چارپائی پر دو عورتیں اور چار بچے ایک دوسرے کے ساتھ چمٹ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ چونکہ وہ جنت کی مخالف سمت کی طرف متوجہ تھے اِس لیے جنت کو دیکھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی نہ پائے۔ مزید زوم اِن کرنے پر اُس نے دیکھا کہ ایک عورت کی جھولی میں دو تین سالہ بچہ بیماری یا بھوک کے باعث بے ہوش یا بہت زیادہ نڈھال ہو چکا تھا۔ اچانک اُس کے سینے میں پتھرائے ہوئے دِل میں درد جاگ اُٹھا۔ وہ لپک کر کچن میں گیا۔ پیراسیٹامول کا سیرپ، بریڈ کے دو پیکٹ، دودھ اور بسکٹوں کے چند ڈبے اُٹھائے اور اپنی ریموٹ کنٹرول بوٹ میں آ گیا۔

چند ہی منٹوں میں درخت کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں عورتیں اُس کی جانب متوجہ ہو چکی تھیں۔ بچے بھی بڑی دلچسپی سے اُس کی بوٹ کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک حد تک قریب آ سکتا تھا۔ زیادہ قریب ہونے پر خطرہ تھا کہ کہیں درخت رُخ پھیر کر بوٹ کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ اُس نے باری باری تمام ڈبے چارپائی پر پھینکے۔ پوچھا۔ ''بچہ نڈھال کیوں ہے؟''

ایک عورت نے سرائیکی زبان میں کہا۔ ''بچہ بھوک کی وجہ سے نڈھال ہے۔''

عورتوں نے دعاؤں کی جھولیاں پھیلا دیں۔ دعاؤں کے الفاظ پروفیسر کی سماعت تک نہیں پہنچ رہے تھے مگر اُسے سننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

عورتوں نے دعا کے ساتھ ساتھ اُس کی منت سماجت بھی کی کہ اُنہیں کسی طرح باہر نکال لیا جائے۔ پروفیسر نے اطراف میں نظر دوڑائی۔ پھر مایوسی سے سر ہلا کر بولا۔ ''چاروں طرف پانی ہے۔ میں تم لوگوں کو خشکی پر نہیں پہنچا سکتا۔ خدا سے دعا کروں گا کہ تم دونوں بچو، نہ بچو، بچے بچ جائیں۔''

اُس کی پُر اضداد فطرت سے بعید تھا کہ اُنہیں اپنی جنت میں لے جاتا یا اُن کے لیے مزید کوئی جتن کرتا۔ اُس نے جونہی بوٹ کا اسٹیئرنگ گھمایا، پانی کے بہاؤ کی طاقت کا اندازہ ہو گیا۔ پانی کے اتنے تیز بہاؤ میں عام کشتی اُلٹے رُخ پر نہیں چل سکتی تھی۔ بوٹ کی رفتار بھی نسبتاً کم تھی۔ دَس منٹ بعد وہ جنت کے بوٹ گیرج میں تھا۔ وڈیو کیمرے کی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ گیارہ بجنے والے تھے۔ خطرے کی گھنٹی بج اُٹھی۔ ریلا کسی دم پہنچا ہی چاہتا تھا۔

وہ ستون پر آ گیا۔ کیمرے میں سیلاب کے مناظر کو محفوظ کرنے لگا۔ کوئی بھینس کیسے زندگی طلب کرتی ہے، کسی بکری کا پیٹ پھول جائے تو کیسی لگتی ہے، کتے ڈبکیاں کھاتے کیسے بھونکنا بھول جاتے ہیں، وہ فلماتا رہا۔ پھر اس کام سے بھی جی اوب گیا۔

پروفیسر گزشتہ رات وقفے وقفے سے ٹی وی کی نشریات دیکھتا رہا تھا۔ بار بار حکومت کی طرف سے یقین دہانی کرائی گئی کہ سیلاب زدگان کی حفاظت اور اُنہیں پانی سے نکالنے کے لیے تمام بندوبست مکمل کر لیے گئے ہیں۔ پروفیسر بہتے ہوئے انسانوں، نعشوں، مویشیوں اور سامان کو دیکھ کر سوچنے لگا۔ ''کتنا جھوٹ بولا جاتا ہے۔ مجھے تاحدِ نگاہ پانی دکھائی دے رہا ہے، پانی کے عفریت سے بچانے والا کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ نہ جانے کن لوگوں کو سندھو سئیں کے غضب سے بچانے پر کروڑوں روپے کے فنڈ لٹا دیے گئے ہیں۔'' مشرق کی سمت میں منہ کر کے بلند آواز میں چیخا۔ ''اے میرے حکمرانو! کچھ نہیں کر سکتے ہو تو میری طرح خاموش ہو جاؤ۔ منافقت کی جھولی میں بیٹھ کر غریب کی ڈاڑھی کیوں نوچتے ہو؟''

وہ ہیجانی کیفیت میں کبھی اپنے مُرشد کو کوسنے دیتا، کبھی حکومت کو اور کبھی بہہ کر آنے والے لوگوں کو بُرا بھلا کہنے لگتا۔ جنت کے قریب سے جب ایک چھوٹی کشتی میں ننگے پنڈے والے لوری چپو لہراتے ہوئے گزرے تو اُس نے چیخ کر مقامی زبان میں کہا۔ ''کیا یہ طوفانِ نوح جیسا ہے جو سب کچھ غرق کر دے گا۔ تم بھی مٹی میں مل جاؤ گے، میں بھی، دُنیا بھی...... جو بھی سندھو دیوتا سے پیار کرے گا اور اِس کی گود میں اچھے دِن گزارے گا، وہ بچ جائے گا۔ جو نفرت کرے گا، اِس کی رگیں کاٹے گا، وہ مر جائے گا۔ یہ میں نہیں، میرا مرشد کہتا ہے۔''

ایک لمبی ریش والے سیاہ فام بڈھے نے باچھیں چیر کر کہا۔ ''تم اپنے مُرشد کی نہیں، اپنی بات کرو۔''

''میری بات تو صاف اور سیدھی سی ہے۔ ہر کسی کو سمجھ آ سکتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جس نے بھی سندھو سے پیار کیا، وہی اِس کی برہمی کا شکار ہوا۔ ہر کوئی کہتا ہے، کیا مُہانے، کیا گھاڑو، کیا لوری، سب یہی کہتے ہیں کہ سندھو جنت ہے۔ کوئی یہ کیوں نہیں سوچتا کہ جنت ہمیشہ مرنے کے بعد ملتی ہے۔''

لوریوں نے مل کر 'واہ سائیاں' کا نعرہ لگایا اور چپو فضا میں بلند کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اچانک فضا میں نامانوس سی بو پھیل گئی۔ شور میں بے تحاشا اضافہ ہو گیا۔ یوں لگنے لگا جیسے کوئی طوفان آنے والا ہو۔ اُس نے ستون کی آہنی ریلنگ کو تھام لیا۔ شمالی جانب دیکھا تو سارے بدن کا خون چہرے میں سمٹ آیا۔ پانی کا خونی ریلا آن پہنچا تھا۔ دور، بہت دور، پانی کی ایک چادر زمین سے اُٹھ کر فلک تک جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ درختوں کے درخت خوفناک آوازوں کے ساتھ چٹ ہو رہے تھے۔ اضطراب اور خوف کی لہر پورے بدن میں پھر گئی۔ چند ہی لمحوں میں شور اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ اُسے اپنے چیخنے چنگھاڑنے کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اُس کی جنت اِس طوفانی لہر کا مقابلہ

نہیں کر سکے گی۔

یہ یقین موت کا سندیسہ تھا۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی جنت کو تباہ و برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس کے پاس بچاؤ کا وقت نہیں رہا تھا۔ ایسے میں افتخار بیگ کا کہا ہوا ایک جملہ یاد آ گیا۔ ''اگر پانی ستون سے اونچا ہوتا دکھائی دے تو ستون کو چھوڑ کر جنت کی چھت پر چلے جائیں۔ ستون ڈوب سکتا ہے، جنت نہیں ڈوب سکتی۔''

اُس نے بانس کو چھوڑا اور بجلی کی سی تیزی سے عرشے پر کود گیا۔ جسم کی پوری قوت کو بروئے کار لا کر بھاگتے ہوئے زینوں تک آیا۔ چند لمحوں میں ہی وہ چھت پر پہنچ کر ریلنگ کو مضبوطی سے تھام چکا تھا۔ پانی کی چادر نصف میل کے فاصلے پر پہنچ چکی تھی۔ اُس کی اُٹھان اور درختوں کے ٹوٹنے اور اکھڑنے کی آوازوں نے پروفیسر پر موت کی سی کیفیت طاری کر دی۔ کیمرا اُس کے کندھے سے لڑھک گیا اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنی طرف بڑھتی ہوئی موت کو دیکھنے لگا۔

دُنیا میں اپنی جنت بنانے والے کو بخوبی علم تھا کہ جنت ہمیشہ مرنے کے بعد ملتی ہے۔ اُسے یہ علم نہیں تھا کہ زندگی میں ملنے والی جنت محض ایک بہلاوا ہوتی ہے۔

❖❖❖

سلطان علی نے محسوس کیا کہ اُس کا بڑھاپا تین جوانیوں کے سامنے کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ اُس نے افتخار اور نورین کو اپنے دُکھ میں شامل کر لیا۔ اُن سے مدد طلب کرتے ہوئے اُسے یقین تھا کہ وہ وجدان اور مصباح پر خاندانی تعلقات کی اہمیت کو ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ چونکہ نورین وجدان سے بات نہیں کر سکتی تھی اِس لیے دونوں کے درمیان یہ طے پایا کہ افتخار وجدان کو سمجھائے گا، نورین مصباح کا دماغ ٹھکانے لانے کی کوشش کرے گی۔ افتخار نے وجدان کو اعتماد میں لیتے ہوئے سمجھایا۔ ''دیکھو وجدان! زندگی اتنی بھی عام شے نہیں کہ اِسے بچگانا فیصلوں کی نذر کر دیا جائے۔''

وجدان نے کہا۔ ''مگر یہ ایسی بھی نہیں کہ اِسے اپنی خواہش پر نثار کر دیا جائے۔''

''تو پھر کیسی ہے؟''

''جیسی بھی ہے مگر جیسی تم کہہ رہے ہو، ویسی ہرگز نہیں ہے۔'' وجدان نے کہا۔ ''بھائی! میں جانتا ہوں کہ تمہیں پاپا نے میرے پیچھے لگایا ہے مگر کان کھول کر سن لو۔ اگر دُنیا میں کوئی شخص پروفیسر کو اپنی جنت میں جا کر رہنے سے روک نہیں پایا اور اُس نے بھری پُری دُنیا کو اپنی خواہش پر قربان کر دیا تو میں کیوں اپنی مرضی نہیں کر سکتا؟ تم نے ہی تو مجھے کہا تھا کہ پروفیسر اُن چند ایک خوش نصیبوں میں سے ایک ہے جس نے جو چاہا، حاصل کر لیا۔ میں بھی خوش نصیبوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوانا چاہتا ہوں۔''

''تم نے اِس رُخ پر نظر نہیں دوڑائی کہ پروفیسر کا دُنیا میں کوئی نہیں جبکہ تم ایک مربوط خاندان کے ساتھ وابستہ ہو۔'' افتخار بیگ کے لہجے میں مخصوص ٹھہراؤ تھا۔

''کیا یہ خاندان ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا؟''

''کیوں نہیں؟'' افتخار بیگ کو اُس کی سوچ پر افسوس ہوا، ''تمہارے پاپا کو خاندان نے کبھی اکیلا چھوڑا ہے جو تمہیں خود سے علیحدہ کر دیا جائے گا۔ شاید تم احساسِ کمتری کا شکار ہو رہے ہو؟''

''نہیں۔ اگر میرا خاندان میرے ساتھ مخلص ہے اور کبھی تنہا چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تو اسے میری خواہش کو تسلیم کرنا چاہیے۔''

دونوں ہوٹل کی ایک ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھے اپنا اپنا مقدمہ لڑ رہے تھے۔ ایسے میں دوسری جانب ہذا کراتی ٹیم مصباح کے کمرے میں ڈیرا جمائے بیٹھا تھا۔ نورین اور صادقہ نے مصباح کو گھیر رکھا تھا۔ نورین اُسے سمجھا رہی تھی۔ ''دیکھو مصباح! کیا عمران بھائی کی پسند انداوان ہماری محبت کو شیئر کر سکے گی؟ وہ اُس کمیونٹی سے تعلق رکھتی ہے جہاں فیملی ایسوسی ایشن کا رواج نہیں پایا جاتا۔ پرندوں کی طرح پَر نکلنے پر اُڑ جانے والے لوگ محبت کو کیا جانیں، ایک دوسرے کے جذبات کو کیا سمجھیں؟''

مصباح نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ عمران بھائی کا مسئلہ ہے، میرا یا تمہارا نہیں۔''

''کیا وہ ہمارا کچھ نہیں لگتا؟''

صادقہ نے کہا۔ ''باجی! مجھے پتا چلا ہے کہ آپ عمران بھائی کی اندھا دھند حمایت کر رہی ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟''

اُس کی نظروں کے سامنے انداوان کی تصویر لہرا گئی۔ دل میں بولی۔ ''ہے کوئی اِس کے جیسا تو سامنے آئے۔ وہ اپنی تمام تر خوبصورتی سمیت عمران کی زندگی میں آئے گی تو شہاب کا پُر کیف ساتھ مجھے میسر آ سکے گا۔ تم لوگ سمجھ نہیں سکتے کہ میں اپنے بھائی کے لیے نہیں، اپنے شہاب کے لیے لڑ رہی ہوں۔'' باری باری دونوں کو مسکرا کر دیکھا، بولی۔ ''تم لوگوں نے انداوان کو دیکھا نہیں ہے، اگر دیکھ لو تو تم بھی وہی کچھ کہنے لگو جو میں کہہ رہی ہوں۔''

نورین نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''کیا وہ آسمان سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُتری ہے؟''

''آسمان سے ہر کوئی اُترتا ہے، اُس نے تو تمہارے خالہ زاد کو ایک نظر دیکھ کر شیشے میں اُتار لیا ہے۔''

''کیا تمہارے گھر سے شروع ہونے والی روایت خاندان کو تنکا تنکا نہیں کر دے گی؟''

''نورین! تم ایک چھوٹی سی بات کو خوامخواہ دل پر لے رہی ہو۔ کیا ہوا جو وجدان نے تمہارے ساتھ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اُس سے بہتر مرد اِس معاشرے میں موجود ہیں۔ آج وہ وقت نہیں کہ ماں باپ نے جس کھونٹے سے باندھنے کا فیصلہ کر دیا، بچوں نے سر جھکا کر طوق گلے میں ڈال لیا۔ میں جانتی ہوں کہ سدرہ تم سے زیادہ خوبصورت نہیں، اتنے بڑے خاندان کی بھی نہیں مگر اِس کا کیا کیا جائے کہ وجدان کو اُس سے زیادہ اچھی کوئی لڑکی دُنیا میں دکھائی نہیں دیتی۔'' مصباح نے کہا۔ ''تم بہت اچھی ہو۔ خود کو پستی میں مت دھکیلو اور یہ ثابت کرو کہ اگر تمہیں وجدان نے قبول نہیں کیا تو تم بھی اُسے جوتے کی نوک پر رکھتی ہو۔''

نورین کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ سر جھک گیا۔ کن اکھیوں سے صادقہ کو دیکھ کر بولی۔ ''جسے آدھی عمر پلکوں پر بیٹھائے رکھا ہو اُسے کیسے جوتے کی نوک پر بٹھایا جا سکتا ہے؟''

مصباح کے دل پر گھونسا لگا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ''تم شدت پسند واقع ہو رہی ہو نورین!''

''ہاں اور شاید وجدان اور عمران بھائی بھی.....'' وہ اپنا جملہ مکمل نہیں کر پائی۔ گلا رُندھ گیا۔ گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی۔ دونوں اُسے چپ کراتے ہوئے ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

اُن کے مایوس لوٹنے کے بعد اُس نے فون پر عمران کو اپنی کارگزاری کی رپورٹ دی۔ وہ پریشان ہو گیا۔ بولا۔ ''یہ تم دونوں کیا کرتے پھرتے ہو؟ میں نے ایسا کرنے کا تو ہرگز نہیں کہا تھا۔''

''سخت رویہ اپنائے بغیر کچھ حاصل ہوتا دکھائی نہیں دیتا بھائی!''

''مگر پھر بھی.....''

وہ بات کاٹ کر بولی۔ ''اگر مگر کچھ نہیں۔ ہم ہر قدم سوچ سمجھ کر اُٹھا رہے ہیں، تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

عمران نے بادلِ ناخواستہ وجدان کے منگنی توڑنے کے عمل کو برداشت کیا تھا۔ سدرہ کے بارے میں سنا تو یکبارگی اُسے احساس ہوا کہ معاملہ خاصا بگڑ چکا ہے مگر اس کی کمزوری مزاحمت مصباح کی دلیلوں کے مقابلے میں زیادہ دیر ٹھہر نہ پائی۔ وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے فکرمند لہجے میں بولا۔ ''اچھا خیر! میں اتنی دور بیٹھا ہوا ہوں کہ چاہوں بھی تو کچھ نہیں کر سکوں گا۔ جو مناسب خیال کرو، وہی راہ اختیار کرو مگر پاپا اور ماما کو اتنا بھی ہرٹ نہ کر دینا کہ ہم تینوں تمام عمر پچھتاتے رہیں۔''

آنے والے دو تین دِنوں میں ہی سلطان علی پے در پے ملنے والی ناکامیوں پر بجھ سا گیا۔ شکست کا احساس کمر توڑ رہا تھا۔ ایک رات میں اُس نے سبھی کو اپنے پاس بلا لیا۔ مصباح نے باپ کو دیکھا تو جگر کٹ کر رہ گیا۔ ارادہ پل بھر کے لیے ڈانواں ڈول ہوا مگر محبت کا جذبہ آن کی آن میں غالب آ گیا۔ پاپا نے سب سے پہلے اُسے ہی مخاطب کر لیا۔ ''مصباح! کیا تم تینوں بہن بھائیوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ میں یا تمہاری ماما تمہاری خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ بن رہے ہیں؟''

وہ سر جھکا کر بولی۔ ''پاپا! ہم نے تو یہ سوچا تک نہیں۔''

ماما کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر پاپا نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ بولے۔ ''میں اِس خاندان کا بادشاہ ہوں۔ ہمیشہ سرینڈر کرنے کا عذاب سربراہ کو ہی جھیلنا پڑتا ہے۔''

وجدان اور مصباح کے سر جھکے ہوئے تھے۔

وہ بولے۔ ''دیکھو بیٹا! نورین کو بہو بنانے کا فیصلہ غلط تھا۔ یہ کڑوی گولی ہمیں بہت پہلے نگل لینا چاہیے تھی کہ اِس گھر میں آنے والی عورتوں کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری خالہ کا گھرانا ہم سے قطع تعلق کر چکا ہے اور میں نے بھی اِس حقیقت کے ساتھ مفاہمت کر لی ہے کہ مجھے اپنے خاندان کی نہیں، تمہاری ضرورت ہے۔''

وہ کچھ دیر کو رُکے۔ مصباح نے دیکھا۔ زندگی میں دادی کے انتقال پر پاپا کو غم سے نڈھال دیکھا تھا یا آج دیکھ رہی تھی۔

''عمران کو اندا اور وجدان کو سدرہ مبارک ہو۔ میں دونوں کے سر پر پیار کا ہاتھ رکھوں گا، دل اور آنکھ میں جگہ دوں گا۔ مصباح تم فون کر کے اپنے بھائی کو خوش خبری سنا دینا۔'' پل پل چہرہ اور لہجہ تغیر پکڑ لیتا تھا۔ سر جھکا کر بولے۔ ''شریعت بیٹے اور بیٹی میں انصاف کا تقاضا کرتی ہے۔ مجھے بھی انصاف کرنا چاہیے۔ مصباح! تمہارے دونوں بھائیوں نے من مانی کر لی ہے۔ تم بھی کر سکتی ہو۔ جسے کہو گی، تمہیں دعاؤں کے ساتھ اُس کے ساتھ رخصت کر دوں گا۔''

مصباح کا حال دگرگوں ہو گیا۔ سوچنے لگی۔ ''ہائے! میں کیسی بدقسمت ہوں۔ پاپا جیسے عظیم انسان کو اس حد تک غم زدہ کر چکی ہوں کہ اُنہوں نے اپنی اَنا کو بھی پس پشت ڈال دیا ہے۔ مجھے ہرگز ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

کچھ کہنے کے لیے لب تھرتھرائے۔ دل نے کمزوری پکڑ لی۔

اپنی دُنیا کو اجڑتا ہوا دیکھ نہیں سکتا تھا، فوراً کود پڑا۔ خاموشی سے سمجھانے لگا۔ ''تم ایک بے وقوفی کے بعد دوسری بے وقوفی کرنے چلی ہو نادان لڑکی! تمہیں رونے کے بجائے اپنی خوش بختی پر جشن منانا چاہیے تھا کہ سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی ٹوٹنے سے بچ گئی۔ نافرمانی اور من مانی کا الزام بھائیوں پر آ رہا ہے، تمہیں مفت میں منزلِ مراد مل رہی ہے..... خاموش بیٹھی رہو۔ آج نہیں تو کل، تمہارا باپ سنبھل جائے گا، مفاہمت کر لے گا اور ماہ دو ماہ بعد اُسے یاد بھی نہیں رہے گا کہ اُس کی اولاد نے اُس کے فیصلے پر شدید نوعیت کی مزاحمت کی تھی۔''

لب بستہ اُٹھی۔ روتے ہوئے باپ سے لپٹ گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر یوں روئی کہ پاپا کو بھی رُلا گئی۔ وجدان سر جھکائے، ماما سے نظریں چراتے ہوئے بیڈ روم سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ فون پر رابطہ کر کے اپنی سدرہ کو خوش خبری دینے لگا۔

سلطان علی اپنی بیٹی کو بہت چاہتا تھا۔ بچپن سے اُس کی حمایت میں بہت دور تک نکل جاتا تھا۔ اُس کی شکایت پر کان دھرتا تھا، دونوں بیٹوں کی شکایت پر دھیان تک نہیں دیتا تھا۔ جوان بیٹی سینے سے لگی ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ دل پسیج گیا۔ کھلی زلفوں کو چومتے ہوئے پیار سے کہنے لگا۔ ''میری بیٹی! میری صبو! کیوں روتی ہو؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں تمہاری آنکھ میں آنسو دیکھ کر بیمار پڑ جاتا ہوں، تم دُکھوں کی ندیاں بہانے پر تلی ہو۔ تمہارا کوئی گناہ نہیں، گناہ تو تمہارے بھائیوں نے بھی کوئی نہیں کیا۔ بھلا کسی کو پسند کر لینا اور اُسے دنیا کے ہر رشتے، ہر فرد پر ترجیح دینا کوئی غیر فطری عمل ہے؟ نہیں میری جان! انسان بسا اوقات بہت بے اختیار ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی تو نہ چاہتے ہوئے ہمیشہ تمہیں فوقیت دی ہے۔ اپنی بیوی پر، اپنے بیٹوں پر، اپنے خاندان پر.....''

ماما کندھا سہلانے لگیں۔ بولیں۔ ''آپ روتے ہوئے ہرگز اچھے نہیں لگ رہے۔''

پاپا نے جیسے سنا ہی نہیں، آنسوؤں سے رُندھی ہوئی آواز میں بولتے گئے۔ ''یاد کرو بیگم! وہ رات جب مصباح بلاوجہ رو رہی تھی تو میں اِسے بہلانے کے لیے کندھے پر ڈالے شب بھر گلیوں میں، شہر کے پُررونق بازاروں میں پاگلوں کی طرح ٹہلتا رہا تھا۔ یاد ہے ناں؟ وہ شب بھی یاد کرو جب عمران کو بے بی سائیکل پر سے گرنے کے باعث چوٹیں لگی تھیں اور وہ سونے کے بجائے ریں ریں کر رہا تھا۔ میں مصباح کو لے کر ڈرائنگ روم میں سونے کے لیے چلا گیا تھا..... مصباح! میں زندگی میں صرف اپنی ماں کی تکلیف پر یا پھر تمہاری پریشانی میں جاگا ہوں نا۔''

مصباح کو اعتراف تھا۔ دُکھی ہونے کے ساتھ ساتھ نادم بھی ہو رہی تھی۔ دل سمجھ رہا تھا کہ وہ بازی ہارنے چلی ہے۔ اتنا اچھا موقع شاید پھر کبھی میسر آئے، فوراً زبان کو اپنی گرفت میں لے کر خود بولنے لگا۔ ''پاپا! وہ شہاب.....''

مصباح کے ریشمی بالوں میں سرکتا ہوا سلطان علی کا ہاتھ اچانک رُک گیا۔ آنکھیں ٹھہر سی گئیں۔ اس کے لفظوں پر اعتبار کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر کانوں پر بھی مکمل بھروسا تھا۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''نہیں مصباح! اِس ایک لفظ کے آگے کچھ مت کہنا۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ تم کیا مانگ رہی ہو، جاؤ! شہاب جو کوئی بھی ہے، تمہارا ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

ماما نے چونک کر اپنے مجازی خدا کو دیکھا۔ وہ پہلے تو ایسا نہیں تھا؟ شروع شروع میں سارا دن اکیلی رہنے کے باعث بور ہو جاتی تھی۔ بڑے ہی چاؤ سے اُس نے ایک وصالِ شب میں ملازمت کی اجازت مانگی تھی جس کے جواب میں کئی دن تک اُسے آگ کی لپٹوں جیسے سوالات پر اشک بہانا پڑے تھے۔ آج بیٹی کی اَدھوری فرمائش پر مائل بہ سخاوت سلطان علی بہت مختلف اور عجیب دکھائی دے رہا تھا۔

❖❖❖

پانی کی بلند لہر بس کسی پل پہنچنے والی تھی۔ اچانک اُسے بے دھیانی میں سرزد ہو جانے والی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ اُس نے الیکٹرک جنریٹر پاور ڈآف کر دیا تھا مگر کنٹرول روم میں جا کر جنت کی تمام پاور سپلائی کو منقطع کرنے والا مین سوئچ کا لیور نہیں کھینچا تھا۔ اَب اُس کے پاس اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ وہ کنٹرول روم تک پہنچ سکتا۔

وہ سانس روکے ریلنگ کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھامے کھڑا تھا۔ پھر اچانک جیسے اُس کی نظر دھندلا گئی ہو۔ ہر طرف پانی ہی پانی دکھائی دینے لگا۔ ریلے نے آن کی آن میں کنکریٹ کے بلند و بالا ستون کو نگل لیا۔ پانی کے چھینٹے بہت اوپر تک گئے۔ عرشے پر کافی سارا پانی آن گرا۔ جنت کو جھٹکا لگا اور وہ لمحہ بھر میں دس فٹ کے لگ بھگ اونچی اُٹھ گئی۔ بری طرح ڈولتی رہی۔ پانی ''شپ ڑپ'' کی تیز آواز سے نیچے سے گزرنے لگا۔ جنت میں اُمڈ آنے والے پانی نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ کنٹرول روم میں تڑتڑاہٹ کی مخصوص آواز گونجی اور اُس کے ساتھ ہی کئی ننھے ننھے دھماکے سنائی دیے۔ پروفیسر کا چہرہ بجھ گیا۔ اُس کا بجلی کا نظام ناکارہ ہو گیا تھا مگر اِس وقت اُس کی تمام تر توجہ اپنی جان اور جنت کو بچانے پر مرکوز تھی۔

اچانک لہر دم توڑ گئی۔ جنت ''شپ'' کی تیز ناگوار آواز کے ساتھ نیچے آئی۔ ایسے میں پروفیسر اپنا توازن اور گرفت برقرار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہ رکھ سکا اور لڑھکتے ہوئے عقبی ریلنگ میں آ کر اٹک گیا۔ اگر غیر ارادی طور پر اُس کا پیر ریلنگ میں اٹک نہ جاتا تو وہ ریلے کے ساتھ ہی آناً فاناً میلوں دور نکل چکا ہوتا۔ ریلنگ نے اُس کا وزن بہ مشکل ایک یا دو منٹ تک سہارا پھر زوردار آواز کے ساتھ ریلنگ کی فاؤنڈیشن کا چوبی تختہ اکھڑ گیا۔ جنت کا اگلا حصہ اوپر کی جانب اُٹھا، پھر یک لخت نیچے گر گیا۔ وہ آگے کی جانب لڑھک آیا۔ ایسے ہی وقت میں اُسے زندگی کی قیمت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

ایک درخت ستون کے ساتھ اٹک گیا۔ پانی کا دباؤ نسبتاً کم ہو گیا۔ دس منٹ تک زندگی اور موت کی کش مکش جاری رہی، پھر ہر آنے والے منٹ میں زندگی کا گراف بلند ہونے لگا۔ موت کی لکیر نیچے کی طرف جھکنے لگی۔ پانی کی سطح اَب بھی کافی بلند تھی مگر خطرہ ٹل گیا تھا۔ پروفیسر تیزی سے ہلکورے لیتی جنت کی عقبی ریلنگ تک آیا۔ پاؤں کی ٹھوکر سے اکھڑے ہوئے تختے کو اپنی جگہ پر بٹھایا اور فرسٹ فلور پر آ گیا۔ صحن نما عرشے میں کافی سارا پانی بھر گیا تھا۔ سرِ دست پانی نکالنے کا سسٹم غیر فعال تھا۔ وہ پانی میں سے گزر کر ٹاور پر چڑھا۔ دیکھا کہ مورچہ سوراخوں تک بھر چکا تھا۔ بجلی کی تاریں جل چکی تھیں۔ واٹر پمپ میں کئی شاخیں پھنسی ہوئی تھیں جنہیں فوری طور پر نکالنا ضروری نہیں تھا۔ ٹاور کے ساتھ اَٹکے ہوئے درخت سے جان چھڑانا بہت ضروری تھا۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہی درخت جو چند منٹ پہلے بہت اچھا لگ رہا تھا، وہی جان بچ جانے پر بُرا لگنے لگا تھا۔

درخت سے جان چھڑانے میں کافی سارا وقت لگ گیا۔ فارغ ہوا تو اپنے اطراف میں پانی کا انسانی جانوں اور مال واسباب سے بھرا ہوا شکم دیکھ کر فرطِ کرب سے بلبلا اُٹھا ”اے کم بخت ساگر! کیا تیری پیاس ایک دو انسانوں کے خون سے بجھنے والی نہیں ہے جو تو نے بھری پُری بستیاں اُجاڑ کر رکھ دی ہیں۔ یہ کیسی تشنگی ہے جو غریبوں کی شہ رگ چوسنے سے سیراب ہوتی ہے؟ کیا تجھ پر امیروں کا خون حرام قرار دے دیا گیا ہے؟“

پانی کی سطح بتدریج کم ہو رہی تھی مگر تاحدِ نگاہ دکھائی دینے والے پانی کو دیکھ کر پروفیسر کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ پانی میں جا بہ جا گھروں کی بکھری ہوئی چھتوں کا ملبا، چارپائیاں، مویشیوں کے بے جان وجود اور کہیں کہیں آڑی ترچھی بہتی ہوئی انسانی نعشیں جنہیں دیکھ کر ذہن چند ثانیوں کے لیے کام کرنا چھوڑ دیتا تھا۔ کسی جانب سے ڈکراتے مویشیوں کی سماعت شکن آوازیں، کہیں سے اُبھرتی، ڈوبتی، آخری جدوجہد میں مصروف عمل انسانی زندگی..... وہ سوچنے لگا۔ ”یہ کیسی جنت ہے جس کے اطراف میں چاروں طرف موت اور جہنم کے شعلے آسمان تک بلند ہوتے دکھائی دیتے ہیں؟“

پھر اچانک اُس کے منہ سے قہقہہ اُبل پڑا۔ کوئی اُسے اِس کیفیت میں دیکھتا تو یقیناً پاگل قرار دیتا۔ ہنستے ہنستے اُس کی آنکھیں تر ہو گئیں۔ بدن پہلے ہی تر تھا۔ دونوں باتیں آسمان کی طرف بلند کر کے منہ اُٹھایا اور حلق پھاڑ کر چیخا۔ ”دیکھ لے پروردگار! یہی کنگر، یہی غریب مُہانے جنہیں درست تلفظ کے ساتھ کلمہ گوئی کا ہنر بھی نہیں آتا مگر یہ لوگ جب بھی بیڑی کو پہلی مرتبہ پانی میں اُتارتے ہیں تو تیرا نام لیتے ہیں۔ کہتے ہیں تو ہی اِس نیا کو پار لگانے والا ہے، ہم کچھ نہیں ہیں۔ جو کچھ بھی ہے، تو ہی ہے مگر جس پانی پر اِن کی گزران ہوتی ہے، وہی پانی اِن کے لیے تیزاب بن جاتا ہے اور جو لوگ.....“

وہ جسے سُنا رہا تھا، وہ یقیناً سن رہا تھا۔ وہ دل کی آواز بھی سننے کی قدرت رکھتا تھا۔ اندیشوں میں بیتنے والی گزشتہ تمام رات کا رت جگا بدن توڑنے لگا تھا۔ کافی دیر سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ خود کو سنبھال کر فرسٹ فلور کا جائزہ لینے لگا۔ بیڈ روم اور اسٹور کا فرش کیچڑ آلود ہو چکا تھا۔ پانی نے بیڈ روم کا قالین خراب کر دیا تھا۔ جب کنٹرول روم میں گیا تو وہاں گھٹنوں تک پانی کھڑا تھا۔ تمام آلات ناکارہ ہو چکے تھے مگر اسٹڈی روم محفوظ رہا تھا۔

دانت پیس کر بڑبڑانے لگا۔ پہلے جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، جان بچی تو جنت کی پامالی پر غصہ آنے لگا۔ جھنجلاتے ہوئے کچن میں آیا۔ چائے بنانے لگا۔ چائے پی کر عرشے پر آیا۔ اگر الیکٹرک سسٹم کارگر رہتا تو وہ ایک بٹن دبا کر سارا پانی نکال دیتا۔ اَب بالٹیاں بھر کر دریا میں پھینکنے کی مشقت اُٹھانا پڑی۔ نصف گھنٹا بیت گیا۔ اِس دوران جنت کے قریب سے گزرنے والے کئی ڈوبتے ہوئے افراد نے اُس سے مدد مانگی مگر اُس نے کسی پر توجہ دینے کی زحمت نہیں کی۔ محکمۂ موسمیات کی پیش گوئی کے مطابق اَب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ شام تک جنت کی صفائی اور دیکھ بھال میں مصروف رہا۔ شام کو تھک کر اپنے کام کا تنقیدی انداز میں جائزہ لیا۔ سوائے بجلی کے نظام کے سب کچھ بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ اُسے اندازہ تھا کہ جنت کی شاید تمام وائرنگ ازسرِنو کرنا پڑے۔

چھت پر آیا۔ لوہے کے پائپوں والی چارپائی غائب ہو چکی تھی۔ اُس کا غم کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اَب تک تو وہ تونسہ بیراج کی یاترا کر چکی ہوگی۔ ریلنگ کے ساتھ کمر ٹکا کر

بیٹھ گیا۔ موبائل بج گیا تھا، ہینڈی کیم میں پانی گھس گیا تھا۔ اتنا علم رکھتا تھا کہ ایسے میں اگر کیمرے کو آن کرے گا تو اُس کا تمام تر سرکٹ شارٹ ہو جائے گا اور وہ مکمل طور پر ناکارہ ہو جائے گا۔ شاید مرمت کے قابل بھی نہ رہتا۔ موبائل پر افتخار بیگ سے رابطہ کیا۔ چھوٹتے ہی بولا۔ ”افتخار بیٹا! پانی کے ریلے نے جنت میں تباہی مچا دی ہے۔ مجھے مین سوئچ بند کرنے کی مہلت نہیں ملی اور پانی نے جنت کی تمام وائرنگ جلا کر راکھ کر دی ہے۔“

افتخار نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”جنریٹر کی کیا پوزیشن ہے؟“

”میں اُس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”چلا کر دیکھا ہے؟“

”نہیں۔ وہ پانی میں ڈوب گیا تھا۔ آن کرنے سے ڈرتا ہوں، کہیں وہ بھی داغِ مفارقت نہ دے جائے۔“

”کنٹرول روم کی کیا پوزیشن ہے؟“

پروفیسر نے کنٹرول روم کی صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد فرداً فرداً جنت کے ہر حصے کی رپورٹ دی۔ یہ بھی بتایا کہ ایک کرسی، ایک چارپائی اور چند برتنوں کے علاوہ ہر چیز محفوظ رہی ہے۔ افتخار بیگ نے پوچھا۔ ”میرے لیے کیا حکم ہے؟“

”وقت نکالو اور آ کر میری جنت کو وہی شکل دے جاؤ جو پانی آنے سے پہلے تھی۔“ پروفیسر نے اُمید بھرے لہجے میں کہا۔

”کیا آپ کے پاس پہنچنے کا راستہ ہے؟“ افتخار بیگ نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ تم بہ آسانی یہاں نہیں پہنچ سکتے۔“

”تو پھر؟“

”انتہائی مخدوش صورتِ حال ہے۔ موٹر بوٹ پتن تک جا سکتی ہے۔ پتن دکھائی نہیں دیتا۔ پتن کے پار جہاں تک نظر جاتی ہے، پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہے۔ ایسے میں سوائے دو چار روز صبر کرنے کے شاید کچھ نہیں کیا جا سکتا۔“ پروفیسر نے مشرقی جانب دور تک چمکتے ہوئے پانی کو دیکھتے ہوئے مایوسی سے کہا۔

”آپ کسی طرح وہاں سے نکل آئیں اور چند دن شہر میں رہ لیں۔ پانی اُترنے پر اکٹھے جائیں گے۔“ افتخار نے مشورہ دیا۔

وہ بولا۔ ”یہ ناممکن ہے۔ میری عدم موجودگی میں مور اور کیہل میری جنت کے حصے بخرے کر لیں گے۔ ویسے بھی امدادی ٹیمیں آج یا کل یہاں پہنچ جائیں گی۔ وہ امداد کے نام پر محض لوٹ مار کرنے کے لیے یہاں تک آتی ہیں۔ مجھے اِن سفید پوش لٹیروں سے اپنی جنت کو بچائے رکھنے کے لیے یہاں رہنا ہوگا۔ کوئی بات نہیں، دو چار دن بجلی کے بغیر کاٹ لوں گا۔“ پروفیسر نے کہا۔

”اوکے سر! میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔“ افتخار بیگ نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

چند ہی لمحوں کے بعد ڈاکٹر اَشو لال کی کال آ گئی۔ وہ پروفیسر کے بارے میں خاصا متفکر تھا۔ مکمل احوال لے کر کچھ مطمئن ہوا۔ بولا۔ ”سَیں میڈا! تم نے بڑی غلطی کی جو حقیقی جنت کے حصول کے لیے کچھ نہیں کیا۔ یہی تو موقع تھا جو تمہیں خدا کے بہت قریب کر سکتا تھا۔“

وہ ہنسا۔ ”مرشد! یہ کتابی باتیں ہیں۔ تم نے سندھ ساگر کی یاترا ہمیشہ اُن دنوں میں کی ہے جب یہ مردہ ناگ کی طرح چپ چاپ لیٹا ہوتا ہے۔ آج تم یہاں ہوتے، مرتے ہوؤں کی بے بسی دیکھتے، اُن کی فریادیں سنتے تب تمہیں پتا چلتا کہ حقیقی دُنیا اور لفظوں کی دُنیا میں کتنا تضاد موجود ہے۔ میرے سمیت ہر کوئی اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا۔ نفسا نفسی کا عالم میں نے دیکھا ہے، تم نے نہیں۔“

”آہ پروفیسر! تمہیں موت بھی زندگی کا درس نہیں دے پائی تو مجھ فقیر کے راکھ زدہ بوسیدہ جملوں کی تمہارے سامنے حیثیت کیا ہوگی۔ خیر! میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“ ڈاکٹر اَشو کے لہجے میں گہری یاس پنہاں تھی۔ ”اور ہاں! ہم نے تین چار گروپ طبی امدادی کارروائیوں کے لیے تشکیل دیے ہیں۔ وہ اَب تب میں نکلنے والے ہیں۔ تم ذرا اپنی جنت کی لوکیشن سمجھاؤ، موقع ملا تو تمہاری جنت کو ضرور دیکھنے کے لیے آؤں گا۔“

”نہیں مُرشد!“ پروفیسر نے جلدی سے کہا۔ ”میری جنت کی تاب گہنائی ہوئی ہے۔ جب جوان ہوگی، تمہیں دکھانے کے لیے دعوت دوں گا۔ اَبھی زحمت نہ کرو۔“

”چلو ٹھیک ہے سَیں! جب اجازت دو گے، تب حاضری دوں گا۔ اَب دعا ہی کر سکتا ہوں کہ اللہ تمہیں ہدایت کا راستہ سجھا دے۔“ اَشو لال نے پورے خلوص سے دعا دے کر فون بند کر دیا۔

جیسی رات آج اُترنے والی تھی، وہ اس جیسی اَن گنت راتیں بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی جنت کا رابطہ پوری دُنیا سے منقطع ہو گیا تھا۔ وہ نیم دیوانگی میں باری باری ہر چیز کے پاس گیا۔ ہر ایک پر ہاتھ پھیر کر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ ٹی وی کی اسکرین پر ہاتھ پھیر کر مغموم لہجے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بولا۔ ''تم بالکل ٹھیک ہو مگر مجھے کوئی رنگ بھری دلکشی دکھانے سے معذور ہو۔ انسان میں روح، تمہارے بدن میں بجلی، ایک ہی بات ہے۔ ایک دِن میں بھی تمہاری طرح بے جان ہو جاؤں گا۔ دیکھنے میں بالکل ٹھیک ٹھاک دکھائی دوں گا۔''

موم بتی کی مدھم سی روشنی میں اُس نے کھانا تیار کیا۔ کھانا کھایا اور اسٹور میں سے ایکسٹرا چارپائی نکال کر چھت پر آ گیا۔ اس نے ہنگامی صورتِ حال میں استعمال کی غرض سے اِس جیسی اور بھی تین فولڈنگ چارپائیاں اسٹور میں رکھی ہوئی تھیں۔ لیٹا تو نئی مصیبت درپیش آنے لگی۔ فضا موٹے موٹے مچھروں سے بھری ہوئی تھی۔ مچھروں کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی قسم کے پتنگے ٹولیوں کی صورت میں اڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ موبائل فون کے ڈسپلے کی روشنی میں اسٹور سے مچھر دانی نکال لایا۔ چارپائی پر مخصوص انداز سے فٹ کرنے کے بعد ایک طرف سے پلو اُٹھا کر اندر گھس گیا۔

اصولی طور پر اُسے سونا نہیں چاہیے تھا۔ بخوبی جانتا تھا کہ اتنا بڑا سیلابی ریلا اپنے جلو میں ہزاروں سانپ بچھو لیے چلتا ہے۔ نیند کی غفلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کوئی سانپ عرشے پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا تو بڑی مشکل پیدا کر دے گا۔ ایسے میں مقولہ صادق آتا ہے کہ نیند تو سُولی پر بھی آ جاتی ہے۔ وہ دو دِنوں سے بے آرام تھا۔ لیٹا تو فوراً ہی دُنیا و مافیہا سے غافل ہو گیا۔

جانے رات کا کون سا پہر تھا جب اُس کی آنکھ ایک چیخ کی تیز اور سماعت میں چبھنے والی آواز پر کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اندھیری رات میں مچھر دانی کے پار کچھ دکھائی نہیں دیا تو اچھل کر چارپائی سے اُتر آیا۔ چند ساعتوں میں ہی نیند کا خمار جاتا رہا۔ وہ سیڑھیاں اُتر کر فرسٹ فلور پر آیا۔ اسٹور میں سے تیز سرچ لائٹ اُٹھائی۔ فضا میں بالکل سکوت طاری ہو گیا تھا۔ چیخ کی تیز آواز دوبارہ سنائی نہیں دی تھی۔ اُس نے جنت کے احاطے میں راہ داری کا چکر کاٹا۔ سرچ لائٹ خاص قسم کی تھی۔ اُس کی روشنی کا ہالہ عام لائٹس سے کہیں بڑا تھا۔ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ وہ ستون پر چڑھا۔ دور دور تک بہ غور دیکھا۔ سر جھٹک کر چلانے لگا۔ ''کوئی ہے؟..... کوئی ہے؟''

کان لگائے مگر کچھ سنائی نہیں دیا۔ وہ پھر چلایا۔ اِس مرتبہ اُس کی آواز خاصی بلند تھی۔ جواب میں ستون سے چند گز کے فاصلے پر پانی میں ''چھپ'' کی آواز اُبھری۔ اُس نے لائٹ کا رُخ اُس طرف کیا۔ دیکھا، یوں لگا جیسے بدن میں بہنے والی کوئی رَگ کٹ گئی ہو۔ ایک عریاں بازو پانی سے نکلا ہوا تھا جبکہ پانی کی سطح پر دو تین مربع فٹ کے دائرے میں سیاہ بال تیر رہے تھے۔ جنت کی فاؤنڈیشن کے اگلے حصے کے ایک آہنی ہُک میں پھنسا ہوا ہاتھ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ حلق کے بل چیخا۔ بالوں کے تلے پانی میں ڈوبے ہوئے بدن میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تو وہ ستون سے اُتر کر عین بالوں کے اوپر جا کھڑا ہوا۔ ریلنگ پر جھک کر پھر چیخا مگر ہُک میں پھنسنے والی شاید دم توڑ چکی تھی۔

اُس نے سرچ لائٹ کا ہالہ کم کیا اور ہُک میں پھنسے ہوئے ہاتھ کو بغور دیکھا۔ اُسے اندازہ ہو گیا کہ اگر ہاتھ کی انگلیاں ہُک سے نکالی نہ گئیں تو لاش یہیں اَٹکی رہے گی۔ سورج کے طلوع ہونے کے ساتھ تعفن پکڑ لے گی اور سانس لینا بھی محال کر دے گی۔ وہ ستون پر چڑھ کر بانس کی مدد سے گرفت چھڑانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ بالوں میں مخصوص حرکت دکھائی دی۔ ایک نسوانی چہرہ سطحِ آب پر اُبھرا۔ آنکھوں میں پڑنے والی روشنی کی بدولت عورت نے اوپر کی جانب دیکھا۔ دوسرے ہاتھ کو ہُک تک پہنچانا چاہا مگر ناکام ہونے پر چلائی۔ ''بچاؤ، مجھے بچائے کوئی.....''

کہتے ہیں کہ بعض کہانیاں زندگی میں اتنی اہمیت رکھتی ہیں کہ ایک پل میں کھلتی ہیں اور سب کچھ لپیٹ کر آگ کے حوالے کر دیتی ہیں۔ وہ بھی شاید ایسی ہی ایک کہانی تھی۔

پروفیسر کی رگوں کا خون جیسے دِل میں بھر گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں دبی قیمتی سرچ لائٹ چھوٹ کر پانی میں جا گری۔ کئی لمحے گزر گئے۔ پروفیسر کے کپکپاتے لبوں سے بس اتنا ہی نکلا ''سموں.....''

سرچ لائٹ کی روشنی میں دکھائی دینے والی رات کے اندھیرے میں نگاہوں سے اوجھل ہو گئی مگر اُس کی آواز مسلسل کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ اچانک جیسے پروفیسر کو ہوش آ گیا۔ وہ بھاگ کر ستون پر چڑھا۔ ہک میں اَٹکا ہوا بانس نکالا اور اُس کی کڑے والی سمت ڈوبنے والی کے سامنے پانی میں ڈال دی۔ حلق کے بل چیخا ''دائیں ہاتھ سے اِس کڑے کو تھام لو۔ جلدی کرو۔''

سموں نہ جانے کب سے زندگی کی جنگ لڑتی آ رہی تھی، اُس کے ناتواں بدن میں اتنی بھی سکت باقی نہیں تھی کہ کڑے کو تھام سکتی۔ پروفیسر نے بانس واپس اپنے ہُک میں لٹکا دیا اور پانی میں کود گیا۔ چھلانگ لگاتے ہی اُسے پانی کی تیز رفتاری کا احساس ہو گیا۔ بہ دقت تمام پلٹا اور سموں کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ وہ جنت کے ہُک کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔ پروفیسر نے ایک جھٹکے سے اُسے کھینچ لیا اور گھسیٹتے ہوئے جنت کی فاؤنڈیشن کے ساتھ ساتھ تیرتا ہوا بوٹ کے گیراج تک پہنچنے کی

کوشش کرنے لگا۔ جنت میں سوار ہونے کا اِس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ دس منٹ کی اعصاب شکن جدوجہد کے بعد وہ سموں کے نڈھال اور بغیر مزاحمت والے بدن کو بوٹ گیراج میں پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ بدقت تمام اُسے بوٹ پر چڑھایا۔ خود بوٹ روپ کو پکڑ کر اسٹیل کی سیڑھیاں چڑھ کر عرشے پر آ گیا۔ چند لمحوں کے بعد سموں کا بے جان وجود عرشے پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ اُس کا پیٹ پھولا ہوا تھا۔

اندھیرے کے باعث اُس کے خال وخد دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ پروفیسر نے فوری طور پر پیٹ کو دونوں ہتھیلیوں کی مدد سے دَبایا۔ پہلا دَباؤ نہایت خفیف تھا۔ پیٹ میں پانی کے بجائے بچہ ہونے کا احتمال بھی تھا۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ وہ ماں بننے والی نہیں ہے تو اُس نے سموں کو پہلو کے بل لٹایا اور پیٹ کو پچکا کر پانی نکالنے کی کوشش کی۔ کامیاب رہا اور ''اوبھ'' کی آواز کے ساتھ سموں کے منہ سے ڈھیر سارا پانی نکل آیا۔ پروفیسر نے اس کا منہ کھولا۔ حلق میں انگلی مار کر قے کروائی۔ یکے بعد دیگرے اُس نے کئی طریقے اپنائے۔ پیٹ نیچے بیٹھ گیا تو نبض اور دھڑکن چیک کرتے ہوئے مطمئن انداز میں سر ہلانے لگا۔

اندھیرے میں سموں کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گیلا اور گلا ہوا لباس اُس کے بدن پر آکٹوپس کی طرح چپکا ہوا تھا۔ پروفیسر کا ذہن برق رفتاری سے سموں کی بحالی صحت کے لیے آئندہ کا لائحہ عمل سوچ رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ کی غنودگی نما بے ہوشی کے بعد سموں کو ہوش آ گیا۔ کافی دیر تک اُس کے لبوں سے کوئی لفظ برآمد نہیں ہوا۔ پروفیسر اُس پر نظریں جمائے ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگاتا رہا، سوچتا رہا کہ وہ رات کے اِس پہر میں دریائی ریلے میں کہاں سے بہہ کر آئی ہو گی؟ یہی تو جبہہ ذہن میں اُبھری کہ اُس کا سسرالی گاؤں دریا کے کنارے اوپر کی جانب کہیں واقع ہو گا۔ اگر ایسا تھا تو پھر اُس کا خاوند، بال بچے اور گھر کے دوسرے افراد کہاں تھے؟

پھر جب وہ نقاہت آمیز انداز میں اُٹھ کر بیٹھ گئی تو پروفیسر نے پوچھا۔ ''کیا تم اَب بالکل ٹھیک ہو؟''

اُس نے چونک کر پروفیسر کی طرف دیکھا۔ اندھیرے کی وجہ سے پہچان نہیں پائی۔ شاید روشنی میں بھی پہچان نہ پاتی۔ پروفیسر کے چہرے پر بیتے ہوئے ماہ وسال کی گرد اتنی پڑ چکی تھی کہ وہ بہ آسانی پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ سرچ لائٹ کی روشنی میں سموں کو پہچان لینے میں نظر کا کمال کم اور دل کا کردار زیادہ تھا۔ اِس حقیقت کو بھی جھٹلانا مشکل تھا کہ ڈھلی ہوئی عمر نے بھی سموں کے نقوش میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں کی تھی۔

پروفیسر اُسے سہارا دے کر اوپر لے آیا۔ مچھر دانی اُٹھا کر اُسے چارپائی پر لیٹنے کا اشارہ کیا اور خود زینے اُتر کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔ اُسے یہ اندازہ بھی تھا کہ آنے والے ایک گھنٹے میں سموں کو تیز بخار آن دبوچے گا۔ ایسے میں اُسے علاج معالجے کی بھی ضرورت ہو گی۔

❖❖❖

پیا سے مل کر آئے نین تو وہ ہر دکھائی دینے والی شے میں شہاب کو ہی ڈھونڈ نکالنے پر بضد تھے۔ وہ زیرِلب مسکراتی، بل کھاتی اور چشمِ تصور میں اپنے محبوب کو مخاطب کرتی۔ ''ہائے شہاب! تم کیا ہو؟ سامنے ہوتے ہو تو یوں لگتا ہے جیسے تمہارے سوا دُنیا میں کوئی اور ذی نفس موجود نہیں ہے۔ دور ہوتے ہو تو یوں لگتا ہے جیسے میرا اپنا وجود کہیں کھو گیا ہے۔ شہاب آ! کہ اَب تاب جدائی کی نہیں.....''

ہوٹل میں ہونے والی مختصر سی ملاقات میں اُس نے اپنے چاہنے والے پر پاپا کی رضامندی عیاں کر دی تھی۔ یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اَب گیند اُس کے کورٹ میں گر چکی ہے، چاہے تو جاندار شارٹ مارتے ہوئے پوائنٹ کے ساتھ ساتھ کھیلنے والی کو ہمیشہ کے لیے جیت لے، چاہے تو ریکٹ پر اپنی گرفت کی کمزوری کے جرم میں ہمیشہ کے لیے سر کو جھکنے پر آمادہ کر لے۔ شہاب نے والہانہ انداز میں اُس کے دونوں ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگا لیا۔ خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''جس ایک ہی شارٹ پر میرے مستقبل کا انحصار ہو، میں اُس شارٹ پر زندگی بھر کی توانائی صرف کر دوں گا۔ تم فکر کرنے کے بجائے میرا انتظار کرو۔''

کھانا کھا کر بلاوجہ ہر ایک سے نظریں چُراتے ہوئے اپنے کمرے میں آئی۔ وہ تنہائی پسند نہیں تھی مگر جب سے اُس کی زندگی میں شہاب وارد ہوا تھا وہ دِن کا کچھ حصہ تنہائی میں اُس کی یادوں سے کھیلتے ہوئے گزارنا پسند کرنے لگی تھی۔ بیڈ پر دراز ہوئی، آنکھیں موندیں تو شہاب کی دل موہ لینے والی شبیہہ تصور میں دَر آئی۔ اَبھی پوری طرح اپنی پیدا کردہ تخیلاتی فضا میں گم نہیں ہوئی تھی کہ دروازے پر انگلی کی ٹھوکر سے دستک دے کر افتخار بیگ بیڈ روم میں داخل ہوا۔ وہ چونک کر بیڈ پر اُٹھ بیٹھی۔ حسبِ عادت دوپٹا درست کرتے ہوئے بولی ''السلام علیکم بھائی!''

افتخار نے زیرِلب سلام کا جواب دیا۔ ڈریسنگ ٹیبل کی کرسی گھسیٹ کر بیڈ کے ساتھ لگا کر بیٹھ گیا۔ بولا۔ ''میں اپنی پیاری سی کزن جسے آج بہت سی باتیں کرنے کے لیے آیا ہوں۔ کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ٹھیک موقع پر آیا ہوں؟''

وہ سمجھتی تھی کہ افتخار اسے کیا کہنا چاہتا ہے، بظاہر لاتعلق سی ہوکر بولی۔ ''میں کچھ سمجھی نہیں بھائی!''

افتخار چند منٹوں تک اُسے یک ٹک دیکھتا رہا، پھر گلا کھنکار کر بولا۔ ''نہ بدلنے والوں کو بدلتے دیکھ کر دِل ڈرنے لگا ہے۔ پہلے سوچتا تھا کہ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے، اَب سوچتا ہوں کہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پھر تمام عمر ہاتھ ملتا رہوں گا اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

وہ کئی مہینوں سے افتخار سے ہونے والی اِس گفتگو کا انتظار کررہی تھی۔ چہرے پر حیرت ثبت کرتے ہوئے بولی۔ ''جی! میں سُن رہی ہوں۔''

''میں چاہتا ہوں کہ تم غور سے سنو اور سن کر سمجھنے کی کوشش بھی کرو۔ ہم دونوں خون کے رشتوں میں پروئے ہوئے دو انسان ہیں۔ ہماری سوچیں مختلف ہوسکتی ہیں مگر ان کا کسی ایک نکتے پر منطبق ہونا کوئی ناممکن امر نہیں ہے۔ میں تمہیں بچپن سے چاہتا آیا ہوں، تم جانتے بوجھتے کنی کتراتی رہی ہو۔ ایسے میں ایک ہی بات مجھے سمجھ آتی ہے کہ تم میرا احترام کرتی ہو، میری دل آزاری سے بچتی ہو ورنہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ کیا میں سچ کہہ رہا ہوں؟''

افتخار غیر معمولی حد تک سنجیدہ تھا۔ اُس کے چہرے پر ہمیشہ دکھائی دینے والی مسکراہٹ بھی معدوم تھی۔ مصباح نے ایک نگاہِ عجیب سے اسے دیکھا اور کہا۔ ''آپ کا تجزیہ بہت حقیقی واقع ہوا ہے۔''

افتخار کے چہرے پر نامانوس سا رنگ چند لمحوں کے لیے لہرایا، پھر معدوم ہوگیا۔ بولا۔ ''میں نے بہت سوچا، بالآخر اِس نتیجے پر پہنچا کہ تم کسی کو چاہتی ہو، کوئی تمہیں چاہتا ہے۔ اتنا کہ تم نے نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے مجھ پر فوقیت دے رکھی ہے۔''

مصباح نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وہ معمول سے کہیں زیادہ سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے بولنے سے پہلے ہی بول پڑا ''کسی کی بھی زندگی میں جھانکنا تہذیب کے خلاف ہے مگر دل پر سارے اختیار کھو چکا تھا۔ تمہارے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ پھر یوں دوڑتے بھاگتے مجھے شہاب خان نظر آ گیا۔ کاش! میرا دِل تمہارے نام پر دھڑکتا نہیں تو میں جی کھول کر تمہارے انتخاب کی داد دیتا۔''

بہ یک وقت دو کیفیات نے مصباح کا لہو نچوڑ کر چہرے میں اکٹھا کردیا۔ پہلا احساس تفاخر کا تھا کہ اُس کے محبوب کی تعریف کی جارہی تھی۔ اُس کی شخصیت تھی بھی سراہے جانے کے لائق! دوسرا احساس ندامت کا تھا کہ اُس کی چوری پکڑی جاچکی ہے۔ اپنے کزن سے آنکھیں چراتے ہوئے بولی۔ ''تم نے خود ہی کہا ہے کہ دِل سارے اختیار کھو بیٹھتا ہے، میں بھی شاید ایسی ہی بے اختیاری کا شکار ہوگئی ہوں۔''

''کیا تم شہاب کو جانتی ہو؟''

''ہاں بھائی!''

''کس حد تک؟''

''جس حد تک اُس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا ہے۔''

''مگر فقط اتنا جاننا کافی نہیں ہے۔''

''میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں کہ اُس کے بتائے کو پرکھ سکوں یا نہ بتائے ہوئے کا کھوج نکال سکوں۔ اِس لیے مجھے اکتفا کرنا پڑ رہا ہے۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

اُسے یقین تھا کہ افتخار بیگ کسی بھی حالت میں اُس سے جھوٹ نہیں بولے گا۔ وہ بچپن سے سچ بولتا چلا آیا تھا۔ تبھی وہ آہستہ آہستہ اُس پر کھلتی جارہی تھی۔

وہ بولا۔ ''مصباح! ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی.....''

وہ جھٹ سے بولی۔ ''مگر کبھی چمکتی ہوئی چیز سونا بھی تو ہوسکتی ہے۔''

افتخار نے اثبات میں سر ہلایا، بولا۔ ''ہاں! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے شہاب کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوسکا، تمہارے گوش گزار تا ہوں۔ ممکن ہے کہ تمہیں اُس کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ وہ ضلع ناظم سردار ارباب خان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ فارن سے تعلیم حاصل کرکے کچھ عرصہ قبل یہاں آیا ہے۔ نرم خو ہے، جذباتی ہے، مجرمانہ ذہنیت نہیں رکھتا۔ یہاں تک تو سب کچھ بالکل ٹھیک ہے مگر جو کچھ میں بتانے چلا ہوں، وہ کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ شہاب کے باپ دادا پاکستان بننے کے عہد سے اقتدار میں چلے آرہے ہیں۔ ان کا اقتدار لے پالک رسہ گیروں، بدمعاشوں اور کرائے کے قاتلوں کے بَل پر پروان چڑھتا ہے۔''

وہ سانس لینے کو چند لمحے رُکا، پھر بولا۔ ''شہاب ایسی ذہنیت کا مالک نہیں ہے مگر ایسا بنتے دیر کتنی لگتی ہے۔ اُس کا خاندان اور باپ کے یار احباب اُسے سر اُٹھاتے ہی اپنی راہ پر گامزن کرلیں گے۔ تب تم پر کڑا وقت اُتر آئے گا جو تمہاری زندگی کو چاٹ جائے گا۔''

وہ ٹھٹک گئی۔ تفکر آمیز نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی جو محبت بھرے دِل میں اندیشے بھرنے لگا تھا۔ جھوٹ نہ بولنے والا شاید اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہوکر رقیب پر کیچڑ اُچھالنے لگا تھا۔ نظر بچی تھی۔ بُرے بھلے میں تمیز نہیں کرسکتی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ''مصباح! تمہاری آنکھیں بولتی ہیں۔ تمہاری زبان جو نہیں کہہ پاتی، تمہاری آنکھیں مجھ پر آشکار کردیتی ہیں۔ تم مجھ پر اعتماد کرنے سے گریزاں ہو۔ آنے والے کل میں تم تنہا رہ جاؤ گی۔ شاید میں بھی تمہارے کسی کام نہیں آسکوں گا۔ شہاب کے باپ نے اَن گنت اشتہاری ڈاکوؤں، جرائم پیشہ لوگوں کو پناہ دے رکھی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ کیچے کے جیلے میں دندناتے پھرتے ڈاکو اُسی کی شہ پر ہر شہ رگ پر دانت گاڑ سکتے ہیں۔''

وہ چپ رہی۔ کچھ کہنا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ افتخار نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ''تم! مصباح سلطان، میری کزن ہو، میری محبت ہو۔ تمہیں خوش دیکھنا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے اور میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ میں تمہارے روتے بسورتے چہرے کو اپنے کمرے میں لے کر جاؤں۔ شہاب جس کلاس سے تعلق رکھتا ہے، وہاں عورتوں کا احترام نہیں کیا جاتا، اُنہیں پیر کی جوتی بنا کر رکھا جاتا ہے۔ آج وہ تمہارے نخرے اُٹھا رہا ہے، کل وہ یقیناً تم پر ہاتھ اُٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ مجھے علم ہے کہ تم تینوں بہن بھائیوں نے بغاوت کا علم بلند کرکے اپنے باپ کو توڑ دیا ہے۔ ٹوٹی ہوئی چیز کو جس سانچے میں فٹ کردیا جائے، ہوجاتی ہے۔ انکل نے تمہیں بھی وجدان اور عمران کے ساتھ ساتھ اپنی مرضی کے مطابق ہم سفر چننے کی اجازت دے دی ہے۔ یہ اُن کا بڑا پن ہے، غلط فیصلہ کروگی تو اپنا چھوٹا پن دکھاؤ گی۔''

مصباح نے سر تھام لیا۔ سائیں سائیں ہوتا دماغ کوئی جواز، کوئی دلیل تلاش کرنے میں ناکام ہورہا تھا۔ افتخار نے اُس کا سر دھوتا ہاتھ تھام لیا۔ فرطِ اضطراب سے گرفت لرزنے لگی۔ ہونٹ کانپنے لگے، بولا۔ ''تمہیں ڈرانا میرا مقصد نہیں ہے۔ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم جو قدم بھی اُٹھاؤ، سوچ سمجھ کر اُٹھاؤ۔ اِس راستے میں واپسی کی گنجائش نہیں رہتی، آگے کی طرف ہی جانا پڑتا ہے۔''

وہ ہاتھ چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ اُسے علم ہوگیا تھا کہ اُس کی نصیحتیں مصباح پر بے اثر جارہی تھیں۔ اُس کے جھکے ہوئے سر کو اوپر اُٹھایا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کئی ساعتوں تک کھڑا رہا۔ کچھ کہہ کر کچھ نہیں کہہ پا رہا تھا۔ اچانک مصباح کی آنکھوں میں آنسو چمک اُٹھے۔ آنسوؤں کی غیر معمولی خاموشی نے افتخار بیگ کو کاٹ کر رکھ دیا۔ وہ اتنی لاچار کبھی نہیں ہوئی تھی۔

آنسو لڑھک کر گالوں پر آگئے۔ افتخار بیگ کو اُس کے گالوں میں پڑنے والے ڈمپل بہت اچھے لگتے تھے۔ تبھی اُسے ہر وقت ہنستا دیکھنا چاہتا تھا۔ آج پہلی مرتبہ پتا چلا تھا کہ روتے ہوئے بھی گلابی مائل رخساروں میں گڑھے بن جاتے تھے۔ ہنستے ہوئے یہی ننھے ننھے استعارے جتنے مسحور کن اور مسرت آگیں لگتے تھے، روتے ہوئے یہی گڑھے دیکھنے والے کے اتنے ہی بڑے دُکھ کو سوا کرنے لگتے تھے۔ افتخار نے انگلیوں کی پوروں سے اشک پونچھے۔ انگلیاں بہک کر زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کرنے لگیں۔ پہلی مرتبہ گالوں میں پڑنے والے گڑھوں کو چھو رہا تھا۔ یوں لگا جیسے چھوٹے چھوٹے انگارے قدرت نے ناظر کی پوریں جلانے کے لیے اُس کے چہرے پر رکھ چھوڑے ہوں۔

وہ کافی دیر تک آنکھیں جھپکائے بغیر اُسے دیکھتی رہی۔ روتی رہی، وہ بھی خاموشی سے آنسو پونچھتا رہا۔ اچانک سسک پڑی۔ اُس کی طرف جھول گئی۔ لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ وہ گھبرا گیا۔ یوں ٹوٹ کر رونے کی وجہ جاننے کے لیے بے چینی سے اصرار کرنے لگا۔ اُس کے لرزیدہ لبوں سے کچھ نکلا بھی تو محض اتنا کہ ''بھائی! میں بہت بُری ہوں۔ میں نے پاپا کو دکھ دیا، میں نے ماما کو رُلایا، میں نے آپ کو مایوس کیا۔ میں بہت بُری ہوں۔ شاید اتنے چاہنے والوں کو ناراض کرکے میں بھی خوش نہیں رہوں گی۔''

افتخار نے اُس کا چہرہ اپنے سینے سے لگا کر نرم گرفت سے بھینچ لیا۔ بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''نہیں مصباح! یہ تینوں تمہاری خوشی کے لیے زندگی بھر دُعائیں مانگیں گے، اِن میں سے کوئی بھی تمہارا گلہ نہیں کرے گا، کوئی بھی بددُعا دینے کی غلطی نہیں کرے گا۔ اِس خوف سے بالاتر ہوکر صحت مند فیصلہ کرنا، میں چلتا ہوں۔''

افتخار بیگ ایک مایوس سی نگاہ اُس پر ڈال کر چلا گیا۔ اُسے سوچوں کی کھینچا تانی میں چھوڑ گیا۔ جتنا بھی تنقیدی انداز سے شہاب کو سوچتی، وہ اتنا ہی دل کو لگنے لگتا۔ جتنا بھی غور سے دیکھتی، کوئی برائی دکھائی نہ دیتی۔

رات کو عمران نے انداوان سے بات کروائی۔ نہ جانے کیوں اُس کا جی چاہتا تھا کہ انداوان اُس سے باتیں کرتی رہے، وہ سنتی رہے، لائن کبھی خاموش نہ ہو مگر ایسا کب ہوتا ہے۔ ہر آنے والے کو جانا ہوتا ہے۔ اُس نے اپنے بھائی کو مبارکباد دے کر کہا۔ ''بھائی! تم بڑے خوش قسمت ہو۔ انداوان بہت اچھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تصویروں میں بیٹھی خاموش انداوان سے کہیں زیادہ پیاری ہوگی۔ کیا ایسا ہی ہے؟''

عمران نے جھینپ کر کہا۔ ''کہیں اُسے مجھ سے چھین ہی نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لینا۔"

اُس نے ہنستے ہوئے فون بند کردیا۔ بیڈ پر اوندھے منہ گر گئی۔ کروٹ بدل کر سیدھی ہوئی، دونوں بانہیں پوری وسعت میں کھولیں اور دل آویز انداز میں مسکرا کر بڑبڑانے لگی۔ "ہے انداوان! تم یہاں چلتی پھرتی سب گڑیاؤں سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو۔ میرا بھائی بھی دُنیا سے حسین ہے، اُسے تمہارے جیسی شریکِ حیات کی ہی ضرورت ہے..... آئی لو یو انداوان!"

چائے کی طلب جاگی۔ کچن میں آئی۔ چائے بنا کر پہلا گھونٹ بھرنا ہی چاہتی تھی کہ شہاب کی کال آ گئی۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ "مصباح! سن رہی ہو؟"

"جی!" اس کا لہجہ خاصا دھیما تھا "خیریت تو ہے ناں؟"

"کبھی اتنی رات گئے گھر سے باہر نہیں رہا، آج اندھیرے میں بیٹھا ہوں تو پتا چل رہا ہے کہ دُنیا رات کو بڑی پرسکون ہوتی ہے۔ سوچا تم سے کچھ باتیں کرلی جائیں، دِل بہلا لیا جائے۔" شہاب کا لہجہ اُس کے اندرونی اضطراب کی چغلی کھا رہا تھا۔

"شہاب! کیا تم پریشان ہو؟"

"ہوں بھی اور نہیں بھی....."

"کھل کر بتاؤ گے تو کچھ جان پاؤں گی!"

"بلاوجہ دِل گھبرا رہا ہے۔"

"دِل بلاوجہ کب گھبراتا ہے، جانتے ہو؟" مصباح نے پوچھا۔

"نہیں تو....."

"جب دماغ کسی مسئلے پر دِل سے اختلاف کر رہا ہو تب دِل میں گھٹن بھر جاتی ہے۔" وہ بولی "یا دِل کی خواہش پوری نہ ہو رہی ہو، تب!"

"تم بہت ذہین بھی ہو۔"

"بھی ہو..... کیا مطلب؟ میں ذہین ہونے کے علاوہ بھی کچھ ہوں؟"

"ہاں! تم بلاشبہ دُنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی ہو۔" شہاب کے لفظوں میں محبت ہی محبت تھی مگر لہجہ الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

وہ دل میں بولی۔ "تو انداوان کیا ہوئی؟"

ہنستے ہوئے کہنے لگی "یہ تو ہر کوئی اپنی محبوبہ سے کہتا ہے۔"

"ایسا کہنے والا ہر مرد سچا ہوتا ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"تم میرے سمجھانے سے بھی سمجھ نہیں پاؤ گی۔"

"سمجھانے کی کوشش تو کر کے دیکھو۔" مصباح نے ترغیب دی۔

"میں اپنے گھر کے سامنے، سول اسپتال کے گراسی پلاٹ میں بیٹھا ہوا ہوں۔ دُنیا سو رہی ہے، کوئی دیکھنے والا نہیں ہے، ایسے میں تم دَبے پاؤں چلی آؤ۔ سمجھنا چاہو گی تو سمجھا دوں گا، نہ سمجھنا چاہو گی تو تب بھی بہت کچھ سمجھ آ جائے گا۔"

اُس نے ہنستے ہوئے فون بند کردیا۔ چاہنے والے کو تڑپانے کا ہنر جانتی تھی۔ انتظار کرتی رہی مگر شہاب نے ری کال نہیں کیا تو جھنجلا سی گئی۔ اُسے کال کرنا چاہتی تھی مگر انا آڑے آئی۔ سوچنے لگی۔ "شاخ کو جھک کر گود میں نہیں گرنا چاہیے ورنہ بے وقعت ہو جائے گی۔ شہاب کو ہی ایڑیوں کے بَل اوپر اُٹھ کر مجھ تک پہنچنا ہوگا۔ آج، کل یا کبھی بھی۔"

اُسے یہ علم نہیں تھا کہ اُس کے چاہنے والے کی قسمت کا ستارہ گردش میں آ گیا تھا۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے اپنی ہر خواہش ضد کر کے منوا لینے والا اپنی زندگی کی سب سے بڑی آرزو کو تسلیم کرانے میں ناکام ہو رہا تھا۔ گوشت پوست کے بنے ہوئے سردار ارباب خان کے سینے میں دھڑکنے والے پتھر سے مسلسل سر پٹخ پٹخ کر بے دم ہو رہا تھا۔

مصباح کو پہلی مرتبہ دیکھنے کے وقت سے لے کر اَب تک اُسے پوری طرح باور رہا تھا کہ اُس کا سخت گیر باپ کبھی اُس کی مرضی پر سر نہیں جھکائے گا۔ وہ اپنی بھتیجی کو بہو بنانے کے لیے اُس کی محبت یا خواہش کا احترام نہیں کرے گا بلکہ اپنی مرضی مسلط کرتے ہوئے اُس کی زندگی اجیرن کردے گا مگر یہ پریشانی کی بات نہیں تھی۔

پریشانی یہ تھی کہ جس گھڑی کو وہ بہت دور سمجھ رہا تھا، وہ غیر متوقع طور پر اچانک سر پر آ گئی تھی۔ اُس کی حاصل کردہ معلومات نے بھی دھوکا دیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ مصباح کے والدین بھی اِس رشتے پر رضامند نہیں ہوں گے بالخصوص اِس حالت میں کہ اُس نے اپنا آپ مکمل طور پر چھپائے رکھا تھا۔ وہ ایک بے روزگار جوان کی صورت میں مصباح کے سامنے آیا تھا۔ ایسے رشتوں کی چاپ پر کان نہیں دھرے جاتے۔ دونوں طرف ایک جیسی صورتِ حال عشق کے مقابل آتی تو وہ کسی نہ کسی طرح مصباح کو کورٹ میرج پر تیار کر لیتا اور اُسے لے کر کہیں دُور نکل جاتا۔ شاید ایسا ہی ہوتا مگر مصباح نے اچانک اُسے پاپا کے مان جانے کی خوش خبری سنا کر پریشان کر دیا تھا۔

شہاب اپنے ماں باپ کو رشتہ مانگنے کے لیے اُس کے گھر لے کر نہیں جا سکتا تھا اور وہ ماں باپ کو بدنامی کی پستی میں گرانے پر کبھی تیار نہ ہوتی۔ اُس نے اپنے طور پر دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے گھر میں ہونے والی سرد جنگ سے

مصباح کو آگاہ نہیں کیا تھا۔

پہلے قدم پر ماں کے سامنے جھکنے پر جھڑکیوں کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ دوسرے مرحلے پر باپ نے اُس کی پوری بات سننے کے بعد بڑے تحمل سے کہہ دیا۔ "بیٹا جی! میرے اگر دو چار بیٹے ہوتے تو شاید تمہیں مَن مانی کرنے کی اجازت مل جاتی۔ تم میرے اکلوتے پتر ہو۔ میں نے سوچ رکھا ہے کہ سردار وریام خان کی بیٹی کو اپنی بہو بناؤں گا۔ تم نے اپنی چچازاد کو ایک نہیں، متعدد بار دیکھا ہے۔ اُس میں کوئی کمی نہیں۔ یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ ہے۔ خوبصورت ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُس کے حصے کا دوسو ایکڑ زرعی رقبہ بھی اُس کے ساتھ تمہارے پاس آئے گا۔ ویسے بھی ہمارے خاندان میں باہر شادی کرنے کا رواج نہیں ہے، تم جانتے ہی ہو!"

وہ سر جھکائے کہنے لگا۔ "بابا! زمانہ وہ نہیں رہا....."

باپ نے بات اُچک لی۔ "تو کیا ہوا؟ ہم تو وہی ہیں ناں۔ ہمارے باپ دادا نہیں بدلے، ہمارا جاہ وحشم ماند نہیں پڑا۔ پورے علاقے کی نظریں آٹھ پہر ہم پر گڑی رہتی ہیں۔ مصباح، تمہاری پسند، خوبصورت ہوگی، پڑھی لکھی ہوگی، شریف خاندان کی بیٹی ہوگی مگر کیا وہ اپنے ساتھ شازیہ کے جتنی جائداد لے کر آئے گی؟ کیا شازیہ کے جوڑ کا کوئی خاندان میں موجود ہے؟ نہیں..... تمہاری بے جا ضد کی بدولت ہم دونوں بھائی دہرے نقصان سے دوچار ہوں گے۔ دوسو ایکڑ نہری رقبہ خاندان سے باہر چلا جائے گا اور تمہارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔"

"مگر بابا! مجھے جائداد کی پروا نہیں ہے۔"

"نہ ہو، مجھے تو ہے۔ تمہاری ماں کو تو ہے۔ تم اپنی نہیں، ہماری فکر کرو کیونکہ آج تک ہم نے تمہاری فکر کی ہے۔"

باپ نہیں مانا تو وہ مایوس ہو کر اپنے بیڈروم میں آ گیا۔ ماں کے دِل کو گھبراہٹ ہو رہی تھی، بیٹے کی دِل جوئی کے لیے چلی آئی۔ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سمجھانے لگی۔ "بیٹا! میری جان! لڑکیوں کا کیا ہے؟ ایک کے بعد دوسری نظر آئے تو پہلی بے توقیر ہو جاتی ہے۔ تم نے کبھی شازیہ کو اِس نظر سے دیکھا نہیں جس نظر سے مصباح کو دیکھ رہے ہو۔ وہ کسی بھی لحاظ سے مصباح سے کم نہیں..... میری مانو تو اپنے بابا کا دِل دکھانے کے بجائے اُن کی عمر بڑھاؤ اور شازیہ کو دُلہن بنا کر گھر لے آؤ۔ اسی میں ہم سب کی خوشی ہے۔"

وہ کھلی اور سپاٹ نگاہوں سے ماں کو گھورتا رہا، بظاہر سنتا رہا، خاموشی سے سوچتا رہا۔ "کاش! میرے ماں باپ کو اپنے خاندانی رسم ورواج اور جائداد کی فکر نہ ہوتی، میری فکر ہوتی....."

آنے والے ایک دو دنوں میں اُس نے اتمامِ حجت کے طور پر ماں اور باپ سے جھگڑا کیا، غیر اعلانیہ بھوک ہڑتال کی، گھر چھوڑنے کی دھمکیاں دیں حتیٰ کہ سامان تک باندھ لیا مگر بابا کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ شازیہ کے علاوہ کسی کو بہو بنانے پر تیار نہیں تھا۔ بیٹے کی حرکتوں سے تنگ آ کر اُس نے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا۔ "شہاب! تم بیٹے ہو، میں تمہارا باپ ہوں۔ بیٹا کبھی باپ کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکا۔ تم یہ فضول ضد چھوڑ دو اور جیسے میں کہہ رہا ہوں، ویسے کرو۔ اگر کوئی الٹی سیدھی حرکت کرو گے تو تمہاری مصباح اور اُس کا پورا خاندان میری نظر میں ہے۔"

"آپ کیا کریں گے اُن کے ساتھ؟" وہ چونکا۔

سردار ارباب خان نے منہ سے کچھ نہیں کہا مگر دائیں ہاتھ کو پھیلا کر مخصوص انداز میں یوں حرکت دی کہ شہاب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ ہکلا کر بولا۔ "بب..... با..... بابا! یہ بہت غلط..... غلط ہوگا۔"

"تم جو کر رہے ہو، کیا وہ غلط نہیں ہے؟" بابا نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "تم ایک تھرڈ کلاس لڑکی کی خاطر پورے گھر بلکہ پورے خاندان کے سکون کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ اَب جاؤ یہاں سے۔ جو کہہ دیا ہے، وہی ہوگا۔ اور ہاں! یہ ذہن میں رکھنا کہ میں تمہیں چوبیس گھنٹے اپنی نظروں میں رکھتا ہوں۔"

وہ اپنی محبوبہ کے دفاع میں ایک حرف بھی بول نہ پایا۔ یوں ماں باپ سے پوری طرح مایوس ہو گیا۔ مصباح کو کھو کر زندگی سے مایوس نہیں ہونا چاہتا تھا۔ گزشتہ دو تین گھنٹوں سے اسپتال کے گراسی پلاٹ کے سنگی بنچ پر سر نیہوڑائے بیٹھا سوچوں کے تانے بانے بننے میں مشغول تھا۔ اُلجھے ہوئے ریشم کا ایک سرا اُس کے ہاتھ میں تھا، دوسرا بہ صد کوشش نظر نہیں آ رہا تھا۔

❖ ❖ ❖

سورج نے طلوع ہوتے ہی چھت کی ریلنگ سے ٹیک لگائے، سوتی کھیس میں لپٹ کر سوتے ہوئے پروفیسر کو پسینے سے نہلا دیا۔ وہ جاگ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ نظر مچھر دانی کے اندر پہلو کے بل لیٹی سموں پر پڑی۔ جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ رات کا بیشتر حصہ سموں کی تیمارداری میں گزرنے کے باعث اُس پر کسلمندی سوار تھی۔

سموں ابھی تک سو رہی تھی۔ اُس نے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور کچن میں آ کر ناشتا تیار کرنے لگا۔ ناشتے کے لوازمات میلامائن کی ٹرے میں رکھے، چائے تھرماس میں ڈالی اور چھت پر آ گیا۔ اُسے آوازیں دیں۔ وہ نہیں جاگی تو مچھر دانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کاپلو اُٹھا کر اُسے جھنجوڑنے لگا۔ وہ جاگ کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے اور اُس کے اطراف میں دیکھنے لگی۔ سمجھنے کی کوشش کرنے لگی کہ وہ اِس وقت کہاں اور کس حال میں ہے۔ کچھ سجھائی دینے پر چارپائی پر اُٹھ بیٹھی۔ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے سرائیکی زبان میں بولی۔ ”آپ کون ہیں؟“

”میں وہ ہوں جس کے پاس تمہیں مصیبت مہمان بنا کر لے آئی ہے۔“ پروفیسر کو ہلکا سا دُکھ ہوا۔ سموں نے اُسے نہیں پہچانا تھا۔ اُس کے چہرے پر شناسائی کا رَتی بھر تاثر بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ سر جھٹک کر ناشتا چارپائی پر چُن دیا۔ بولا۔ ”ذہن پر زیادہ بوجھ ڈالنے کی ضرورت نہیں، ناشتا کرو۔ سوچنے کے لیے اَبھی بہت وقت پڑا ہے۔“

”مم...... میرا کندن کہاں ہے؟“ وہ سہمی ہوئی نظروں سے اِردگرد دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں تمہارے کندن کو نہیں جانتا‘ کہاں ہے۔“ پروفیسر کے لہجے میں درشتی یا سختی نہیں تھی۔

”وہ شکنتلا بھی دکھائی نہیں دے رہی، کہاں مرگئی ہے؟“ سموں نے عجیب سے کھوئے کھوئے انداز میں کہا تو پروفیسر کو شبہ ہوا کہ وہ ذہنی توازن کھو چکی ہے، ترحم آمیز نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کہا ناں! کچھ کھا پی لو، پھر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“

سموں کا رویہ نہایت غیر فطری محسوس ہوا جب وہ پروفیسر کی بات سُن کر اچانک شانت ہوگئی۔ کچھ دیر تک اطمینان بھری نظروں سے سامنے دیکھتی رہی پھر چلّا اُٹھی۔ ”ہائے میرا کندن! ہائے میری شکنتلا!“

پروفیسر کا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ مطمئن نہیں ہوئی بلکہ اُس کے اندر عجیب بھونچال پیدا ہوگیا تھا۔ وہ کافی دیر تک چیختی چلّاتی رہی۔ اپنے کندن اور شکنتلا کو آوازیں دیتی رہی، پروفیسر کی منت وسماجت کرتی رہی کہ اُس کے بچوں کو ڈھونڈ کر اُس کے سامنے لے آئے۔ بہت سست رَوی سے اُس کی حالت میں تبدیلی رونما ہورہی تھی اور وہ صورتِ حال سے مفاہمت کرتی جارہی تھی۔

پروفیسر نے دِلاسا دیا، یقین دلایا کہ اُس کے بچے جہاں بھی ہوں گے، خیر وعافیت سے ہی ہوں گے اور آخرکار اُس کو پُرسکون کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ بے دِلی سے تلی ہوئی بریڈ کے نوالے توڑ توڑ کر کھانے لگی۔ پروفیسر نے دیکھا کہ سموں نے آج بھی فرائی انڈے کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔

اُس نے پروفیسر کی طرف دوبارہ نہیں دیکھا اور نہ ہی کوئی بات کی بلکہ ناشتے کی ٹرے پر جھکی رہی۔ پروفیسر نے کھانے میں اُس کی غیر معمولی رغبت کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ وہ کافی دیر سے بھوکے پیٹ موت سے نبرد آزما رہی تھی۔

وہ اُس کے خال وخد پر نظریں جمائے بیٹھا بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ لمبی اور اُلجھی ہوئی سیاہ زلفیں چہرے پر ننھے ننھے دائرے بنائے چپٹی ہوئی تھیں۔ سموں کی رنگت پہلے سانولی تھی، اَب گوری چٹی تھی جو زیادہ دیر پانی میں رہنے سے زردی مائل دکھائی دے رہی تھی۔ ملیح جلد اور شریر نقوش والے چہرے پر اَدھیڑ عمری سلوٹیں بن کر اپنا آپ دکھا رہی تھی۔ لبوں کے دائیں گوشے سے جھانکتے سفید دانتوں میں سے ایک دانت غائب تھا اور اُس کی جگہ پر بننے والا خلا بھی اچھا لگ رہا تھا۔

اُس کے تن سے چپکا ہوا لباس سیلاب زدہ ہونے سے پہلے سفید رہا ہوگا۔ دریا کے پانی نے اُسے خاکی کر دیا تھا۔ گلابی رنگ کے پھول بھی اپنا رَنگ بدل چکے تھے۔ بیس سال پہلے، جب اُس کی شادی ہوئی تھی، وہ پندرہ کے سِن میں تھی۔ توت کی گیلی لکڑی کی طرح پتلی اور لچکدار ہوا کرتی تھی، اَب بھرے بدن کی بدولت باوقار لگنے لگی تھی۔ پروفیسر کو ماننا پڑا کہ وہ پینتیس کی ہو کر بھی بہ مشکل پچیس کی دکھائی دیتی ہے۔

وہ زیادہ نہیں، بس تھوڑی بہت ہی بدلی تھی۔ اتنی تبدیلی تو عمر کے ساتھ ساتھ آ ہی جاتی ہے۔ وہ کھانے سے فارغ ہوئی، نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے خالی خالی نظروں سے پروفیسر کو دیکھنے لگی۔ اُس کے یوں دیکھنے سے چند ہی لمحوں میں اُسے وحشت سی ہونے لگی۔ وہ بولا۔ ”کیا بات ہے؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟“

”تم کون ہو؟“

”یہ سوال تو مجھے تم سے کرنا چاہیے۔“

وہ کندھے اُچکا کر خاموش ہوگئی۔ اُس کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ سورج لحہ بہ لحہ دن کو گرماتا جاتا تھا۔ پروفیسر نے اسے ساتھ لیا۔ نیچے آیا اور بیڈروم کا دروازہ کھول کر اُس سے مخاطب ہوا ”تم آرام کرو، ضرورت پڑنے پر یہ باتھ روم استعمال کرسکتی ہو۔“

وہ کسی معمول کی طرح اُس کی ہدایات پر عمل کررہی تھی۔ پروفیسر اُلجھتا جاتا تھا۔ کہاں بچپن میں کھڑی وہ سموں جو ہر کام پر تنقید، ہر بات کی تردید اور ہر رَنگ پر رائے زنی خود پر فرض قرار دیتی تھی اور کہاں یہ اُجڑی ہوئی سموں جو کسی مزاحمت کے بغیر مانے چلے جارہی تھی۔ وہ دوائیوں والی الماری کی طرف جاتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ ”واقعی وقت انسان کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔“

اِبروپروفن سیرپ کی بوتل اُٹھاتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا۔ ڈاکٹر اَشو کی ہدایات یاد آئیں۔ فوراً رابطہ کیا۔ کہا ”مُرشد! تمہاری مسیحائی کی ضرورت پڑ گئی ہے۔“

”کیا بیمار پڑ گئے ہوسکیں؟“ اَشولال کی آواز بہت صاف سنائی دی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں، میری ایک مہمان کی حالت خاصی خراب ہے۔“ وہ اَٹک اَٹک کر بولا۔ ”وہ دریا میں نہ جانے کہاں سے بہتے ہوئے میری جنت تک آئی ہے۔ میں نے پیٹ کا پانی نکال دیا تھا۔ چونکہ وہ ذہنی طور پر نارمل نہیں تھی، اِس لیے میں نے بہ یک وقت ملیریا اور ٹائیفائڈ کی دوائیاں اُسے کھلا دی ہیں۔ اَب مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”کیا اَب بھی اُس کا باڈی ٹمپریچر زیادہ ہے؟“

”نہیں...... کچھ کم ہے۔“

مریض کی کیفیت جاننے کے بعد ڈاکٹر نے چند دوائیں تجویز کرکے بروقت ہدایت دیں پھر کہا۔ ”فکر نہ کرو، مسلسل رابطے میں رہو، میں تمہیں ٹریٹ منٹ بتاتا رہوں گا۔“ اَشولال نے تفصیل سے سمجھایا۔

”وہ شاید بہت زیادہ خوفزدہ ہے!“

”تمہاری مہمان مریضہ کی عمر کیا ہے؟“

”پینتیس سال!“

”اُس نے بتائی ہے؟“

”نہیں۔“

”پھر تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”محض اندازہ لگایا ہے۔“

”جھوٹ مت بولو۔ اندازہ ہوتا تو کہتے کہ تیس پینتیس سال ہوگی، اتنے وثوق سے نہ کہتے۔“

”بال کی کھال نکالنا تمہارا شوق ہے مُرشد!“ پروفیسر نے مصنوعی قہقہہ لگایا۔

”ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے دوسرا جھوٹ بھی بول دو۔“

”میں کوئی جھوٹ نہیں بول رہا مُرشد!“ وہ کراہا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے اپنی جنت کے لیے کوئی حور خرید رکھی ہو؟“

پروفیسر کا فون ایک کان سے لگا تھا، دوسرا کان اُلٹے ہاتھ سے کھینچ کر بولا۔ ”الزام مت لگاؤ، میں نے جو کہا ہے، سچ کہا ہے۔ ویسے بھی مجھے عورت ذات سے نفرت ہے۔ یہ بے وفا جنس ہے، اِس سے دور رہوں گا تو زندہ رہوں گا، قریب جاؤں گا تو اپنے احساس تلے دَب کر مرجاؤں گا۔“

”دیکھیں! مرد اور عورت، دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کی اَٹل ضرورت بنا کر دُنیا میں بھیجا ہے۔ مرد عورت کی طرف کھنچتا ہے، عورت مرد کے بغیر نہیں رہ سکتی نتیجتاً انسان کی فطرت ایسی ہے جس سے فرار ممکن ہی نہیں۔ اگر تم نے اپنی جنت کی تنہائی کو کسی رنگ بھرے وجود سے پُر کرنے کی کوشش کرہی لی ہے تو اِس میں کوئی حرج نہیں۔ یہ غیر فطری عمل نہیں ہے مگر ہاں! اپنے اِس عمل کو شرعی حیثیت دے دو تو ضمیر پر بھی بوجھ نہیں پڑے گا۔“

”تم سمجھتے کیوں نہیں ہو مرشد؟“ وہ زِچ ہوکر بولا۔ ”وہ میری کچھ نہیں لگتی، بڑے ریلے میں بہہ کر آئی اور میں نے بڑی مشکل سے اُس کی جان بچائی ہے۔“

”کیا سیلابی ریلے میں اکیلی وہی بہتی ہوئی دکھائی دی تھی؟“

وہ جھنجلا کر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اسٹور کے دروازے کے عین وسط میں سموں کھڑی دکھائی دی۔ وہ تعجب بھری نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ پروفیسر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”کیا بات ہے سموں؟“

سموں کا چہرہ ایک پَل میں متغیر ہوگیا۔ ایسے میں فون میں اَشولال کی طنزیہ آواز گونجی۔ ”چوری پکڑی گئی ناں پروفیسر! بھلا سموں بھی کوئی نام ہوتا ہے؟ ثمینہ، صائمہ، سمیرا...... یا اِن سے ملتا جلتا کوئی نام ہوگا جسے بوڑھا پروفیسر پیار سے بگاڑ کر سموں بنائے بیٹھا ہے۔ کیوں ایسا ہی ہے ناں؟“

وہ فون میں دانت پیس کر بولا۔ ”مُرشد! میں گستاخی سے ڈرتا ہوں۔ تم مجھے اُکسا رہے ہو کہ میں منہ پھاڑ کر جواب دوں۔ اُس کا نام سموں ہے، وہ مسلمان نہیں، ہندو عورت ہے۔ شادی شدہ ہے اور بال بچوں والی ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ میرا اُس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔“

پروفیسر کے کانوں میں اَشولال کا قہقہہ گونجا۔ بدقت تمام خود پر قابو پا کر بولا۔ ”تمہیں یقین نہیں آیا۔ ہاں! تم شکّی مزاج آدمی ہو۔ بہتر ہوگا کہ فوراً میرے پاس چلے آؤ۔ اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھ لو تاکہ زندگی بھر مجھے اپنے طنزیہ جملوں سے چھلنی نہ کرتے رہو۔“

”اپنی جنت کی لوکیشن سمجھاؤ، مجھے واقعی تمہارے بیانات پر یقین نہیں آرہا۔ ایک جوان عورت اگر کسی مرد کی جنت جیسی تنہائی میں زیرِ علاج ہو تو خیر نہیں ہوتی۔“ اَشو نے کہا۔

پروفیسر نے جوش کے عالم میں اُسے جنت کا محل وقوع سمجھایا۔

”اچھا! اَب سمجھا۔ تم نے بزداروں والی ڈھنڈھ پر ڈیرا لگایا ہے۔“

”ہاں! یہاں کچا پتن بنا ہوا ہے مگر اَب وہ پانی میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی دکھائی دے رہا ہے۔ سوائے کشتی کے میرے پاس پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''آج تو ممکن نہیں، میں کل کسی وقت تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ تب تک اللہ حافظ!'' اُشولال نے پرجوش آواز میں کہا اور فون بند کر دیا۔

سموں اَبھی تک دروازے میں کھڑی تھی۔ فون کانوں سے ہٹا تو وہ قریب آ گئی۔ بولی ''آپ کون ہیں اور یہ سب کیا ہے؟''

اُس کا اشارہ جنت کی طرف تھا۔

''میں دنیا سے بیزار انسان ہوں۔ یہ میری جنت ہے اور میرے سمیت ہمیشہ یہیں رہتی ہے۔'' پروفیسر نے اُسے یک ٹک دیکھتے ہوئے کہا ''تم کیوں یہاں چلی آئیں؟''

''آپ جس سے فون پر بات کر رہے تھے وہ آپ پر شک کیوں کر رہا تھا؟''

''تم نادان نہیں ہو۔''

وہ جھینپ سی گئی۔ بولی۔ ''نہ جانے آپ کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے میں نے پہلے بھی کہیں آپ کو دیکھ رکھا ہو۔''

پروفیسر کا دل دھڑکنے لگا۔ شناسائی کا جذبہ سدھ مندی کے عود کرتے ہی اُترنے لگا تھا۔ بظاہر بے پروائی سے بولا۔ ''اِس بارے میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''

''آپ نے اپنے دوست سے کہا ہے کہ آپ عورت ذات سے نفرت کرتے ہیں، کیا واقعی ایسا ہی ہے؟''

''ہاں!'' اُس نے اَٹل لہجے میں کہا۔

''کیوں؟''

''اِس کا جواب میں اپنے دوست کو دے چکا ہوں۔ تم بھی سننا چاہتی تو سن لو کہ یہ جنس بے حد نامعتبر اور موقع پرست ہوتی ہے۔'' پروفیسر کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی غیر معمولی تلخی گھل گئی۔

''پھر زندگی بچانے کا احسان مجھ پر کیوں کیا آپ نے؟''

''مجھے تم سے نفرت نہیں ہے۔''

''کیا میں عورت نہیں ہوں؟''

''شاید نہیں ہو۔'' اُس نے جان چھڑانا چاہی۔ ''کیا تم خود کو مکمل طور پر فٹ محسوس کر رہی ہو؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا، منہ سے کچھ نہیں بولی۔

''اِدھر چل کر بیٹھو، میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے کہ میں اچھی چائے بنا سکتی ہوں۔'' وہ بولی اور پلٹ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ چونکہ دروازہ اَدھ کھلا تھا، اِس لیے کچن کے اندر ریک میں پڑے برتنوں کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہو سکتا تھا کہ یہ کچن ہے۔ وہ اُس کے پیچھے پیچھے کچن میں آیا۔ اُسے کچن میں پڑی ہوئی مختلف اشیا کے بارے میں سمجھا کر کرسی پر آن بیٹھا۔

آج دریائی پانی کے اضطراب میں خاصی کمی واقع ہو چکی تھی مگر فضا میں حبس کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ عجیب سی بساند ماحول میں رچی بسی تھی۔ چڑھے ہوئے پانی میں بہہ کر آنے والا سامان بھی خال خال دکھائی دے رہا تھا۔ چند ہی منٹوں کے بعد سموں چائے ٹرے میں رکھ کر وہیں آ گئی۔ چائے پیش کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو میرے نام کا کیسے پتا چلا؟''

پروفیسر کو اِس سوال کی توقع تھی۔ بات پہلے ہی بنائے بیٹھا تھا، اِس لیے بے نیازی سے بھویں اُچکا کر بولا ''تم نے بے ہوشی میں اپنے نام اور مذہب سے آگاہ کیا تھا۔''

''میں نے اور کیا کچھ بتایا تھا؟''

''بے ہوشی میں بتائے ہوئے کو چھوڑو، ہوش میں رہ کر بتاؤ۔'' پروفیسر نے اپنی نظریں اُس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اسے حیرانی ہوئی کہ سموں کے چہرے پر حزن و اضطرار کے بجائے پُرعافیت سکون جھلک رہا تھا۔

وہ چائے کا گھونٹ بھر کر بولی۔ ''میرا نام واقعی سموں ہے۔''

اچانک چونک پڑی۔ آنکھوں سے عجیب سا تاثر جھانکنے لگا۔ پروفیسر نے استعجاب آمیز لہجے میں پوچھا ''کیا ہوا؟''

''آپ کا نام کیا ہے؟''

''میرا نام وسیم ہے۔'' اُس نے روانی میں کہہ دیا۔ تیر ہاتھوں سے نکل گیا تو غلطی کا احساس ہوا۔ سموں کے چہرے کے تاثرات یک لخت بدل گئے۔ وہ کپ تھامے کھڑی ہو گئی۔ عجیب سی بے یقین نظروں سے دیکھتے ہوئے آہستگی سے بڑبڑانے کے سے انداز میں گویا ہوئی ''سیمو..... تم؟ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم سیمو ہو۔ ہے ناں؟''

خود کو چھپانا بے سود تھا۔ وہ ویسے بھی خود کو چھپانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں سموں! میں وہی سیمو ہوں جسے تمہارے باپ نے پالا پوسا، پڑھایا اور ایک جرم کی پاداش میں مجھے گھر سے نکال دیا، تمہیں میری زندگی سے نکال دیا۔ میں وہی ہوں۔''

چائے کا کپ سموں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ایک زوردار آواز سے چوبی فرش پر گرا اور لڑھک کر پروفیسر کے قدموں میں آ گیا۔ وہ چند لمحوں تک کھڑی اُسے یک ٹک دیکھتی رہی پھر اتنی تیزی سے پروفیسر پر آن گری کہ اُسے سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔ کرسی چوبی فرش میں مضبوطی سے نصب تھی وگرنہ وہ پیچھے کی طرف الٹ جاتی۔ وہ دیوانہ وار اُسے چومتی جاتی تھی، روتی جاتی تھی اور بار بار کہتی جاتی تھی ''میرے نصیبے کی طرح میری آنکھیں پھوٹ کیوں نہیں گئیں جنہوں نے اپنے سیمو کو بھی نہیں پہچانا!''

(جاری ہے)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk